از افاداتِ شیخ القرآن
فی تفسیر سورۃ البقرۃ وام القرآن

مؤلفہ

حضرت علامہ شیخ القرآن ابوالفضل والبیان
مولانا غلام علی اوکاڑوی قادری اشرفی قدس سرہ

ضابطہ

نام کتاب:	اشرف التفاسیر (از افادات شیخ القرآن فی تفسیر سورۃ البقرۃ واُم القرآن)
مؤلف:	حضرت علامہ شیخ القرآن ابو الفضل والبیان مولانا غلام علی اوکاڑوی قادری اشرفی قدس سرہ
اہتمام:	صاحبزادہ محمد فضل الرحمٰن اوکاڑوی اشرفی
ناشر:	جامعہ حنفیہ دار العلوم اشرف المدارس، اوکاڑا
کمپوزنگ:	ایسکام کمپیوٹرز، اوکاڑا، 0300-6952580
سرِ ورق:	شاہد لطیف
اشاعتِ اول:	اکتوبر 2018ء
تعداد:	500
قیمت:	/800 روپے
رابطہ:	+92 300 4262579

کتاب ملنے کے پتے

☆ جامعہ حنفیہ دار العلوم اشرف المدارس

جی ٹی روڈ، اوکاڑا، فون: 044-2525338

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشرف التفاسیر

از افادات شیخ القرآن

فی تفسیر سورۃ البقرہ و ام القرآن

مؤلفہ

حضرت علامہ شیخ القرآن

ابو لفضل و البیان مولانا غلام علی اوکاڑوی قادری اشرفی قدس سرہ

سراغِ احساسات

◎

ایسکام پبلشرز

4/ عبدالحق سنٹر، غلہ منڈی، اوکاڑا موبائل: 0300-6952580

مقدمہ

الحمد للہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی سیدنا محمد وعلی الہ واصحابہ اجمعین

تمام علوم سے افضل قرآن کریم کے علوم ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جن کو قرآن فہمی کا ملکہ عطا فرمایا اور اس میں غوطہ زنی کی توفیق عطا فرمائی وہ اس کے خاص فضل وکرم اور رحمت سے برگزیدہ اور منتخب صالحین میں سے ہیں۔ قرآنِ کریم کا ترجمہ اور اس کی تفسیر کرنا کوئی آسان کام نہیں کہ جو شخص محض عربی دان ہو یا صرف لغت عرب سے واقف ہو وہ اس کو کما حقہ سمجھ کر بیان کر دے جیسا کہ کچھ لوگوں کا زعم باطل ہے۔ چنانچہ علامہ سید محمد محمود آلوسی حنفی (متوفی ۱۲۷۰ھ) اپنی تفسیر روح المعانی کی ابتداء میں لکھتے ہیں۔

قرآن کریم کی تفسیر کے لیے ضروری علوم میں سے علم لغت کی ضرورت ہے کیونکہ علم لغت کے ذریعے مفردات قرآنی کے معنی، موضوع لہ معلوم ہوتے ہیں نیز صرف ونحو کے قواعد کا جاننا بھی بہت ضروری ہے۔ اس لیے کہ اس سے قرآن پاک کی آیات کی حرکات اور اعراب کا علم حاصل ہوتا ہے۔

اور یہ واضح ہوتا ہے کہ فلاں اعراب اور حرکت کے اعتبار سے قرآن پاک کی اس آیت کا کیا معنی ہے۔

نیز معانی، بیان اور بدیع (فصاحت و بلاغت) کا جاننا بھی لازمی اور ضروری ہے۔ اس لیے کہ اس کے ذریعہ سے مقتضی حال کے مطابق معانی حقیقت ومجاز اور کنایات کے مختلف طریقوں کے اعتبار سے قرآن کریم کے معانی اور تحسین کلام کا پتہ چلتا ہے۔

(اس کی مثال قبلہ استاذی المکرم شیخ القرآن والحدیث مولنا غلام علی رحمۃ اللہ تعالیٰ یہ فرمایا کرتے تھے کہ جب کافروں نے حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی رسالت کا شدّ ومدّ سے انکار کیا تو اللہ تعالیٰ نے بھی مقتضی کے مطابق تاکید کے ساتھ ان کے جواب میں ارشاد فرمایا۔

انک لمن المرسلین

''بیشک آپ ضرور رسولوں میں سے ہیں''

اس میں ایک تو تاکید حرف ''اِنّ'' کی اور دوسرا خبر پر لام تاکید لانا۔ یہ ان کفار کا رد مقتضیٰ حال کے عین مطابق ہے۔

نیز تفسیر کرنے کے لیے علم حدیث کی بھی نہایت ضرورت ہے۔

بعض اوقات احادیث سے اسباب نزول کا پتہ چلتا ہے نیز علم اصول فقہ بھی تفسیر قرآن کریم کے لیے لازم اور ضروری کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سے قرآنِ کریم کے خاص، عام، مطلق، مقید اور امر و نہی وغیرہ کی دلالت کا علم حاصل ہوتا ہے۔ اور علمِ کلام کی بھی ضرورت ہے تاکہ مفسر کو معلوم ہو سکے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے کیا چیز جائز ہے اور کیا محال ہے۔

نیز علمِ کلام سے اللہ تعالیٰ کے نبی کی صفات اور اس کے مقام کا پتہ چلتا ہے نیز مفسر کے لیے قرأت کا علم بھی ضروری اور لازمی ہے تاکہ بعض قرأت کے بعض پر راجح ہونے کی علت معلوم ہو سکے۔

نیز علامہ علی بن سلطان محمد انصاری المکی (متوفی ۱۰۱۴ھ)۔

مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوۃ المصابیح میں اس حدیث پاک (من قال فی القرآن بدائیہ فاصاب فقد اخطأ) کی شرح میں تحریر فرماتے ہیں وھی خمسۃ عشر علماً اللغت۔ والنحو۔ والتصریف۔ والاشتقاق۔ الخ ۱/۲۹۲ مکتبہ امدادیہ ملتان۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ بقول علامہ محمود آلوسی وعلامہ علی قاری رحمہما اللہ تعالیٰ قرآنِ کریم کی تفسیر کرنے کے لیے مذکورہ علوم کا حصول لازمی اور ضروری ہے۔ اور ان علوم سے عدم واقفیت مفسر کے لیے باعث ضلالت و گمراہی ہے اور بقول بعض

ع آنکہ خود راہ گم کردہ است کرا رہبری کند

قبلہ حضرت صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ کو اللہ تعالیٰ نے کثیر علوم سے نوازا تھا۔ من جملہ ان کے قرآن کریم کے علوم کو بیان کرنے اور لکھنے لکھانے میں آپ کو مہارت تامہ حاصل تھی۔

اسی بنا پر آپ نے پاکستان کے منتخب اور بڑے بڑے شہروں میں دورۂ تفسیر قرآنِ کریم پڑھایا جن میں سینکڑوں کی تعداد میں علماء وفضلاء نے شرکت کر کے اپنی علمی پیاس بجھائی اور کثیر موضوعات پر آپ نے تحریرات کروائیں بعض حضرات کے پاس اب بھی وہ کاپیاں موجود ہیں۔

ایک دن دورۂ تفسیر قرآن پڑھتے ہوئے میں نے یہ سوال کیا کہ آپ کو قرآن کریم کی تفسیر کا ملکہ کیسے حاصل ہوا؟

تو آپ نے فرمایا کہ جالندھر میں میرے استاذ محترم (علامہ عبدالجلیل ہزاروی) چونکہ رات کو بعد نماز عشاء شہر جالندھر کی جامع مسجد میں درس قرآن دیتے تھے۔ کثرتِ اسباق کی وجہ سے انہیں مطالعہ کا وقت دن کو کم ملتا تھا۔ بنا بریں مغرب وعشاء کے درمیان تفاسیر کا اس طرح مطالعہ فرماتے کہ منتہی طلباء میں سے کسی کو پڑھنے کا حکم دیتے اور خود سن کر اُن تفاسیر کے مفاہیم ومعانی کو ازبر کر لیتے ہیں۔ استاذ مرحوم کی شفقت اور محبت کی وجہ سے اکثر یہ فریضہ میں ہی ادا کرتا تھا۔

اس وجہ سے مجھے اللہ تعالیٰ نے دورۂ قرآنِ کریم اور درسِ قرآنِ حکیم کا ادراک و فہم عطا فرما دیا۔

بنابریں آپ نے تفسیرِ قرآن کریم لکھنے کا ارادہ فرمایا تو سب سے پہلے ''مقدمہ تفسیر رضوی'' (اصول تفسیر) عربی تحریر فرما کر اس کا نام اشرف التحریر فیما یتعلق بالتفسیر رکھا۔ جس میں بارہ ۱۲ فصول معین فرما کر تفسیرِ قرآنِ کریم کی مبادیات کو واضح کیا۔ من شاء فلیرجع الیٰ مقدمہ تفسیر رضوی اس کے بعد آپ ملکی سیاست میں حصہ لینے کی وجہ سے تفسیر قرآنِ کریم کے لیے وقت نہ نکال سکے۔ اخیر عمر میں جب آپ نے سیاست کو خیر اباد کہا تو پھر تفسیر کا کام شروع کیا۔

لیکن ناسازی طبع کے باعث سورۂ بقرہ شریف کی احکام کی آیات کی تفسیر لکھوائی اور اس کا مسودہ تیار ہو گیا اور آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیغامِ لِقا آ پہنچا اور آپ ملک بقا کے راہی ہو گئے۔

آپ کے صاحبزادہ والاشان جنابِ محترم محمد فضل الرحمٰن صاحب نے مجھے حکم فرمایا کہ آپ کے اس تفسیری مجموعہ پر نظر ثانی کریں تا کہ اس کو چھپوا کر حضرت کے فیوض و برکات کو علما و عوام تک پہنچایا جا سکے۔ چنانچہ ہم نے حتی المقدور اس کو دیکھا، اب بھی اگر کوئی غلطی رہ گئی ہو تو اس سے ہمیں مطلع فرما کر ممنون فرمائیں تا کہ آئندہ ایڈیشن میں اس کی تصحیح کی جا سکے۔ قبلہ استاذی المکرم کی صلاحیتیں تو خداداد تھیں اس بنا پر اخیر عمر میں مکمل قرآنِ کریم کی تفسیر آپ نے کیسٹوں کی صورت میں محفوظ فرما دی۔

اسی وجہ سے ہمارے شیخ طریقت سجادہ نشین آستانہ عالیہ حضرت کرمانوالہ شریف اوکاڑا پیر جی سرکار میر طیب علی شاہ بخاری مدظلہ العالی نے ایک مرتبہ صاحبزادہ محمد فضل الرحمٰن

صاحب سے ارشاد فرمایا کہ قبلہ شیخ القرآن رحمۃ اللہ تعالیٰ کی تفسیری کیسٹیں ہمیں بھی عطا فرمائیں تا کہ ہم سن کر آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ کے علوم سے فیضیاب ہو جائیں۔ چنانچہ صاحبزادہ محمد فضل الرحمٰن صاحب نے بکمال الفت ومحبت ان کی کاپی کروا کر راقم سے ہی ارشاد فرمایا کہ دربار شریف پر جا کر مرشد العصر سجادہ نشین مدظلہ العالی کی جناب میں میری طرف سے یہ ہدیہ پیش کریں تو میں جب ان کو لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے نہایت فرحت ومسرت کا مظاہرہ فرما کر قبول فرمالیں۔ وللہ الحمد

آپ نے اس تفسیری مجموعہ میں مسئلہ شفاعت، نیز ناسخ ومنسوخ، احکام حج و رمضان المبارک واحکام جہاد وزکوٰۃ وصدقات واحکام طلاق وعدت وربا پر تفصیلی کلام فرمایا ہے۔ پڑھنے والا ان کی جامعیت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے گا۔

مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید

خادم العلم والعلماء

(حضرت علامہ مولانا) حافظ غلام یاسین اشرفی

مفتی جامعہ حنفیہ دار العلوم اشرف المدارس اوکاڑا

عرضِ ناشر

اللہ تبارک وتعالیٰ اور اس کے پیارے حبیب ﷺ کا لاکھ لاکھ شکر ہے میں والد گرامی قبلہ شیخ القرآن مولانا غلام علی اوکاڑوی رحمۃ اللہ تعالیٰ کی تالیف ''اشرف التفاسیر'' کی چھپوائی کے قابل ہوا ہوں۔ اس کتاب کی طباعت میں جن لوگوں کا تعاون اور رہنمائی مجھے حاصل ہوئی۔ ان میں حضرت علامہ ڈاکٹر کوکب نورانی اوکاڑوی، حضرت علامہ مفتی غلام یسٰین اشرفی، مولانا مفتی غلام دستگیر اکبری، علامہ حامد سبحانی اوکاڑوی اور مولانا عبدالرحمٰن اشرفی وغیرہ شامل ہیں جن کا میں تہہ دل سے شکرگزار ہوں۔

اس کتاب میں یقیناً بہت سی غلطیاں ہوئی ہوں گی جن کی نشاندہی کی آپ قارئین سے توقع رکھتا ہوں اور ان کو آئندہ ایڈیشن میں دور کرنے کا وعدہ کرتا ہوں۔

قارئین کرام! امید رکھتا ہوں کہ یہ کتاب آپ کو پسند آئے گی اور یقیناً اس سے استفادہ حاصل کریں گے۔ اگر آپ حضرات نے حوصلہ افزائی فرمائی تو ان شاء اللہ عنقریب قبلہ والدِ گرامی کی دیگر تالیفات آپ کے سامنے پیش کروں گا۔

اللہ تعالیٰ اور اس کے حبیب ﷺ اس سعی کو قبول فرمائیں۔

طالبِ دُعا:

(صاحبزادہ مولانا پیر)

محمد فضل الرحمٰن قادری اشرفی اوکاڑوی

مہتمم جامعہ حنیفہ دارالعلوم اشرف المدارس اوکاڑا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین

سورۃ الفاتحہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۝ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝ مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ ۝ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ ۝ اِہۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ ۝ غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا الضَّآلِّیۡنَ ۝ آمین

(ترجمہ) اللہ کے نام سے شروع جو بہت مہربان رحمت والا (ہے)

''سب خوبیاں اللہ کو جو مالک سارے جہان والوں کا، بہت مہربان، رحمت والا، روز جزا کا مالک، ہم تجھی کو پوجیں اور تجھی سے مدد چاہیں، ہم کو سیدھا راستہ چلا، راستہ ان کا جن پر تو نے احسان کیا، نہ کہ ان کا جن پر غضب ہوا اور نہ گمراہوں کا۔''

سورۃ فاتحہ کے اسماء:

سورہ فاتحہ کے متعدد نام ہیں۔ فاتحہ، فاتحۃ الکتاب، ام القرآن، سورۃ الکنز، کافیہ، وافیہ، شافیہ، شفاء، سبع مثانی، نور، رقیہ، سورۃ الحمد، سورۃ الدعاء، تعلیم المسئلہ، سورۃ المناجاۃ، سورۃ التفویض، سورۃ السوال، ام الکتاب فاتحۃ القرآن، سورۃ الصلوۃ، اس سورۃ میں سات آیتیں، ستائیس کلمے، ایک سو چالیس حروف ہیں۔ کوئی آیت ناسخ یا منسوخ نہیں۔ (خزائن العرفان)

شانِ نزول:

یہ سورۃ مکہ مکرمہ میں ہجرت سے پہلے نازل ہوئی اور ایک قول کے مطابق ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں دوبارہ نازل ہوئی تاکہ مسلمانوں کو اس کی عظمتِ شان کا پتا لگ جائے۔

(روح البیان)

عمرو بن شرجبیل سے منقول ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے فرمایا میں ندا سنا کرتا ہوں جس میں اِقْـرَاْ کہا جاتا ہے۔ ورقہ بن نوفل کو خبر دی گئی۔ اس نے کہا کہ جب یہ ندا آئے تو آپ باطمینان سنیں۔ اس کے بعد حضرت جبریل علیہ السلام نے حاضرِ خدمت ہو کر عرض کیا۔ فرمایا ہے! بِسْمِ اللّٰـہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ (کبیر) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نزول میں یہ پہلی سورۃ ہے، مگر دوسری روایات صحیحہ کثیرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے سورۃ اِقْرَاْ نازل ہوئی۔

اس سورۃ میں بندوں کو تعلیم دی گئی ہے کہ اس طرح اللہ کی حمد بیان کریں۔ فاتحہ کے مضامین میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء، ربوبیت، رحمت، مالکیت، استحقاقِ عبادت، توفیقِ خیر، بندوں کی ہدایت، توجہ الی اللہ، اختصاصِ عبادت، استعانت، طلبِ رشد، آدابِ دعا، صالحین کے حال سے موافقت، گمراہوں سے اجتناب و نفرت، دنیا کی زندگی کا خاتمہ، جزاء اور روزِ جزا کا مصرح اور مفصل بیان ہے اور دیگر مسائل کا اجمالاً بیان ہے۔

اَلْـحَمْدُ لِلّٰہِ (سب خوبیاں اللہ کو) ھو الثناء باللسان علی الجمیل الاختیاری نعمۃ کان او غیرھا الخ کسی اختیاری خوبی پر زبان سے تعریف کرنے کو حمد کہتے ہیں۔ اس میں نعمت کی خصوصیت نہیں ہے، ہو یا نہ ہو (مظہری) ہر کام کی ابتداء میں تسمیہ کی طرح حمد الٰہی بجالانا چاہیے۔

حمد۔ شکر اور مدح کا فرق:

کسی اختیاری خوبی پر زبان سے تعریف کرنے کو حمد کہتے ہیں۔ اس میں نعمت کی خصوصیت نہیں ہے ہو یا نہ ہو اس لیے کہ حمد باعتبار تعلق شکر کی نسبت عام ہے، کیوں کہ شکر نعمت کے ساتھ مخصوص ہے اور باعتبار مورد کے خاص ہے، کیوں کہ شکر زبان و دل اور دیگر تمام اعضاء سے صادر ہو سکتا ہے اور حمد صرف زبان سے خصوصیت رکھتی ہے۔ اس لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

(الحمد راس الشکر ماشکر اللہ عبد لایحمدہ) (حمد شکر کی اصل ہے جس شخص نے خدا کی حمد نہ کی اس نے ذرا بھی شکر نہ کیا) (رواہ عبدالرزاق عن قتادہ) اور مدح حمد کی نسبت عام ہے، کیوں کہ مدح صرف خوبی پر ہوا کرتی ہے اور اس خوبی کا اختیاری یا غیر اختیاری ہونا ضروری نہیں۔ (مظہری)

رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (جو مالک سارے جہان والوں کا) اس جملہ میں تمام کائنات کے حادث ممکن محتاج ہونے اور اللہ تعالیٰ کے واجب قدیم ازلی، ابدی، حی وقیوم، قادر، علیم ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ رب العالمین ان سب کو مستلزم ہے۔ ان دولفظوں میں علم الٰہیات کے اہم مباحث طے ہوگئے۔

مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ (روز جزا کا مالک) اس جملہ میں مِلک کے ظہور تام کا بیان ہے اور دلیل یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی مستحق عبادت نہیں ہے، کیوں کہ سب اس کے مملوک ہیں اور مملوک مستحق عبادت نہیں ہوسکتا، نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ دنیا دارالعمل ہے اور اس کے لیے ایک اخیر ہے لہٰذا جہان کے سلسلہ کو ازلی وقدیم کہنا باطل ہے۔ اختتام دنیا کے بعد ایک جزاء کا دن ہے۔ اس سے عقیدہ تناسخ کا بطلان بھی ظاہر ہوتا ہے۔

اِیَّاکَ نَعْبُدُ (ہم تجھی کو پوجیں) ذکر ذات وصفات کے بعد یہ فرمانا اشارہ کرتا ہے کہ اعتقاد عمل پر مقدم ہے اور عبادت کی مقبولیت عقیدے کی صحت پر موقوف ہے۔ نَعْبُدُ کے صیغہ جمع سے عبادت (نماز) ادا بجماعت مستفاد ہوتی ہے اور یہ بھی کہ عوام کی عبادتیں محبوبوں اور مقبولوں کی عبادتوں کے ساتھ درجہ قبولیت پاتی ہیں۔ (مسئلہ) اس میں ردشرک بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا عبادت کسی کی نہیں ہوسکتی۔

وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ (اور تجھ ہی سے مدد چاہیں) اس میں یہ تعلیم فرمائی کہ استعانت خواہ بواسطہ ہو یا بے واسطہ ہر طرح اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے۔ حقیقی مستعان وہی ہے۔ باقی آلات وخدام و احباب وغیرہ سب عونِ الٰہی کے مظہر ہیں۔ بندے کو چاہیے کہ اس پر نظر رکھے اور ہر چیز میں دستِ

قدرت کو کارکن دیکھے۔ اس سے یہ سمجھنا کہ اولیآء و انبیآء سے مدد چاہنا شرک ہے، عقیدہ باطلہ ہے کیوں کہ مقربانِ حق کی امداد، امدادِ الٰہی ہے استعانت بالغیر نہیں۔ اگر اس آیت کے وہ معنی ہوتے جو وہابیہ نے سمجھے تو قرآنِ پاک میں (اعینونی بقوۃ)، (استعینوا بالصبر والصلوۃ)، (من انصاری الی اللہ) کیوں وارد ہوتا اور احادیث میں اہل اللہ سے استعانت کی تعلیم کیوں دی جاتی۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (ہم کو سیدھا راستہ چلا) معرفتِ ذات وصفات کے بعد عبادات اور اس کے بعد دعا کی تعلیم فرمائی۔ (ف): معلوم ہوا کہ بندے کو عبادت کے بعد مشغول بدعاء ہونا چاہیے۔ حدیث شریف میں بھی نماز کے بعد دعا کی تعلیم فرمائی (طبرانی فی الکبیر والبیہقی فی السنن) صراطِ مستقیم سے مراد اسلام یا قرآن یا خلق نبی کریم ﷺ یا حضور کے آل واصحاب ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ صراطِ مستقیم طریق اہل سنت ہے جو اہلِ بیت واصحاب اور سنت وقرآن سب کو مانتے ہیں۔

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (راستہ ان کا جن پر تو نے احسان کیا) یہ جملہ اولیٰ کی تفسیر ہے کہ صراطِ مستقیم سے طریق مسلمین مراد ہے۔ اس سے بہت سے مسائل حل ہوتے ہیں کہ جن امور پر بزرگانِ دین کا عمل رہا ہو وہ صراطِ مستقیم میں داخل ہیں۔ اس کی تفسیر اس حدیث سے ہوتی ہے۔ (ما راٰہ المومنونَ حسناً فھو عند اللہ حسن) (جس کو مسلمان (کامل مومنین) اچھا سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھا ہے) لہٰذا محفل میلاد شریف، فاتحہ، عرسِ بزرگانِ دین اور وہ تمام امور جن کو عرب وعجم کے علماء زاہدین، صالحین، مشائخ، صوفیاء اچھا جانتے اور عمل کرتے ہیں وہ سب جائز اور مستحب ہیں۔

غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ (نہ ان کا جن پر غضب ہوا اور نہ گمراہوں کا) اس میں ہدایت ہے کہ طالبانِ حق کو دشمنانِ خدا سے اجتناب اور ان کے راہ ورسم، وضع واطوار، صورت وسیرت سے پرہیز لازم ہے۔ ترمذی کی روایت ہے کہ مغضوب علیھم سے یہود اور ضآلین سے نصاریٰ مراد ہیں۔ (ملخصا خزائن العرفان)

احکام، مسائل:

اس سورہ شریفہ کے احکام و مسائل سے پہلے تعوذ اور تسمیہ کے متعلق چند ضروری مسائل بیان کیے جاتے ہیں۔

1. تلاوت سے پہلے اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم پڑھنا سنت ہے (خازن) لیکن شاگرد استاد سے پڑھ رہا ہو تو اس کے لیے سنت نہیں (شامی)

مسئلہ: نماز میں امام و منفرد کے لیے ثناء سے فارغ ہو کر آہستہ اعوذ پڑھنا سنت ہے۔ (شامی)

مسائل تسمیہ:

(بسم اللہ الرحمن الرحیم) قرآن پاک کی آیت ہے، مگر سورہ فاتحہ یا کسی اور سورۃ کا جزو نہیں۔ اس لیے نماز میں جہر کے ساتھ نہ پڑھی جائے۔

بخاری و مسلم میں مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ اور حضرت صدیق و فاروق رضی اللہ عنہما نماز (الحمد للہ رب العلمین) سے شروع فرماتے تھے۔

مسئلہ: تراویح میں جو ختمِ قرآن کیا جاتا ہے اس میں کہیں ایک مرتبہ بسم اللہ الخ جہر کے ساتھ ضرور پڑھی جائے تا کہ ایک آیت باقی نہ رہ جائے۔

مسئلہ: قرآن مجید کی ہر سورۃ بسم اللہ الخ سے شروع کی جائے۔ سوائے سورہ برأت (توبہ) کے۔

مسئلہ: سورہ نمل میں آیتِ سجدہ کے بعد جو بسم اللہ آئی ہے وہ مستقل آیت نہیں بلکہ جزوِ آیت ہے بلا خلاف اس آیت کے ساتھ ضرور پڑھی جائے گی۔ جہری نماز میں جہراً اور سری میں سراً۔

مسئلہ: ہر مباح کام بسم اللہ سے شروع کرنا مستحب ہے۔ ناجائز کام پر بسم اللہ پڑھنا ممنوع ہے۔

مسئلہ: حمد کبھی واجب ہوتی ہے جیسے خطبہ جمعہ میں۔ کبھی مستحب جیسے خطبہ نکاح و دعا اور ہر امرِ ذی شان میں اور ہر کھانے پینے کے بعد، کبھی سنت مؤکدہ جیسے چھینک آنے کے بعد (طحاوی)۔

مسئلہ: نماز میں اس صورت کا پڑھنا واجب ہے۔ امام ومنفرد کے لیے تو حقیقۃً اپنی زبان سے اور مقتدی کے لیے حکماً یعنی امام کی زبان سے۔ صحیح حدیث میں ہے قراۃ الامام لہ قراۃ (امام کا پڑھنا ہی مقتدی کا پڑھنا ہے) قرآن پاک میں مقتدی کو خاموش رہنے اور امام کی قرأت سننے کا حکم دیا گیا ہے۔ (واذا قرئ القرآن فاستمعوا لہ و انصتوا) مسلم شریف کی حدیث ہے کہ (اذا قرء فانصتوا) جب امام قرأت کرے تم خاموش رہو اور بہت سی احادیث میں یہی مضمون وارد ہے۔

مسئلہ: ضاد اور ظاء ہر دو میں مباینت ذاتی ہے۔ بعض صفات کا اشتراک انہیں متحد نہیں کرسکتا، لہٰذا غیر المغضوب بظاء پڑھنا اگر بالقصد ہو تو تحریفِ قرآن کفر ہے ورنہ ناجائز۔

مسئلہ: جو شخص ضاد کی جگہ ظاء پڑھے اس کی امامت جائز نہیں (محیط)

مسئلہ: آمین یہ کلمہ قرآن نہیں ہے اس کے معنی ہیں "ایسا ہی کر" یا "قبول فرما"

مسئلہ: سورۃ فاتحہ کے ختم پر آمین کہنا سنت ہے نماز کے اندر بھی اور باہر بھی۔

مسئلہ: حضرت سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا مذہب یہ ہے کہ نماز میں آمین آہستہ کہی جائے۔ تمام احادیث پر نظر وتنقید سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ جہر کی روایتوں میں صرف حضرت وائل کی روایت صحیح ہے اس میں (مد بہا) کا لفظ ہے جس کی دلالت جہر پر قطعی نہیں کیوں کہ جیسا جہر کا احتمال ہے ویسا ہی بلکہ اس سے قوی مد ہمزہ کا، لہٰذا یہ روایت جہر کے لیے حجت نہیں ہوسکتی۔ دوسری روایات جن میں جہر ورفع کے الفاظ ہیں ان کی اسناد میں کلام ہے۔ علاوہ ازیں وہ روایات بالمعنی ہیں اور فہم راوی حدیث نہیں لہٰذا آمین کا آہستہ کہنا صحیح تر ہے۔

مسئلہ: نماز جنازہ میں دعا یاد نہ ہو تو سورہ فاتحہ بانیتِ دعا پڑھنا جائز ہے بانیت قرأت جائز نہیں (عالمگیری)۔

فضائل:

احادیثِ صحیحہ میں اس سورۃ مبارکہ کی بہت سی فضیلتیں وارد ہیں۔ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا (تورات، انجیل، زبور میں اس کی مثل سورت نازل نہ ہوئی) (ترمذی) ایک فرشتہ نے آسمان سے نازل ہو کر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر سلام عرض کیا اور ایسے دو نوروں کی بشارت دی جو حضور سے پہلے کسی نبی کو عطا نہ ہوئے۔ ایک سورۃ فاتحہ دوسرا سورۃ بقرہ کی آخری آیتیں (مسلم) سورۃ فاتحہ ہر مرض کے لیے دوا ہے (دارمی) سورۃ فاتحہ سو مرتبہ پڑھ کر دعا مانگے اللہ تعالیٰ قبول فرماتا ہے (دارمی)

سورۃ البقرۃ

حیات قبر کا ثبوت

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ كُنْتُمْ اَمْوَاتاً فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ○ (سورۃ البقرۃ:۲۸)

"بھلا تم کیوں کر خدا کے منکر ہو گے حالاں کہ تم مردہ تھے اس نے تمہیں جلایا پھر تمہیں مارے گا پھر تمہیں جلائے گا پھر اسی کی طرف پلٹ کر جاؤ گے"۔ (کنز الایمان)

اس آیت سے قبر کی برزخی حیات پر استدلال کیا جا سکتا ہے، کیوں کہ رب تعالیٰ فرماتا ہے تم مردے تھے یعنی ماں کے پیٹ میں نطفہ تھے۔ پس اس نے تمہیں جلایا یعنی دنیا میں آئے پھر تمہیں مارے گا یعنی موت طبعی سے پھر تمہیں جلائے گا یعنی قبر میں پھر قیامت کے دن اس کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

یاد رہے کہ معتزلہ اور شیعہ اور بعض دیگر گمراہ لوگ ثواب وعذاب قبر کے منکر ہیں۔
یہ آیت مدنیہ ہے اس میں کفار و یہود اور منافقین کو خطاب ہے اور یہ ظاہر ہے۔ یہود حشر ونشر کے معتقد و معترف تھے اب یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ مخاطب تو حشر ونشر کے قائل نہیں پھر یہ آیت ان پر کس طرح حجت ہو سکتی ہے۔ (مظہری)
بعض مفسرین کے نزدیک یہ خطاب مومنین کے لیے ہے۔ فلا اشکال علیه ولا حاجة بالجواب عنه والله اعلم

اصل اشیاء میں اباحت ہے

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

ھُوَالَّذِیۡ خَلَقَ لَکُمۡ مَّافِی الۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا (سورۃ البقرۃ:۲۹)

''اور وہی ہے جس نے تمہارے لیے بنایا جو کچھ زمین میں ہے۔'' (کنز الایمان)

تفسیر:

ھُوَالَّذِیۡ قرآن کریم میں ھُوَالَّذِیۡ کبھی تو اللہ کی رحمت ظاہر کرنے کے لیے ہوتا ہے، کبھی اظہار قدرت کے لیے، یہاں دونوں مقصود ہو سکتے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ وہ قدرت والا ہے یا وہ رحمت والا۔ کبھی کسی خاص بندے کی عظمت ظاہر کرنے کے لیے بھی ھُوَالَّذِیۡ آتا ہے۔ جیسے (ھوالذی ارسل رسولہ)۔ (اللہ وہ شان والا ہے جس نے ایسے شان والے محمد رسول اللہ ﷺ کو بھیجا)۔ یہاں حضور ﷺ کی شان کا اظہار مقصود ہے کہ اگر میری شان دیکھنا ہے تو میرے اس محبوب کی شان دیکھو، بے دیکھی چیز کو ان مظاہر سے جانا جاتا ہے۔ جان کو اعضاء کی حرکات سے معلوم کرتے ہیں ایسے ہی رب کو ان کے حالات سے معلوم کرو۔

حضرات مفسرین نے اس جگہ پر خلق کو قدر کے معنی میں لیا ہے۔ یعنی اس رب نے تمہارے لیے زمین کی ساری نعمتوں کو مقدر فرمایا، کیوں کہ اس آیت کے نازل ہونے کے وقت نہ تو ساری چیزیں پیدا ہوئی تھیں نہ سارے انسان۔ اب آیت کا مقصد یہ ہوا کہ جو کچھ پیدا ہو چکا وہ تمہارے لیے تھا اور جو کچھ پیدا کیا ہے اور کرے گا وہ سب تمہاری ہی خاطر۔

لکم اس میں لام نفع کا ہے یعنی تمہارے نفع کے لیے یہ چیزیں پیدا ہوئیں جس سے تم دینی یا دنیوی نفع حاصل کرو۔ بعض چیزوں کا کھانا، بعض کو پہننا، بعض کو پینا وغیرہ یہ دنیوی نفع ہیں، بعض

چیزوں سے بچ کر ثواب حاصل کرنا اور ان سب چیزوں کو دیکھ کر خالق کو پہچاننا وغیرہ دینی نفع ہیں (نعیمی)

مَّافِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا : (جو کچھ زمین میں ہے سارا) یعنی کانیں، سبزے، جانور، دریا، پہاڑ جو کچھ زمین میں ہے سب اللہ تعالیٰ نے تمہارے دینی اور دنیوی نفع کے لیے بنائے۔ دینی نفع اس طرح کہ زمین کے عجائبات دیکھ کر تمہیں اللہ تعالیٰ کی حکمت اور قدرت کی معرفت ہو اور دنیوی منافع یہ کہ کھاؤ پیو آرام کرو۔ اپنے کاموں میں لاؤ تو ان نعمتوں کے باوجود تم کس طرح کفر کرو گے۔ (خزائن العرفان)

ما کے عموم میں جس طرح عمدہ غذائیں، پاکیزہ خوشبوئیں، دل پسند آوازیں، حسین صورتیں، وہ لذیذ چیزیں جو بلا واسطہ ہمارے لیے ہیں اور لکڑی، لوہا، تیر کمان، رسی وغیرہ اسی لیے ہیں کہ ان سے ہم غذائیں حاصل کریں اور بیماری اور مشقت عبرت کے لیے پیدا فرمائی گئیں۔ موت اس لیے بنی تا کہ دنیاوی نعمتوں سے اگلے اور پچھلے لوگ نفع حاصل کریں اگر سب لوگ پیدا ہی ہوتے جاتے اور کوئی نہ مرتا تو زمین بھی تنگ ہو جاتی اور روزی بھی اور بے شمار لڑائی جھگڑے اور فسادات بھی وقوع میں آتے اور پہلے لوگ حکومت پر قائم رہتے اور پچھلے اس سے محروم اور مشقتیں اور مصیبتیں بھی ہمارے ہی فائدے کے لیے بنیں۔ اگر یہ نہ ہوتیں تو دنیا میں کوئی کارخانہ نہ چلتا۔ اگر چور نہ ہوتے تو پولیس کا محکمہ نہ بنتا اور اگر دشمن نہ ہوتا تو فوج کا محکمہ بے کار تھا۔ اگر سردی گرمی کی مصیبت نہ ہوتی تو کپڑے کے کارخانے اور پنکھے اور کولر اور ایئر کنڈیشن وغیرہ کچھ نہ ہوتا۔ اگر بھوک نہ ہوتی تو بے چارے سارے باورچی بے کار ہو جاتے۔ اگر بیماری نہ ہوتی تو ہسپتال اور شفاء خانے بے کار، حکیم اور ڈاکٹر سول سرجن اور جراح سب رائیگاں تھے۔ الغرض ان مصیبتوں نے ہی دنیا کو آباد فرمایا حتیٰ کہ زہر قاتل اور سانپ، بچھو وغیرہ بھی بہت سی دواؤں میں کام آتے ہیں۔ الحاصل یہ تمام چیزیں ہمارے ہی نفع کے لیے ہیں۔ (نعیمی عزیزی، بتغیر یسیر) مزید تفصیل دیکھنا ہو تو تفسیر عزیزی جلد اول صفحہ نمبر 188 مطبوعہ ملاحظہ فرمائیں)

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے:۔

1. زمین اور آسمان کی ساری چیزیں انسان کے نفع کے لیے بنائیں گئیں اسی لیے انسان کو ساری مخلوقات سے پیچھے پیدا فرمایا، کیوں کہ سامان پہلے جمع کیا جاتا ہے اور جس کی خاطر یہ سامان ہو وہ بعد میں آتا ہے۔ اگر کہیں جلسہ، وعظ ہو تو فرش و تخت روشنی صفائی وغیرہ کا انتظام پہلے ہو جائے گا اور اکثر اوقات سامعین کا اجتماع بھی پہلے ہو جاتا ہے اور مقرر، واعظ کی تشریف آوری بعد میں ہوتی ہے۔ وہ جو حدیث قدسی میں آیا ہے۔ اے محبوب ﷺ! (لولاک لما خلقت الافلاک) اگرچہ بعض لوگوں نے حدیث کی سند میں کلام کیا ہے تاہم ملا علی قاری وغیرہ نے اس حدیث کو معنیً صحیح لکھا ہے اور اگر حدیث ضعیف بھی ہو مگر اس کی تائید قرآن کریم سے ہو جائے تو قوی ہو جاتی ہے، لہٰذا اس حدیث کا مضمون بالکل صحیح ہے۔ بارات کا کھانا دانہ باراتیوں کے لیے اور براتی دولھا کے طفیل۔ عالم کا بناؤ انسان کے لیے اور انسان حضور سرور کائنات ﷺ کے لیے اسی لیے حضور ﷺ تمام نبیوں سے پیچھے آئے کہ اصلی مقصود پیچھے ہوتا ہے۔ اسی لیے شیخ محقق عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں۔ **مقصود ذات اوست دگر جملگی طفیل**

2. جو چیزیں نفع کے قابل ہیں وہ سب حلال نہیں یعنی جس کو شریعت نے حرام فرمایا وہ حرام ہے اور جس سے سکوت فرمایا وہ حلال، کیوں کہ جب چیزیں ہمارے لیے ہی بنی ہیں تو بغیر دلیلِ شرعی کسی چیز کو حرام کہنا زیادتی ہے۔ امام کرخی اور ابوبکر رازی وغیرہ نے **(خلق لکم)** کو قابلِ انتفاع اشیاء کے مباح الاصل ہونے کی دلیل قرار دیا ہے۔ چناں چہ جصاص رازی کے الفاظ یہ ہیں: **وقوله تعالے (فاخرج به من الثمرات رزقالكم) نظير قوله (هو الذى خلق لكم مافى الارض جميعا) وقوله (سخرلكم ما فى السموت وما فى الارض) وقوله (قل من حرم زينة الله التى اخرج لعباده والطيبات من الرزق) يحتج و يجمع ذالك فى ان الاشياء على الاباحة**

مما لا یحظره العقل فلا یحرم منه شئی الا ماقال دلیله (احکام القرآن صفحہ 30)

ان شاء اللہ اس مسئلہ کی مزید تفصیل آئندہ کسی موقع پر بیان کی جائے گی۔ علمائے اہلسنت نے اپنے رسائل میں اس بارے میں بہت کچھ لکھا ہے۔

پس! واضح ہوا کہ وہابیہ دیوبندیہ کا یہ عقیدہ جو چیز حضور پاک ﷺ کے زمانہ اقدس میں نہ ہو وہ سب بدعت اور حرام ہے باطل ہے۔ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ اعراب والا قرآن کریم اور بخاری ومسلم وغیرہ اور دیگر کتب دینیہ رکھنا، چھاپنا اور ان کو باضابطہ پڑھنا، پڑھانا اور اس طرح قسم قسم کے رنگ برنگے کھانے کھانا، ریل گاڑی، موٹر ہوائی جہاز وغیرہ کی سواری سب حرام ہے کیا کوئی دیوبندی وہابی ہے جو اپنے اس من گھڑت اصل پر عمل کر کے دکھائے؟

اعتراض: جب ہر چیز ہمارے لیے ہی بنی تو شریعت میں بعض چیزیں حرام کیوں فرمائیں؟ چاہیے تھا کہ ہم ہر چیز کو ہر طرح استعمال کر سکتے۔

جواب: ہر چیز تمہارے ہی نفع کے لیے بنی نہ کہ تمہارے کھانے کے لیے۔ ہر چیز کا نفع علیحدہ علیحدہ ہے کسی کو کھاؤ، کسی کو پیو کسی کو سونگھو، کسی سے بچو اور کسی سے عبرت حاصل کرو اسی لیے حضرات مفسرین نے اس کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا (لتنتفعوا بہ) اور (لتعتبروا بہ) دیکھئے تمہارے گھر میں تمہاری بیوی، ماں،، بہن، بیٹی یہ سب تمہارے انتفاع کے لیے ہیں، لیکن سب کا نفع یکساں نہیں۔ بیوی سے وطی کی جاتی ہے، ماں بہن سے امداد اور شفقت حاصل کی جاتی ہے۔ پانی اور آگ سب تمہارے نفع کے لیے ہیں، مگر پانی پیا جاتا ہے اور آگ کھائی پی نہیں جاتی اور جس طرح ہر چیز کا طریقہ استعمال سکھانے والے کی مدد کے بغیر حاصل نہیں ہوتا اسی طرح حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیم کے بغیر کسی چیز کو استعمال کرنا مفید نہ ہوگا۔ حضرات انبیاء نے فرمایا کہ بکری کو استعمال کر کے نفع حاصل کرو اور خنزیر سے بچ کر۔

فائدہ ضروریہ:

امام زاہد کی تصریح کے مطابق بعض مباح کنندگان کا یہ کہنا کہ تمام مسلمانوں کا مال ہر ایک کے لیے مباح ہے اور اسے جو چاہے لے سکتا ہے کسی کو روک ٹوک کا حق نہیں جب خدا کسی کو اپنا محبوب بنالے تو اسے کسی گناہ سے کوئی ضرر نہیں۔ کسی حرام کا ارتکاب کرے تو کوئی مواخذہ نہیں وغیرہ ذلک تو معاذ اللہ یہ غلط استدلال ہے۔ قاضی بیضاوی نے اس کے جواب میں کہا ہے کہ اس کا اقتضاء یہ ہے کہ تمام مفید اشیاء مباح ہیں اور عارضی اسباب کی بناء پر بعض اشیاء کا بعض افراد کے ساتھ مختص ہونا کوئی مخل نہیں، کیوں کہ آیت کا مدلول یہ ہے کہ تمام اشیاء تمام افراد کے لیے ہیں نہ کہ ہر شئی ہر فرد کے لیے، فاحفظ اور ملا احمد جیون اپنی رائے پیش فرماتے ہیں: ہم جو مباح کو اصل اور محرم کو ناسخ بتاتے ہیں تو اس کا مدار عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد ﷺ کا درمیانی زمانہ ہے۔ جسے زمانہ فترت کہتے ہیں۔ اس دور میں ورود شریعت سے قبل ہر شئی میں اصل اباحت تھی۔ پھر ہمارے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ مبعوث ہوئے اور انہوں نے ان اشیاء کی وضاحت کردی جو حرام ہیں باقی تمام اشیاء اپنے اصل کے مطابق مباح رہیں (تفسیرات احمدیہ صفحہ 31)

یاد رہے کہ اصل اشیاء میں اباحت ہے۔ یہاں اشیاء سے مراد اموال ہیں اور انفس میں اصل حظر ہے۔ چناں چہ شرح مسلم علامہ بحر العلوم میں ہے:

قال صدر الاسلام الاباحة فی الاموال والحظر فی الانفس فقتل النفس وقطع العضو وایلامه بالضرب و التصرف فی الفروج بقیت علی الحرمة الا ماخص بدلیل کالقصاص والنکاح (فواتح الرحموت صفحہ 26)

صدر الاسلام نے فرمایا اموال میں اصل اباحت ہے اور انفس میں اصل حرمت ہے پس کہا گیا ہے نفس اور کسی عضو کا کاٹنا اور ضرب سے دردناک کرنا اور فروج میں ناجائز تصرف کرنا اس حرمت پر باقی رہے گا، مگر جو دلیل سے خاص کیا گیا جیسے قصاص اور نکاح۔

آیت سجدہ، سجدہ عبادت اور سجدہ تعظیمی کے احکام

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَاِذۡ قُلۡنَا لِلۡمَلٰٓئِکَۃِ اسۡجُدُوۡا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوۡٓا اِلَّآ اِبۡلِیۡسَ اَبٰی وَاسۡتَکۡبَرَ وَکَانَ مِنَ الۡکٰفِرِیۡنَ (سورۃ البقرۃ:۳۴)

"اور (یاد کرو) جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا آدم (علیہ السلام) کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے کہ منکر ہوا اور غرور کیا اور کافر ہو گیا۔"

ملائکہ جمع ملک کی ہے۔ ملک الوکت سے ماخوذ ہے جس کا معنی سفارت ہے چوں کہ ملائکہ خالق اور مخلوق کے درمیان سفارت کا کام کرتے ہیں اس لیے ان کو ملائکہ کہا جاتا ہے۔ فرشتہ کی تعریف یوں کی جاتی ہے کہ فرشتہ ایک نورانی شکل ہے جسے اللہ تعالیٰ نے مختلف اشکال میں تبدل کا اختیار دیا ہے۔ فرشتے معصوم ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے حکم کے مامور اور اطاعت کے پابند ہوتے ہیں۔ قرآن کریم میں صراحۃً "ویفعلون مایؤمرون" فرمایا گیا ہے۔

اسجدوا: امر ہے، سجدہ سے ماخوذ ہے۔ سجدہ کا لغوی معنی زمین پر پیشانی رکھنا ہے اور شریعت میں سات اعضاء پر سجدے کا حکم دیا گیا ہے۔

لِاٰدَمَ: لام یا تو الیٰ کے معنی میں ہے اور اس صورت میں لِاٰدَمَ کا معنی الیٰ ادم ہوگا۔ یعنی آدم مسجود الیہ تھے مسجود لہ نہیں تھے۔ اسی معنی میں کہا گیا:

قسم بقبلۂ روئے تو یارسول اللہ ﷺ
رواست سجدہ بسوئے تو یارسول اللہ ﷺ

مگر یہ قول ضعیف ہے۔ کماسنذکرہ ان شاء اللہ.

یا لام واسطے کہ معنی میں ہے اور معنی یہ ہیں کہ آدم کو سجدہ کرو۔

ابلیس: اَبْلَس سے ماخوذ ہے اور ابلاس کا معنی ناامیدی ہے اور ابلیس کو اس لیے ابلیس کہا جاتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے انتہائی مایوس ہے۔

اَبٰی وَاسْتَکْبَرَ: (منکر ہوا اور غرور کیا)

وَکَانَ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ: (اور کافر ہو گیا) یعنی کان بمعنی 'صار' ہو گیا۔ یا کافروں سے تھا۔ یعنی علم الٰہی میں پہلے ہی کافر تھا۔

تفسیر:

ملائکہ نے جب انسان کی فساد انگیزی اور خون ریزی کا تذکرہ کیا اور در پردہ استحقاقِ خلافت کے مدعی ہوئے اور آپس میں یوں کہنے لگے کہ ان سے افضل واعلیٰ کوئی مخلوق، اللہ پیدا نہیں کرے گا، تو حق سبحانہ وتعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو تمام چیزوں کے نام سکھا دیئے اور انسان کی افضلیت اور علیت کے اظہار کے لیے ملائکہ کو آدم علیہ السلام کے سامنے سجدہ ریز ہونے کا حکم دیا۔

مسئلہ: تعلیم کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنا صحیح ہے اگرچہ اس کی ذات پر معلم کا اطلاق درست نہیں ہے، کیوں کہ عموماً معلم پیشہ ور تعلیم دینے والے کو کہتے ہیں۔ (خزائن)

اس مقام پر نہایت اہم ترین مسئلہ یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کو جو سجدہ کیا گیا وہ سجدۂ عبادت تھا یا سجدۂ تحیۃ؟ سجدۂ عبادت جو بقصد پرستش اور پوجا کیا جائے۔ سجدۂ تحیۃ جس سے مسجود کی تعظیم منظور ہوتی ہے نہ کہ عبادت۔

اس بارے میں علمائے حق، علمائے اہلسنت اور آئمہ دین کی تحقیق یہ ہے کہ سجدۂ عبادت اللہ تعالیٰ کے لیے خاص ہے کسی اور کے لیے نہیں ہوسکتا۔ آدم علیہ السلام سے لے کر جناب سیدنا محمد ﷺ تک کسی شریعت میں کبھی بھی جائز نہ تھا۔ اس آیت میں بعض مفسرین جو سجدہ سے عبادت

مراد لیتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ سجدہ درحقیقت حق سبحانہ کے لیے تھا اور حضرت آدم علیہ السلام کو قبلہ بنایا گیا تھا اور حضرت آدم درحقیقت مسجود الیہ تھے نہ کہ مسجود لہ جیسا کہ ہم تمام مسلمان کعبہ کی طرف مونھ کر کے اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرتے ہیں مگر یہ قول ضعیف ہے کیوں کہ اس سجدے سے حضرت آدم علیٰ نبینا وعلیہما السلام کا فضل وشرف ظاہر فرمانا مقصود تھا اگر ان کو صرف مسجود الیہ بنایا جاتا تو اس سے ان کی افضلیت ثابت نہیں ہوتی - کیوں کہ مسجود الیہ کا ساجد سے افضل ہونا کچھ ضروری نہیں۔ جیسا کہ کعبہ معظمہ حضور انور سید عالم ﷺ کا قبلہ اور مسجود الیہ تھا باوجود کہ حضور ﷺ اس سے افضل ہیں۔ آئمہ اہل سنّت کا اس بات پر اجماع ہے کہ حضور سید عالم ﷺ افضل الکائنات ہیں، حتّٰی من الکعبة حتی من العرش ، امام اہل سنّت اعلیٰ حضرت مجدد دین وملت مولانا الشاہ احمد رضا خاں قدس سرہ نے کیا خوب فرمایا

حاجیو آؤ شہنشاہ کا روضہ دیکھو
کعبہ تو دیکھ چکے کعبے کا کعبہ دیکھو

دوسرا قول یہ ہے کہ یہاں سجدۂ عبادت نہیں تھا، سجدۂ تعظیم وتحیۃ تھا اور بالخصوص حضرت آدم علیہ السلام کے لیے ہی تھا۔ اور زمین پر پیشانی رکھ کر تھا صرف جھکنا ہی نہیں تھا: ھذا ھو القول الصحیح وعلیہ الجمھور (خزائن العرفان بحوالہ مدارک)

مسئلہ: سجدہ تحیۃ پہلی شریعتوں میں جائز تھا ہماری شریعت میں منسوخ کیا گیا اب کسی کے لیے جائز نہیں ہے۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے حضور اقدس ﷺ سے سجدہ کرنے کی اجازت طلب کی تو حضور ﷺ نے فرمایا: مخلوق کو نہ چاہیے کہ اللہ کے سوا کسی کو سجدہ کرے۔ (خزائن)

سوال: تفسیر خازن میں ہے: فی ھذا السجود قولان اصحھما انه کان لاٰدم علی الحقیقة ولم یکن فیه وضع الجبھة علی الارض وانما ھو الانحناء. وکان السجود تحیة وتعظیماً لاسجودُ عبادةٍ کسجود اخوة یوسف له فی قوله

(وخروا له سجداً) فلما جاء الاسلام ابطل ذالک بالسلام خازن کی اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سجدہ صرف انحناء ہی تھا بمعنی جھکنا۔

جواب: اگرچہ خازن وغیرہ بعض مفسرین نے اس قول کو نقل کیا ہے مگر عندالتحقیق یہ قول صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس میں بلاضرورت سجدہ کو مجازی معنی میں لینا پڑتا ہے سیدھی سی بات ہے کہ سجدہ حقیقی تھا جو پہلے جائز تھا اب منسوخ ہو گیا ہے۔

فائدہ:

ملائکہ میں سب سے پہلے سجدہ کرنے والے حضرت جبریل پھر میکائیل پھر اسرائیل پھر عزرائیل پھر ملائکہ مقربین (علیہم السلام) یہ سجدہ جمعہ کے روز وقتِ زوال سے عصر تک کیا گیا۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ ملائکۂ مقربین سو برس اور ایک قول میں پانچ برس سجدہ میں رہے۔ شیطان نے سجدہ نہ کیا اور براہِ تکبر اس اعتقاد پر قائم رہا کہ وہ آدم سے افضل ہے۔ اس کے لیے سجدے کا حکم معاذ اللہ بخلاف حکمت ہے۔ اس اعتقاد باطل کی وجہ سے وہ کافر ہو گیا۔

سوال: سجدۂ تعظیمی کے جواز کے قائلین اس موقع پر بزعم خویش ایک مشہور اصولی اعتراض کرتے ہیں کہ سجدہ تعظیمی کا جواز قرآن کریم سے نکلتا ہے جیسا کہ آدم علیہ السلام کو ملائکہ کا سجدہ کرنا اور یوسف علیہ السلام کو ان کے بھائیوں کا سجدہ کرنا اور سجدہ تعظیمی کے عدمِ جواز کے لیے کتاب وسنت کی کوئی نصِ قطعی وارد نہیں۔ سجدے کے عدمِ جواز کے لیے جو احادیث پیش کی جاتی ہیں وہ اخبار احاد ہیں اور ظنی ہیں۔ اور ظنی سے قطعی کا نسخ جائز نہیں۔ ورنہ خبرِ واحد سے زیادتی علی القرآن لازم آئے گی۔

جواب پہلی شریعتوں میں سجدے کا جواز ثابت ہوتا ہے۔ رہا یہ مسئلہ کہ شرائع من قبلنا ہمارے لیے بھی حجت ہیں تو یہ ایک مغالطہ ہے۔ شرائع سابقہ کے حجت ہونے کے لیے علمائے اصول نے تصریح کی ہے کہ وہ اس وقت حجت ہوتی ہیں جب ہماری شریعت میں ان کا نسخ ثابت نہ ہو اور اگر نسخ موجود ہو تو پہلی شریعتیں ہمارے لیے حجت نہیں رہیں اور ہماری

شریعت نے اس پر صریح انکار فرمایا ہے۔ چناں چہ سلمان فارسی اور بعض دیگر صحابہ علیہم الرضوان نے جب سجدہ تعظیمی کی اجازت طلب کی تو حضور ﷺ نے فرمایا۔ لاتفعلوا (مت کرو) لا ینبغی لمخلوق ان یسجدالا للّٰہ تعالیٰ ۔(کسی مخلوق کو غیر خدا کے لیے سجدہ لائق نہیں) اور سجدۂ تعظیمی کا جواز اور نفسِ ثبوت تو نص سے ثابت ہے مگر اس پر قیاس کر کے اور علت جامعہ نکال کر مثبوت عنہ کو منصوص پر قیاس کرے تو وہ نص نہیں رہتا۔ بلکہ قیاس ظنی بن جاتا ہے۔ بالفرض اگر احادیث ناسخہ کو ظنی بھی کہا جائے تو مجوزین کے ہاں تو ظنیت در ظنیت کتنی ظنیتیں ہیں۔ ظنی کے انکار کو ظنی بس ہے اور انکار خاص اس بیان کے ساتھ کچھ ضروری نہیں ورنہ بکثرت استحالے لازم آئیں گے۔ بقدرِ کفایت ہم نے اختصار کے ساتھ اس مسئلہ کو بیان کر دیا ہے۔ اعلیٰ حضرت عظیم البرکت قدس سرہ العزیز نے اس موضوع پر ایک نہایت جامع رسالہ ارقام فرمایا ہے، جس میں اس مسئلے کے تمام پہلوؤں پر تفصیلی بحث فرمائی ہے اور آیات واحادیث اور اقوال آئمہ سے سجدۂ تعظیمی کی حرمت کو مدلل اور مُبر ہن کیا ہے۔ اعلیٰ حضرت کے اس رسالے کا نام (الزبدۃ الزکیۃ لتحریم سجدۃ التحیۃ) ہے۔ رسالہ کے ٹائٹل پر ہے: ستر نصوص سے اس کا روشن ثبوت کہ سجدہ اللہ واحد قہار ہی کے لیے ہے۔ غیر کے لیے کسی نیت سے ہو مطلقاً حرام اور کبیرہ گناہ ہے۔

فمن شآء البسط فلیر اجع الی الزبدۃ الزکیۃ.

فوائد و مسائل

- استاد کا ادب شاگرد پر بہت ضروری ہے کیوں کہ فرشتوں نے آدم علیہ السلام کا ادب کیا۔
- تکبر اور غرور نہایت بری چیز ہے کیوں کہ سب سے پہلے شیطان تکبر سے گمراہ ہوا۔
- خدا کا حکم وجوب کے لیے ہوتا ہے، مگر جب کوئی قرینہ صارفہ ہو، اسی لیے تو شیطان مخالفت سے گمراہ ہوا۔
- کسی شخص کو اپنی عبادت پر ناز نہ کرنا چاہیے کیوں کہ اعتبار خاتمے کا ہے اور اس کی خبر نہیں۔
- شریعت میں بھی اور اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی حکم ظاہر پر ہوتا ہے کیوں کہ جب شیطان عابد تھا تو اگر چہ خدا کے علم میں وہ کافر تھا مگر اس وقت کی حالت کے لحاظ سے اس کو فرشتوں میں عزت دی گئی اور جب اس کا کفر ظاہر ہوا تب نکالا گیا۔ اسی طرح حضور ﷺ کا منافقوں کی رعایت فرمانا بے علمی کی وجہ سے نہیں تھا (نعیمی)
- بغیر عظمتِ انبیاء توحید لعنت کا سبب ہے۔ شیطان نے توحید الٰہی کا انکار نہ کیا بلکہ آدم علیہ السلام کی تعظیم کا منکر ہو کر ملعون بن گیا۔ منکرینِ عظمتِ رسالت کو عبرت پکڑنی چاہیے۔ کفر کی صدہا قسمیں ہیں۔ مگر ان سب سے بدتر کفر، اہانتِ پیغمبر ہے کہ شیطان کا کفر اسی قسم کا تھا۔ وہ رب تعالیٰ کی ذات و صفات میں کسی چیز کا انکاری نہ تھا۔
- اللہ والوں کو حقیر جاننا اور ان کی بے ادبی کرنا اتنا بڑا جرم ہے کہ پھر توبہ کی توفیق کبھی نہیں ہوتی۔

توہینِ پیغمبر کے ہوتے ہوئے علم و عبادت سب بے کار ہیں۔

حضور ﷺ کی نعت، دولت دنیا کے لیے مت چھپاؤ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَلَا تَشۡتَرُوۡا بِاٰیٰتِیۡ ثَمَنًا قَلِیۡلًا ۫ وَّ اِیَّایَ فَاتَّقُوۡنِ ○ (سورۃ البقرۃ:۴۱)

''اور میری آیتوں کے بدلے تھوڑے دام نہ لو مجھی سے ڈرو۔ اس جگہ اشترا بمعنی استدلال ہے۔''

یہ خطاب دراصل اہل کتاب کو ہے اور ان آیات سے مراد توریت وانجیل کی وہ آیات مراد ہیں جن میں حضور ﷺ کی نعت وصفت ہے۔ مقصد یہ ہے کہ حضور ﷺ کی نعت دولت دنیا کے لیے مت چھپاؤ کہ متاع دنیا ثمنِ قلیل اور نعمتِ آخرت کے مقابلے میں بے حقیقت ہے (خزائن)

(كل كثير اليه قليل و كل كبير اليه حقير. كشاف) اور امام حسن بصری فرماتے ہیں، هو الدنيا بحذا فيرها ، یعنی دنیا اپنے تمام مال اسباب کے باوجود آخرت کے مقابلے میں متاع قلیل ہے (مدارک) یہ معنی نہیں ہیں کہ تھوڑے مول کے بدلے فروخت نہ کرو اور زیادہ مول لے لیا کرو کیوں کہ یہ مفہوم، مخالف ہے اور آیت کے مشہور شانِ نزول کے بھی خلاف ہے۔ چناں چہ اس سے اگلی آیت خود اس مضمون کو واضح کر رہی ہے۔ الحاصل ثمن قلیل سے مراد دنیا کا مال ہے کتنا ہی زیادہ کیوں نہ ہو آخرت کے مقابلے میں بالکل لاشی اور حقیر ہے۔ یہود ونصاریٰ اپنے جہلا اور عوام سے متاع دنیا کے لیے بائبل کی ان آیات شریفہ کو چھپاتے تھے جن میں نعتِ مصطفیٰ ﷺ مذکور تھی۔ ان کو خطرہ تھا کہ اگر ہم نے حق کو بیان کر دیا تو سالانہ وظائف اور نذرانے وغیرہ بند ہو جائیں گے یہی حال آج کل کے بعض گمراہ بدمذہب علماء کا ہے کہ باوجود جاننے کے کتاب وسنت میں حضور پرُنور سید عالم ﷺ جو نعت وشانِ کریم بکثرت مذکور ہے اس کو اپنے عوام سے چھپاتے ہیں کہ ظاہر کرنے سے دنیاوی معاملات میں کھنڈت نہ پڑ جائے گی (والله مخرج ما كنتم تكتمون)

اگر چہ امور ضروریہ گزشتہ سطور میں بیان ہو چکے ہیں، اتمام فائدہ کے لیے تفسیرِ عزیزی کی اصل عبارت بالفاظہٖ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ درج کی جاتی ہے:

دراین جابایددانست کہ ہر چند ایں آیت بظاہر پند بنی اسرائیل است لیکن در حقیقت سرزنشی چند فرقہ ازیں امت است کہ در عوض آیات الٰہی قیمت قلیل رامی گیرند و آن نعمت رابر بادمی دھند چنانچہ حضرت امیر المومنین عمر بن خطاب در تفسیر ایں آیت و مانند آں فرمودہ اند کہ (قد مضٰی) بنو اسرائیل ودر جوا ما یسمع بھذہ الآیات غیر کم

فرقہ اول:

علماء بدقماش باشند بادنیاداراں وظالماں اختلاط می کنند وبرائے لذات وشھوات آں ہاو تصیح مظالم آں ہاروایات نادرہ برمی آرند وحیلہ ہابرمی انگیزند۔ ۲۶۴

فرقہ دوم:

قاضیاں مرتشی ومفتیانِ بے باک کہ برائے رشوت حکمِ شرع راتبدیل می کنند ومدعی رامدعا علیہ وبالعکس قرارمی دہند۔

فرقہ سوم:

پادشاہاں ظالم وامرائے بیدادگر کہ دادِ مظلوماں نمی دھند واز احوالِ عمال خود ومتصدیان وکار پردازان خود متجسس نمی شوند۔

فرقہ چہارم:

وزیراں ومتصدیاں دفاتر کہ در تحصیل اموال وکشیدن اخراج از رعایا ومزارعان خوف آخرت رادر خاطرنمی آرند۔

فرقہ پنجم:

معلمانِ دنیا طلب وواعظانِ طماع کہ بر تعلیم احکام الٰہی وتبلیغ مواعظ وپند از متاع دنیا۔ درخواست نمایند (تفسیری عزیزی پارہ اول صفحہ ۲۶۴)

قال الحافظ الشیر ازی فی ھذا المعنی واعظاں کین جلوہ بر محراب ومنبر میکنند - چون بخلوت می روند آں کار دیگری کنند

مسائل ضروریہ:

متعلقه بهذه الایت اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔

نمبر 1: دین کو دنیا حاصل کرنے کا ذریعہ نہ بنائے کہ دنیا کی خاطر دین چھوڑ دے۔

نمبر 2: آیت اگرچہ بنی اسرائیل کے لیے آئی ہے، مگر اس میں مسلمانوں کے بھی چند فرقے داخل ہیں۔ جن کا ذکر آگے تفسیرِ عزیزی کی عبارت میں آ رہا ہے۔

نمبر 3: تنخواہ لے کر علمِ دین پڑھانا، اُجرت پر تعویز لکھنا اور دم کرنا، قرآن پاک چھاپ کر فروخت کرنا اس آیت کے حکم سے خارج ہیں کیوں کہ بیچنے کے یہ معنی ہیں کہ پیسہ لے کر شرعی احکام بدل دیئے جائیں۔ پریس والا درحقیقت کاغذ اور لکھائی اور چھپائی کی قیمت لے رہا ہے اسی طرح تعویذ لکھنے والا اور دم کرنے والا ایک طرح کے علاج کی اجرت لے رہا ہے کیوں کہ اس نے قرآن سے علاج کیا ہے۔ صحابہ کرام نے ایک سانپ کاٹے ہوئے پر سورۃ فاتحہ پڑھ کر دم کر دیا اور اس پر تیس (۳۰) بکریاں اجرت لیں۔ خود بھی کھائیں اور اس سے حضور نبی کریم ﷺ نے بھی ملاحظہ فرمایا۔ اسی طرح قرآن پاک پڑھانے والا قرآن پاک کو فروخت نہیں کرتا بلکہ اپنا وقت لگانے اور اپنا کاروبار چھوڑنے اور بچوں کی نگرانی کرنے وغیرہ کی اجرت لیتا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خلافت پر تنخواہ لی

حالاں کہ خلافت دینی کام تھا مگر چوں کہ اپنا تمام وقت امورِ خلافت کی انجام دہی میں خرچ کرتے تھے اس لیے صحابہ کرام نے مشورہ کر کے ان کو تجارت سے روک دیا اور بقدرِ کفایت بیت المال سے ان کا وظیفہ مقرر کر دیا۔

مسئلہ: خالص عبادت اور حرام کاموں پر اجرت لینا منع ہے جیسے نماز، روزہ اور تلاوتِ قرآن کہ یہ خالص عبادتیں ہیں اور گانا بجانا وغیرہ کہ یہ حرام ہے اس لیے کہ اس کی حدیث میں ممانعت آئی ہے لیکن علماءِ متاخرین نے امامت اور اذان وغیرہ کی اجرت جائز رکھی کیوں کہ اسلامی حکومتوں کے زمانے میں آئمہ اور مؤذنین اور خطیب و مفتیوں وغیرہ دینی کام کرنے والوں کے لیے وظیفے مقرر ہوتے تھے۔ جواَب بند ہو گئے اگر اب متقدمین کے فتویٰ پر عمل کیا جائے تو اس دور میں مساجد اور مدارس ویران ہو جائیں گے اور کوئی آدمی ان دینی فرائض اور خدمت کی ادائیگی کے لیے آسانی سے نہیں ملے گا۔

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نے تفسیر عزیزی میں اس جگہ ایک عمدہ فائدہ بیان فرمایا ہے اور وہ یہ کہ جائز کام پر اجرت لینی جائز ہے اس طرح جس فرض یا واجب میں جائز کام مل جائے اس پر بھی اجرت لینی جائز ہے اور یہ اجرت اس جائز کی ہوگی نہ کہ واجب و فرض کی لہٰذا چوں کہ امامت میں دو چیزیں ہیں ایک ادائے نماز جو کہ فرض ہے اور ایک خاص جگہ اور وقت کی پابندی یعنی فلاں مسجد میں فلاں وقت حاضری دینا یہ جائز فعل ہے۔ تنخواہ اس کی پابندی کی ہے نہ کہ نماز کی۔

ھذا ما ظھر لی الیٰ الآن واللہ اعلم بالنیات انتھی۔

علامہ شامی نے اس مسئلے کو ردالمختار حاشیہ درمختار میں تفصیل سے بیان کیا کہ اس زمانے میں کہاں اجرت لینی جائز ہے اور کہاں ناجائز اور اس بارے میں ایک الگ مستقل رسالہ بھی لکھا ہے جو کہ مجموعہ رسائل ابن عابدین میں طبع ہو چکا ہے اور اس کا نام شفاء العلیل وبل الغلیل فی حکم الوصیت بالختمات والتھلیل (رسالہ نمبر 7 مجموعہ رسائل جز اول۔)

نماز و زکوٰۃ اور نماز میں رکوع فرض ہے، و وجوب جماعت

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

وَاَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّکٰوةَ وَارۡکَعُوۡا مَعَ الرّٰکِعِيۡنَ ○ (سورۃ البقرۃ:۴۳)

''اور نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ دو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔''

چوں کہ اس سے پہلی آیت میں بنی اسرائیل کو ایمان لانے کی رغبت دی گئی اور اب نیک اعمال کرنے کا حکم دیا جارہا ہے چوں کہ ایمان عمل پر مقدم ہے اس لیے ایمان کا حکم پہلے دیا گیا ہے اور اعمال کا بعد میں۔

وَاَقِيۡمُوا: صیغہ جمع مذکر حاضر تقیمون سے بنا، اس کے لغوی معنی سیدھا کرنا، دوام اور حفاظت کرنے کے ہیں (مفردات) لہٰذا اقیموا الصلوۃ کا معنی نماز کے دوام اور اس کے ارکان کی حفاظت کرنے کے ہیں یعنی نماز کو ہمیشہ پڑھنا اور اس کے ظاہری، باطنی آداب کی رعایت کرتے ہوئے پڑھنا، صحیح وقت پر پڑھنا، نماز کی فکر رکھنا، سفر، حضر تندرستی بیماری ہر حال میں نماز پڑھنا قائم کرنا ہے۔ اس لیے قرآن حکیم میں جہاں بھی نماز کا ذکر فرمایا وہاں قائم کرنے کے ساتھ فرمایا۔ نماز قائم کرنا ہی انسان کو برائیوں سے بچاتا ہے۔ نماز قائم رکھنے والا مرنے کے بعد قبر میں بھی نماز پڑھتا ہے یا نماز کی فکر میں ہوتا ہے۔

الصَّلٰوةُ: میں الف لام عہد خارجی ہے یعنی مسلمانوں والی نماز۔ صلوۃ صلیٰ یا صلوٌ سے بنا ہے۔ صلیٰ کے معنی ہیں آگ سے گرمی حاصل کرنا جس کا معنی تاپنا ہے قرآن پاک فرماتا ہے لَعَلَّكُمۡ تَصۡطَلُوۡنَ چوں کہ ٹیڑھے بانس کو آگ سے گرم کر کے سیدھا کرتے ہیں اسی طرح ٹیڑھے آدمی کو نماز کی برکت سے سیدھا کیا جاتا ہے۔ اس لیے اس کو صلوٰۃ کہتے ہیں۔

صلیٰ کا دوسرا معنی لازم پکڑنا، چمٹنا وغیرہ۔ قرآن مجید میں ہے کہ (لا یَصْلٰھَآ اِلَّا الاشقی الَّذِی کذّب وتولیٰ) بقول بعض اس کا معنی لا یَصْطَلِی بھا یعنی دوزخ کے ساتھ وابستہ اور چمٹے نہیں رہیں گے (مفردات) چوں کہ نماز بھی مسلمان کے لیے لازم رہتی ہے اس لیے اسے صلوٰۃ کہتے ہیں۔

لفظ صلوٰۃ قرآن حکیم میں پانچ معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ (1) دعا کے لیے جیسے کہ (وصلّ علیھم) (ان کے حق میں دعائے خیر کرو) (2) تعریف کے معنی میں جیسا کہ (یصلون علی النبی) میں (3) قرآن کی تلاوت (ولا تجھر بصلوٰتک) (4) رحمت کے معنی میں (اُولٰئِکَ علیھم صَلَوَاتٌ من رَبّھم) (یہی لوگ ہیں جن پر ان کے پروردگار کی رحمت ہے) (5) نماز کے معنی میں (اقیموا الصلوۃ) حق یہ ہے کہ نماز مشروعہ میں یہ سب معنی شامل ہیں۔ اس میں رب سے دعا بھی ہے، اس کی تعریف بھی، تلاوت قرآن بھی اور اس کے پڑھنے والے پر رحمت بھی (روح البیان)۔ نماز کی بہت سی قسمیں ہوتی ہیں۔ فرض جیسے نماز پنج وقتہ اور جمعہ، واجب جیسے نمازِ عیدین اور وتر، سنتِ مؤکدہ جیسے ظہر و مغرب کی سنتیں، غیر موکدہ جیسے عصر و عشاء کی پہلی سنتیں، نوافل جیسے اوّابین، چاشت و اشراق وغیرہ۔

فضائل نماز:

نماز دین اسلام کا ستون اور دین کی بنیاد ہے اور تمام عبادات کی سردار ہے اور ہر وہ شخص جو پنج وقتہ فرض نمازوں کو ان کی شرائط اور وقت کے مطابق ادا کرتا ہے۔ اس کے ساتھ اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ اس کی امان میں رہے گا اور اسے حمایت الٰہی حاصل ہوگی اور اگر کبیرہ گناہوں سے کنارہ کش رہے تو باقی ہر گناہ کے لیے یہ پانچ نمازیں کفارہ کی حیثیت رکھتی ہیں اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ (ان پانچ نمازوں کی مثال ایک صاف و شفاف ندی کی ہے جو کسی کے گھر کے دروازے سے گزرتی ہو اور وہ ہر روز پانچ مرتبہ اس میں غسل کرتا ہو تو کیا یہ ممکن ہے کہ کسی بھی طرح کی میل کچیل

کا اثر اس پر باقی رہ جائے گا؟ لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ہرگز نہیں فرمایا یہ پانچ نمازیں بھی گناہوں کو ایسے ہی بہا کر لے جاتی ہیں جیسے کہ پانی میل کو)۔ رسول اللہ ﷺ نے (فرمایا نماز دین کا ستون ہے۔ جس نے اس سے ہاتھ اٹھایا اس نے اپنے دین کو برباد کیا)۔ نیز فرمایا کہ (نماز جنت کی کنجی ہے)۔ نیز فرمایا کہ (اللہ تعالیٰ نے توحید کے بعد نماز سے بڑھ کر کوئی محبوب تر چیز اپنے بندوں پر فرض قرار نہیں دی۔ کیوں کہ اگر اس سے محبوب تر کوئی چیز ہوتی تو اپنے فرشتوں کو اس میں مشغول رکھتا اور یہ سب محوِ نماز رہتے۔ ان میں سے بعض رکوع میں ہیں، بعض سجود میں، بعض قیام میں اور بعض قعود میں)۔ نیز فرمایا (جس نے ارادتاً ایک نماز چھوڑ دی وہ کافر ہو گیا) یعنی اس کا یہ فعل کافرانہ ہے یا کفرانِ نعمت مراد ہے۔ یا یہ کہ اگر ترکِ نماز کو حلال سمجھا تو کافر ہو گیا۔

کیفیت نماز:

جاننا چاہیے کہ نماز کا ظاہری عمل بمنزلہ ایک جسم کے ہے اور اس کی ایک حقیقت اور راز بھی ہے جسے روح نماز کہتے ہیں۔ اور جملہ اعمال نماز میں سے ہر عمل اور اذکار میں سے ہر ذکر کی اپنی اپنی مخصوص روح ہے۔ کہ اگر وہ اصل روح موجود نہ ہو تو نماز ایک مردہ آدمی کی طرح بے جان جسم ہے۔ لہٰذا نماز کی اصل روح خشوع و خضوع ہے تمام نماز میں دل کا حاضر رہنا لازمی ہے کیوں کہ اصل مقصود یہی ہوتا ہے کہ دل اللہ تعالیٰ کے ساتھ درست رہے اور ہیبت الٰہی اور تعظیم خداوندی کے باعث ذکرِ حق کو ہر دم تازہ رکھ سکیں جب کہ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا (اقم الصلوۃ لذکری) نماز قائم رکھو تا کہ مجھے یاد رکھ سکو)۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ (کتنے ہی لوگ کہ انہیں نماز سے سوائے رنج و تکلیف کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا اور یہ اس لیے ہوتا ہے کہ وہ صرف جسم سے نماز ادا کرتے ہیں اور دل سے غافل ہوتے ہیں)۔

حضرت ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہم

سے باتیں کررہے ہوتے تھے کہ نماز کا وقت آجاتا تو یوں معلوم ہوتا کہ گویا وہ ہم کو اور ہم ان کو پہچانتے بھی نہیں کیوں کہ حق تعالیٰ میں یوں مشغول ہو جاتے تھے (کہ ایک دوسرے کا ہوش ہی نہ رہتا تھا)۔ حضرت سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب نماز کا ارادہ کرتے تو ان کے بدن پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا اور رنگ بدل جاتا تھا اور کہا کرتے تھے کہ اس امانت کے اٹھانے کا وقت آن پہنچا ہے کہ جسے ساتوں آسمانوں اور زمینوں کے سامنے پیش کیا گیا لیکن وہ اسے اٹھانے کی ہمت نہ کر سکے (ملخصاً کیمیائے سعادت للغزالی)

صاحب تفسیر روح البیان نے نقل فرمایا کہ عاصم بن یوسف نے حاتم زائد سے پوچھا کہ نماز آپ کس طرح پڑھتے ہیں۔ فرمایا: جب نماز کا وقت قریب آتا ہے تو اچھی طرح وضو کرتا ہوں پھر جائے نماز پر سیدھا کھڑا ہوتا ہوں اور دل میں محسوس کرتا ہوں کہ کعبہ معظمہ میرے چہرے کے سامنے ہے اور مقام ابراہیم میرے سینے کے آگے ہے۔ اللہ میرے پاس ہے جو میرے قلبی خطرات سے بھی آگاہ ہے گویا کہ میرے قدم پل صراط پر ہیں اور جنت میری دائیں طرف اور دوزخ میرے بائیں طرف اور ملک الموت میرے پیچھے کھڑے ہوئے ہیں اور ہر نماز کے متعلق یہ خیال کرتا ہوں کہ یہ میری آخری نماز ہے۔ پھر تکبیر تحریمہ کہتا ہوں۔ پھر قرآن کی تلاوت کرتا ہوں کہ ایک ایک لفظ کے معنی پر غور کرتا ہوں۔ عاجزی کے ساتھ رکوع کرتا ہوں اور گریہ زاری کے ساتھ سجدہ اور اُمید قبولیت پر تشہد پڑھتا ہوں اور سنت طریقہ پر سلام پھیرتا ہوں اور پھر فارغ ہوتا ہوں تو نماز قبول ہونے کی امید اور نا مقبول ہونے کے خوف میں مشغول ہوتا ہوں اور فرمایا کہ میں گزشتہ تیئس (23) سال سے اسی طرح نماز پڑھ رہا ہوں۔ یہ سن کر حضرت عاصم رو پڑے کاش! کہ ہماری نمازیں بھی اسی طرح ہوں۔ (نماز کے مسائل تفصیلی طور پر بہار شریعت میں ملاحظہ فرمائیں)۔

حضرات صوفیائے کرام فرماتے ہیں اے اللہ کے بندو! اللہ تعالیٰ کے حضور یا تو ستارے بن جاؤ کہ تمام رات رب کی عبادت کرو اور یہ نہ ہو سکے تو چاند بن جاؤ یعنی رات کے بعض حصہ میں

عبادت کرو اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو سورج سے کم نہ ہو یعنی دن کو تو غفلت میں نہ گزارو (روح البیان)

وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ (اور زکوٰۃ دو) نماز کے بعد ادائے زکوٰۃ کا حکم دیا جا رہا ہے۔ کیوں کہ نماز بدنی عبادت اور زکوٰۃ مالی عبادت ہے۔ بدن مال سے افضل ہے۔ اس لیے نماز زکوٰۃ سے افضل ہے لہٰذا پہلے نماز کا ذکر بعد میں زکوٰۃ کا ذکر ہوا اگرچہ نماز و زکوٰۃ کا حکم بظاہر یکساں ہے لیکن ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ نماز ہر امیر غریب پر فرض ہے اور زکوٰۃ صرف مالداروں پر (ملتقطاً نعیمی) زکوٰۃ کے لغوی معنی ہیں نمو (بڑھنا) اہلِ عرب کہتے ہیں زکاالزرع یعنی کھیتی بڑھ گئی۔ یا پاک ہونا قرآن مجید میں ہے (غلاماً زکیۃ) (پاکیزہ لڑکا) زکوٰۃ میں یہ دونوں معنی پائے جاتے ہیں۔ اگرچہ زکوٰۃ سے بظاہر مال گھٹتا ہے لیکن حقیقت میں مال میں برکت ہوتی ہے۔ بلائیں دور ہوتی ہیں۔ آنے والی مصیبتوں سے امن ملتا ہے نیز زکوٰۃ نکالنے سے بقیہ مال پاک ہو جاتا ہے بلکہ صاحبِ مال خود بھی گناہوں سے پاک ہو جاتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ سے خطاب فرمایا (خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صدقة تطهرهم وتزكيهم بها)۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد پاک ہے کہ (صدقہ و خیرات میں چھ (6) فائدے ہیں:۔ تین دنیا میں اور تین آخرت میں۔ دنیا میں تو رزق میں برکت، مال میں زیادتی، گھر میں آبادی ہوتی ہے اور آخرت میں صدقہ عیبوں کو چھپائے گا، قیامت کی دھوپ سے بچائے گا اور آگ سے آڑ بنے گا) (تفسیر کبیر)

زکوٰۃ:

اسلام کے ارکان خمسہ: ۱۔ کلمہ شہادت، ۲۔ نماز، ۳۔ زکوٰۃ، ۴۔ روزہ، ۵۔ حج میں سے تیسرا رکن زکوٰۃ ہے۔ اسلامی معاشرہ میں حکومت وقت کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ صاحبِ نصاب لوگوں سے اموالِ ظاہرہ کی زکوٰۃ وصول کرے اور اللہ کے حکم کے مطابق مستحقین میں تقسیم کرے تاکہ معاشی ناہمواریوں کا بقدرِ امکان حل ہو۔

قرآن حکیم میں زکوٰۃ ادا کرنے والوں کے لیے انعامات الٰہیہ اور نہ ادا کرنے والوں کے لیے وعید کی آیات آئی ہیں۔ ادا کرنے والوں کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

(مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ۭ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ) (وہ لوگ جو اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ان کے خرچ کیے ہوئے مالوں کی حالت اس دانہ کی طرح ہے جس نے سات بالیں اُگائیں اور ہر بال میں سو دانے ہوں اور اللہ تعالیٰ اسے بھی زیادہ بڑھا دیتا ہے جس کے لیے چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ وسعت والا علم والا ہے) (پارہ 3 سورۃ بقرہ آیت نمبر 261)

اور جو لوگ زکوۃ ادا نہیں کرتے ان کے بارے میں ارشاد فرمایا: (وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۳۴ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ۭ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ۳۵) وہ لوگ جو سونا چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور ان کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ہیں پس ان کو ایک بڑی دردناک سزا کی خبر سنا دیجئے کہ جب وہ تپایا جائے گا جہنم کی آگ میں پھر اس سے داغیں گے ان کی پیشانیاں اور کروٹیں اور پیٹھیں، یہ ہے وہ جو تم نے اپنے لیے جوڑ رکھا تھا۔ اب چکھو مزہ اپنے جوڑنے کا)۔

ابو داؤد شریف میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ جب یہ آیت کریمہ (وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ) نازل ہوئی تو مسلمانوں پر شاق ہوئی (سمجھے کہ سونا چاندی جمع کرنا حرام ہے تو بہت دقت کا سامنا ہوگا)۔ فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ میں تم سے مصیبت دور کرتا ہوں۔ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ یہ آیت حضور کے اصحاب پر گراں معلوم ہوتی ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے زکوۃ اسی لیے فرض فرمائی کہ تمہارے مالوں کو پاک کر دے اور مواریث اس لیے فرض ہے کہ تمہارے بعد والوں کے لیے ہو (یعنی مطلقاً مال جمع کرنا حرام ہوتا تو زکوۃ سے مال کی طہارت نہ

ہوتی بلکہ زکوۃ کس پر واجب ہوتی اور میراث کس چیز میں جاری ہوتی بلکہ وہ جمع کرنا حرام ہے جس چیز میں سے زکوۃ نہ دی جائے) اس پر فاروق اعظم نے تکبیر کہی۔

حضرت سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا منکرینِ زکوۃ کے خلاف اعلان جہاد اس بات کی دلیل ہے کہ صرف کلمہ پڑھ لینا اسلام کے لیے کافی نہیں جب تک کہ تمام ضروریات دین کا اقرار نہ کرے۔

زکوۃ کے بارے میں چند مسائل فقیہہ

مال داروں کے لیے مسائل زکوۃ کا جاننا فرض ہے۔

مسئلہ: زکوۃ فرض ہے اس کا منکر کافر اور نہ دینے والا فاسق اور قتل کا مستحق ہے اور ادائیگی میں تاخیر کرنے والا گناہ گار اور مردود الشہادۃ ہے (عالمگیری)

مسئلہ: زکوۃ شریعت میں اللہ کے لیے مال کے ایک حصہ کا جو شرع نے مقرر کیا ہے مسلمان فقیر کو مالک کر دینا ہے اور یہ فقیر نہ ہاشمی ہو نہ ہاشمی کا آزاد کردہ غلام اور اپنا نفع اس سے بالکل جدا کرے (درمختار)

مسئلہ: زکوۃ میں تملیک (مالک بنا دینا) شرط ہے۔

مسئلہ: مباح کر دینے سے زکوۃ ادا نہ ہوگی مثلاً فقیر کو بانیتِ زکوۃ کھانا کھلا دیا زکوۃ ادا نہ ہوگی کہ مالک کر دینا نہیں پایا گیا۔ ہاں اگر کھانا دیدیا کہ چاہے کھائے یا لے جائے تو ادا ہوگئی (درمختار)

مسئلہ: زکوۃ کے واجب ہونے کے لیے چند شرطیں ہیں: ۱۔مسلمان ہونا، ۲۔بلوغ، ۳۔عقل، ۴۔آزاد ہونا، ۵۔مال بقدر نصاب اس کی ملک میں ہونا، ۶۔پورے طور پر اس کا مالک ہونا یعنی اس کے قبضہ میں بھی ہو، ۷۔نصاب دین سے فارغ ہونا، ۸۔نصاب

حاجت اصلیہ سے فارغ ہو، ۹- مال نامی ہو یعنی بڑھنے والا خواہ حقیقتاً ہو یا حکماً یعنی اگر بڑھانا چاہے تو بڑھے، ۱۰- سال گذرنا۔

مسئلہ: جو مال گم ہوگیا یا دریا میں گر گیا یا کسی نے غصب کرلیا یا کسی مقروض نے قرض سے انکار کردیا اور اس کے پاس گواہ نہیں یا جنگل میں دفن کیا اور یاد نہ رہا کہ کہاں دفن کیا۔ انجان کے پاس امانت رکھی اور یاد نہ رہا کہ وہ کون ہے کچھ عرصے بعد مذکورہ بالا اموال مل گئے تو جب تک نہ ملے تھے تو اس زمانے کی زکوٰۃ واجب نہیں۔

مسئلہ: تین قسم کے اموال پر زکوۃ واجب ہے۔ ۱- ثمن خلقی (سونا چاندی) ۲- مال تجارت، ۳- سائمہ یعنی چرائی پر چھوڑے ہوئے جانور۔

مسئلہ: سال گزرنا سے مراد قمری سال ہے یعنی چاند کے مہینوں سے بارہ مہینے۔

مسئلہ: سونے کا نصاب بیس مثقال یعنی ساڑھے سات تولے سونا اور چاندی کا نصاب دوسو درھم یعنی ساڑھے باون تولے چاندی۔

مسئلہ: سونا چاندی جبکہ بقدر نصاب ہو تو ان کی زکوۃ چالیسواں حصہ ہے خواہ وہ ویسے ہی ڈلی کی صورت میں ہوں یا ان کے سکے جیسے روپے وغیرہ یا ان کی بنی ہوئی کوئی چیز خواہ اس کا استعمال جائز ہو جیسے عورت کے لیے زیور، مرد کے لیے چاندی کے ایک نگ کی انگوٹھی ساڑھے چار ماشہ سے کم کی یا سونے چاندی کے بلا زنجیر کے بٹن یا استعمال ناجائز ہو جیسے چاندی سونے کے برتن، گھڑی، سرمہ دانی، سلائی کہ ان کا استعمال مرد وعورت سب کے لیے حرام ہے یا مرد کے لیے سونے چاندی کا چھلا یا زیور یا سونے کی انگوٹھی یا ساڑھے چار ماشہ سے زیادہ چاندی کی انگوٹھی یا کئی انگوٹھیاں یا کئی نگ کی ایک انگوٹھی غرض جو کچھ ہو سب کی زکوۃ واجب ہے۔ مثلاً ساڑھے سات تولے سونا ہو تو دو ماشہ زکوۃ واجب ہے اور ساڑھے باون تولے چاندی ہو تو ایک تولہ ۳ ماشہ چھ رتی واجب ہے چاہے بعینہ سونا چاندی دے یا ان کی قیمت دے۔

مسئلہ: زکوۃ کے مصارف سات ہیں: فقیر، مسکین، عاملِ زکوٰۃ، رقاب (گردن چھڑانا)، غارم، فی سبیل اللہ، ابن سبیل (مسافر)

مسئلہ: اپنی اصل یعنی ماں باپ، دادا، دادی، نانا، نانی وغیرھم کو جن کی اولاد میں یہ ہے اور اپنی اولاد بیٹا، بیٹی، پوتا، پوتی، نواسہ، نواسی وغیرھم کو زکوۃ نہیں دے سکتا۔ یونہی صدقہ فطر، نذر، کفارہ بھی انہیں نہیں دے سکتا۔ رہا صدقہ نفل وہ دے سکتا ہے بلکہ بہتر ہے (عالمگیری وغیرہ)

مسئلہ: عورت خاوند اور خاوند اپنی عورت کو زکوۃ نہیں دے سکتا اگرچہ طلاق ہو چکی ہو اور عورت عدت میں ہو ہاں بعد العدۃ جائز ہے (درمختار)

مسئلہ: عورت کو ماں باپ کے یہاں سے جو جہیز ملتا ہے اس کی مالک عورت ہی ہے۔ اس میں دو طرح کی چیزیں ہوتی ہیں- ایک حاجت کی جیسے خانہ داری کے سامان، پہننے کے کپڑے، استعمال کے برتن اس قسم کی چیزیں کتنی ہی قیمت کی ہوں ان کی وجہ سے عورت غنی نہیں۔ دوسری وہ چیزیں جو حاجتِ اصلیہ سے زائد ہیں زینت کے لیے دی جاتی ہیں جیسے زیور اور حاجت کے علاوہ اسباب اور برتن اور آنے جانے کے بیش بھاری جوڑے ان چیزوں کی قیمت اگر بقدر نصاب ہے تو عورت غنی ہے زکوۃ نہیں لے سکتی (ردالمختار) بلکہ اس پر زکوۃ دینا واجب ہے۔

مسئلہ: بنی ہاشم (سید) کو زکوۃ نہیں دے سکتے نہ غیر سید انہیں دے سکتے ہیں اور نہ ایک ہاشمی دوسرے ہاشمی کو۔ بنی ہاشم حضرت علی جعفر عقیل اور حضرت عباس و حارث بن عبدالمطلب کی اولادیں ہیں۔ ان کے علاوہ جنہوں نے نبی کریم ﷺ کی اعانت نہ کی مثلاً ابولہب کے اگرچہ یہ کافر بھی جناب عبدالمطلب کا بیٹا تھا مگر ان کی اولادیں بنی ہاشم میں شمار نہ ہونگی۔ (عالمگیری)

وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ (اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو) آیت کے سیاق کے اعتبار سے یہ تیسرا حکم بھی بنی اسرائیل کے لیے ہے یعنی رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔ رکوع کے لغوی معنی اِنحِناء یعنی جھکنا ہے (مفردات) اصطلاحِ شریعت میں نماز کے ایک رکن کا نام ہے۔ یعنی تم ان نمازیوں کے ساتھ رکوع والی نماز پڑھا کرو کیوں کہ یہودیوں کی نماز میں رکوع نہ تھا تو گویا یہ جملہ {اقیمو الصلوۃ} کی تفسیر ہے یعنی کونسی نماز قائم کرو رکوع والی یا اس کا یہ مطلب بھی لیا گیا ہے کہ جماعت سے نماز پڑھا کرو کیوں کہ جماعت کی نماز تنہا نماز پر ستائیس درجہ افضل ہے۔

نیز سلطانی بارگاہ میں وفد کی عرض و معروض بمقابلہ اکیلے کی عرض سے زیادہ سنی جاتی ہے۔ جماعت کی شکل میں مسلمان وفد کی شکل میں اپنے رب کے حضور میں حاضر ہوتے ہیں۔ امام ان کا نمائندہ ہوتا ہے نمائندہ جتنا اعلیٰ ہوگا اتنی ہی اعلیٰ نمائندگی ہوگی۔ (نعیمی)

مسئلہ: داؤد ظاہری کے نزدیک جماعت رکن ہے۔ امام احمد کے نزدیک ایک فرض جمہور علماء کے نزدیک سنت موکدہ واجب کے قریب ہے۔ اسی لیے ہر نماز با جماعت نہیں پڑھی جاتی۔ جمعہ اور عیدین کے لیے جماعت فرض ہے اور پنجگانہ فرض نمازوں کے لیے واجب نماز کسوف (سورج گرہن کی نماز) نماز استسقاء، نماز تراویح کے لیے جماعت سنت باقی نفلوں کے لیے تداعی واہتمام سے جماعت کرنا مکروہ ہے۔

فائدہ: حضرات فقہاء کرام نے اسی آیت سے استدلال فرمایا کہ جس نے رکوع پالیا اس نے رکعت پالی۔

بوسیلہِ اعمال دعا کرنا......نماز کا بوجھ معلوم ہونا علامتِ نفاق ہے۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

وَاسۡتَعِيۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ وَاِنَّهَا لَكَبِيۡرَةٌ اِلَّا عَلَى الۡخٰشِعِيۡنَ الَّذِيۡنَ يَظُنُّوۡنَ اَنَّهُمۡ مُّلٰقُوۡا رَبِّهِمۡ وَاَنَّهُمۡ اِلَيۡهِ رٰجِعُوۡنَ ۝ (سورۃ البقرۃ:۴۵،۴۶)

"اور صبر اور نماز سے مدد چاہو اور بے شک نماز ضرور بھاری ہے، مگر ان پر (نہیں) جو دل سے میری طرف جھکتے ہیں۔ جنہیں یقین ہے کہ وہ ضرور اپنے رب سے ملنے والے ہیں اور بلاشبہ اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں"۔

چوں کہ اس سے پہلے نماز باجماعت ادا کرنے اور زکوۃ ادا کرنے کی ہدایت فرمائی گئی اور یہ کام بہت شاق اور بھاری تھے لہٰذا اب یہاں وہ ترکیب بتائی جارہی ہے کہ جس سے ان کی یہ مشکل آسان ہو جائے جیسے طبیب بیمار کو بدمزہ کڑوی دوا دیتا ہے اور ہدایت کرتا ہے کہ اس میں شکر ملا کر پی لینا ایسے ہی یہاں ہے۔

تفسیر:

اِسۡتَعِيۡنُوۡا: استعانت سے بنا، اس کے معنی مدد مانگنا اور مدد حاصل کرنا۔

بِالصَّبۡرِ: صبر کے معنی ہیں کسی کو تنگی کی حالت میں روک رکھنا۔ یا عقل و شریعت دونوں یا ان میں سے کسی ایک کے تقاضہ کے مطابق اپنے آپ کو روک رکھنا (مفردات)

صبر کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ مصیبت میں صبر کرنا یعنی جب کہ بوقتِ مصیبت دل چاہتا ہے کہ بے قراری اور بے چینی کا اظہار کرے اس وقت دل کو قابو میں رکھنا اور راضی برضا رہنا۔

۲۔ عبادات اور اطاعت کی مشقتوں پر صبر کرنا اور ان پر قائم رہنا مثلاً سردی کے موسم میں ٹھنڈے پانی سے وضو کرنے کی ہمت نہیں پڑتی، اسی طرح زکوۃ نکالنے کو جی نہیں چاہتا ،اب دل پر جبر کر کے ان کاموں کو کر گزرنا۔

۳۔ نفس کو گناہ کی طرف مائل ہونے سے روکنا مثلاً دل گانے بجانے کی طرف مائل ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ سود خوار بڑے مزے سے پیسے کمار ہے ہیں، آج کل اہلِ یورپ عیش وعشرت کی زندگی گزار رہے ہیں اور دولت کی ریل پیل ہے، گناہ کا تصور بھی ان کے ذہنوں سے مٹ چکا ہے۔ ان کی ایسی پرفریب زندگی دیکھ کر انسان کا جی چاہتا ہے کہ ہم اسی بے راہ روی کا شکار ہو جائیں، لیکن اپنے دل کو روکنا اور ادھر مائل نہ ہونے دینا یہ بھی صبر ہے۔ اس تقریر کو مختصراً یوں ادا کیا جا سکتا ہے۔ صبر فی المصیبة، صبر علی الطاعة، صبر عن المعصیة (ملخصاً عزیزی)

اس جگہ تینوں صبر مراد ہو سکتے ہیں۔ بعض نے فرمایا کہ اس جگہ صبر سے مراد روزہ ہے کیوں کہ اس میں بھی نفس کو خواہشات سے روکنا ہوتا ہے تو مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ سے بذریعہ صبر و نماز کے مدد مانگو یا نماز اور صبر سے مدد حاصل کرو۔

وَالصَّلٰوة: بعض مفسرین نے فرمایا کہ وَالصَّلٰوة میں واؤ بمعنی علیٰ ہے اس تقدیر پر آیت کے یہ معنی ہوئے کہ نماز پڑھ کر ہر صبر سے مدد چاہو جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد فرمایا (وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا) آپ اپنی اھل کو نماز کا حکم کیجیے اور خود بھی اس پر قائم رہیے [۱] } تفکرات کے رفع کرنے اور حوائج کے پورا ہونے میں نماز کو بڑا دخل ہے۔ چناں چہ امام احمد اور ابو داؤد وغیرھم نے حذیفہ بن الیمان کے بھائی عبدالعزیز سے روایت کی کہ رسول اللہ ﷺ کو جب کوئی مہم پیش آتی تو نماز کی طرف توجہ فرماتے تھے۔ اس آیت میں صلوۃ سے مراد یا تو نماز پنجگانہ

ہے یا خاص نماز یعنی ہر مصیبت کے وقت خاص نماز ادا کرنا جیسے قحط سالی میں نماز استسقاء وغیرہ۔

یا صلوۃ سے مراد دعا (جو کہ اس کے لغوی معنی ہیں) بھی ہو سکتی ہے کیوں کہ دعا سے بھی پریشانیاں دور ہوتی ہیں اور دینی و دنیاوی حاجتیں پوری ہوتی ہیں، چناں چہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس کو اللہ سے یا کسی بندہ سے کوئی حاجت ہو تو اسے چاہیے کہ خوب اچھی طرح وضو کرے پھر دو رکعت پڑھ کر حق تعالیٰ کی حمد وثناء کرے اور نبی کریم ﷺ پر درود بھیجے پھر یہ دعا پڑھے لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰـهُ الـحليم الكريم سبحان الله رب العرش العظيم الحمد لله رب العالمين اَسْئَلُكَ موجباتِ رَحْمَتِكَ وعزائِمَ مَغْفِرَتِكَ والغنيمةَ من كل بِرٍّ وَّالسَّلامةَ من كل اثم لاَ تدع لى ذنباً الاّ غَفَرْتَهٗ ولا هماً الا فرجتهٗ ولاَ حاجةً هى لك رِضاً الاَّ قضيتها يا ارحم الراحمين (صفحہ نمبر 277 عزیزی) (رواہ الترمذی عن عبداللہ بن ابی اوفی)

اس آیت کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ اولاً تو صبر سے مدد چاہو اور جب صبر سے کام نہ چلے تو نماز میں مشغول ہو جاؤ چوں کہ نماز میں کمال مشغولیت ہوتی ہے اور روح حضور الٰہی کی لذتوں میں اس قدر مشغول ہو جاتی ہے کہ پھر اس تک کوئی خطرہ نہیں پہنچ سکتا لہٰذا دنیاوی تکلیفوں سے نجات دیتی ہے۔ (نعیمی، عزیزی وغیرہ)

وَاِنَّهَـا لَـكَبِيـرَةٌ: (بے شک نماز ضرور بھاری ہے) اِنَّهَـا میں ضمیر ھا یا تو صبر اور نماز دونوں کی طرف۔ ضمیر اگرچہ واحد کی ہے لیکن مرجع میں کوئی تاویل کر کے واحد کی ضمیر لانا جائز ہے۔ یہاں یہ تاویل کر لی جائے گی کہ انھا کی ضمیر ہر ایک خصلت کی طرف لوٹتی ہے۔ تو اس تقدیر پر معنی یہ ہونگے کہ دونوں خصلتوں (صبر وصلوۃ) میں ہر ایک گراں اور شاق ہے یا صرف صلوۃ کی طرف راجع ہے کیوں کہ نماز کی شان بہت عظیم ہے اور نیز اس میں کئی قسم کے صبر ہیں (نماز میں کئی قسم کے صبر آجانے کی مثال ایسی سمجھنی چاہیے) جیسا کہ حق تعالیٰ نے فرمایا (واللّٰـهُ و رسـولـهٗ احق ان يُـرْضـوه) (یعنی اللہ اور رسول اس کا زیادہ حق رکھتے ہیں کہ وہ انہیں راضی رکھیں) چوں کہ اللہ کی رضا بعینہ رسول کی رضا ہے اس لیے یـرضـوه میں ضمیر واحد اللہ اور رسول دونوں کی جانب راجع

ہوتی ہے (ملخصا مظہری) یہاں کبیرہ کے معنی شاق، دشوار، ثقیل یعنی بھاری کے ہیں۔ جیسے کہ قرآن پاک میں ہے کہ (كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ) مشرکین پر بھاری پڑ گیا) یعنی وہ نماز وغیرہ کفار منافقین وغیرہ پر بہت بھاری ہے۔

اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ: (مگر ان پر (نہیں) جو دل سے میری طرف جھکتے ہیں) خاشعین خشوع سے بنا اس کے لغوی معنی ہیں، عاجزی کرنا، جھک جانا، مائل ہو جانا۔ (مفردات) یا سکون قلب (نعیمی) اور خشوع آواز اور نگاہ میں ہوتا ہے چناں چہ حق تعالیٰ فرماتا ہے (وخشعت الاصوات للرحمن) پ ۱۶ (اور آوازیں پست ہو جائیں گی رحمٰن کے خوف سے) اور فرمایا (خاشعة ابصارهم) پ ۲۹ (نظریں جھکی ہوئی ہوں گی) خضوع کے معنی لغت میں نرم ہو جانے اور مطیع ہو جانے کے ہیں۔ چناں چہ کہتے ہیں کہ خشوع تو اعضاء سے ہوتا ہے اور خضوع قلب سے۔ اس آیت میں الخاشعین سے مراد وہ مومن بندے ہیں جن کے دلوں کو حق تعالیٰ کی اطاعت سے اطمینان اور چین حاصل ہو گیا اور وہ اللہ سے ڈرنے والے اور متواضع ہیں۔

الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ: (جنہیں یقین ہے کہ انہیں اپنے رب سے ملنا ہے) ظن کسی چیز کی علامات سے جو نتیجہ حاصل ہوتا ہے اسے ظن کہتے ہیں۔ جب یہ علامت قوی ہو تو اسے علم کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے، مگر جب بہت کمزور ہو تو وہ نتیجہ وہم کی حد سے آگے تجاوز نہیں کرتا یہی وجہ ہے کہ جب وہ نتیجہ قوی ہو جائے اور علم کا درجہ حاصل کر لے یا اسے علم کے درجہ میں فرض کر لیا جائے تو اس کے بعد اَنَّ یا اَنْ استعمال ہوتا ہے۔ (مفردات) بغوی فرماتے ہیں کہ لفظ ظن اضداد میں سے ہے کہ کبھی تو اس کے معنی شک کے ہوتے ہیں کبھی یقین کے کہ یہ لفظ مشترک ہے۔ بعض نے کہا کہ یہ لفظ مشترک تو نہیں اس کے معنی فقط گمان غالب کے ہیں، لیکن مجازاً کبھی کبھی یقین کو ظن بول دیتے ہیں کہ اس میں بھی ایک طرف غالب ہوتی ہے۔

مُلٰقُوْا: ملاقات سے بنا جس کے معنی ہیں ملنا۔ یہاں یا تو قیامت میں رب سے ملنا یا حالت نماز میں یا موت کے وقت وغیرہ یعنی نماز ان لوگوں پر بھاری نہیں جن کو قیامت میں رب سے ملنے کا

یقین ہے۔ (مظہری، نعیمی) یا ان پر جو کہ نماز کے وقت یہ سمجھتے ہیں کہ ہم رب سے ملاقات کر رہے ہیں اور ہمارا رب ہم کو دیکھ رہا ہے کیوں کہ سچ یہ ہے کہ نماز مومن کے لیے معراج ہے بندہ کے لیے رویت باری تعالیٰ کا وسیلہ بن جاتی ہے۔ (عزیزی) یا ان پر جو ہر لحظہ موت کا خیال رکھنے والے ہیں کیوں کہ ہر وہ شخص جو ہر آن موت کو اپنے سامنے دیکھتا ہے اور اسے یقین ہوتا ہے کہ میں نے مر کر اللہ سے ملاقات کرنی ہے تو ہر وقت اس کے دل میں خشوع وخضوع ہوگا اور وہ نیکی کی طرف راغب ہوگا، برائی سے اجتناب کرے گا اور توبہ کی طرف جلدی کرنے والا ہوگا۔ (کبیر) اس مقام پر صاحبِ تفسیرِ مظہری اور علامہ رازی نے ایک عجیب اور عمدہ نکتہ بیان فرمایا کہ حق تعالیٰ نے اس مقام پر لفظ ظن ارشاد فرمایا اور علم ویقین کا لفظ نہ فرمایا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بات معلوم ہو جائے کہ جسے اس امر کا گمان غالب بھی ہوگا کہ میں اللہ سے ملنے والا ہوں اور اللہ تعالیٰ نیکی بدی کا بدلہ دے گا تو اگر وہ عقلِ سلیم رکھتا ہوگا تو اس کے لیے طاعت پر قائم رہنا اور معصیت وضرر سے بچنا سہل وآسان ہو جائیگا۔ مثلاً اگر کسی کو بظنِ غالب معلوم ہو کہ اس کوزہ میں زہر آلود پانی ہے تو وہ پیاس کی شدت اور تکلیف کو برداشت کرلے گا اور اس پانی کو کبھی نہ پیئے گا۔ ایسے ہی اگر کسی کو یہ بات معلوم ہو جائے کہ فلاں کوزہ کا پانی امراض سے شفاء دیتا ہے تو وہ اگرچہ تلخ اور بدمزہ ہی کیوں نہ ہو اسے خوشی خوشی پی جائے گا۔ تو جب ایسے قلیل ضرر سے بچنے اور فانی نفع کے حاصل کرنے کے لیے آدمی ایسی مشقت کو برداشت کرلیتا ہے تو بھلا وہ شخص جو اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان لائے تو وہ محبوبِ حقیقی کی رضا کے لیے ہر قسم کی تکلیف ومشقت کیوں کر نہ گوارا کرے گا چوں کہ ان تکالیف کا محبوب نے حکم دیا۔ اس لیے اس کی برداشت اور مشغولی میں اسے ایک طرح کی لذت محسوس ہوگی۔ اسی لیے سید عالم ﷺ نے فرمایا (جُعِلَتْ قُرَّةُ عینی فی الصلوة) (میری آنکھ کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے)۔ (رواہ الحاکم والنسائی)

وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ: (اور بلاشبہ وہ اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں) راجعون رجوع سے بنا اور اس کا اصل معنی کسی چیز کا اپنے مبداء حقیقی یا تقدیری کی طرف لوٹنا ہے خواہ وہ کوئی مکان ہو یا فعل ہو

یا قول ہو اور خواہ وہ رجوع بذاتہ ہو یا باعتبار جز کے یا باعتبار فعل کے ہو۔ الغرض رجوع کے معنی عود کرنے یا لوٹنے کے ہیں (مفردات) یعنی جو اسے جانتے ہیں کہ وہ اللہ کی طرف جانے والے ہیں اور وہاں اللہ تعالیٰ نیک و بد کا بدلہ دینے والا ہے جو شخص اس کا لحاظ کرے گا کہ مجھے اللہ تعالیٰ سے معاملہ پڑتا ہے اور وہاں جزاء و سزا بھی ہوتی ہے تو اسے صبر آسان ہو جائے گا۔ اسی لیے مصیبت زدہ کے لیے مسنون ہے کہ وہ (انا للّٰہ و انا الیہ راجعون) پڑھا کرے۔

فوائد و مسائل:

(۱) مصیبت، تکلیف اور پریشانی کے وقت صبر کرنا چاہیے اور نماز کی طرف متوجہ ہو جانا چاہیے کیوں کہ صبر اور نماز سے بڑی بڑی مشکلیں حل ہو جاتی ہیں۔ حکیم ترمذی نے نوادر الاصول میں بروایت ابن عباس نقل کیا کہ حضور ﷺ نے فرمایا (عَلَیْکَ بالعلم فَاِنَّ الْعِلْمَ خلیل المؤمن والحلم وزیرہٗ والعقل دلیلہٗ والرفق اخوہ والصبر امیر جنودہ) (علم مومن کا دوست ہے اور حلم (بردباری) اس کا وزیر، عقل اس کی رہبر، نرمی (تواضع) اس کا بھائی اور صبر اس کے لشکر کا سپہ سالار} یعنی جس طرح بغیر سالار کے کوئی مہم سر نہیں ہوتی اسی طرح بغیر صبر کوئی مشکل حل نہیں ہو سکتی۔ (تفسیر عزیزی)

(۲) عالمِ دین اس عابد گوشہ نشین سے افضل ہے، جو کہ نہ لوگوں سے میل جول رکھتا ہے، نہ ان سے تکلیفیں اٹھاتا ہے، نہ صبر کرنے کی نوبت آتی ہے لیکن عالم دین لوگوں میں رہ کر تبلیغ دین کرتا ہے جس کی وجہ سے سینکڑوں اس کے دشمن بن جاتے ہیں اور وہ سب کی اذیتیں اور طعن و تشنیع برداشت کیے ہوئے صبر سے اپنا کام کیے جاتا ہے۔ صاحب تفسیرِ عزیزی نے بحوالہ بیہقی اشعث بن سلامہ سے ایک حدیث نقل کی کہ ایک صحابی نے حضور ﷺ کے زمانہ میں پہاڑ کے غار میں گوشہ نشینی اختیار کرلی۔ تو حضور ﷺ نے چند روز بعد صحابہ سے دریافت فرمایا کہ وہ صاحب غیر حاضر کیوں رہتے ہیں؟ تو لوگوں نے واقعہ عرض کیا۔

آپ ﷺ نے فرمایا: ان کو بلاؤ۔ جب وہ حاضر خدمت ہوئے تو ان سے گوشہ نشینی کی وجہ دریافت کی تو انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! لوگوں کی صحبت عبادت میں خلل ڈالتی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ؎ مسلمانوں کی صحبت میں رہ کر مشقتیں برداشت کرنا ساٹھ سالہ تنہائی کی عبادت سے بہتر ہے}۔

(۳) رب تعالیٰ سے بوسیلہ اعمال دعا کرنا جائز اور قابلِ قبول ہے۔

(۴) مومنین کو آخرت میں ان شاء اللہ دیدار الٰہی نصیب ہوگا جیسا کہ ملاقو ربھم سے معلوم ہوا کیوں کہ بغیر دیدار ملاقات ناقص ہے۔ (نعیمی)

(۵) نماز کا بوجھ معلوم ہونا نفاق کی علامت ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ عشاء اور فجر کی نمازیں منافقین پر بہت دشوار ہیں کیوں کہ اس کو وہ بے کار سمجھتا ہے اور مسلمان کے لیے نماز معراج ہے۔

مسئلہ شفاعت

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

وَاتَّقُوۡا يَوۡمًا لَّا تَجۡزِىۡ نَفۡسٌ عَنۡ نَّفۡسٍ شَيۡـئًا وَّلَا يُقۡبَلُ مِنۡهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤۡخَذُ مِنۡهَا عَدۡلٌ وَّلَا هُمۡ يُنۡصَرُوۡنَ ۝ (سورۃ البقرۃ:۴۸)

"اور ڈرو اس دن سے جس دن کوئی جان دوسرے کا بدلہ نہ ہو سکے گی اور نہ (کافر کے لیے) کوئی سفارش مانی جائے گی اور نہ کچھ لے کر (اس کی) جان چھوڑی جائے گی اور نہ ان کی مدد ہو گی۔"

تفسیر:

وَاتَّقُوۡا يَوۡمًا: یہ لفظ وقیٰ سے بنا ہے جس کے معنی بچنا اور ڈرنا ہے۔ یہاں دونوں معنی بن سکتے ہیں یعنی اس دن کے عذاب و شدائد سے ڈرو یا ایمان لا کر اس دن کی مصیبتوں سے بچ جاؤ۔

لَّا تَجۡزِىۡ نَفۡسٌ عَنۡ نَّفۡسٍ شَيۡـئًا: (جس دن کوئی جان دوسرے کا بدلہ نہ ہو سکے) مراد یہ ہے کہ کوئی کافر کسی کافر کو نفع نہ پہنچا سکے گا۔ یہ معنی نہیں کہ مسلمان بھی مسلمان کے کام نہ آئے گا کیوں کہ آیات و احادیث میں تصریح ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام اور دیگر نیک بندے گنہگاروں کی شفاعت کریں گے۔

وَّلَا يُقۡبَلُ مِنۡهَا شَفَاعَةٌ: اور (نہ کافر کے لیے) کوئی سفارش مانی جائے گی جس سے کافر کی مغفرت ہو جائے۔

وَّلَا يُؤۡخَذُ مِنۡهَا عَدۡلٌ: (اور نہ کچھ لے کر (اس کی) جان چھوڑی جائے گی۔ لفظ عدل کے معنی برابری اور مساوات کے ہیں۔ قرآن حکیم میں ہے (بربهم يعدلون) اس لیے نظیر اور مثل کو

عدیل کہتے ہیں کیوں کہ وہ اس کے برابر ہوتا ہے نیز انصاف کو عدل اور انصاف کی جگہ کو عدالت کہتے ہیں اس لیے کہ وہاں ظالم سے بدلہ لے کر مظلوم کے برابر کیا جاتا ہے۔اس مال کو بھی عدل کہا جانے لگا جو جان وغیرہ کے عوض میں دیا جائے یعنی خون بہا اور فدیہ وغیرہ تو آیت کے معنی یہ ہوئے کہ کافر کو رشوت یا نذرانہ یا خون بہا لے کر بھی نہیں چھوڑا جائے گا۔

وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ : اور نہ ان کی مدد ہوگی۔مدد کی چار صورتیں ہیں کہ مددگار یا تو زبردستی اپنے قوت بازو سے اس کو سزا دینے والے کے ہاتھ سے چھڑا لے جسے نصرت کہتے ہیں۔یا زبردستی تو نہیں مگر کسی کے کہنے سے اسے مفت چھوڑ دیا جاتا ہے اسے شفاعت کہتے ہیں۔یا جو اس کے ذمے ہو وہ ادا کر دیا جاتا ہے یہ جزاء ہے یا جو اس کے ذمے ہے وہ تو ادا نہیں کیا مگر اس کا بدل دے دیا یہ عدل ہے۔اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان سب صورتوں کی نفی فرمادی یعنی قیامت کے دن کوئی بھی کسی کافر سے کسی تدبیر کے ساتھ عذاب دفع نہ کر سکے گا۔(مظہری)

مسئلہ شفاعت:

جملہ اہلِ حق کا اس پر اجماع ہے کہ حضور پُر نور شافع یوم النشور سید عالم ﷺ باذن اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی شفاعت فرمائیں گے۔

فرقہ معتزلہ اور خوارج شفاعت کے منکر ہیں یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر مرتکب کبیرہ بغیر توبہ کے مر جائے تو ہمیشہ کے لیے دوزخی ہو جائے گا اس کی کوئی شفاعت نہ ہوگی۔نہ اس کو کبھی دوزخ سے رہائی ملے گی لیکن ثبوت شفاعت کے لیے اتنی کثرت سے احادیث صحیحہ وارد ہیں کہ تواتر معنوی کی حد تک پہنچ چکی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اس زمانے کے علماء خصوصاً صاحب تفسیر کبیر امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ نے منکرینِ شفاعت کا ردِ بلیغ فرمایا۔اب اگرچہ وہ دونوں فرقے مٹ کر گمنام ہو چکے ہیں تاہم اس زمانہ میں بعض دیوبندیہ، وہابیہ، نجدیہ اور ان کے پیروکار شفاعت رسول (ﷺ) کے پُر زور منکر موجود ہیں۔چناں چہ ان ہر دو فرقہ کے امام مولوی اسماعیل دہلوی

نے اپنی شرانگیز کتاب تقویۃ الایمان میں لکھا ہے کہ (کوئی کسی کا سفارشی اور حمایتی نہیں) اور اسی کتاب میں اگرچہ ایک جگہ شفاعت بالاذن کا اقرار تو کیا مگر اس کے معنی ایسے بگاڑے کہ جس سے شفاعت کی کوئی حقیقت باقی نہیں رہتی۔ اس ذبیح تیغ خیار کے نزدیک صرف شفاعت کی یہ صورت ہے کہ مثلاً ایک بادشاہ کسی مجرم کو خود چھوڑنا چاہتا ہے لیکن اپنے قانون ٹوٹنے کے ڈر سے بظاہر کسی سے سفارش کروالیتا ہے اور وہ سفارش کرنے والا بھی شاہی اشارہ پا کر (مفت کرم داشتن) کے طریقے سے کچھ ظاہری سفارش کر دیتا ہے۔ خدا کے ہاں کسی کی عزت نہیں جو عزت سے سفارش کرے اور نہ رب کو کسی سے محبت ہے کہ اس کی بات محبت کی وجہ سے مان لے۔ ظاہر ہے کہ در پردہ اس نے شفاعت کا انکار کر دیا ہے لیکن اب دیوبندی اور وہابی نجدی اللہ کے خوف سے نہیں بلکہ مسلمانوں سے ڈر کر اور عامۃ المسلمین کو اپنے دامِ فریب میں پھنسانے کے لیے شفاعت کا اقرار کر لیتے ہیں اور حضورﷺ کو شفیع المذنبین بھی جان لیتے ہیں لیکن اسی بگڑے ہوئے معنی سے جیسے کہ قادیانی حضورﷺ کو خاتم النبین کہہ دیتے ہیں لیکن معنی میں تحریف کرتے ہیں۔ جناب مودودی صاحب نے بھی شفاعت کے معنوں کو اسی طرح بگاڑا ہے اور صاحب تقویت الایمان کے نقش قدم پر چلا ہے۔ کما فی التفہیم وغیرہ

اگرچہ قبل ازیں صاحب تفسیر کبیر امام فخر الدین رازی، صاحب تفسیر روح البیان علامہ اسماعیل حقی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، حضرت علامہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی، صاحب تفسیر مظہری امام اور عصر حاضر کے مفسر اعظم علی شارح مشکوۃ مفسر قرآن مفتی احمد یار خان گجراتی (رحمۃ اللہ علیہم) حضرات کی اس مسئلے پر معرکۃ الاراء تحریریں موجود ہیں بلکہ سالار قافلہ حریت امام المجاہدین مولانا فضلِ حق خیر آبادی (رحمۃ اللہ علیہ) نے تو تقویۃ الایمان مصنفہ مولوی اسماعیل دہلوی کی مذکورہ عبارت کے رد میں اس مسئلہ پر ایک مفصل کتاب بنام تحقیق الفتوی فی ابطال طغوی تحریر فرمائی جو کہ ایک علمی شاہکار ہے۔ علاوہ ازیں امام اہل سنت مولانا الشاہ احمد رضا فاضل بریلوی (رحمۃ اللہ علیہ) نے بھی اس مسئلے پر ایک ایمان افروز، باطل سوز رسالہ بنام (اسماع

الاربعین فی شفاعة سیدالمحبوبین) تحریر فرمایا ہے تاہم ہم بھی ان سلف صالحین سے اکتساب کرتے ہوئے چند سطور ہدیہ قارئین کرتے ہیں۔ اس بحث کے دو باب ہوں گے پہلا باب شفاعت کا ثبوت بایآت قرآنی واحادیث صحیحہ اور دلائل عقلیہ سے ہوگا۔ اس میں یہ بھی وضاحت ہوگی کہ حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی شفاعت محض رب کا بہانہ نہ ہوگی بلکہ شفاعت بالمحبہ اور شفاعت بالوجاہت ہوگی اور یہ دونوں شفاعتیں بالاذن میں داخل ہیں اور دوسرا باب اس مسئلہ پر اعتراضات کے جوابات پر مشتمل ہوگا۔

شفاعت:

شفاعت شفعٌ سے بنا ہے جس کا معنیٰ ملنا، ساتھی ہونا، ہمراہی بننا، دو رکعت نماز کو شفعہ کہتے ہیں۔ ہر جوڑ عدد کو شَفعٌ اور طاق عدد کو وتر کہتے ہیں۔ قرآن حکیم میں (والشفع والوتر) پڑوسی شفیع اور اس کے حق پڑوسیت کو شفعہ کہتے ہیں کیوں کہ وہ اس کے ساتھ رہتا ہے۔ (نعیمی) پھر یہ لفظ سفارش کے معنی میں استعمال ہونے لگا کیوں کہ سفارشی حاجت مند کو اکیلا نہیں چھوڑتا بلکہ اس کا ساتھی بن کر اسی کی حمایت کرتا ہے۔ (کبیر) شافع یوم النشور وہ جو قیامت کے دن گناہ گاروں کو اپنے سینے سے لگالیں گے۔ شفاعت دو قسم کی ہے: ☆شفاعت کبریٰ اور ☆شفاعت صغریٰ۔

شفاعت کبریٰ:

شفاعت کبری صرف حضور ﷺ کریں گے اس شفاعت کا فائدہ ساری مخلوق حتیٰ کہ کفار کو بھی پہنچے گا۔ اس شفاعت کی برکت سے حساب کتاب شروع ہوجائے گا اور میدان حشر کے احوال سے نجات ملے گی۔ یہ شفاعت قیام قیامت کے اول میں جبکہ عدلِ خداوندی کا ظہور ہوگا حضور ﷺ ہی کریں گے۔ اس وقت کوئی بھی اس شفاعت کی جرأت نہ کرے گا۔

شفاعت صغریٰ:

شفاعت صغریٰ ظہورِ فضل کے وقت ہوگی۔ یہ شفاعت بہت سے لوگ علماء، صلحاء، حفاظ، حجاج، نابالغ بچے، بلکہ قرآن، رمضان، خانہ کعبہ، حجر اسود وغیرہ بھی کریں گے۔ (اللھم ارزقنا شفاعۃ حبیبک الکریم ﷺ) حضور سید الکائنات کی شفاعت نو قسم کی ہے۔ (۱) حساب شروع کرنے کے لیے جس کا فائدہ سب مخلوق کو ہوگا (۲) بغیر حساب جنتیوں کو جنت میں پہنچانے کے لیے (۳) جن کی نیکیاں بدیاں برابر ہوں ان کا نیکی کا پلہ وزنی کرنے کے لیے (۴) بہت سے لائقِ جہنم گناہ گاروں کو چھڑانے کے لیے (۵) صالحین کے درجات بلند کرنے کے لیے (۶) دوزخ میں گرے ہوؤں کو وہاں سے نکلوانے کے لیے (۷) جنت کا دروازہ کھلوانے کے لیے (۸) اہلِ مدینہ اور زائرینِ روضہ انور کو اپنا قرب دلوانے کے لیے (۹) بعض کفار کا عذاب ہلکا کروانے کے لیے۔ (اشعۃ اللمعات، مرأۃ المناجیح)

پہلا باب

آیت نمبر 1:

اللہ جل مجدہ العظیم فرماتا ہے: (وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ۝) (پ۵ آیت ۶۴) (اور اگر جب وہ اپنی جانوں پر ظلم کریں تو اے محبوب ﷺ! یہ تمہارے حضور حاضر ہوں اور پھر اللہ سے معافی چاہیں اور رسول ان کی شفاعت فرمائے تو اللہ کو بہت توبہ قبول کرنے والا مہربان پائیں گے)۔

اس سے معلوم ہوا کہ جو مجرم بھی اپنی معافی چاہے وہ بارگاہ مصطفیٰ ﷺ میں حاضر ہو اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اس کے لیے سفارش فرمائیں تو رب تعالیٰ معاف فرمادیتا ہے کیوں کہ بارگاہ الٰہی میں رسول اللہ ﷺ کا وسیلہ اور آپ کی شفاعت حاجت برآری کا ذریعہ ہے۔ یہی شفاعت ہے پھر جیسا کہ عمومِ وقت کے لیے ہوتا ہے تو معلوم ہوا کہ مجرم کی یہ جسمانی یا روحانی حاضری چاہے آپ

کی حیات شریف میں ہو یا بعد وفات شریف کے۔ چناں چہ تفسیر مدارک میں ہے کہ وفات شریف کے بعد ایک اعرابی روضہ اقدس پر حاضر ہوا اور قبر انور کی خاک اپنے سر پر ڈالی اور عرض کرنے لگا: یارسول اللہ ﷺ جو آپ نے فرمایا ہم نے سنا اور جو آپ پر نازل ہوا اس میں یہ آیتِ کریمہ بھی ہے (ولو انّھُمْ اذ ظلموا) میں نے بے شک اپنی جان پر ظلم کیا اور میں آپ ﷺ کے حضور میں اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہ کی بخشش چاہنے حاضر ہوا تو میرے رب سے میرے گناہ کی بخشش کروایئے۔ اس کے بعد اعرابی مسجد میں آرام کے لیے لیٹ گیا اور اس کو خواب میں ندا آئی (قد غفر لک)

فوائد:

مسئلہ: اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرضِ حاجت کے لیے اس کے مقبولوں کو وسیلہ بنانا ذریعہِ کامیابی ہے۔

مسئلہ: قبر پر حاجت کے لیے جانا بھی ۃ لجـــاء وک } میں داخل ہے اور خیر القرون کا معمول ہے۔

مسئلہ: بعدِ وفات مقبولانِ حق کو یا کے ساتھ ندا کرنا جائز ہے۔

مسئلہ: مقبولانِ حق مدد فرماتے ہیں اور ان کی دعا سے حاجت روائی ہوتی ہے۔

آیت نمبر 2:

(عَسٰی اَنْ یَّبْعَثَکَ رَبُّکَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا) (سورہ بنی اسرائیل آیت نمبر ۷۹)

قریب ہے کہ تمہارا رب تمہیں ایسی جگہ کھڑا کرے جہاں سب تمہاری حمد کریں }۔ مقام محمود مقام شفاعت ہے۔ اس میں اولین و آخرین حضور ﷺ کی حمد کریں گے۔ اسی پر جمہور ہیں۔ (خزائن)

احمد بن ابی حاتم اور ترمذی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راویت کرتے ہیں کہ رسول اللہ

ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مقام محمود وہ مقام ہے جہاں میں اپنی امت کے لیے شفاعت کروں گا}
(مظہری)

آیت نمبر 3:

(وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ) (سورہ والضحیٰ آیت نمبر ۵) اور بے شک قریب ہے کہ تمہارا رب تمہیں اتنا دے گا کہ تم راضی ہو جاؤ گے) اس سے معلوم ہوا کہ رب تعالیٰ حضور کو راضی فرمائے گا۔ مسلم شریف کی حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ دونوں ہاتھ مبارک اٹھا کر امت کے حق میں رو رو کر دعا فرما رہے تھے۔ (اللھم امتی امتی) اللہ تعالیٰ نے جبریل (علیہ السلام) کو حکم دیا کہ (محمد مصطفیٰ ﷺ) کی خدمت میں جا کر دریافت کرو کہ رونے کا کیا سبب ہے باوجودیکہ اللہ تعالیٰ دانا ہے۔ جبریل علیہ السلام نے حسب حکم حاضر ہو کر دریافت کیا تو سید عالم ﷺ نے انہیں تمام حال بتایا اور غمِ امت کا اظہار فرمایا۔ جبریل امین علیہ السلام نے بارگاہ الٰہی میں عرض کیا کہ آپ کے حبیب یہ فرماتے ہیں باوجود یہ کہ وہ خوب جاننے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جبریل کو حکم دیا کہ جاؤ میرے حبیب ﷺ سے کہو ہم آپ ﷺ کو آپ ﷺ کی امت کے بارے میں عنقریب راضی کریں گے اور آپ کو گراں خاطر نہ ہونے دیں گے۔ حدیث شریف میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو سید عالم ﷺ نے فرمایا کہ (جب تک میرا ایک امتی بھی دوزخ میں رہے گا میں راضی نہ ہوں گا)۔ آیتِ کریمہ صاف دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ وہی کرے گا جس میں رسول ﷺ راضی ہوں گے اور احادیثِ شفاعت سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی رضا اسی میں ہے کہ سب گناہ گاران امت بخش دیئے جائیں تو آیت و احادیث سے قطعی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حضور ﷺ کی شفاعت مقبول اور حسب مرضی مبارک گناہ گارانِ امت بخش دیئے جائیں گے۔ سبحان اللہ! کیا رتبہ اعلیٰ ہے کہ جس پروردگار کو راضی کرنے کے لیے تمام مقربین تکلیفیں برداشت کرتے اور محنتیں اٹھاتے ہیں۔ وہ اس حبیب اکرم ﷺ کو راضی کرنے کے لیے عطائے

عام کرتا ہے۔ (خزائن العرفان) بلا شبہ حضور ﷺ کی یہ شفاعت بالمحبۃ اور بالوجاہت ہوگی کیوں کہ حضور ﷺ کو راضی کرنے کے لیے ہوگی۔

آیت نمبر 4:

(وَصَلِّ عَلَيْهِمْ إِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ) (پ۱۱، آیت نمبر۱۰۳) (اوران کے حق میں دعائے خیر کرو بے شک تمہاری دعا ان کے دلوں کا چین ہے) اس آیتِ کریمہ میں حضور پُرنور سید عالم ﷺ کو حکم دیا جارہا ہے کہ آپ مسلمانوں کے صدقات لے کر ان کو پاک فرمادو اور ان کے لیے دعا بھی کیا کرو۔ آپ کی دعا سے ان کو چین حاصل ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کوئی عمل حضور ﷺ کی سفارش کے بغیر قبول نہیں ہوتا اور مسلمانوں کو طہارت و پاکیزگی حضور ﷺ سے ہی حاصل ہوتی ہے نہ اپنے اعمال سے۔ نیز صحابہ کرام کو محض اپنے اعمال پر چین نہ آتا تھا بلکہ حضور ﷺ کی سفارش اور دعا سے۔

آیت نمبر 5:

(وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ) (سورہ محمد آیت نمبر۱۹) (اے محبوب اپنے خاصوں اور عام مسلمان مردوں اور عورتوں کے گناہوں کی معافی مانگو) ظاہر ہے کہ ایمان دار مردوں اور عورتوں کے لیے مغفرت چاہنا ان کے لیے شفاعت ہے اور اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو حکم فرمایا ہے کہ ان کے لیے شفاعت کیجئے۔ اب دو ہی صورتیں ہیں۔ یہ شفاعت مقبول ہو یا نہ مقبول دوسری صورت باطل ہے کیوں کہ اس وقت لازم آئے گا کہ اللہ تعالیٰ کا امر عبث اور بے فائدہ ہو بلکہ ناپسندیدہ مزاح یا وعدہ کی خلاف ورزی ﴿اللہ کی پناہ ایسی بات سے﴾ تو پہلی صورت متعین ہوگئی اور وہی مقصود ہے کہ حضور ﷺ کی دعاءِ شفاعت مقبول ہے۔

آیت نمبر 6، 7:

مسلم نے حضرت ابن عمر کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابراہیم کا یہ قول ذکر کیا کہ (رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ کثیرً امن الناس فمن تبعنی فانه مِنِّیْ و من عصانی فَاِنَّکَ غفورٌ رحیم) پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ قول ذکر کیا (اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُکَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْم) پھر اس کے بعد دونوں ہاتھ اٹھا کر عرض کیا (امتی امتی) پھر رو دیے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا جبریل جا کر محمد ﷺ کو یہ پیغام پہنچا دو کہ (تمہاری امت کے بارے میں ہم تم کو راضی کر دیں گے دکھ نہیں پہنچائیں گے)۔

آیت نمبر 8:

اللہ تعالیٰ نے متقین کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا (لَا یَمْلِکُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا) (سورہ مریم آیت نمبر ۸۷) معلوم ہوا کہ متقی اس کی شفاعت کریں گے جس نے رب سے عہد کر لیا اور ہر مسلمان رب سے عہد کرنے والا ہے۔)

آیت نمبر 9:

حق تعالیٰ صفاتِ ملائکہ میں فرماتا ہے (وَلَا یَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰی) (سورۃ الانبیآء، پ ۱۷، آیت نمبر ۲۸) معلوم ہوا کہ جس سے رب تعالیٰ راضی ہوگا فرشتے اس کے لیے شفاعت کریں گے۔ اللہ تعالیٰ اسلام کی وجہ سے ہر مسلمان سے راضی ہے۔

آیت نمبر 10:

(فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشَّافِعِیْنَ) (پ ۲۹، آیت نمبر ۴۸) (انہیں سفارشیوں کی سفارش کام نہ دے گی) یعنی کفار پر یہ قہر الٰہی ہوگا کہ انہیں شفاعت نفع نہ دے گی۔ اگر مسلمانوں کا بھی یہی حال ہو تو ان میں اور کفار میں کیا فرق رہا۔ اس آیت میں صراحت ہے کہ کفار کو کسی شافع

کی شفاعت کام نہیں آئے گی۔اسی طرح باقی آیات نفی کا بھی یہی مفہوم ہوگا۔

آیت نمبر 11:

(يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ○ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ) (پ۱۹، آیت نمبر ۸۸) (جس دن نہ مال کام آئے گا اور نہ بیٹے، مگر وہ جو اللہ کے حضور حاضر ہوا سلامت دل لے کر)} معلوم ہوا کہ مشرکین کا مال اور اولاد انہیں کچھ فائدہ نہ دے گی لیکن مسلمان کے لیے مال و اولاد کارآمد اور مفید ہیں۔ نیز اللہ تعالیٰ فرماتا ہے (مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ) (پ۲۴، آیت نمبر ۱۸) (اور ظالموں کا نہ کوئی دوست اور نہ کوئی سفارشی، جس کا کہا مانا جائے) یعنی کافروں کا نہ کوئی دوست اور نہ کوئی سفارشی، جس کا کہا مانا جائے۔ اگر مسلمانوں کا بھی کوئی دوست و شفیع نہ ہو تو مومن و کافر میں فرق کیا ہوا؟۔ نیز للظالمین کی تقدیم حصر کا فائدہ دیتی ہے یعنی صرف کفار کا کوئی دوست اور شفیع نہیں۔ جو کہے کہ ہمارا کوئی شفیع نہیں وہ در پردہ اپنے کفر کا اقرار کرتا ہے۔ (نعیمی)

احادیث

شفاعت کے متعلق بے شمار احادیث وارد ہیں چند استشہاداً نقل کی جاتی ہیں:-

(۱) حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہر نبی کی ایک دعا خصوصاً قبول ہوتی ہے تو ہر نبی نے اپنی وہ دعا یہاں استعمال کر لی اور میں نے اپنی دعا روز قیامت میں اپنی امت کی شفاعت کے لیے بچا رکھی ہے چناں چہ میری وہ دعا ان شاء اللہ میرے ہر اس امتی کو پہنچے گی جو اس طرح مرے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرتا ہو۔(مشکوٰۃ بحوالہ مسلم باب الدعاء)-

(۲) سید عالم ﷺ نے فرمایا (شفاعتی لاھل الکبائر من امتی) میری شفاعت میرے ان امتیوں کے لیے ہوگی جو کبیرہ گناہوں کے مرتکب ہوں گے)(رواہ ابوداؤد، والترمذی، والحاکم، والبھیقی، عن انس بن مالک، والطبرانی، وابو نعیم عن عبد بن بشیر بمعناہ، والطبرانی، فی الاوسط عن ابن عمر، نحوہ الطبرانی فی الکبیر عن ام سلمۃ بمعناہ، والترمذی والحاکم عن جابر بمعناہ وعن کعب بن عجرہ وعن طاؤس) بیہقی نے کہا کہ یہ حدیث مرسل حسن ہے۔ (شفاعتی لاھل الکبائر) کی عبارت تابعین میں بہت زیادہ شائع تھی ان الفاظ سے اصل روایت کی تائیدی شہادت ہو جاتی ہے۔(مظہری)

(۳) صاحب مشکوۃ نے بحوالہ مسلم و بخاری ایک طویل حدیث نقل فرمائی ہے۔ہم اس مقام پر اس کا خلاصہ بیان کرتے ہیں کہ جب لوگ قیامت کی گرمی سے گھبرا کر شفیع کی تلاش میں نکلیں گے۔

قال علیہ الصلوۃ والسلام (یجمع اللہ الاولین والاخرین یوم القیامۃ فیھتمون اوقال فیلھمون فیقولون لواستشفعنا الیٰ ربنا)۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اولین آخرین کو قیامت کے دن جمع فرمائے گا پس تمام غمگین ہوجائیں گے یا فرمایا (راوی کو شک ہے) انہیں الہام کیا جائے گا کہ شفاعت طلب کرنے کے لیے جائیں تو وہ کہیں گے کہ کتنا ہی اچھا ہوتا کہ ہم دربار الٰہی میں کسی کو شفیع بنائیں۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ (ماج الناس بعضھم فی بعض) بعض لوگ بعض سے ٹکرائیں گے۔

۴۔ حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ (فَتَدْنُوْ الشَّمْسُ فَیَبْلُغُ النَّاسَ مِنَ الْغَمِّ مالا یُطِیقُونَ ولا یحتملون فَیَقُوْلُوْنَ اَلاَ تَنْظُرُوْنَ من یَشْفَعُ لَکُمْ) آفتاب قریب ہوجائے گا اور لوگوں کو اتنا غم لاحق ہوگا جس کی طاقت نہیں رکھیں گے اسے برداشت نہیں کرپائیں گے تو آپس میں کہیں گے کیا تم ایسی ہستی کو نہیں ڈھونڈتے جو تمہاری شفاعت کرے)۔ پس! سارے لوگ آدم علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوکر طالب شفاعت ہوں گے تو وہ فرمائیں گے کہ مجھ سے خود ایک خطا ہوگئی، لب کشائی کرنے کی میری ہمت نہیں پڑتی۔ نوح علیہ السلام کے پاس جاؤ، شاید وہاں شفاعت ہوجائے۔ وہ بھی یہی جواب دے کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس بھیجیں گے وہ بھی ایسا ہی جواب دے کر موسیٰ علیہ السلام کے پاس روانہ کریں گے اور وہ عیسیٰ علیہ السلام کے پاس بھیجیں گے تو عیسیٰ علیہ السلام فرمائیں گے کہ آج سوائے محمد رسول اللہ ﷺ کے تمہاری شفاعت کوئی نہیں کرسکتا۔ تب سب لوگ ہمارے پاس آئیں گے۔ (فَاَقُوْلُ اَنَا لھا) تو میں کہوں گا کہ میں خاص شفاعت (کبریٰ) کے لیے ہوں) پھر ہم سر سجدے میں رکھ کر شفاعت فرمائیں گے۔ حکم الٰہی ہوگا۔ (یا محمد اِرْفَعْ رَاسَکَ وَقُلْ تُسْمَعْ وَاشْفَعْ تُشَفَّعْ وَسَلْ تُعْطَ) (اے محمد (ﷺ) اپنا سر مبارک اٹھاؤ بات کرو سنی جائے گی، شفاعت کرو قبول کی جائے گی، کچھ مانگو دیا جائے گا تب ہم شفاعت فرمائیں گے)۔ ونعم ما قال امام احمد رضا بریلوی قدس سرہ

خلیل و نجی مسیح و صفی سبھی سے کہی کہیں نہ بنی

یہ بے خبری کہ خلق پھری کہاں سے کہاں تمہارے لیے

اس حدیث سے جو کتب صحاح میں مختلف طرق و الفاظ سے مروی ہے چند مطالب و فوائد حاصل ہوتے ہیں۔

(۱) جب تمام اولین و آخرین میدانِ حشر میں حیران و پریشان ہوکر سوائے اس کے کوئی راستہ نہیں پائیں گے کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کوئی وسیلہ اور شفیع تلاش کریں تو سب کے سب از آدم تا عیسیٰ (علیہم السلام) رسولانِ عظام کے پاس جائیں گے اور سوائے سید المرسلین، امام الاولین والآخرین حبیب رب العالمین ﷺ کے کسی کو شفاعت کی اجازت نہ ملے گی۔ پس! اگر کوئی نابکار حضور ﷺ کی شفاعت سے ناامید وار یہ عقیدہ رکھے کہ بغیر شفاعت و وسیلہ مصطفیٰ ﷺ رحمت الہیہ کا مستحق بن جائے گا تو یہ اس کا خیالِ خام اور سودائے ناتمام ہے۔

(۲) حضور پُرنور ﷺ کا ارشاد (فاقول انا لھا) الخ سے ظاہر ہے کہ حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ کا ارشاد (سَلْ تُعْطَ وَاشْفَعْ تُشَفَّعْ) سے پہلے ہی شفاعت کی اجازت تھی اور آپ (ﷺ) کو شفاعت کی قبولیت کا یقین تھا کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجازت اور قبولیتِ شفاعت کے یقین کے بغیر کلمہ (اَنَا لَهَا) کوئی معنیٰ نہیں رکھتا۔ قبولیتِ شفاعت کا یقین اس بشارت سے حاصل ہے۔ (وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضىٰ)۔

(۳) حضور سید عالم ﷺ کو بارگاہِ رب العزت میں انتہائی وجاہت اور کامل محبوبیت حاصل ہے۔ کیوں کہ اس وقت تمام اولوالعزم رسول اپنی جگہ (خشیتِ الٰہی سے) لرزہ براندام ہوں گے ایسے وقت حضور ﷺ اپنی عزت و وجاہت اور محبوبیت و مقبولیت کے سبب سائلین کا سوال پورا کریں گے اور ان کی شفاعت کی ذمہ داری سرانجام دیں گے۔

(۴) اللہ جل مجدہ العظیم کی بارگاہ میں حضور سرور عالم ﷺ کی انتہائی عزت و عظمت اس حدیث سے مستنبط ہوتی ہے کہ بارگاہِ خداوندی میں قبولیت اور اجابت آپ کی دعا کا استقبال

کرے گی کیوں کہ دعا سے پہلے ارشاد ہوگا۔(سَلْ تُعْطَ وَاشْفَعْ تُشَفَّعْ) (تحقیق الفتویٰ للفاضل خیرآبادی)

کیا خوب فرمایا امامِ اہلِ سنت نے

اجابت نے بڑھ کر گلے سے لگایا
بڑھی ناز سے جب دعائے محمد (ﷺ)

فائدہ:

کل قیامت کے روز سب سے پہلے وہی کام ہوگا جسے آج منکرین شفاعت شرک کہتے ہیں۔یعنی اللہ کے بندوں سے مدد مانگنا اور ان کے دروازوں پر مدد کے لیے حاضر ہونا۔اس مجمع میں منکرین بھی ہونگے جو محبوب خدا ﷺ کے دروازہ پر ہاتھ پھیلائے حاضر ہونگے

ہم بھی محشر میں خیر دیکھیں گے
نجدی آج ان سے التجاء نہ کرے

کل جب ان سے استغاثہ کرنا ہے تو آج انکار کیسا؟

آج لے اُن کی پناہ آج مدد مانگ اُن سے
کل نہ مانیں گے قیامت میں اگر مان گیا

آج دنیا میں سب کو معلوم ہے کہ روزِ محشر حضور ہی شفیع المذنبین ہوں گے،مگر اس دن کسی کو یاد نہیں رہے گا۔محدثین مفسرین علماء ومشائخ بھی اس مجمع میں ہوں گے سب بھول جائیں گے حتی کہ انبیاء کرام علیہم السلام کو بھی خیال نہ رہے گا۔اس میں کیا حکمت ہے؟ بات یہ ہے کہ اگر تمام اولین وآخرین پہلے ہی حضور سید عالم ﷺ کی بارگاہ میں پہنچ جاتے اور وہاں جا کر بگڑی سنور جاتی تو ممکن ہے کہ کوئی زبان دراز بدگو کہہ دیتا کہ اس شفاعت میں حضور کی کیا تخصیص ایسی شفاعت تو ہر جگہ ہوسکتی تھی۔اس لیے تمام مخلوق کو دربدر پھرایا جائے گا تا کہ شانِ مصطفےٰ ﷺ کا پتا چل جائے اور سب کو معلوم ہوجائے کہ آج سارے انبیاء (نفسی نفسی) اور (اذْهَبُوا اِلٰی غیری) فرما رہے ہیں

اور **(امتی امتی)** فرمانے والے اور **(انا لها)** کہنے والے صرف حضور سید المرسلین خاتم النبیین (ﷺ) ہیں۔

فقط اتنا سبب ہے انعقادِ بزمِ محشر کا
کہ ان کی شان محبوبی دکھائی جانے والی ہے

حضرت انس (رضی اللہ عنہ) نے حضور ﷺ سے عرض کیا کہ قیامت میں آپ میری شفاعت فرمائیں گے۔ آپ (ﷺ) نے فرمایا ضرور کریں گے۔ عرض کیا: میں آپکو کس جگہ تلاش کروں فرمایا (صراط پر) عرض کیا: اگر وہاں نہ پاؤں تو فرمایا (میزان پر)) عرض کیا: اگر وہاں بھی نہ پاؤں تو فرمایا (حوض کے پاس) **(فانی لا اخطئی هذه الثلاث المواطن)** پس میں تین جگہوں کے علاوہ میں نہ ہونگا (رواہ الترمذی)

کوئی قریبِ تراز و کوئی لب کوثر
کوئی صراط پر اُن کو پکارتا ہوگا

کسی طرف سے صدا آئے گی حضور (ﷺ) آؤ
نہیں تو دم میں غریبوں کا فیصلہ ہوگا

کوئی کہے گا دہائی یا رسول اللہ (ﷺ)
تو کوئی تھام کے دامن مچل رہا ہوگا

غرض یہ کہ ایک جان اور فکرِ جہاں **(اللهم صل علی سیدنا محمد واله وصحبه وسلم)**

(٦) حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے پانچ نعمتیں وہ دی گئیں جو مجھ سے پہلے کسی کو نہ دی گئیں۔ میں ایک ماہ کے راستے سے رعب کے ذریعے سے مدد کیا گیا اور میرے لیے ساری زمین مسجد اور ذریعہ طہارت بنا دی گئی کہ میری امت کے آدمی کو جس

جگہ نماز کا وقت آجائے وہ وہاں ہی نماز پڑھ لے اور میرے لیے غنیمتیں حلال کر دی گئیں مجھ سے پہلے کسی کے لیے حلال نہیں کی گئیں (واُعْطِیْتُ الشَّفَاعَةُ وَكَانَ النبیُّ یُبْعَثُ اِلٰی قَوْمِهٖ خَاصَّةً وَّبُعِثْتُ اِلَی النَّاسِ عامَّةً) (اور مجھے شفاعت (کبریٰ) دی گئی اور نبی خاص اپنی قوم کی طرف بھیجے جاتے تھے، میں سارے انسانوں کی طرف بھیجا گیا ہوں) (بخاری مسلم)

کیا خوب فرمایا امام اہلِ سنت نے

اذن کب کا مل چکا اب تو حضور ﷺ ہم غریبوں کی شفاعت کیجئے

(۷) حضرت ابو ہریرہؓ راوی ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا (اَسْعَدُ النَّاسِ بِشَفَاعَتِیْ یَوْمَ الْقِیَامَةِ مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهَ خَالِصًا من قَلْبِهٖ او من نفسه) (رواہ البخاری) لوگوں میں سے زیادہ کامیاب میری شفاعت سے قیامت کے دن وہ ہوگا جس نے خالص دل سے یا خالص نفس سے کہا (لا اله الا الله)۔

(لا الٰه الا اللّٰه) کہنے سے مراد سارے عقائدِ اسلامیہ کا اقرار کرنا ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے نماز میں الحمد پڑھنا واجب ہے یعنی پوری سورہ فاتحہ شریف۔ (خالصًا) فرما کر منافقین کو علیحدہ فرمادیا کہ وہ صرف زبان سے اسلام مانتے ہیں دل سے کافر ہوتے ہیں (مرأة)

(۸) حضور ﷺ نے فرمایا: (فَخَیَّرَنِی بَیْنَ اَنْ یَدْخُلَ نصف اُمَّتِیْ الجنة بغیر حساب وَبَیْنَ الشَّفَاعَةَ فَاخْتَرْتُ الشفاعة) کہ میرے رب نے مجھے دو باتوں میں سے ایک کو انتخاب کر لینے کا اختیار عطا فرمایا۔ ایک یہ کہ وہ میری آدھی امت کو بلا حساب جنت میں داخل فرمادے گا دوسری یہ کہ وہ مجھے حق شفاعت عطا فرمادے گا تو میں نے حق شفاعت کو لینا پسند کر لیا۔ اب میری شفاعت ہر مسلمان کے لیے ہوگی۔

دوسری روایت میں ہے کہ میری شفاعت ہر اس شخص کے لیے ہوگی جو شرک پر نہ مرا ہو (مرتے وقت مشرک نہ ہو) یہ حدیث عوف بن مالک اشجعی کی روایت سے ترمذی ابن ماجہ، حاکم،

ابن حبان، بیہقی اور طبرانی نے بیان کی اور حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے (رواہ احمد والطبر انی والبز از بسند حسن عن معاذ بن جبل وابی موسیٰ واحمد والطبر انی والبیہقی بسند صحیح ابن عمر) اس روایت کے آخر میں ہے (اترو نہا للمتقین ولکِنہا لِلمُذنِبِینَ الخَطّائینَ المعلوثین) کیا تم متقیوں کے لیے میری شفاعت خیال کرتے ہو (نہیں) بلکہ وہ شفاعت تو گناہ گاروں، خطا کاروں اور معصیت کے ساتھ آلودہ لوگوں کے لیے ہوگی۔ (مظہری)

(۹) ابن ابی الدنیا نے حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت آدم علیہ السلام کے ٹھہرنے کا ایک خاص مقام ہوگا وہ سبز کپڑے پہنے ایسے معلوم ہونگے جیسے کوئی کھجور کا لمبا درخت ہے اپنی جگہ کھڑے کھڑے دوزخ کی طرف جانے والوں کو دیکھتے ہوں گے۔ اسی اثناء میں امت محمدی کے ایک شخص کو دوزخ کی طرف لے جاتا دیکھ کر پکاریں گے۔ یا احمد} میں جواب دوں گا ابوالبشر میں یہ ہوں۔ حضرت آدم کہیں گے تمھاری امت کے اس آدمی کو دوزخ کی طرف لے جایا جا رہا ہے۔ میں یہ سنتے ہی فوراً جلد جلد تیاری کر کے فرشتوں کے پیچھے جاؤں گا اور کہوں گا اے اللہ کے قاصدو ٹھہر جاؤ۔ فرشتے کہیں گے ہم سخت خو اور طاقت ور ہیں۔ اللہ جو حکم دیتا ہے اس کے خلاف نہیں کر سکتے جیسا حکم ملتا ہے ویسا ہی کرتے ہیں (راوی نے کہا) جب رسول اللہ ﷺ ناامید ہو جائیں گے تو بائیں ہاتھ کی مٹھی میں ریش مبارک پکڑ کر عرش کی طرف رخ کر کے عرض کریں گے میرے مالک! تو نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ مجھے میری امت میں رسوا نہ کرے گا فوراً عرش سے ندا آئیگی (اَطِیعُوا محمداً) (محمد ﷺ کا کہنا مانو) اور مقام (میزان) کی طرف اس بندہ کو واپس لے آؤ (حضور ﷺ نے فرمایا) پھر میں پورے کے برابر ایک سفید پرچہ اپنی گود سے نکال کر (بسم اللہ) کہہ کر ترازو کے دائیں پلڑے میں ڈالوں گا جس سے نیکیوں کا پلڑہ جھک جائے گا۔ تو ندا ہوگی (سَعِدَو سَعِدَ جدہ) (اس کوشش کامیاب ہوگئی) (اس کی نیکیوں کا وزن) بھاری نکلا۔ اس کو جنت میں لے جاؤ

شخص (فرشتوں سے) کہے گا۔ (یارسل ربی قِفُوا حتّٰی اسأل ھذا العبد الکریم علی ربہ)

(اے میرے رب کے کارندو ذرا ٹھہر جاؤ میں اس معزز بندہ سے کچھ دریافت کرلوں جس کی بارگاہ الٰہی میں اتنی عزت ہے)۔ (پھر رسول اللہ ﷺ کی طرف رخ کرکے) کہے گا۔ (بابی وَ اُمِّی مَا اَحْسَنَ وَجْھَکَ وَاَحْسَنَ خُلُقَکَ مَنْ اَنْتَ فقد اقلتنی ورحمت عزتی فاقول انا نبیّکَ محمدٌ وھذہ صلوٰتک التی کنت تصلیھا علی وافتک احوج ماتکون الیھا) آپ پر میرے ماں باپ قربان! آپ کون ہیں آپ کا چہرہ کتنا حسین ہے اور آپ کے اخلاق کتنے اعلیٰ ہیں، آپ نے مجھے لوٹا دیا اور میری آبرو پر رحم فرما۔ میں جواب دوں گا تیرا نبی محمد (ﷺ) ہوں اور یہ تیرے وہ درود تھے جو تو مجھ پر پڑھتا تھا، آڑے وقت میں یہ تیرے کام آئے۔ (تفسیر مظہری زیر آیت (وَالْوَزْنُ یَوْمَئِذِنِ الْحَقُّ)

(۱۰) حضرت عمران بن حصین سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (محمد مصطفیٰ ﷺ کی شفاعت سے ایک قوم آگ سے نکالی جائے گی جو جنت میں داخل ہوں گے اور ان کا نام جہنم میں رکھا جائے گا)۔ (مشکوۃ بحوالہ بخاری)

فائدہ: ان میں وہ لوگ داخل ہوں گے جنہوں نے صرف کلمہ پڑھا، اچھے عقیدے اختیار کیے، مگر کوئی نیکی نہ کی۔

(۱۱) حضرت عثمان ابن عفان (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (یَشْفَعُ یَوْمَ الْقِیَامَةِ ثَلَاثَةٌ الانبیاءُ ثُمَّ الْعُلَمَاءُ ثُمَّ الشُّھَدَآءُ) (مشکوۃ بحوالہ ابن ماجہ) (قیامت کے دن تین جماعتیں شفاعت کریں گی۔ انبیاء پھر علماء پھر شہید لوگ)۔

فائدہ: اس ترتیب میں علماء کو شہداء پر مقدم رکھا گیا ہے کیوں کہ علماء کے دوات کی روشنائی جس سے وہ دینی تحریر وتصنیف کریں وہ شہیدوں کے خون سے افضل ہے۔ جیسا کہ

شیرازی نے حضرت انس سے ابن عبدالبر نے حضرت ابوالدرداء اور ابن جوزی سے علل میں نعمان ابن بشیر (رضی اللہ عنہ) سے مرفوعاً روایت کی (یُوْزَنُ یوم القیامۃ مداد العلماء و دم الشہداء فیرجح مداد العلماء علی دم الشہداء) (مرقات) ابوداؤد نے ابوالدرداء سے مرفوعاً روایت کیا کہ شہید اپنے ستر عزیزوں کی شفاعت کرے گا۔ خیال رہے کہ یہ خاص شفاعت مراد ہے۔ ورنہ ہر نیک مسلمان گناہ گاروں کی شفاعت کریں گے چناں چہ صاحب مشکوۃ نے بحوالہ ابن ماجہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا کہ (یَصَفُّ اَھْلُ النَّارِ فَیَمُرُّ بِھِمُ الرَّجُلُ مِنْ اَھْلِ الْجَنَّۃِ فَیَقُوْلُ الرَّجُلُ مِنْھُمْ یا فُلَانُ اَمَا تَعْرِفُنِی اَنَا الَّذِیْ سَقَیْتُکَ شَرْبَۃً وَقَالَ بَعْضُھُمْ اَنَا الَّذِیْ وَھَبْتُ لَکَ وَضُوْءً فَشَفَعُ لَہٗ فَیُدْخِلُہُ الْجَنَّۃَ) دوزخی لوگ صف بستہ کھڑے ہونگے تو جنتیوں میں سے ایک شخص ان پر گزرے گا تو ان میں سے ایک دوزخی کہے گا اے فلاں کیا تو مجھے پہچانتا نہیں میں وہ ہوں جس نے تجھے ایک گھونٹ پانی پلایا تھا اور کوئی دوزخی کہے گا کہ میں وہ ہوں جس نے وضو کا پانی دیا تھا یہ جنتی ان کی شفاعت کرے گا پھر اسے جنت میں داخل کرے گا)۔

فائدہ: اہلِ جنت کے راستے میں گناہ گار مستحق نار مومن ایسے ہی صف بستہ کھڑے ہونگے جیسا کہ اس دنیا میں کسی غنی اور سخی کے راستہ میں بھکاری اور مساکین صف بستہ کھڑے ہوتے ہیں۔ (مرقات) اس آس و امید میں کہ ہمیں کوئی پہچان لے اور ہماری رہائی کروادے۔ جونہی کسی جان پہچان والے جنتی کا گزر ہوگا تو وہ گناہ گار مومن جھٹ بول اٹھے گا۔ (یا فلاں میں نے فلاں وقت میں آپ کو کھانا کھلایا یا میں نے فلاں وقت آپ کو سلام کیا یا فلاں وقت آپ کو کپڑا دیا یا فلاں وقت تیرے پاس محبت سے کچھ معمولی ہدیہ پیش کیا غرض یہ کہ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ یہ بھی اسی طرح سہارا لے گا)۔

حدیث شریف میں دو چیزیں بطور مثال مذکور ہیں۔(مرقات)

مندرجہ بالا حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ:

(۱) صلحاء، علماء، شہداء کی شفاعت برحق ہے جیسا کہ اس سے پہلی حدیث جو کہ سیدنا عثمان ذوالنورین (رضی اللہ عنہ) سے مروی ہے میں گزرا۔

(۲) ہم ایسے گناہ گاروں کو چاہیے کہ صلحاءِ امت علماء ربانیین مقبولانِ بارگاہِ خدا کی خدمت کیا کریں۔ ان کی خدمت بڑی کام آئے گی۔ ان سے تعلق رکھیں کہ ان سے تعلق بہت فائدہ دے گا۔ انہیں نیاز مندی سے ہدیہ پیش کریں اگرچہ ایک کھجور ہی کیوں نہ ہو۔(مرقات، اشعۃ اللمعات)

(۳) رب تعالیٰ کی قدرت یہ ہے کہ ہر ایک کو براہ راست بغیر وسیلہ ہر چیز دے مگر قانون یہ ہے کہ گناہ گاروں کو نیکو کاروں کے وسیلہ سے دیتا ہے۔ ان دوزخی صفوں والوں کو رب تعالیٰ ہی بخشے گا مگر جنتی راہ گزروں کی شفاعت سے۔ بلکہ ان لوگوں کو اہلِ جنت کے راستہ میں کھڑا ہی اس لیے کرے گا کہ ان کی شفاعت سے ان کی بخشش ہو۔

شنیدم کہ در روزِ امید و بیم
بداں را بہ نیکاں بخشند کریم

(۴) (یُدْخِلهُ الْجَنَّةَ) فرما کر بتایا کہ وہ جنتی اس دوزخی کو اپنے ساتھ جنت میں لے جائے گا۔

میں مجرم ہوں آقا مجھے ساتھ لے لو
کہ رستہ میں ہیں جابجا تھانے والے

(۵) قیامت میں لوگوں کو اپنے اچھے برے اعمال یاد ہوں گے۔ یہاں کی دوستیاں آپس کے سلوک یاد ہوں گے ایک دوسرے کی پہچان ہوگی۔

(٦) وفات یافتہ بزرگوں کی فاتحہ ختم وغیرہ ان شاء اللہ قیامت میں کام آئے گا، کیوں کہ اس میں بھی ان حضرات کی خدمت میں کھانے پانی وغیرہ کا ثواب ہدیہ کیا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ ان

کے ذریعہ ہم کو ان کی شفاعت نصیب ہو جائے گی۔ ã لسقیتک شربۃ } کے الفاظ یاد رکھے جائیں۔(مرآۃ المناجیح)

بفضلہ تعالیٰ اگرچہ مسئلہِ شفاعت آیات واحادیث سے مبرہن ومدلل بیان ہو چکا ہے۔تاہم اگر کوئی بدنصیب، شفاعت سید المرسلین (ﷺ) کا منکر ہے تو اسے حضرت انس رضی اللہ عنہ کے اس قول پر غور کرنا چاہیے جو کہ سعید بن منصور، بیہقی وغیرہما (رضی اللہ عنہما) نے نقل فرمایا کہ (جو شفاعت کا قائل نہ ہوگا اس کو (شفاعت) نصیب نہ ہوگی اور جو رسول اللہ ﷺ کے حوض کو نہ مانے اس کو حوض سے کوئی حصہ نہ ملے گا)۔(مظہری)

ابونعیم نے حضرت انس (رضی اللہ عنہ) کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (میری امت کے دو قسم کے لوگوں کو میری شفاعت حاصل نہ ہوگی)۔

۱۔ مرجیہ:

وہ فرقہ جو کہتا ہے کہ اعمال ہیچ ہیں۔اگر ایمان دل میں ہے تو کوئی بدعملی آخرت میں ضرر رساں نہ ہوگی۔کوئی مومن خواہ کتنا ہی بدکردار ہو دوزخ میں نہیں جائے گا۔

۲۔ قدریہ:

وہ فرقہ جو قائل ہے کہ ہم اپنے اعمال کے خود خالق ہیں اور تقدیر اعمال کوئی چیز نہیں۔ہم جس طرح چاہیں کر سکتے ہیں۔خیر ہو یا شر۔

بیہقی بشیب بن ابی فضلہ مکی سے راوی ہیں کہ لوگوں نے حضرت عمران بن حصین (رضی اللہ عنہ) کے سامنے شفاعت کا تذکرہ کیا تو ایک شخص بولا اے ابونجید (حضرت عمران کی کنیت) آپ لوگ کچھ ایسی حدیثیں بیان کرتے ہیں جن کا ذکر ہم کو قرآن میں قطعاً نہیں ملتا۔آپ کو غصہ آ گیا اور فرمایا: تو نے قرآن پڑھا ہے؟ اس نے کہا جی ہاں۔تو آپ نے فرمایا: کیا قرآن میں تو نے نماز

پنجگانہ کی تعدادِ رکعات، نصابِ زکوۃ کی تفصیل، سات مرتبہ طواف کعبہ اور نکاح شغار کی ممانعت کا ذکر کہیں قرآن میں تم نے پایا؟ تو اس نے کہا نہیں۔ تو آپ نے فرمایا: کہ کیا یہ باتیں تم نے ہم سے نہیں سیکھیں؟ اور ہم نے یہ تفصیل رسول اللہ ﷺ سے حاصل کی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ارشاد فرمایا (مَا اٰتٰکُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوْہ وَمَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا) (اور رسول اللہ جو کچھ تم کو دیں اس کو لے لو اور جس چیز سے منع فرمائیں اس سے باز رہو) چناں چہ ہم نے رسول اللہ ﷺ سے بہت سے ایسے مسائل واحکام حاصل کیے جن کا تم کو علم بھی نہیں۔ (یہ مسئلہ شفاعت بھی انہیں میں سے ایک ہے) (ملخصاً مظہری)

اعتراضات:

۱۔ بہت سی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے ہاں کسی کی شفاعت نہیں۔ حضور علیہ السلام نے اپنی اول تبلیغ میں حضرت فاطمہ (رضی اللہ عنہا) سے کہا کہ میں تم سے خدا کا عذاب رفع نہیں کر سکتا۔

جواب: اس قسم کی ساری آیات واحادیث میں کفار مراد ہیں۔ سیدتنا فاطمۃ الزہرا (رضی اللہ عنہا) سے یہی فرمایا جا رہا ہے اگر تم نے ایمان قبول نہ کیا تو تمہاری شفاعت نہ ہوگی۔ اس لیے بہت آیات قرآنیہ میں الا فرما کر مستثنیٰ فرمایا گیا۔

۲۔ کفارِ عرب بتوں کو اپنا شفیع مانتے تھے۔ قرآن کریم نے اس عقیدہ کو کفر قرار دیا اور تم لوگ پیغمبروں ولیوں کو شفیع مان کر کافر ہو رہے ہو۔

جواب: کفارِ عرب غیر ماذون بلکہ رب تعالیٰ کے دشمنوں (بتوں) کو شفیع جان کر کافر ہوئے۔ ہم اُن محبوبانِ خدا کو شفیع مانتے ہیں جن کو رب نے شفیع بنایا۔ نیز کفار دھونس کی شفاعت مانتے تھے اور وہ سمجھتے تھے کہ رب تعالیٰ کو بتوں کی شفاعت مجبوراً ماننی پڑے گی کیوں کہ وہ اس کی خدائی میں داخل ہیں، لہٰذا وہ کافر ٹھہرے۔ ہم مقبولانِ خدا کی شفاعت بالاذن اور شفاعت بالعزت اور بالوجاہت عطائی کے قائل ہیں۔

۳۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ زکوۃ نہ دینے والے قیامت میں اپنا مال لادے ہمارے پاس شفاعت کے لیے آئیں گے۔ہم فرمائیں گے کہ ہم نے تمہیں تبلیغ احکام کردی تھی اب ہم مالک نہیں معلوم ہوا کہ شفاعت نہ ہوگی۔

جواب: اس حدیث سے تو یہ ثابت ہو رہا ہے کہ حضور ﷺ شفاعت پر مجبور نہیں بلکہ مختار ہیں جس کی چاہیں شفاعت کریں اور جس کی چاہیں نہ کریں۔جیسے رب تعالیٰ غفور ہے مگر بخشش پر مجبور نہیں بلکہ مختار ہے جس کو چاہے گا بخشے گا۔حضور ﷺ کا دنیا میں یہ اعلان فرمانا بھی قانون کا وقار قائم کرنے کے لیے ہے ورنہ اظہار رحمت کے لیے تو فرمایا (شفاعتی لاھل الکبائر من امتی) یا یہ خطاب منکرین زکوۃ سے ہوگا کیوں کہ وہ انکار زکوۃ سے کافر ہو چکے اور کافر کے لیے شفاعت نہیں (فما تَنْفَعُهُمْ شفاعة الشافعین)

فائدہ:

فقہائے کرام علیہم الرحمۃ والرضوان نے تو ایسے شخص کے پیچھے نماز پڑھنے کو ناجائز لکھا ہے جو شفاعت مصطفیٰ (ﷺ) کا منکر ہے چناں چہ حاشیہ علی مراقی الفلاشرح نورالایضاح میں ہے (فلا تجوز الصلاۃ خلف من ینکر شفاعة النبی ﷺ) (صفحہ نمبر ۲۴۵)

کچھ گروہ تو کفار میں داخل ہیں جیسے یہود ونصاریٰ اور کچھ گمراہ ہیں جیسے وہابی جو شفاعت کے منکر ہیں صفحہ نمبر ۲۴۷ دیکھو نورالانوار صفحہ ۲۴۷ اور اس کا حاشیہ (او مضلل کالوھابی المنکر اللشفاعة)

سحر جادو حرام اور کفر

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۚ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ؕ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ؕ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَ زَوْجِهٖ ؕ وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ؕ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِى الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ؕ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ ؕ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ (سورۃ البقرۃ:۱۰۲)

”اور اس کے پیرو ہوئے جو شیطان پڑھا کرتے تھے۔ سلطنت سلیمان کے زمانے میں اور سلیمان نے کفر نہ کیا ہاں شیطان کافر ہوئے۔ لوگوں کو جادو سکھاتے ہیں اور وہ (جادو) جو بابل میں دو فرشتوں ہاروت و ماروت پر اترا اور وہ دونوں کسی کو کچھ نہ سکھاتے تھے جب تک یہ نہ کہہ لیتے کہ ہم تو نری آزمائش ہیں تو اپنا ایمان نہ کھو تو ان سے سیکھتے وہ جس سے جدائی ڈالیں مرد اور اس کی عورت میں اور اس سے ضرر نہیں پہنچا سکتے کسی کو مگر خدا کے حکم سے اور وہ سیکھتے ہیں جو انھیں نقصان دے گا نفع نہ دے گا اور بے شک ضرور انھیں معلوم ہے کہ جس نے یہ سودا لیا آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں اور بے شک کیا بری چیز ہے وہ جس کے بدلے انہوں نے اپنی جانیں بیچیں کسی طرح انھیں علم ہوتا۔“ (کنز الایمان)

شان نزول:

حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں بنی اسرائیل جادو سیکھنے میں مشغول ہوئے تو آپ نے ان کو اس سے روکا اور ان کی کتابیں لے کر اپنی کرسی کے نیچے دفن کردیں۔ حضرت سلیمان علی السلام کی وفات کے بعد شیاطین نے وہ کتابیں نکلوا کر لوگوں سے کہا کہ سلیمان علیہ السلام اسی کے زور سے حکومت کرتے تھے۔ بنی اسرائیل کے صلحاء وعلماء نے تو اس کا انکار کیا، لیکن ان کے جہلاء جادو کو حضرت سلیمان علیہ السلام کا علم بتا کر اس کے سیکھنے پر ٹوٹ پڑے۔ انبیاء کی کتابیں چھوڑ دیں اور حضرت سلیمان پر ملامت شروع کردی۔ حضور سید عالم ﷺ کے زمانہ اقدس تک اسی حال پر رہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ پر سلیمان علیہ السلام کی براٴت میں یہ آیت نازل فرمائی۔ (اسباب النزول، خزائن العرفان)

تفسیر:

(یُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ (ہاں شیطان کافر ہوئے) لوگوں کو جادو سکھاتے ہیں)۔

(السحر)۔ والسحر فی الاصل مصدر سحر یسحر بفتح الحین فیھما اذا ابدی ما یدق ویخفی وھو من المصادر الشاذة ویستعمل فیا لطف وخفی سببه (روح المعانی) ذکر اھل اللغة انه فی ا لاصل عبارة عما لطف وخفی سببه (کبیر) غرض یہ کہ سحر کے لغوی معنیٰ میں خفاء پایا جاتا ہے۔

صبح صادق کو سحر کہتے ہیں کہ وہ رات کی اندھیری میں کچھ چھپی ہوتی ہے۔ سینہ کو بھی اسی لیے سحر کہتے ہیں وہ بھی قمیص وغیرہ میں چھپا رہتا ہے۔ حضرت ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ (توفی رسول اللہ ﷺ بین سحری و نحری) حضور علیہ السلام کی وفات میرے گلے اور سینے کے درمیان ہوئی۔ جادو کو بھی سحر اسی لیے کہتے ہیں کہ اس کا سبب چھپا (پوشیدہ) ہوتا ہے۔

شریعت میں سحر کے معنی ہیں خفیہ طور پر کسی چیز کو خلاف اصل ظاہر کرنا۔ (نعیمی)

سحر اور اس کے احکام و اقسام

سحر ایسے الفاظ، اعمال کے جاننے کا نام ہے جن کے ذریعہ انسان شیاطین سے قریب ہو جاتا ہے اور شیاطین اس کے مسخر ہو جاتے ہیں اور اس کی منشاء کے مطابق کام کرتے ہیں اور وہ الفاظ آدمی کے بدن میں مرض، موت اور جنون کا اثر پیدا کر دیتے ہیں اور کان اور آنکھ میں خلاف واقع امر کا خیال جما دیتے ہیں جس سے آدمی ایک شئی کو دیکھتا ہے حالاں کہ وہ شی کچھ اور شئی ہوتی ہے۔ جیسا کہ فرعون کے جادوگروں نے رسیاں اور عصا ڈال کر موسیٰ علیہ السلام اور حاضرین کے خیال کو جما دیا تھا کہ چلتے پھرتے سانپ اور بچھو لگے۔ قال اللہ تعالیٰ (یُخَیَّلُ اِلیہ مِنْ سِحْرِ ہِمْ اَنَّھَا تسعیٰ) اور یہ جملہ تاثیرات حق تعالیٰ کی طرف سے آزمائش کے لیے پیدا کردہ تھیں۔ (مظہری)

صاحب تفسیر عزیزی، کبیر، نعیمی اور دیگر مفسرین نے اس مقام پر جادو کی اقسام اور ان کے دفعیہ کے طریقے اور بڑی عجیب و غریب حکایات و واقعات نقل فرمائے ہیں لیکن ہم صرف سحر کے احکام و مسائلِ شرعیہ بیان کرتے ہیں۔

جادو میں خیر و شر کے دونوں پہلو ہیں۔ کسی کو دھوکا اور فریب دینے کے لیے جادو کرنا بُرا ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا اِنَّ مِنَ الْبَیَانِ لَسِحْرٌ بعض وعظ جادو اثر ہوتے ہیں یعنی بعض واعظ اپنے زورِ بیان سے مشکل بات کو واضح بیان کر دیتے ہیں اور ان کے کلام جادو کی طرح دلوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

اس زمانے کے بعض روشن دماغ جنات اور جادو کا انکار کرتے ہیں مگر یہ ان کی گمراہی ہے۔ اہلِ سنت کے ہاں سحر اور جنات کا وجود برحق ہے۔ حضور علیہ السلام پر جادو کا اثر ہو گیا تھا۔ جس کے اتارنے کے لیے سورہ فلق اور سورہ الناس نازل ہوئیں۔ موسیٰ علیہ السلام کا فرعون کے ساحروں سے مقابلہ قرآن حکیم میں تفصیلاً مذکور ہے۔

مسئلہ: جادو اکثر کفر ہی ہوتا ہے۔ یا تو خود اس میں کفریہ الفاظ ہوتے ہیں یا کفریہ شرائط یا یہ کفار کا کام ہے اور کفر بھی۔

مسئلہ: بعض جادو خود کفر ہیں، اور بعض میں کفریہ شرطیں، بعض کفر تو نہیں مگر حرام ہیں، جادو خواہ کیسا ہی ہو اس کا سیکھنا کفر نہیں کیوں کہ فی نفسہٖ ہر علم اچھا ہے (کبیر) ہاں ناجائز عمل کے لیے سیکھنا کفر ہے۔ چنانچہ شیخ ابو المنصور ماتریدی فرماتے ہیں کہ جادو کے بارے میں کفر علی الاطلاق کا قول خطاء ہے۔ بلکہ اس کی حقیقت سے بحث کی جائے گی۔ اگر اس میں کوئی ایسی چیز ہے جس سے شرائطِ ایمان میں کسی شرط کا رد لازم آتا ہے تو وہ کفر ہے ورنہ نہیں۔ (مدارک)

مسئلہ: جس دعا یا منتر کے معنی کی خبر نہ ہو ان سے پرہیز چاہیے ممکن ہے کہ ان میں کفریہ الفاظ ہوں۔

مسئلہ: کفریہ الفاظ سے منتر کرنا، نجاست (جیسے خون یا پیشاب وغیرہ) سے آیات قرآنیہ کا لکھنا، یا الٹی آیات پڑھنا یا لکھنا حرام ہیں۔ اس سے بچنا سخت ضروری ہے۔ کتب فقہ میں ان کا بیان ہے۔

مسئلہ: الفاظ کفر سیکھنا، سکھانا کفر نہیں بلکہ اس کا ماننا یا اس پر عمل کرنا کفر ہے۔ ہاروت و ماروت جو کہ فرشتے تھے جادو سکھاتے تھے جو کہ کفر ہے۔ مگر کافر نہیں سیکھنے والا بھی اگر فقط علم حاصل کرنے کے لیے سیکھے تو وہ کافر نہیں۔ اسی لیے وہ پہلے فرمادیتے تھے کہ لَا تَكْفُرْ (تو اس کو سیکھ کر کفر نہ کرنا) یعنی اس پر اعتقاد یا عمل نہ کرنا۔

مسئلہ: جو جادو کفر ہے اس کا عامل مرتد ہے۔ اگر مرد ہے تو قتل کیا جائے گا۔ اگر عورت ہے تو قید کی جائے گی۔

مسئلہ: جو سحر کفر نہیں مگر اس سے کسی کو ہلاک کیا جائے۔ اس کا عامل قطاع الطریق (ڈاکو) کے حکم میں ہے۔ اس کو گرفتار کر کے قتل کیا جائے گا۔ اس میں مرد، عورت دونوں برابر ہیں۔ (مدارک) اگر گرفتاری سے پہلے توبہ کر کے نیک صالح بن جائے اور جادو چھوڑ دے تو اس کی توبہ قبول اور اس کو معاف کر دیا جائیگا۔ (مدارک)

مسئلہ: صحیح مذہب یہ ہے کہ جادوگر کی توبہ منظور ہے۔ (مدارک)

مسئلہ: کسی کو تکلیف پہنچانے یا حرام غرض سے جادو کرنا یا کفر ہے یا حرام، مگر جادو سے بچنے یا اس کو باطل کرنے کے لیے جادو کرنا جائز ہے بشرطیکہ اس میں کلمات کفریہ نہ ہوں۔

فائدہ:

جو شخص بذریعہ دعائے سیفی یا بذریعہ اسماءِ جلالیہ ایسے آدمی کو قتل کر ڈالے جس کا خون حلال نہیں یا اس کی نعمتِ بدنی یا مالی کو ضائع کر دے تو وہ اگر چہ کافر نہیں لیکن فاسق قطعاً ہے اور اس کا حکم راہزنوں جیسا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے (اَلَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ بِغَیْرِ مَا اکْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِیْنًا) جو لوگ مسلمان مرد اور مسلمان عورتوں کو بلا قصور ستاتے ہیں وہ بہتان اور صریح گناہ کا بوجھ اٹھاتے ہیں) اور رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں (اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِهٖ وَیَدِهٖ) کامل مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان سلامتی میں رہیں}(مظہری)

انبیاء علیہم السلام کی توہین، بے ادبی کرنے والے کافر و مرتد ہیں

نبی کی شان میں ذومعنی لفظ استعمال کرنا جائز نہیں

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَقُوۡلُوۡا رَاعِنَا وَقُوۡلُوا انۡظُرۡنَا وَاسۡمَعُوۡا ؕ وَلِلۡكٰفِرِیۡنَ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ

(سورۃ البقرۃ: ۱۰۴)

"اے ایمان والو! راعنا نہ کہو اور یوں عرض کرو کہ حضور ہم پر نظر رکھیں اور پہلے ہی سے بغور سنو اور کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے۔"

شان نزول:

حضور سید عالم ﷺ جب صحابہ کرام کو کچھ تعلیم فرماتے تو مسلمان درمیان کلام میں عرض کردیتے کہ (راعنا یارسول اللہ ﷺ) یعنی (کلام سننے میں یارسول اللہ ﷺ ہماری رعایت فرمایئے) یعنی یہ بات ہماری [illegible] میں نہ آئی دوبارہ [illegible] فرمادیجیے۔ لیکن یہودیوں کی زبان میں یہ لفظ بطور گالی [illegible] استعمال ہوتا تھا وہ لوگ اسے (رعونت) سے مشتق قرار دے کر [illegible] احمق کے استعمال کرتے تھے یا وہ کسی قدر کھینچ کر اور زبان کو پیچ دے کر بولتے جو کہ (راعینا) بن جاتا تھا یعنی ہمارا چرواہا۔ بہر حال [illegible]یوں نے یہ لفظ بانیت معنی قبیح استعمال کرنا شروع کیا اور آپس میں خوب ہنسی اڑاتے اور دل میں خوش ہوتے کہ بارگاہ عالی میں نہایت چالاکی سے گستاخی کا موقع مل گیا۔ ایک روز حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ اُن کی نیتِ فاسد کو پہچان گئے۔ [illegible]ن کر فرمایا اگر آئندہ میں [illegible] تم سے یہ کلمہ حضور علیہ السلام کے بارے میں استعمال کرتے سنا تو [illegible] اری گردن اڑادوں گا وہ [illegible] لے یہ کلمے تم بھی تو کہتے ہو [illegible] پر حق تعالیٰ نے یہ آیتِ کریمہ [illegible] فرمائی۔

(مظہری، کبیر وغیرہ)

تفسیر:

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (اے ایمان والو) قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے (اے ایمان والو) ان الفاظ سے اٹھاسی (88) جگہ خطاب فرمایا اور یہ پہلا موقع ہے۔ حضرت ابن عباس (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ تورات میں اللہ تعالیٰ نے (âیاایھا المساکین) کے الفاظ سے خطاب فرمایا جس کا انجام یہ ہوا کہ (ضربت علیھم الذلۃ والمسکنۃ) (ان پر ذلت اور خواری مسلط کردی گئی) اور ہمیں اللہ تعالیٰ نے (یاایھا الذین امنوا) کے معزز خطاب سے سرفراز فرمایا۔ تمام اسماءِ صفات میں سے لفظ مومن نہایت معزز و اشرف ہے تو جس طرح ہمیں دنیا میں اس اعلیٰ خطاب سے نوازا تو ہمیں اس کے وسیع فضل و کرم سے امید ہے کہ آخرت میں بھی ہمارے ساتھ بہترین معاملہ فرمائے گا۔ کیوں کہ کام کی ابتداء انتہا کو بتلاتی ہے۔ یا اس خطاب کی برکت سے اللہ تعالیٰ آخرت میں ہم کو عذابِ نار سے امن میں رکھے گا۔ (ملخصاً کبیر)

الذین امنوا کے خطاب میں حضور داخل نہیں ہوتے کیوں کہ یہ خطاب ایمان والوں سے ہے اور حضور عینِ ایمان ہیں۔ حضور کو خطاب (یا ایھا النبی، یا ایھا الرسول، یا ایھا المزمل) وغیرہ سے ہے کیوں کہ کبھی اس خطاب کے بعد ایسے احکام بیان ہوتے ہیں جو حضور انور ﷺ پر شامل نہیں ہو سکتے جیسے یہاں (راعنا) کہنے سے باز رہنے کا حکم۔ یا رب تعالیٰ کا فرمان کہ (یاایھا الذین امنو لاترفعوا اصوا اتکم فوق صوت النبی) (اے مومنو! نبی کی آواز پر آواز اونچی نہ کرو) وغیرہ۔ (نعیمی)

لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا: (راعنا نہ کہو) یہ لفظ مراعات کا امر ہے جس کے معنیٰ ہیں رعایت کرنا۔ صحابہ (رضی اللہ عنہم) عرض کرتے تھے کہ ہماری رعایت فرمائیے، لیکن جیسا کہ پہلے ذکر ہوا، یہودیوں کی زبان میں یہ گالی تھی کہ وہ زبان کھینچ کر بولتے تھے جو کہ راعینا بن جاتا تھا یعنی ہمارا راعی (چرواہا) یا وہ رعونت سے بناتے تھے جس کے معنیٰ ہیں حماقت تو راعنا کے معنیٰ احمق اور اس طرح وہ دل میں خوش

ہوتے تھے۔ نیز چوں کہ یہ باب مفاعلۃ سے ہے جس کے معنی ہوئے آپ ہماری رعایت کریں اور ہم آپ کی۔ اس میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ برابری کا شائبہ پایا جاتا تھا۔ حالاں کہ مخاطبت میں حضور علیہ السلام کی تعظیم ضروری ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے (لا تجعلوا دعاء الرسول بینکم کدعاء بعضکم بعضاً) یا اس میں استعلاء (خودسری) کا شائبہ تھا کہ یارسول اللہ ﷺ ہمارے کلام کی رعانت فرمائیے اور اس سے بے پرواہی اور غفلت نہ کیجیے اور کسی اور کے ساتھ مشغول نہ ہو جائیے۔ (تفسیر کبیر)

ان وجوہات کی بناء پر مسلمانوں کو اس سے روک دیا گیا کہ تم اگرچہ نیک نیتی سے کہتے ہو مگر چوں کہ اس لفظ کے دوسرے خلاف معنی بھی ہیں اور دوسروں کو اس سے بے ادبی کرنے کا موقع مل جاتا ہے لہٰذا ایسا ذومعنی لفظ استعمال نہ کرو۔

وَقُوْلُوا انْظُرْنَا: (اور یوں عرض کرو کہ حضور (ﷺ) ہم پر نظر رکھو) انظر اِنْتَظِرْ کے معنی میں ہے یعنی مہلت دیجیے تا کہ ہم آپ کا کلام سمجھ لیں۔ یا بوجہ فعل ہونے کے اِلٰی کے ساتھ متعدی ہے اور تقدیرِ عبارت اس طرح ہے۔ (انظر الینا) یعنی ہماری طرف نظرِ شفقت فرمائیے۔ (روح المعانی)

وَاسْمَعُوْا: (اور پہلے ہی بغور سنو) یعنی مجمع میں حضور ﷺ کا کلام اچھی طرح سن لیا کرو تا کہ دوسری مرتبہ پوچھنے کی ضرورت نہ رہے یا یہ حکم جو تم کو دیا جارہا ہے اس کو سنو اور اطاعت کرو۔ (روح المعانی، مظہری)

وَلِلْکٰفِرِیْنَ عَذَابٌ اَلِیْمٌ: (اور کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے) کافرین سے وہ یہود مراد ہیں جو نبی کریم ﷺ کو راعِنا کہہ کر ایذا پہنچاتے تھے۔

فوائد و مسائل

۱۔ اللہ تعالیٰ اور حضور علیہ السلام کی شان میں ایسے لفظ بولنا حرام ہیں جن میں بے ادبی کا ادنیٰ سا شائبہ بھی ہو اور جو ان کی شان کے خلاف ہوں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کو میاں اور حضور علیہ السلام کو بھائی اور محض بشر کہنا حرام ہے کہ میاں شوہر کو اور بھائی بشر وغیرہ برابر والے کو بھی بولا کرتے ہیں۔

۲۔ برائیوں کے ذریعوں کو بند کرنا ضروری ہے لہٰذا وہ جائز کام بھی ممنوع ہے جس سے محرمات کا دروازہ کھلے۔ رب نے مشرکین کے بتوں کو گالیاں دینے سے منع فرمایا کیوں کہ اس سے مشرکین رب تعالیٰ کو گالیاں دیتے تھے۔ تصویر بنانا اور شوقیہ استعمال کرنا حرام کر دیا گیا کہ یہ بت پرستی کا ذریعہ بنتا ہے۔ قبر کے سامنے نماز ناجائز ہے کیوں کہ اس سے بت پرستی کا دروازہ کھلنے کا اندیشہ ہے۔ (ملخصا روح البیان) افسوس کہ دورِ حاضر کا دیوبندی فرقہ اس اصول کو سمجھ نہ سکا کہ انہوں نے تقویۃ الایمان اور براہین قاطعہ جیسی گندی کتابیں شائع کیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ غیر مسلم ہندوؤں نے رنگیلا رسول جیسی ملعون کتابیں چھاپیں اور اپنی اس گستاخی کے لیے آڑ تقویۃ الایمان کو بنایا۔ (نعیمی) ایسے ہی فرقۂ دیوبندیہ کے بانی کی کتاب تحذیر الناس کو مرزا قادیانی نے آڑ بنا کر نبوت کا دعویٰ کر دیا۔ نانوتوی صاحب نے خاتم النبیین کے معنی میں ایسی تحریف کی کہ قادیانیوں کو اس سے نہایت تقویت ملی۔

۳۔ للکافرین سے اشارۃً معلوم ہوا کہ حضور علیہ السلام کی شان میں بے ادبی کا لفظ بولنا کفر ہے اگرچہ اس قصد (ارادہ) سے نہ ہو لہٰذا حضور علیہ السلام کی شانِ اقدس میں بے ادبی کرنے والے دیوبندی مرتد ہیں اگرچہ وہ کہیں کہ ہماری یہ نیت نہ تھی۔ گستاخی میں عرف کا لحاظ ہے نہ کہ نیت کا، نیک نیتی سے گالی دینے والا بھی مجرم ہے۔

نسخ کا بیان

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَۃٍ اَوْ نُنْسِھَا نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْھَآ اَوْ مِثْلِھَا ؕ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (سورۃ البقرۃ:۱۰۶)

''جب کوئی آیت ہم منسوخ فرمائیں یا بھلادیں تو اس سے بہتر یا اس جیسی لے آئیں گے۔ کیا تجھے خبر نہیں کہ اللہ سب کچھ کرسکتا ہے۔''

شان نزول:

مشرکین اور یہود مسلمانوں سے کہتے تھے کہ کیا تم تعجب نہیں کرتے کہ محمد (ﷺ) صحابہ کو آج ایک کام کا حکم دیتے ہیں اور کل اس سے منع کر کے دوسرا حکم دیتے ہیں۔ دیکھو پہلے زانی کے لیے فرمایا (فآذوھما) (کہ انہیں زبانی ایذادو) پھر اس کے خلاف حکم دیا کہ انہیں گھروں میں تادم مرگ قید رکھو، پھر اس کو بھی بدلا اور کہا کہ انہیں سو کوڑے مارو وغیرہ جس سے معلوم ہوتا ہے یہ خود ان کا کام ہے کبھی بے خبری میں کچھ کہہ دیتے ہیں، پھر نادم ہو کر اس کو بدلتے ہیں۔ (معاذ اللہ) (روح البیان، کبیر وغیرہ)

تفسیر:

مَانَنْسَخْ: میں ما شرطیہ ہے جس کا معنیٰ ہے جو کچھ (روح البیان) ننسخ نسخ سے بنا۔ اس کے اصلی معنیٰ ایک چیز کو زائل کر کے دوسری کو اس کی جگہ پر لانا...... کبھی صرف زائل کرنے کے معنیٰ میں آتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے (فینسخ اللّٰہ ما یلقی الشیطٰن) جو وسوسہ شیطان ڈالتا ہے، اسے زائل (باطل) کر دیتا ہے) بعض نے کہا یہ (نسخت الکتاب) کے محاورہ سے ماخوذ

ہے جس کے معنیٰ (کتاب کو نقل کرنے کے ہیں)۔ اسی لیے کتاب کی نقل کو نسخ اور ناقل کو ناسخ اور کتاب کو نسخہ کہتے ہیں۔ زمانہ کی تبدیلی اور روحوں کے بدلنے کو تناسخ کہا جاتا ہے۔ (تناسخیہ اس فرقہ کو کہتے ہیں جو شریعت کے ثابت کردہ حشر ونشر کا انکار کرے اور مرنے کے بعد ارواح کے اسی دنیا میں مختلف اجسام میں منتقل ہونے کا اعتقاد رکھے۔ (مفردات)

شریعت میں کسی حکم یا آیت کی انتہا بیان کرنے کو نسخ کہتے ہیں۔ (روح البیان، نعیمی) کیوں کہ اس سے وہ حکم زائل یا منتقل ہو جاتا ہے۔

مِنْ اٰيَةٍ: میں من بیانیہ ہے۔ نسخ اگر چہ آیت کا بھی ہوتا ہے، حدیث کا بھی، پوری شریعت اور دین کا بھی، بعض احکام کا بھی، مگر چوں کہ یہاں پر نسخ آیت پر ہی اعتراض تھا اس لیے آیت کا ذکر ہوا۔ ممکن ہے کہ آیت سے مراد نشانی ہو جس میں دین، حکم، شریعت سب داخل ہوں۔ (نعیمی)

اَوْ نُنْسِهَا: (یا بھلا دیں) ابو عمر اور ابن کثیر نے اس کو نون اول اور ہمزہ کے ختم سے پڑھا ہے اور نساء بمعنی تاخیر سے مشتق انا ہے۔ (مظہری)۔ قرآن مجید میں ہے (اِنَّمَا النَّسِیْٓءُ زِيَادَةٌ فِی الْكُفْرِ) اسی لیے ادھار کو نسیہ کہتے ہیں۔ یعنی جس آیت کے اتارنے میں ہم دیر لگاتے ہیں، لیکن قرأت مشہورہ ضمہ نون اور کسرہ سین سے ہے یہ انساء (بھلانا) یا نسیان (بھولنا) سے بنا۔ قرآن مجید میں ہے (فَنَسِیَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا) یا ترک کر دینے اور چھوڑنے کے معنیٰ میں ہے جیسے (فَالْيَوْمَ نَنْسٰهُمْ) یعنی (جس آیت کو ہم بھلا دیتے ہیں کہ اس کی تلاوت منسوخ فرما دیتے ہیں یا جس آیت کو ہم چھوڑ دیتے ہیں۔ یعنی قرآن میں باقی نہیں رکھتے)۔ چناں چہ ابو امامہ بن سہل بن حنیف سے مروی ہے کہ چند صحابہ ایک رات نماز کے لیے کھڑے ہوئے اور ایک سورۃ پڑھنی چاہی تو وہ سورت بالکل یاد نہ آئی صرف بسم اللہ یاد رہ گئی۔ صبح حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ واقعہ عرض کیا تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ اس سورت کی تلاوت اور حکم دونوں اٹھا لیے گئے ہیں۔ (مظہری)

نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا (تو اس سے بہتر یا اس جیسی لے آئیں گے) یعنی جب کوئی آیت

منسوخ یا محو کرتے ہیں تو نفع یا سہولتِ عمل یا کثرتِ ثواب میں اس سے بہتر آیت نازل فرماتے ہیں۔ یا نفع یا کثرتِ ثواب میں برابر۔ یہ مطلب نہیں کہ کوئی آیت کسی آیت سے بہتر ہے اور دوسری بہتر نہیں کیوں کہ تمام کلام اللہ ایک ہے اور سب بہتر۔

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (کیا تجھے خبر نہیں کہ اللہ تعالیٰ سب کچھ کر سکتا ہے) یہ استفہام انکاری ہے یعنی تم کو معلوم ہے کہ اللہ ہر شے پر قادر ہے۔ کائنات عالم کو ہر لحظہ اور ہر آن بدلتا ہے تو کیا وہ احکام بدلنے پر قادر نہیں؟ اور جو مالک الملک دنیوی حاکموں کو دیتا ہے، کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ مختلف احکام سے دین و دنیا کا نظام قائم رکھے؟

نسخ اور اس کے اقسام و احکام

نسخ کے لغوی معنیٰ اور اصطلاحی معنیٰ بیان ہو چکے ہیں۔ نسخ ہمارے لیے تبدیلی اور رب تعالیٰ کے علم میں انتہائے مدت کا بیان ہے نسخ عقلاً نقلاً ہر طرح جائز بلکہ واقع ہے۔ عقلاً تو اس لیے کہ احکام دو قسم کے ہیں تکوینی اور تشریعی۔ تکوینی احکام کا تعلق عالم کی پیدائش سے ہے اور تشریعی احکام قابل عمل قوانین کا نام ہے۔ تکوینی احکام میں ہمیشہ انقلاب رہتا ہے۔ نہ زمین و آسمان کو ایک حال پر قرار ہے نہ ان کی کسی چیز کو۔ جب تکوینی احکام دن رات بدل رہے ہیں تو تشریعی احکام بدلنے میں کیا مضائقہ؟ بلکہ حق یہ ہے کہ تشریعی احکام کو تکوینی احکام کے ساتھ خاص تعلق ہے جیسے مخلوق کی حالت ویسے اس کے احکام۔ بچے پر جسم ڈھانپنا فرض نہیں، غریب پر زکوۃ واجب نہیں، مال دار کو زکواۃ کھانا جائز نہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام کے زمانہ میں بہن سے نکاح حلال تھا اور اس کے بعد حرام۔ کیوں کہ تکوین بدلنے سے انسان کی حالت بدلتی رہی اگر اسکے احکام نہ بدلیں تو زندگی دشوار ہو جائے۔ بڑھاپے تک ماں کا دودھ پینا پڑے۔ لہٰذا تکوین کے اختلاف سے نسخ احکام بھی ثابت ہوتا ہے۔

نقلا اس واسطے کہ آدم علیہ السلام سے ہمارے حضور ﷺ تک صدہا پیغمبر تشریف لائے مگر ان کے احکام میں سخت اختلاف رہا۔ آدم علیہ السلام کے دین میں اپنی بہن سے نکاح حلال تھا جو کہ شریعت نوح علیہ السلام میں منسوخ ہوا۔ خود اسلام میں پہلے شراب حلال رہی بعد میں شراب حرام ہوئی۔ پہلے وفات کی عدت ایک سال تھی الی الحول غیر اخراج پھر چار ماہ دس دن ہوئی۔ پہلے بیت المقدس قبلہ تھا بعد میں کعبہ ہوا۔ پہلے حضور علیہ السلام سے عرض و معروض کرنے کے لیے خیرات کرنا واجب تھی پھر یہ حکم ﴿ءَ اَشْفَقْتُمْ ﴾ کی آیت سے منسوخ ہوا۔ (تفسیر نعیمی)

اقسام نسخ

نسخ کی تین قسمیں ہیں۔ (۱) نسخ حکم (۲) نسخ تلاوت (۳) نسخ حکم مع التلاوت۔

۱۔ منسوخ الحکم:

وہ آیات جو کہ قرآن مجید میں موجود ہیں۔ ان کی تلاوت بھی ہوتی ہے اور تلاوت پر ثواب بھی مگر ان کا حکم باقی نہیں۔ جیسے (متاعاً الی الحول غیر اخراج) سے عدت وفات ایک سال معلوم ہوتی ہے لیکن اب اس کا حکم منسوخ ہو چکا ہے اور تلاوت باقی ہے۔ اس پر یہ اعتراض نہیں ہوسکتا کہ جب حکم باقی نہیں رہا تو ایسی آیات کو قرآن میں کیوں باقی رکھا گیا؟ اس لیے کہ ساری آیات قرآنیہ صرف احکام کے لیے نازل نہیں ہوئیں جیسے متشابہات، قصص اور مثالیں وغیرہ صرف تلاوت کے لیے ہیں احکام کے لیے نہیں۔

۲۔ منسوخ التلاوت:

وہ آیات کہ ان کے الفاظ قرآن میں باقی نہ رہیں نماز وغیرہ میں ان کی تلاوت جائز نہ ہو مگر ان کے احکام باقی ہوں۔ جیسے کہ یہ (الشیخُ والشیخة اذا زنیا فارجمو هما نکالا من

اللّٰہ واللّٰہُ عزیز حکیم) شادی شدہ مرد اور شادی شدہ عورت جب زنا کر بیٹھیں تو ان کو سنگسار کر دو۔ اس آیت کی تلاوت منسوخ مگر حکم باقی۔

۳۔ منسوخ الحکم والتلاوت:

ایسی آیات جن کا حکم باقی نہ رہا نہ تلاوت، جیسے کہ ایک آیت تھی (عَشْرَ رضعات مَعْلُومات) (عورت کا دس گھونٹ دودھ پینے سے رضاعت ثابت ہوگی) مگر اب نہ آیت کی تلاوت رہی اور نہ ہی حکم۔ بلکہ ایک گھونٹ سے ہی رضاعت ثابت ہو جائے گی۔ (کبیر)

محل نسخ

قیاس اور اجماع نہ تو منسوخ ہو سکتے ہیں نہ ناسخ۔ صرف قرآنی آیات اور احادیث میں نسخ ہوتا ہے۔ ان میں بھی قابلِ نسخ صرف احکام کی آیات و احادیث ہیں۔ تاہم مستقل واجب اور مستقل حرام کی آیتیں منسوخ نہیں ہو سکتیں جیسے کہ ایمان کے وجوب اور کفر کی حرمت کی آیتیں۔ اسی طرح حق تعالیٰ کی ذات و صفات کی آیات و احادیث بھی قابلِ نسخ نہیں۔ نیز قرآن کی خبریں بھی منسوخ نہیں ہو سکتیں ہاں وہ قوانین جو خبری شکل میں بیان ہوئے ان میں نسخ جائز ہے۔ جیسے (**کُتِبَ علیکم الصیام**) یا (**وللّٰہِ علی الناس حج البیت**) یہ بظاہر خبریں ہیں مگر درحقیقت شرعی قانون، لہٰذا ان کا نسخ بھی جائز ہے۔ غرض یہ کہ جہاں خبر کے نسخ سے جھوٹ لازم آئے وہ نسخ منع ہوگا اس کے علاوہ جائز۔ یہ قاعدہ مدنظر رکھنا چاہیے۔ ہر خبر کا منسوخ التلاوت ہونا جائز ہے۔ (تفسیر عزیزی) نیز جن احکام کو قرآنِ حکیم نے دائمی فرمایا وہ بھی منسوخ نہیں ہو سکتے جیسے (**خٰلِدِیْنَ فیھا ابداً**)۔

۱۔ کبھی آسان حکم سے مشکل حکم کا نسخ ہوتا ہے جیسے کہ وفات کی ایک سال کی عدت چار ماہ دس دن سے منسوخ ہوئی۔

۲۔ مشکل حکم سے آسان حکم کا نسخ۔ مگر اس مشکل میں ثواب زیادہ جیسے ترک جہاد کا حکم جہاد کی آیات سے منسوخ ہوا اگر چہ جہاد ہے تو مشکل مگر اس کا ثواب بہت زیادہ ہے۔

۳۔ مساوی کا مساوی سے نسخ۔ یعنی منسوخ اور ناسخ آسانی اور ثواب میں برابر ہوں جیسے تبدیلی قبلہ کہ بیت المقدس کا قبلہ ہونا منسوخ ہوا اور کعبۃ اللہ قبلہ بنا مگر ان دونوں قبلوں میں ثواب اور آسانی برابر۔ اس تقسیم کی طرف اشارہ نات بخیرٍ منھا او مثلھا میں ہے۔ آیت کریمہ میں خیر سے مراد یا آسان یا زیادہ باعثِ ثواب ہے اور مثل سے مراد برابر (مساوی) ہے۔ (نعیمی، روح البیان)

نسخ کی صورتیں

نسخ کی چار صورتیں ہیں:

۱۔ آیت کا نسخ آیت سے:

جیسے (لکم دینکم ولی دین) کی آیت (قَاتِلُوْا فِیْ سبیل اللّٰہ) کی آیت سے منسوخ ہوئی۔ یا (متاعاً الی الحول) کی آیت (اربعۃ اشھر وعشراً) کی آیت سے منسوخ ہوئی۔

۲۔ آیت کا نسخ حدیث سے:

جیسے کہ غیر اللہ کو سجدہ تعظیمی کا جواز قرآن سے ثابت ہے (اسجدوا لاٰدم) وغیرہ مگر حدیث سے منسوخ یا جیسے والدین (ماں باپ) اور اہلِ قرابت کو وصیت کرنا قرآن سے ثابت (اَلْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ) مگر یہ حکم حدیث (لا وصیۃ للوارث) سے منسوخ ہوا یا (اُحِلَّ لَكُمْ مَا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ) کی آیت سے ثابت تھا کہ ماں بہن اور دیگر چند محرمات کے علاوہ تمام عورتیں حلال ہیں۔ مگر یہ آیت اس حدیث سے منسوخ ہے (لَاتُنْكَحُ الْمَرْاۃُ علیٰ

عمتها ولا علیٰ خالتها) جس سے معلوم ہوا کہ پھپی، بھتیجی اور خالہ، بھانجی کو نکاح میں جمع نہیں کر سکتے۔

اعتراض: حدیث شریف میں ہے کہ (کَلَامِیْ لَا یَنْسَخُ کلام اللہ) (میرا کلام خدا کے کلام کو منسوخ نہیں کر سکتا)۔ تم کہتے ہو کہ حدیث سے قرآن منسوخ ہو جاتا ہے۔

جواب: اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جو کلام میں اپنے اجتہاد و رائے سے فرمادوں وہ کلام الٰہی کو منسوخ نہیں کر سکتا۔ لیکن جو کلام رب کے الہام سے ہو وہ یقیناً منسوخ کر سکے گا۔ کیوں کہ کلامِ رسول کا اللہ کی جانب سے ہونا ثابت ہے۔ خود ارشاد باری تعالیٰ ہے (وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی) (ملخصاً اتقان) یا یہ مطلب ہے کہ میرا کلام قرآن شریف کی تلاوت منسوخ نہیں کر سکتا یعنی آیت کا نسخ تلاوت صرف حدیث سے نہیں ہو سکتا اسی لیے یہاں کلام فرمایا گیا ہے۔ احکام اللہ نہ فرمایا گیا۔ کلام عبارت کو کہا جاتا ہے نہ کہ احکام کو۔ (نعیمی) لیکن یہ امر یاد رہے کہ خبر واحد سے قرآن پر زیادتی جائز نہیں ہے کیوں کہ ظنی قطعی کا معارض نہیں ہو سکتا۔ ناسخ جب حدیث ہو تو اس خبر کا مشہور و مستفیض ہونا ضروری ہے۔

۳۔ حدیث کا نسخ قرآن سے:

جیسے بیت المقدس کا قبلہ ہونا حدیث سے ثابت تھا لیکن وہ (فَوَلِّ وَجْھَکَ شطر المسجد الحرام) سے منسوخ ہوا۔

۴۔ حدیث کا نسخ حدیث سے:

رفع یدین کی حدیثیں دوسری احادیث سے منسوخ ہوئیں اور بعض نے منسوخ کی بجائے مرجوح کا قول کیا ہے۔ چناں چہ عینی شرح بخاری میں ہے کہ حضرت براء بن عازب نے کسی کو

نماز میں رفع یدین کرتے دیکھا تو فرمایا رفع یدین ابتدائے اسلام میں تھا، بعد میں ترک کر دیا گیا۔
حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا کہ (میں نے حضور ﷺ کو نماز پڑھتے دیکھا، سوائے تکبیر تحریمہ کے اور کسی وقت ہاتھ نہ اٹھائے)۔

نسخ کی حکمتیں:

نسخ کی چند وجہیں ہوتی ہیں۔

۱۔ پہلا حکم عارضی طور پر ضرورتاً جاری کیا گیا تھا بعد میں ختم کر دیا گیا۔ جیسے شریعت آدم علیہ السلام میں بہن سے نکاح جائز تھا کہ دوسری عورتیں نہ ملتی تھیں لیکن بعد میں شریعتِ نوح علیہ السلام میں یہ حکم منسوخ ہو گیا کہ ضرورت نہ رہی۔

۲۔ پہلے لوگ ایک حکم کے عادی ہو چکے تھے اس کا ایک دم چھوڑنا مشکل تھا لہٰذا آہستگی سے بند کیا گیا جیسے کہ اہل عرب شراب کے عادی تھے اس لیے پہلے شراب سے نفرت دلائی گئی، پھر آہستہ آہستہ بالکل حرام کر دی گئی۔

۳۔ کبھی ناسخ کی عظمت ظاہر کرنے کے لیے۔ جیسے اسلام سے دوسرے ادیان کا نسخ ہوا۔ اگر اول سے ہی دنیا میں اسلام آ جاتا تو اس کے قوانین کی برتری ظاہر نہ ہوتی۔ (نعیمی)

۴۔ بعض اوقات انسانوں کے حالات کے اختلاف سے بھی احکام بدل جاتے ہیں۔ طبیب اپنے مریض کے لیے اس کی حالت کے موافق دوائیں اور غذائیں تجویز کرتا ہے جوں مریض کی حالت بدلے گی طبیب کی تجویز بھی بدلے گی یہ طبیب کی جہالت نہیں بلکہ کمال کی دلیل ہے۔ (ملخصاً روح المعانی)

اعتراض: اسلام اور قرآن میں اب بھی نسخ جاری رہنا چاہیے کیوں کہ دنیا کے حالات اب بھی بدل رہے ہیں۔

جواب: ہر چیز اپنے کمال پر پہنچنے سے پہلے بدلتی رہتی ہے اور کمال پر پہنچ کر ٹھہر جاتی ہے۔ بیمار کی

دوائیں بدلتی رہتی ہیں مگر آخر میں کوئی پرمغز مقوی دوا تجویز کردی جاتی ہے کہ اسے ہمیشہ استعمال کیا کرے۔ بڑھاپے سے پہلے جسم انسانی میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے مگر بڑھاپے پر پہنچ کر تبدیلی بند ہو جاتی ہے کیوں کہ اب آدمی کمال پر پہنچ گیا۔ اس طرح ادیان میں تبدیلی ہوتی رہی اور مسائل میں نسخ کا سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ بشارت آگئی (الیوم اکملت لکم دینکم) اب کمال کے بعد نسخ اور تبدیلی کی ضرورت نہیں رہی۔

خیال رہے! قرآن و حدیث میں جس قدر نسخ ہونا تھا، حضورﷺ کی ظاہری زندگی پاک میں ہو گیا۔ اب حضورﷺ کی وفات شریف کے بعد کسی قسم کا نسخ ممکن نہیں کیوں کہ نہ اب وحی آسکتی ہے اور نہ ہی حدیث۔

تنبیہ:

آئمہ کا قول ہے کہ جب تک کوئی شخص قرآن کے ناسخ و منسوخ کی پوری معرفت حاصل نہ کر لے اس وقت تک اس کے لیے قرآن کی تفسیر لکھنا اور وعظ کرنا جائز نہیں۔ (اتقان) اس لیے حضرت سیدنا علی المرتضیٰ (رضی اللہ عنہ) نے مسجد کوفہ میں ایک واعظ کو وعظ کرنے سے منع کر دیا تھا کہ وہ قرآن کے ناسخ منسوخ سے بے علم تھا۔ (عزیزی، اتقان وغیرہ)

ناسخ و منسوخ آیات کی تفصیل کے لیے مقدمہ تفسیر رضوی مع الفوز الکبیر اور اتقان کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے۔

ناسخ ومنسوخ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

مَا نَنۡسَخۡ مِنۡ اٰیَۃٍ اَوۡ نُنۡسِہَا نَاۡتِ بِخَیۡرٍ مِّنۡہَاۤ اَوۡ مِثۡلِہَا ؕ
اَلَمۡ تَعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ (سورۃ البقرۃ:۱۰۶)

"جب کوئی آیت ہم منسوخ فرمائیں یا بھلادیں تو اس سے بہتر یا اس جیسی لے آئیں گے کیا تجھے خبر نہیں کہ اللہ سب کچھ کرسکتا ہے۔"

تفسیر:

مَا نَنۡسَخۡ یہ ماشرطیہ ہے جس کے معنیٰ ہیں کچھ، کوئی، نَنۡسَخۡ، نَسۡخ سے بنا ہے جسکے معنی زائل کرنا، نسخ الشمس الظل والظل الشمس والشیب الشباب دھوپ کا سائے کو اور سایہ کا دھوپ کو زائل کر کے ان کی جگہ لے لینا یا جوانی کے بعد بڑھاپے کا آنا کبھی محض اس سے ازالہ یا باطل کرنا کے معنیٰ مراد ہوتے ہیں۔

فینسخ اللہ مایلقی الشیطن: اللہ تعالیٰ شیطانی وسوسے کو دور کردیتا ہے یا باطل کردیتا ہے۔ بعض نے کہا کہ یہ نقل کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ جیسا کہ (کنا نستنسخ ما کنتم تعملون) ۔ہم تمہارے اعمال کو نامہ اعمال میں نقل فرماتے ہیں۔ اسی سے نسخت الکتاب کا محاورہ مستعمل ہے جس کے معنی کتاب کو نقل کرنے کے ہیں، لہٰذا نقل کتاب کو نسخ اور ناقل کو ناسخ اور کتاب کو نسخہ کہتے ہیں۔ کبھی صرف اثبات کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور کبھی اس سے معاً دونوں معنی مفہوم ہوتے ہیں لہٰذا نسخ الکتاب یعنی کتاب اللہ کے منسوخ ہونے سے ایک حکم کو زائل کر کے پھر اس کی بجائے دوسرا حکم نازل کرنا مراد ہوتا ہے۔ (مفردات امام راغب) زمانے کی تبدیلی اور روحوں کے ایک جسم سے نکل کر دوسرے جسم میں بدلنے کو تناسخ کہا جاتا ہے۔

مِنْ اٰیَةٍ: نسخ آیت کا بھی ہوتا ہے اور حدیث کا بھی پوری شریعت اور دین کا بھی اور بعض احکام کا بھی...... ممکن ہے آیت سے مراد نشانی ہو جس میں دین، حکم شریعت سب داخل ہوں۔ (نعیمی)

اَوْ نُنْسِهَا: ایک قرأت میں نَنْسَاُهَا ہے نون کے فتح اور همزہ سے یہ نَسَأٌ سے بنا جس کے معنیٰ دیر لگانا یا کسی چیز کو اس کے وقت سے موخر کرنا۔ اسی لیے ادھار کو نسیہ کہتے ہیں۔ اسی سے وہ نسئ ہے جس کا ایام جاہلیت میں رواج تھا۔ چناں چہ قرآن کریم میں ہے (انما النسئُ زیادةٌ فی الکفر) (زمانہ امن میں کسی مہینہ کو آگے پیچھے کر دینا کفر میں اضافہ کرتا ہے)۔ لیکن قرأت مشہورہ نُنْسِهَا ہے یہ نسیان سے بنا ہے جس کے معنیٰ بھول جانا ہیں۔ جیسے (فَنَسِیَ ولم نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا) (یعنی آدم بھول گئے اور ہم نے ان کا قصد نہ پایا)۔ یا جب لفظ نسیان کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس سے از راہِ اہانت انسان کو چھوڑ دینے اور احکامِ الٰہی کے ترک کرنے کی وجہ سے سزا دینے کے معنیٰ مراد ہوتے ہیں۔ (فَالْیَوْمَ نَنْسٰهُم کما نَسُوْا لِقَآءَ یَوْمِهِمْ هٰذا) (پس آج ہم ان کو چھوڑ دیں گے جیسا وہ ہمارے اس دن کے ملنے کو بھول گئے)۔ (مفردات)۔

یعنی جس آیت کے اتارنے میں ہم دیر لگاتے ہیں یا جس آیت کو ہم بھلا دیتے ہیں یعنی اس کی تلاوت منسوخ فرما دیتے ہیں یا جس آیت کو ہم چھوڑ دیتے ہیں یعنی قرآن میں باقی نہیں رکھتے۔

نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْهَآ: اس سے اچھی ہم لے آتے ہیں۔ (اس سے آسان تر یا ثواب میں زیادہ)۔

اَوْ مِثْلِهَا: یا اس منسوخ آیت کی مثل کہ یہ آیت ثواب اور آسانی اور مناسب حالت میں منسوخ کی طرح ہوتی ہے۔

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ: اَلَمْ تَعْلَمْ کا خطاب کفار سے بھی ہو سکتا ہے اور مسلمانوں سے بھی یعنی اے منکر کافر! یا اے قرآن پڑھنے والے مسلمان کیا تو نہیں جانتا (نعیمی) اور ممکن ہے کہ حضور علیہ السلام سے خطاب ہو اور استفہام انکاری ہو۔ یعنی بے شک آپ جانتے ہیں۔ (مظہری) کہ اللہ تعالیٰ ہر چاہے پر قادر ہے کہ کائنات عالم کو ہر لحظہ اور ہر آن بدلتا ہے تو کیا وہ احکام بدلنے پر قادر نہیں؟

شانِ نزول:

آیتِ کریمہ کی لفظی تشریحات کے بعد مسئلہ نسخ کو سمجھنے کے لیے اس آیت کے شانِ نزول کا علم ہونا چاہیے تاکہ فہمِ مراد میں آسانی ہو۔ اس آیت میں یہود اور دیگر کفار کے ایک خاص شبہ کا جواب دیا جا رہا ہے جو کہ وہ مسلمانوں کے دلوں میں ڈالنے کی کوشش کرتے تھے۔ کفار مشرکین تو کہا کرتے تھے کہ محمد (ﷺ) کی طرف نہیں دیکھتے کہ وہ اپنے ساتھیوں کو ایک کام کا حکم دیتا ہے پھر انہیں اس سے منع کر کے اس کے برعکس دوسرے کام کا حکم دیتا ہے۔ (اسباب النزول) کبھی تو زانیہ عورتوں کو فقط ایذا رسانی کا حکم دیا (فَاٰذُوهُما) اور کبھی تا دمِ مرگ گھروں میں قید کرنے کا (حَتّٰی یَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ) اور کبھی کوڑے مارنے کا (فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُما مِائَةَ جَلْدَةٍ) کفار کا یہ گمان تھا کہ ایسا کرنا ندامت کی دلیل ہے اور یہ خود ان کا اپنا کلام ہے کہ کبھی بے خبری میں کچھ کہہ دیتے ہیں پھر بعد میں نادم ہو کر بدل ڈالتے ہیں اور اگر خدا کا کلام ہے تو بھی معاذ اللہ اس سے خدا تعالیٰ کی بے وقوفی کا اظہار ہوتا ہے۔ یہودی کہتے تھے اگر پہلی کتابیں بھی خدا کی طرف سے آئیں تھیں اور یہ قرآن بھی خدا کی طرف سے ہے تو ان کے بعض احکام کی جگہ اس میں دوسرے احکام کیوں دیئے گئے ہیں؟ ایک ہی خدا کی طرف سے مختلف اوقات میں مختلف احکام کیسے ہو سکتے ہیں؟ یہ ساری باتیں وہ تحقیق کی خاطر نہیں بلکہ مسلمانوں کو قرآن کے من جانب اللہ ہونے میں شک ڈالنے کے لیے کہتے تھے۔ ان کے جواب میں رب تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر ہم مصالحِ مخلوق اور مقتضائے وقت کو مدنظر رکھتے ہوئے کسی آیت کو منسوخ کرتے ہیں یا تمہارے دلوں سے بھلا دیتے ہیں تو اس سے بہتر چیز اس کی جگہ لاتے ہیں یا کم از کم وہ اپنے مقام میں اتنی ہی مفید اور مناسب ہوتی ہے جتنی کہ پہلی۔ میں مالک ہوں، میرے اختیارات غیر محدود ہیں، اپنے جس حکم کو چاہوں منسوخ کر دوں اور جس چیز کو چاہوں محو کر دوں۔ اسی مضمون کو اللہ تعالیٰ نے سورہ نحل میں ان الفاظ میں بیان فرمایا۔

وَاِذَا بَدَّلْنَا اٰیَةً مَّکَانَ اٰیَةٍ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا یُنَزِّلُ قَالُوْٓا اِنَّمَا اَنْتَ مُفْتَرٍ ؕ بَلْ اَکْثَرُهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ (۱۶=۱۰۱)

(اور جب ہم ایک آیت کی جگہ دوسری آیت بدلیں اور اللہ خوب جانتا ہے جو اتارتا ہے۔ کافر کہیں تم دل سے بنا لاتے ہو بلکہ ان میں اکثر کو علم نہیں)

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَةٍ اَوْ نُنْسِهَا :اور اس آیت میں فرق صرف یہ کہ اس میں لفظ تبدیل آیا ہے اور پہلی میں نسخ انسا۔ اس دوسری آیت میں (وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا یُنَزِّلُ اور بَلْ اَکْثَرُهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ) کہہ کر اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ کفار نسخ کے اسرار ورموز سے بے بہرہ ہیں اور پہلی آیت میں (اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْر) کہہ کر اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

نسخ اور اس کے احکام

نسخ کے لغوی معنی تفسیر میں بیان ہو چکے۔ شریعت میں کسی حکم یا آیت کی انتہا بیان کرنے کو نسخ کہتے ہیں۔ (احمدی، مظہری، روح البیان، نعیمی وغیرہ) کیوں کہ اس سے وہ حکم زائل یا منتقل ہو جاتا ہے۔

مسائل شرع میں ناسخ ومنسوخ ایک اہم مسئلہ ہے۔ حتّٰی کہ جو اس مسئلہ سے بخوبی واقف نہ ہو اسے حق نہیں پہنچتا کہ واعظ بن کر وہ لوگوں کے سامنے وعظ وتقریر کرے، چناں چہ امام جلال الدین سیوطی نے تفسیر اتقان میں اور علامہ ابن جوزی نے اپنے رسالہ (المصفی بأکف اهل الرسوخ من علم الناسخ والمنسوخ) میں نقل فرمایا کہ

اِنَّ علیًا رضی اللّٰہ عنہ مَرَّ بقاصٍ فقال ! اَتَعرِفُ الناسخ و المنسوخ ؟ قال لا ! قَال ھَلَکتَ و اَھلَکتَ الخ

حضرت سیدنا علی المرتضٰی رضی اللہ عنہ ایک واعظ کے قریب سے گزرے تو آپ نے فرمایا کہ کیا تو ناسخ و منسوخ کو جانتا ہے؟ تو اس نے کہا نہیں! تو آپ نے فرمایا: تو خود بھی ہلاک ہوا اور لوگوں کو بھی ہلاک کیا۔

نسخ کی اقسام

نسخ کی تین قسمیں ہیں: (۱) نسخِ تلاوت (۲) نسخ حکم (۳) نسخ تلاوت و حکم

۱۔ نسخ تلاوت:

نسخ تلاوت یہ ہے کہ آیت کے الفاظ قرآن میں نہ رہیں اور نماز وغیرہ میں اس کی تلاوت جائز نہ ہو مگر اس کے احکام باقی ہوں۔ جیسا کہ آیت رجم (الشیخ و الشیخة اذا زنیا فارجموا ھما نکالاً من اللہ واللہ عزیز حکیم) (یعنی جب شادی شدہ مرد یا عورت بدکاری کے مرتکب ہوں تو ان کو سنگسار کرو)۔ یہ آیت تلاوۃً منسوخ ہے لیکن اس کا حکم باقی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ آیت ہم رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں تلاوت کیا کرتے تھے لیکن اب اس کی تلاوت منسوخ ہے۔ اگر مجھے اس بات کا اندیشہ نہ ہوتا کہ لوگ کہیں گے کہ عمر قرآن میں اپنی طرف سے زیادتی کر رہا ہے تو میں خود اپنے ہاتھ سے قرآن پاک میں اسے لکھ دیتا۔ (تفسیرات احمدیہ)

۲۔ نسخ حکم:

نسخ حکم یہ ہے کہ آیت قرآن میں موجود ہے اور اس کی تلاوت بھی ہوتی ہو، مگر اس کا حکم باقی نہ ہو جیسے (متاعاً الی الحول غیر اخراج) عدت وفات ایک سال معلوم ہوئی مگر اب یہ حکم منسوخ ہو چکا، مگر آیت کی تلاوت باقی ہے۔ ایسے ہی سورۃ کافرون کی آیات۔

فائدہ:

منسوخ الحکم آیتوں کی تلاوت ہوگی اس کی تلاوت پر ثواب ملے گا کیوں کہ آیات قرآنیہ صرف احکام کے لیے نہیں اتریں جیسے متشابہات، قصص، مثالیں وغیرہ صرف تلاوت کے لیے ہیں ، احکام کے لیے نہیں۔

۳۔ نسخ تلاوت وحکم:

نسخ تلاوت وحکم یہ ہے کہ نہ تو آیت کا حکم باقی رہے نہ اس کی تلاوت۔ جیسا کہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنھا سے مروی ہے کہ ایک آیت تھی (عشر رضعات معلومات یحرمن) جس سے معلوم ہوتا تھا کہ عورت کا دودھ دس گھونٹ پینے سے رضاعت ثابت ہوگی۔ (روح البیان) مگر اب نہ اس آیت کی تلاوت رہی نہ اس کا حکم۔ بیہقی میں ابوامامہ سے روایت کی ایک انصاری صحابی شب کو تہجد کے لیے اٹھے اور سورہ فاتحہ کے بعد جو سورت ہمیشہ پڑھا کرتے تھے اس کو پڑھنا چاہا تو یہ بالکل یاد نہ آئی اور سوائے بسم اللہ کے اور کچھ نہ پڑھ سکے۔ دوسرے صحابہ (رضوان اللہ علیہم اجمعین) سے اس کا ذکر کیا تو ان حضرات نے فرمایا: ہمارا بھی یہی حال ہے۔ ہمارے حافظہ میں بھی اب وہ سورت نہیں رہی۔ سب نے حضور ﷺ کی خدمت میں واقعہ عرض کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: آج رات وہ سورت اٹھالی گئی اس کا حکم وتلاوت دونوں منسوخ ہو گئے۔

(خزائن العرفان)

فتنۂ قادیانیت کے متعلق اکابر صوفیہ و علماء کے حقیقت پر مبنی مکاشفات
اور
پیش گوئیاں
تحقیق و تدوین
خواجہ غلام دستگیر فاروقی
الحقائق فاؤنڈیشن

۴۔ حکم کے کسی وصف کا منسوخ ہونا:
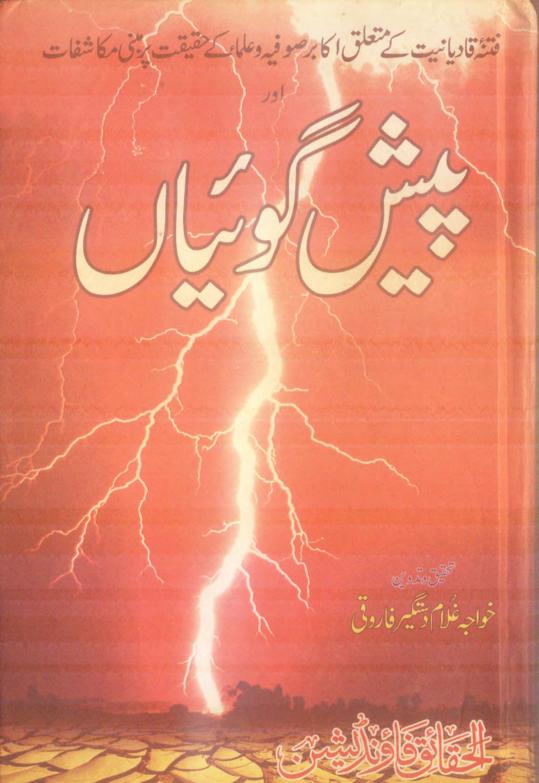
مثلاً کسی حکم کے مطلق میں کوئی قید لگادی جائے جیسا کہ نص میں مطلقاً پاؤں دھونے کا حکم ہے لیکن موزوں پر مسح کرنے والی حدیث مشہور کا اقتضاء یہ ہے کہ جب موزے پہنے ہوں تو پاؤں پر مسح کیا جائے یہ گویا مطلق کو مقید کردیا ہے اور نص میں زیادتی کی ہے۔ ہم تو اسے نسخ ہی کہتے ہیں۔ لیکن امام شافعی کے نزدیک یہ نسخ نہیں بلکہ بیان ہے۔

اگرچہ صاحب مدارک نے نسخ کی یہ چار قسمیں بیان کرنے کے بعد لفظ انساء وغیرہ کے معنی بیان کیے لیکن نسخ کی چند اقسام اور بھی ہیں جنہیں ہم یہاں ذکر کرتے ہیں۔

نسخ الی الاسھل:

آسان حکم سے مشکل حکم کا نسخ جیسے کہ ایک سال کی عدت وفات چار ماہ دس دن سے منسوخ ہوئی۔

نسخ الی الاشق:

مشکل حکم سے آسان حکم نسخ مگر اس مشکل میں ثواب زیادہ ہو جیسا کہ فخر الاسلام نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے روزے اور فدیے میں اختیار دیا تھا۔ پھر روزہ رمضان کو لازم کردیا۔ ایسے ہی پہلے مشرکین سے صلح اور درگزر کا حکم تھا لیکن جہاد کی آیات سے منسوخ ہوا۔ اگرچہ جہاد ہے تو مشکل مگر اس کا ثواب بہت ہے۔

نسخ الی المساوی:

ناسخ مثل (مساوی کا مساوی سے نسخ) یعنی منسوخ اور ناسخ آسانی اور ثواب میں برابر ہوں جیسا کہ امام زاہد کی تصریح کے مطابق قبلہ کا بیت المقدس سے تبدیل ہو کر کعبہ معظمہ کا مقرر ہونا۔ مگر ان دونوں قبلوں میں ثواب اور آسانی برابر ہے۔

محلِ نسخ:

قیاس اور اجماع نہ تو منسوخ ہو سکتے ہیں اور نہ ناسخ، صرف قرآنی آیات اور احادیث میں نسخ ہوتا ہے اور ان میں بھی یہ حکم جو فی نفسہٖ وجود و عدم کا محتمل ہو یعنی وہ حکم واجب لذاتہٖ ہو جیسے وجوبِ ایمان اور ممتنع لذاتہٖ بھی نہ ہو جیسے حرمتِ کفر۔ بالفاظ دیگر مستقل واجب اور مستقل حرام کی آیات منسوخ نہیں ہو سکتیں۔ یوں ہی حق تعالیٰ کی ذات و صفات کی آیات و احادیث بھی قابلِ نسخ نہیں۔ نیز ایسا حکم جس کے ساتھ توقیت یا تابید ملحق ہو اور وہ نصاً یا دلالۃً ثابت ہو، وہ بھی قابلِ نسخ نہیں۔ توقیت کی نظیر تو شرع میں نہیں ہے اور تابید جو نص سے ثابت ہے وہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے۔ (خَالِدِیْنَ فِیْهَا اَبَدًا) اور وہ تابید جو دلالۃً ثابت ہے وہ جملہ احکام و شرائع جن پر رسول اللہ ﷺ کا وصال ہوا۔ (احمدی)

قرآن و حدیث کی خبریں بھی منسوخ نہیں ہو سکتیں۔ ہاں وہ قوانین جو بشکل خبر یہاں بیان ہوئے وہ قابل نسخ ہیں۔ جیسے (کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ) (تم پر روزے فرض کیے گئے) یا (وَلِلّٰهِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ) (لوگوں پر بیت اللہ کا حج فرض ہے) یہ بظاہر اخبار ہیں مگر حقیقتاً شرعی قوانین، لہٰذا ان کا نسخ جائز ہے۔ اس لیے آیت (وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ یُحَاسِبْکُمْ بِهِ اللّٰهُ) (تم دل کی باتیں ظاہر کرو یا چھپاؤ رب سب کا حساب لے گا) بظاہر خبر ہے مگر حقیقت میں شرعی قانون اس لیے آیت کریمہ (لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا) سے منسوخ ہو گیا۔ نیز (وَمَآ اَدْرِیْ مَا یُفْعَلُ بِیْ وَلَا بِکُمْ) (اور میں نہیں جانتا میرے ساتھ کیا کیا جائے گا اور تمہارے ساتھ کیا) یہ آیت (لِیَغْفِرَ لَکَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِکَ) (تاکہ اللہ تمہارے سبب سے گناہ بخشے تمہارے اگلوں کے) سے منسوخ ہے (فی قولٍ) غرض یہ کہ جہاں خبر کے نسخ سے جھوٹ لازم آ جائے وہ نسخ منع ہو گا۔ اس کے علاوہ جائز۔ یہ قاعدہ خیال میں رکھنا چاہیے۔ ہر خبر کا منسوخ التلاوۃ ہو جانا جائز ہے۔ (تفسیر عزیزی، بحوالہ نعیمی)

شرائطِ نسخ

نسخ کے لیے شرط یہ ہے کہ ناسخ و منسوخ میں اتنا وقفہ ہو جس میں منسوخ کا اعتقاد دل میں پختہ ہو جائے، پھر ناسخ آئے اور یہ شرط نہیں کہ اتنا وقت ہو جس میں منسوخ کا فعل بھی ہو سکے بخلاف معتزلہ کے (ولا یشترط زمان التمکن من فعل المنسوخ بخلاف المعتزلہ) (احمدی)

نسخ کی صورتیں

نسخ کی چار صورتیں ہیں:

۱۔ آیت کا آیت سے نسخ جیسے (لَکُمْ دِیْنُکُمْ) الخ کی آیت (قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ) کی آیت سے منسوخ ہے یا (مَتَاعاً اِلَی الْحَوْلِ) کی آیت (اربَعَۃَ اَشْھُرٍ و عَشْرا) کی آیت سے۔

۲۔ حدیث کا حدیث سے نسخ جیسے مثلاً (مقتول کے اعضاء کاٹ دینا) کی حدیث کی ممانعت حدیث سے منسوخ ہے۔ یا جیسے امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھنے یا رفع یدین کی احادیث دوسری احادیث سے منسوخ ہیں۔ چناں چہ عینی شرح (عمدۃ القاری) بخاری میں حضرت براء ابن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ (کان النبی ﷺ اذا کبر لافتتاح الصلٰوۃ رَفَعَ یَدَیْہِ حَتّٰی یکون اِبْھَامَاہ قَرِیْباً من شحمتی اذنیہ ثم لا یعود) (حضور ﷺ جب تکبیر تحریمہ کہتے تو دونوں ہاتھ کانوں کی لو تک اٹھاتے پھر اس کے بعد ہاتھ نہ اٹھاتے) (صفحہ ۲۷۴/۵) نیز حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے حضور ﷺ کو نماز پڑھتے دیکھا حضور ﷺ نے سوائے تکبیر تحریمہ کے اور کسی وقت ہاتھ نہ

اٹھائے (صفحہ ۵/۲۷۴) یوں ہی پہلے حکم تھا کہ مقتدی فاتحہ پڑھے لیکن پھر فرمایا امام کے پیچھے نہ پڑھے۔

فائدہ ضروریہ

ہر عامل بالقرآن اور مجتہد و مستنبط احکام قرآن کے لیے ضروری ہے کہ نسخ کی بیان کردہ اقسام میں سے منسوخ الحکم دون التلاوت سے آگاہ ہوتا کہ بوقت تعارض ناسخ پر عمل کرئے اور منسوخ کو چھوڑ دے اور یہ اس بات پر موقوف ہے کہ اسے پتہ ہو کہ کونسی سورۃ اور کونسی آیت نزولاً مقدم ہے اور کونسی موخر، کون سی مدنی ہے کون سی مکی تا کہ وہ مقدم کو منسوخ اور موخر کو ناسخ قرار دے سکے۔ اسے یہ بھی علم ہونا چاہیے کہ کون سی سورت میں ناسخ و منسوخ ہر دو آیات موجود ہیں اور کون سی سورت میں صرف آیتِ منسوخ یا صرف آیتِ ناسخ پائی جاتی ہے اور کون سی سورت ہر دو سے خالی ہے۔ نیز وہ یہ بھی جانتا ہو کہ نسخ اور تخصیص میں کیا فرق ہے؟ کونسی آیت نسخ کا احتمال رکھتی ہے اور کونسی آیت نسخ کی محتمل نہیں۔

لہٰذا اب ہم اس مقام پر مختلف کتب کی تتبع و تلاش کے بعد ان آیات کا ذکر کرتے ہیں جو کہ منسوخ الحکم دون التلاوۃ ہیں۔

ا۔ وہ تمام آیات جن میں مقاتلین سے عفو و درگزر کا تذکرہ ہے جیسے (فَاِنَّمَا عَلَیْکَ الْبَلَاغ) اور (لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْن) یا جن میں جنگ میں پہل کرنے سے منع کیا گیا مثلاً (وَلَا تَعْتَدُوا اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْن) ایسی تمام آیات ان آیات سے منسوخ ہیں جن میں ہمیں جنگ کا حکم دیا گیا ہے جیسے (وَقَاتِلُوْا الْمُشْرِکِیْنَ کَآفَّةً کَمَا یُقَاتِلُوْنَکُمْ کَآفَّةً) اور (فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِکِیْنَ حَیْثُ وَجَدْتُمُوْهُمْ) وغیرہ (او کلاهما غیر مقصور فی القرآن)۔

امام زاہد کہتے ہیں کہ قریباً ستر (۷۰) آیات ایسی ہیں جو آیاتِ قتال سے منقول ہیں۔

صاحب الاتقان لکھتے ہیں کہ ایک سو چوبیس (۱۲۴) آیات اس آیت سے منسوخ ہوئیں۔

(فَإِذَا انْسَلَخَ الْأَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوْهُمْ)۔

پھر یہی آیت اشہر حرم میں حرمت قتال پر دلالت کرتی ہے اور اسی طرح (يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ) تا (قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ) اور (وَلَا الشَّهْرُ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَائِدَ) سے بھی اشہر حرم میں جنگ کی حرمت ثابت ہوتی ہے۔ ایسی تمام آیات آیاتِ مطلقہ سے منسوخ ہیں۔

نیز (حَيْثُ وَجَدْتُمُوْهُمْ) سے پتہ چلتا ہے کہ مسجد حرام میں ابتداءً اور انتہاءً ہر حال میں جنگ جائز ہے حالاں کہ حکم ایسا نہیں۔ اس تعمیم کو (وَلَا تُقَاتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقَاتِلُوْكُمْ فِيْهِ) خاص کر رہی ہے۔ جرح بر صاحب المدارک۔

(وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَافَّةً) کا مدلول یہ ہے کہ ذمی اور حربی ہر دو سے جنگ واجب ہے۔ ذمی سے جنگ کے حکم کو درج ذیل آیت منسوخ کر رہی ہے۔

(قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صَاغِرُوْنَ)

اور یہ قرآن میں صرف ایک آیت ہے۔ نیز یہ آیت معذورین پر جنگ لازم قرار دیتی ہے خصوصاً (اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا) کیوں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ خواہ تن درست ہو یا بیمار، جنگ کے لیے نکلو۔ تو یہ درج ذیل آیات سے منسوخ ہے۔

(وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَافَّةً)

اور (لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَاءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى) ...... الآية

اور (لَيْسَ عَلَى الْأَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْأَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ)

القصہ جنگ ابتداء مسجدِ حرام کے باہر مؤمنین غیر معذورین پر واجب ہے اور انتہاء مسجدِ حرام میں بھی، خواہ اشہرِ حرم میں ہو یا کسی اور وقت۔ صرف حربی سے جنگ کی جائے گی۔ ذمی جنگ سے مستثنٰی ہیں۔ جب آپ قتال کے بارے میں ناسخ و منسوخ سے مطلع ہو چکے ہیں تو یہ بھی جان لیں کہ ان کے علاوہ منسوخ آیات مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ سورہ بقرہ کی آیت (فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ)

ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس آیت کا مدلول یہ ہے کہ نماز میں کعبہ کی طرف متوجہ ہونا شرط نہیں۔ یہ آیت درج ذیل آیت سے منسوخ ہے۔

(فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ)

بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ (فاینما تولوا فثم وجه الله) کا حکم اس صورت میں ہے جب قبلہ معلوم نہ ہو۔ خواہ اندھیرے کی وجہ سے یا کسی اور وجہ سے۔ اسے مسئلہ تحری کہتے ہیں۔ یا یہ آیت سواری پر نوافل کے بارے میں ہے۔ سواری پر نفل نماز جائز ہے، سواری کا رخ جدھر بھی ہو ہوتا رہے۔ اس آیت میں چند اور توجیہات بھی ہیں جو آگے آئیں گی۔

۲ (يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِى الْقَتْلٰى ؕ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى) (۲=۱۷۸)

(اے ایمان والوں تم پر مقتولوں میں قصاص فرض ہے۔ آزاد کو آزاد کے بدلے میں مارا جائے گا، غلام کو غلام کے بدلے میں، عورت کو عورت کے بدلے میں۔)

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ اس آیت کی رو سے آزاد کو غلام کے بدلے مارنا جائز نہیں اور نہ ہی مرد کو عورت کے بدلے میں مارنا جائز ہے۔ یہ آیت سورۃ مائدہ کی درج ذیل آیت سے منسوخ ہے۔

(وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ)

(ہم نے توراۃ میں ان پر فرض کیا تھا کہ وہ نفس کے بدلے نفس کو قتل کریں) امام شافعیؒ کے نزدیک آزاد کو غلام کے بدلے میں نہیں مارا جاسکتا اور نہ ہی مرد کو عورت کے بدلے میں مارا جاسکتا ہے لہٰذا ان کے نزدیک یہ آیت منسوخ نہ ہوگی۔

۳.(كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۚ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ) (۲=۱۸۰) (جب تم میں سے کوئی ایک قریب المرگ ہو تو اگر وہ کچھ مال چھوڑے جارہا ہے تو اسے لازم ہے کہ والدین و اقرباء کے حق میں معروف وصیت کر جائے۔)

اکثر فقہاء کے نزدیک اس آیت کی رو سے والدین اور اقرباء کے حق میں وصیت فرض ہے۔ حالاں کہ انہیں سوائے میراث کے کچھ نہیں ملے گا۔ یہ آیت آیتِ میراث اور حدیثِ ذیل سے منسوخ ہے۔

(لَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ) نیز اجماع سے بھی یہ آیت منسوخ ہے۔

بعض مفسرین کے نزدیک یہ آیت منسوخ نہیں بلکہ مجمل ہے اور آیت میراث اس کا بیان ہے۔ رہا یہ قول کہ وصیت کا حکم اس صورت میں ہے جب والدین غیر مسلم ہوں، غلام ہوں یا کوئی اقرب کسی اور قریبی کی وجہ سے میراث سے محروم ہو۔ جیسا کہ امام زاہدؒ نے کہا ہے۔ تو یہ قول ضعیف ہے کیوں کہ اس صورت میں بھی وصیت زیادہ سے زیادہ جائز ہوگی فرض تو نہ ہوگی۔ ہاں اگر صاحب ہدایہ اور صاحب مدارک کے موافق یہ معنیٰ کیا جائے کہ (كُتِبَ عَلٰى سَبِيْلِ الْاِسْتِحْبَابِ) تو کچھ بات بن جاتی ہے۔

۴-(يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ) (۲=۱۸۳) (اے ایمان والوں تم پر بھی پہلے لوگوں کی طرح روزہ رکھنا فرض کیا گیا ہے تاکہ تم پرہیزگار ہو جاؤ)

صاحب اتقان لکھتے ہیں کہ آیت ہذا سے پتہ چلتا ہے کہ ہمارا روزہ اہل کتاب کے روزہ کے

مشابہ ہے۔ حالاں کہ ہمارا روزہ صبح سے مغرب تک اور ان کا روزہ عشاء سے مغرب تک ہے۔

سو یہ آیت (اُحِلَّ لَکُمْ لَیْلَۃَ الصِّیَامِ الرَّفَثُ) ...... الآیۃ سے منسوخ ہے۔

بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ ان کے روزے سے تشبیہ صرف وجوب میں ہے۔ (وَاِنَّ قَوْلَہٗ تعالیٰ احل لکم) الآیۃ ناسخ لما کان بالسنۃ لا لقولہ (کما کتب علی الذین من قبلکم) فھی باقیۃ.

۵- (وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ط) (اور جن کو روزہ کی طاقت ہے ان کے ذمہ ایک مسکین کا کھانا بدلا دینا ہے۔)

کچھ مفسرین کے نزدیک اس آیت کا مدلول یہ ہے کہ جو شخص روزہ کی طاقت رکھتا ہے اسے اختیار ہے چاہے روزہ رکھے چاہے ایک فقیر کو کھانا کھلا دے۔ حالاں کہ حکم اس طرح نہیں۔ لہذا یہ اگلی آیت (فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ) سے منسوخ ہے کیوں کہ اس آیت کا مدلول یہ ہے کہ جو بھی رمضان کا مہینہ پائے اس پر روزہ واجب ہے۔

کچھ مفسرین کے نزدیک یہ آیت منسوخ نہیں اور یہاں لا مقدر ہے (وَعَلَى الَّذِيْنَ لَا يُطِيْقُوْنَهٗ) یعنی جو لوگ روزہ کی طاقت نہیں رکھتے ان کے ذمہ ایک فقیر کا کھانا ہے۔ اس صورت میں اس سے شیخ فانی کا مسئلہ نکلتا ہے کہ وہ ہر روزے کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلائے۔

۶. (وَيَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ) (۲۱۹:۲) (وہ آپ سے سوال کرتے ہیں کہ کیا خرچ کریں؟ آپ کہہ دیجئے جو تمہاری ضرورت سے زائد ہے (خرچ کردو))

صاحب حسینی، صاحب مدارک اور امام زاہد کہتے ہیں کہ عفو وہ ہے جو ضرورت سے زائد ہو۔ لہذا یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ ضرورت سے زائد جتنا مال بھی ہو سب کا سب اللہ کی راہ میں دے دیا جائے۔ حالاں کہ فرض تو سال کے بعد مال کا چالیسواں حصہ ہے۔ پس یہ آیت آیت الزکوۃ سے منسوخ ہے۔

(وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ أَزْوَاجًا وَّصِيَّةً لِّأَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا إِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ إِخْرَاجٍ فَإِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِي مَا فَعَلْنَ فِي أَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ۔وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ) (۲ : ۲۴)

(تم میں سے جو فوت ہو جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں ان پر لازم ہے کہ بیویوں کے لیے وصیت کر جائیں کہ انہیں ایک سال تک مکان میں رہنے دیا جائے، نکالا نہ جائے۔ پس اگر وہ خود نکل جائیں تو تم پر اس بارے میں کوئی حرج نہیں۔ وہ اپنے بارے میں اپنے اختیار سے جو چاہیں کریں، بھلے طریقے سے اور اللہ تعالیٰ غالب ہے حکمت والا ہے۔)

مفسرین کہتے ہیں کہ آیتِ ہذا کا مصداق یہ ہے کہ خاوند پر واجب ہے کہ مرتے وقت منکوحہ کے لیے وصیت کر جائے۔ عورت ایک سال تک رہائشی سہولتیں حاصل کرے گی۔ نیز عورت ایک سال تک عدت گزارے گی۔ سو وصیت کا واجب ہونا تو آیتِ میراث سے منسوخ ہے۔ جس میں میت کی اولاد کی صورت میں عورت کو 1/8 اور میت کی اولاد نہ ہونے کی صورت میں عورت کو 1/4 حصہ ملے گا اور رہائش کا حق ہمارے نزدیک حدیث سے منسوخ ہے، لیکن امام شافعیؒ اسے رہائش کا حق دلاتے ہیں اور ایک سال عدت میں رہنے کا حکم اس سے پہلے کی آیت (وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ أَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَّعَشْرًا) سے منسوخ ہے۔

واضح رہے کہ قرآن پاک کی ہر ناسخ آیت جیسا منسوخ سے نزولاً مؤخر ہے اسی طرح تلاوت میں بھی مؤخر ہے۔ صاحب اتقان کے کہنے کے مطابق صرف دو مقام ایسے ہیں جہاں ناسخ تلاوت میں منسوخ سے مقدم ہے۔ ایک مقام تو یہی ہے اور دوسرا سورہ احزاب میں آئے گا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ایسے مواقع دو سے زائد ہیں جیسا کہ آپ پر آئندہ انکشاف ہوگا۔ پھر اس آیتِ ناسخہ کا مصداق یہ ہے کہ جس عورت کا خاوند مر جائے اس کی عدت چار ماہ دس دن ہے خواہ وہ حاملہ

ہو یا نہ ہو۔ لیکن حکم یوں نہیں بلکہ حاملہ کی عدت تو وضع حمل ہے۔

لہٰذا اس صورت میں جب کوئی عورت حاملہ ہو اور اس کا خاوند مر جائے تو یہ آیت منسوخ اور اس کی ناسخ سورہ طلاق کی یہ آیت ہوگی (وَاُولَاتُ الاحمال اجلهن اِنْ یَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ)

لیکن بعض فقہاء و مفسرین کے نزدیک یہ آیت ناسخہ (وَالَّذِیْنَ یُتَوَفَّوْنَ مِنْکُمْ وَیَذَرُوْنَ اَزْوَاجاً یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْراً) منسوخ نہیں ہوگی اور وہ حاملہ جس کا خاوند مر جائے وہ دو عدتوں میں سے زیادہ لمبی عدت گزارے گی۔ یعنی اگر وضع حمل چار ماہ دس روز سے قبل ہو تو چار ماہ دس روز عدت گزارے گی اور اگر وضع حمل کے لیے چار ماہ دس روز سے زیادہ عرصہ درکار ہے تو وضع حمل تک عدت گزارے گی۔

(وَلَا یَاْبَ کَاتِبٌ اَنْ یَّکْتُبَ کَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْیَکْتُبْ) (۲:۲۸۲) (اور کاتب لکھنے سے انکار نہ کرے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے لکھنا سکھایا ہے اسے چاہیے کہ لکھ دے)

(وَلَا یَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا) (۲:۲۸۲) (اور گواہوں کو جب بلایا جائے تو وہ انکار نہ کریں)

ان دو جملوں میں سے پہلے کا مدلول یہ ہے کہ بیع سلم میں کاتب پر واجب ہے کہ وہ وثیقۂ قرض لکھ دے۔ دوسرے فقرے کا مدلول یہ ہے کہ گواہ کے لیے گواہ بننا واجب ہے۔

بعض مفسرین کے نزدیک یہ دونوں جملے آئندہ جملے (وَلَا یُضَآرَّ کَاتِبٌ وَّلَا شَهِیْدٌ) سے منسوخ ہیں۔

بعض کے نزدیک منسوخ نہیں، لیکن دونوں جملوں میں صیغۂ امر استحباب کے لیے ہے اور کچھ کا خیال ہے کہ وجوب کے لیے ہے۔ یا دوسرے جملہ کا مطلب یہ ہے کہ گواہ بننا تو مستحب ہے، لیکن گواہ بننے کے بعد گواہی دینا واجب ہے اور پہلے کا مطلب یہ ہے کہ بوقت تنگی کاتب کو کتابت سے انکار نہ کرنا چاہیے بلکہ اس پر وثیقۂ دین لکھنا واجب ہے۔

(وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْ اَنْفُسِکُمْ اَوْ تُخْفُوْہُ یُحَاسِبْکُمْ بِہِ اللّٰہُ) (جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے خواہ تم اسے ظاہر کرو خواہ پوشیدہ رکھو، اللہ تعالیٰ اس پر تمہارا محاسبہ کرے گا)

اس قول کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے دل میں کسی گناہ کا تصور بھی آئے تو اس پر اس کا مؤاخذہ ہوگا۔ حالاں کہ حکم یوں نہیں۔ کیوں کہ یہ تکلیف مالا یطاق ہے۔ لہٰذا یہ قول اگلی آیت سے منسوخ ہے۔ وہ آیت ہے کہ۔ (لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا)

محققین کے نزدیک یہ آیت منسوخ نہیں کیوں کہ نسخ احکام میں ہوتا ہے، اخبار میں نہیں ہوتا۔ پس اسے نفس کے عمل وکسب پر محمول کیا جائے گا۔ محض تصور پر نہیں یا کفر کے تصور پر عمل کیا جائے گا، اور کفر کے علاوہ باقی گناہ اس سے مستثنیٰ ہیں۔

سورہ آل عمران کی منسوخ آیات

(یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُو اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ) (اے ایمان والوں اللہ سے اتنا ڈرتے رہو جتنا اس سے ڈرنا چاہیے)

آیت بتلاتی ہے کہ اللہ سے اس قدر ڈرنا واجب ہے جس قدر اس سے ڈرنے کا حق ہے۔ ایسا ہونا انسانی طاقت سے باہر ہے اور انسان کو اس کا مکلف بنانا محال ہے۔ لہٰذا یہ آیت سورۃ تغابن کی آیت (فَاتَّقُوْا اللّٰہَ مَا اسْتَطَعْتُمْ) سے منسوخ ہے۔ لیکن اکثر مفسرین کے خیال میں یہ آیت منسوخ نہیں بلکہ مجمل ہے اور سورۃ تغابن والی آیت اس کے اجمال کو بیان کرتی ہے۔

سورہ نساء کی منسوخ آیات

۱. (وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ) (جب تقسیم میراث کے وقت رشتہ دار، یتیم اور مسکین حاضر ہوں تو اس میں سے انہیں بھی کچھ دے دیا کرو)

کہا جاتا ہے کہ آیتِ ہذا کی رو سے تقسیم ترکہ کے وقت مذکورہ بالا لوگوں کو بھی کچھ نہ کچھ دینا واجب ہے۔ یہ آیت آیتِ میراث سے منسوخ ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ آیت منسوخ نہیں لیکن لوگ اس پر عمل کرنے میں سستی کر رہے ہیں جیسا کہ استیذان اور تقویٰ میں سستی کرتے ہیں اور بعض کے خیال میں یہاں امر استحباب کے لیے ہے۔

۲. (وَالّٰتِىْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِى الْبُيُوْتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا) (۴ : ۱۵) (اور جو کوئی تمہاری عورتوں میں سے بدکاری کریں تو ان پر چار گواہ اپنے مردوں میں سے لاؤ۔ اگر وہ گواہی دے دیں تو ان عورتوں کو گھروں میں قید کر دو۔ یہاں تک کہ وہ اسی حالت میں مر جائیں یا اللہ اُن کے لیے کوئی اور راہ پیدا کر دے)

(وَالَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ۚ فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا ۗ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا) (۴ : ۱۶) (اور جو مرد تم میں سے بدکاری کریں تو انہیں ایذاء دو۔ پھر اگر وہ تائب ہو جائیں اور اصلاح کا وعدہ کریں تو ان کا خیال چھوڑ دو۔ بے شک اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرنے والا رحم کرنے والا ہے)

یہ دونوں آیتیں حدِ زناء کے بارے میں ہیں۔ پہلی آیت سے پتہ چلتا ہے کہ زنا کی سزا تاحیات گھر میں قید رکھنا ہے۔ یا یہ کہ کوئی اور صورت جو اللہ پیدا کردے۔ نیز چار گواہوں کا ہونا ضروری ہے۔ دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حدِ زنا صرف ایذاء ہے۔ مفسرین لکھتے ہیں کہ ابتدائے اسلام میں دوسری آیت پر عمل تھا۔

پھر دوسری آیت کو پہلی آیت نے منسوخ کر دیا اور زنا کی حد گھر میں تاحیات قید ہوگئی۔ پھر اس کو سورہ نور کی آیت (اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ ......) الآیة سے منسوخ کر دیا اور گواہوں کے بارے میں چار والا حکم ہی باقی رہا۔

بعض کے نزدیک پہلی آیت صرف عورتوں کے حق میں ہے کہ فاعلہ ومفعولہ دونوں عورتیں ہوں تو ان کی سزا تاحیات گھر میں قید رکھنا ہے اور دوسری آیت ان دو مردوں کے حق میں ہے کہ عملِ قومِ لوط کے مرتکب ہوں۔ اس صورت میں یہ آیات منسوخ نہ ہوں گی۔

۳- (فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً) (۴:۲۴) (پھر ان عورتوں میں جن کو تم کام میں لاؤ تو انہیں ان کے مقررہ حق ادا کرو)

بعض کا کہنا ہے کہ یہ قول متعہ کے بارے میں ہے جو ابتدائے اسلام میں جائز تھا۔ پھر حدیث سے منسوخ ہوگیا اور بعض کے نزدیک یہ آیت منسوخ نہیں بلکہ (اِسْتَمْتَعْتُمْ) کا معنی (نَكَحْتُمْ) ہے اور (اُجُوْرَهُنَّ) کا معنی (مُهُوْرَهُنَّ) ہے۔

۴-(وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ) (۴:۳۳) (اور جن سے تمہارا معاہدہ ہوا ہے ان کو ان کا حصہ دیا کرو)

یہ آیت وراثتِ موالات کے سلسلہ میں ہے اور صرف امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک منسوخ ہے اور احناف کے نزدیک منسوخ نہیں کیوں کہ ولاء کا معاہدہ ہمارے نزدیک اب بھی ہوسکتا ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک نہیں ہوسکتا۔

سورۃ مائدہ کی منسوخ آیات

۱- (فَاِنْ جَآءُوْکَ فَاحْکُمْ بَیْنَھُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْھُمْ) (۴۲:۵) (پس اگر وہ تیرے پاس آئیں تو ان کے درمیان فیصلہ کریں یا ان سے منہ پھیر لیں)

مفسرین نے لکھا ہے کہ اس آیت کی رو سے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اختیار تھا کہ اگر ان کے پاس اہلِ کتاب کوئی محاکمہ لائیں تو وہ فیصلہ کریں یا انکار کر دیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ آیت منسوخ نہیں اپنے حال پر باقی ہے۔ لیکن کشاف میں ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے قول کے مطابق یہ آیت (وَاَنِ احْکُمْ بَیْنَھُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰہُ) سے منسوخ ہے اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک بھی یہی ہے۔

۲- (یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ لَا یَضُرُّکُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اھْتَدَیْتُمْ) (۱۰۵:۵) (اے ایمان والوں تم پر اپنی جان کا فکر لازم ہے، اگر تم سیدھی راہ پر ہوئے تو گمراہ تمہیں کوئی نقصان نہ دے گا)

صاحب اتقان کے کہنے کے مطابق اس قول کے ابتدائی حصے سے امر بالمعروف کا ترک معلوم ہوتا ہے۔ یہ حصہ (اِذَا اھْتَدَیْتُمْ) سے منسوخ ہے۔ کیوں کہ (اِھْتَدَیْتُمْ) کا معنی ہے کہ جب تم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کو انجام دیتے ہوئے سیدھی راہ پر رہے۔

۳- (یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَیْنِكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِیْنَ الْوَصِیَّةِ اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَیْرِكُمْ اِنْ اَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ فَاَصَابَتْكُمْ مُّصِیْبَةُ الْمَوْتِ ؕ تَحْبِسُوْنَهُمَا مِنْۢ بَعْدِ الصَّلٰوةِ فَیُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ اِنِ ارْتَبْتُمْ لَا نَشْتَرِیْ بِهٖ ثَمَنًا وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰی ۙ وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ ۙ اللّٰهِ اِنَّاۤ اِذًا لَّمِنَ الْاٰثِمِیْنَ ۱۰۶ فَاِنْ عُثِرَ عَلٰۤی اَنَّهُمَا اسْتَحَقَّاۤ اِثْمًا فَاٰخَرٰنِ یَقُوْمٰنِ مَقَامَهُمَا مِنَ الَّذِیْنَ اسْتَحَقَّ عَلَیْهِمُ الْاَوْلَیٰنِ فَیُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ لَشَهَادَتُنَاۤ اَحَقُّ مِنْ شَهَادَتِهِمَا وَمَا اعْتَدَیْنَاۤ ۖ اِنَّاۤ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِیْنَ) (۱۰۶-۱۰۷)

(اے ایمان والوں اگر تم میں سے کسی کو موت آئے تو وصیت کے وقت تم میں سے دو معتبر گواہ ہونے چاہئیں یا اگر موت کی مصیبت سفر میں آ جائے تو دو گواہ تمہارے غیروں سے ہونے چاہئیں۔ اگر تمہیں شبہ پڑے تو ان دونوں کو نماز کے بعد کھڑا کرو اور وہ کہیں کہ ہم اللہ کی قسم کھاتے ہیں کہ ہم قسم کے بدلے مال نہیں لیتے خواہ ہم سے کسی کو رشتہ داری ہی کیوں نہ ہو اور نہ ہم اللہ کی گواہی چھپاتے ہیں۔ اگر ہم ایسا کریں تو بیشک ہم گنہگار ہیں۔ پھر اگر معلوم ہو کہ ان دونوں نے حق دبایا ہے تو میت کے اقرباء میں سے جن کا حق دبا ہے دو اور کھڑے ہو کر اللہ کی قسم کھائیں کہ ہماری گواہی پہلے دو کی گواہی سے زیادہ تحقیق ہے اور ہم نے زیادتی نہیں کی۔ نہیں تو ہم بے شک ظالم ہیں)

ان ہر دو آیات کا مدلول یہ ہے کہ ذمی کی گواہی جائز ہے کیوں کہ اللہ تعالٰی فرماتا ہے (اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَیْرِكُمْ) یہ حکم سورۃ طلاق کی آیت سے منسوخ ہے۔ (وَاَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ) (اپنے میں سے دو معتبر آدمیوں کو گواہ بناؤ)

دوسرا حکم یہاں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ گواہ سے قسم لینا جائز ہے۔ یہ حکم حدیث سے منسوخ ہے اور اگر (مِنْ غَیْرِكُمْ) سے مراد (مِنْ اَجَانِبِكُمْ) لیا جائے اور شاہدان سے مراد دو وصی لیے جائیں تو پھر یہ آیات منسوخ نہ ہوں گی۔

سورۃ انعام کی منسوخ آیات

۱- (وَاِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ (۶:۶۸)) (اور اگر تجھے شیطان بھلادے تو یاد آ جانے کے بعد ظالموں کے پاس مت بیٹھو)

یعنی اگر شیطان تجھے یہ بات بھلادے کہ ظالموں کے پاس بیٹھنا منع ہے تو یہ حکم یاد آ جانے کے بعد ان کے پاس مت بیٹھو۔ اس آیت سے ثابت ہوا کہ کافروں کے پاس بیٹھنا حرام ہے۔ پھر یہ حکم اگلی آیت سے منسوخ ہو گیا۔ کما قال

(وَمَا عَلَى الَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِنْ شَيْءٍ وَّلٰكِنْ ذِكْرٰى لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ) (اور پرہیز گاروں کے ذمہ جھگڑنے والوں کے حساب میں سے کچھ نہیں۔ لیکن ان کے ذمہ نصیحت کرنا ہے تاکہ وہ پرہیز گار ہو جائیں)

زاہدی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نصیحت کو واجب کر دیا اور بیٹھنے میں رخصت دے دی۔ لیکن ہدایۃ سے مفہوم ہوتا ہے کہ یہ آیت منسوخ نہیں محکم ہے اور ظالمین سے مراد مبتدعین ہیں۔

۲- وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا ۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ) (اور جن کی یہ پرستش کرتے ہیں تم لوگ انہیں برا مت کہو ورنہ وہ بھی بے سمجھے بے ادبی سے اللہ تعالیٰ کو برا کہیں گے)

امام زاہدی نے کہا ہے کہ یہ آیت درج ذیل آیات سے منسوخ ہے۔

الف (اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ اَنْتُمْ لَهَا وَارِدُوْنَ) (تم بھی اور اللہ کے سوا جن کی تم پوجا کرتے ہو وہ بھی جہنم کا ایندھن ہیں تم سب اس میں جانے والے ہو)

ب(اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَاءٍ)　　　　(وہ مردے ہیں، زندہ نہیں ہیں)

ج (ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ)　　　　(طالب ومطلوب ہر دو کمزور ہیں)

لیکن حسینی اور کشاف میں اس کے برعکس لکھا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی (اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ) تو کفار کہنے لگے ہم بھی تمہارے معبود کی ہجو کریں گے جیسا کہ تم ہمارے معبودوں کو برا بھلا کہتے ہو اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ) الخ

۳- (كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ) (۶:۱۴۱)　　　　(کھاؤ اس کے پھل سے جب وہ پھل لائے اور کٹائی کے دن اس کا حق ادا کرو)

کہا جاتا ہے کہ اس آیت میں حق سے مراد وہ صدقہ ہے جو ابتدائے اسلام میں واجب تھا۔ پھر آیتِ زکوٰۃ سے منسوخ ہو گیا۔ لیکن زیادہ صحیح یہ ہے کہ اس سے مراد پھلوں اور کھیتی کی زکوٰۃ ہے جو کبھی دسواں حصہ اور کبھی بیسواں حصہ ہوتی ہے۔

۴-(قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ) (۶: ۱۴۵)　　　　(کہہ دیجئے کہ جو وحی مجھ تک پہنچی ہے، میں اس میں کوئی چیز کھانے والے پر کسی چیز کو حرام نہیں پاتا مگر یہ کہ وہ چیز مردار ہو یا بہتا ہوا خون یا سور کا گوشت ہو کیوں کہ وہ ناپاک ہے یا وہ کوئی ناجائز صدقہ وغیرہ ہو جس پر غیر اللہ کا نام پکارا گیا ہو)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت میں مذکور اشیاء کے علاوہ باقی کوئی چیز حرام نہیں۔ حالاں کہ اور بھی کئی اشیاء حرام ہیں۔ عضد الملۃ والدین کہتے ہیں کہ یہ آیت اس حدیث سے منسوخ ہے۔

(اِنَّهٗ عَلَیْهِ السَّلَامُ نَهٰی عَنْ اَکْلِ کُلِّ ذِیْ نَابٍ مِنَ السِّبَاعِ) (کہ نبی علیہ السلام نے درندوں میں سے ہر اس جانور کے کھانے سے منع کیا جس کے کچلیاں ہوتی ہیں)

لیکن یہ خبرِ واحد ہے پھر اس کے جواب میں کافی طویل بحث کی ہے جیسا کہ اپنے مقام پر آئے گی۔

سورۃ اعراف کی منسوخ آیت

اس باب میں سورۃ اعراف کی صرف ایک آیت ہے۔

(خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِیْنَ) (۷:۱۹۹) (ضرورت سے زائد مال لے لیا کر بھلے کام کا حکم دے اور جاہلوں سے منہ پھیر لے)

صاحبِ اتقان لکھتے ہیں کہ یہ بڑی عجیب آیت ہے۔ اس کا پہلا حصہ بھی منسوخ ہے اور آخری حصہ بھی منسوخ ہے۔ لیکن درمیان والا حصہ (وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ) محکم ہے منسوخ نہیں۔

آیت میں تین چیزیں ہیں۔ (۱) فاضل مال لینے کا حکم (۲) امر بالمعروف (۳) اعراض عن الجاہلین۔ پہلی اور آخری منسوخ اور درمیان والی اپنے حال پر ہے۔

سورۃ انفال کی منسوخ آیات

۱۔ (یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْاَنْفَالِ، قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ) (۸:۱) (تجھ سے مالِ غنیمت کے بارے میں پوچھتے ہیں تو کہہ دیجئے کہ مالِ غنیمت اللہ کا ہے اور اس کے رسول کا)

اگر انفال سے مراد غنائم اور لِلّٰہ والرسول کا لام تملیک کے لیے ہے تو یہ آیت اسی سورۃ کی اس آیت سے منسوخ ہے۔

(وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ) (۸:۴۰)

(اور جان لو کہ جو کچھ کسی چیز سے مالِ غنیمت تمہارے ہاتھ لگے تو اس کا پانچواں حصہ اللہ تعالیٰ، اس کے رسول، رسولِ کریم ﷺ کے رشتہ داروں، یتیموں، مساکین اور مسافروں کے لیے ہے۔)

اور اگر انفال سے مراد وہ زیادتی ہے جو امیر کسی مجاہد کو اس کے حصے سے زیادہ دے اور للّٰہ والرسول کا معنی یہ ہو کہ مالِ غنیمت کی تقسیم کا حق اللہ اور اس کے رسول کو ہے تو پھر یہ آیت منسوخ نہ ہوگی۔

۲-(وَاِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ یَغْلِبُوْا مِائَتَیْنِ ۚ وَاِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ مِّائَةٌ یَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا یَفْقَهُوْنَ) (۸:۶۵)

(اور اگر تم میں سے بیس شخص ثابت قدم رہنے والے ہوں تو دو سو پر غالب آ جائیں گے اور اگر تم میں سے ایک سو ہوں تو کفار کے ایک ہزار پر غالب آ جائیں گے کیوں کہ وہ ایک ناسمجھ قوم ہیں)

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر میدانِ جنگ میں مسلمانوں کے مقابلہ میں دس گنا کافر بھی ہوں تو بھاگنا حرام ہے اور ان سے قتال واجب ہے۔ یہ حکم اگلی آیت سے منسوخ ہے

(اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْکُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِیْکُمْ ضَعْفًا ۚ فَاِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ یَّغْلِبُوْا مِائَتَیْنِ ۚ وَاِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ اَلْفٌ یَّغْلِبُوْٓا اَلْفَیْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ) (۸:۶۶)

(اب اللہ تعالیٰ نے تم پر تخفیف کردی ہے اور جان لیا ہے کہ تم میں سستی آ گئی ہے۔ پس اگر تم میں سے سو شخص ثابت قدم ہوں تو دو سو پر غالب ہوں گے اور اگر تم میں سے ایک ہزار ہوں تو دو ہزار پر اللہ کے حکم سے غالب آ جائیں گے اور اللہ کی تائید ثابت قدم رہنے والوں کے ساتھ ہوتی ہے)

۳-(اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَهَاجَرُوۡا وَجَاهَدُوۡا بِاَمۡوَالِهِمۡ وَاَنۡفُسِهِمۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ وَالَّذِیۡنَ اٰوَوۡا وَّنَصَرُوۡۤا اُولٰٓئِکَ بَعۡضُهُمۡ اَوۡلِیَآءُ بَعۡضٍ ؕ وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَلَمۡ یُهَاجِرُوۡا مَا لَکُمۡ مِّنۡ وَّلَایَتِهِمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ حَتّٰی یُهَاجِرُوۡا ۚ)الایة ۸:۷۲

(بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنی جان و مال سے لڑے اور جن لوگوں نے مدد کی اور جگہ دی، یہ لوگ ایک دوسرے کے رفیق ہیں اور جو لوگ ایمان لائے اور گھر نہیں چھوڑا۔ تمہیں ان کی رفاقت سے کچھ کام نہیں یہاں تک کہ وہ ہجرت کر آئیں)

اس آیت سے ثابت ہوا کہ میراث ہجرت سے ہے قرابت سے نہیں۔ یہ حکم اللہ کے قول (وَاُولُوا الۡاَرۡحَامِ بَعۡضُهُمۡ اَوۡلٰی بِبَعۡضٍ) یعنی (قرابت والے ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں) سے منسوخ ہے۔

سورۃ نور کی منسوخ آیات

۱ (اَلزَّانِیۡ لَا یَنۡکِحُ اِلَّا زَانِیَۃً اَوۡ مُشۡرِکَۃً ۫ وَّالزَّانِیَۃُ لَا یَنۡکِحُهَاۤ اِلَّا زَانٍ اَوۡ مُشۡرِکٌ ۚ وَحُرِّمَ ذٰلِکَ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ) (۸:۷۶)

(بدکار مرد ہی بدکار عورت یا مشرکہ سے نکاح کرتا ہے اور بدکار عورت سے بدکار مرد یا مشرک ہی نکاح کرتا ہے اور مومنوں پر یہ حرام ہے)

اکثر مفسرین کے نزدیک اس آیت کی رو سے زانی کسی صالحہ سے نکاح نہیں کرسکتا اور نہ ہی کسی صالح کے نکاح میں کوئی زانیہ آسکتی ہے۔ حالاں کہ ان کے مابین نکاح جائز ہے۔ یہ آیت درج ذیل آیت سے منسوخ ہے۔

(وَانْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَائِكُمْ) (۳۲:۲۴) (اپنے رانڈوں۔ نیک غلاموں اور لونڈیوں کا نکاح کردو)

اس آیت میں اولیآء کو حکم ہے کہ وہ نیک غلاموں اور لونڈیوں کا نکاح کردیں۔ جن سے نکاح کریں وہ خواہ نیک ہوں یا بد اس کی کوئی قید نہیں اور بعض کے نزدیک یہ نفی و اخبار ہے اور منسوخ نہیں کیوں کہ نسخ نہی میں ہوتا ہے۔

۲۔ آیات استیذان اور وہ یہ ہیں۔

(يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰى اَهْلِهَا) (۳۲:۲۴) (اے ایمان والوں اپنے گھروں کے سوا کسی کے گھروں میں اس وقت تک داخل نہ ہوا کرو جب تک اجازت طلب نہ کرلو اور گھر والوں کو سلام نہ کرلو)

(يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِيَسْتَاْذِنْكُمُ الَّذِيْنَ مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ وَالَّذِيْنَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْكُمْ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَحِيْنَ تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِيْرَةِ وَمِنْ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ لَّكُمْ) (۳۲:۲۴) (اے ایمان والوں! تمہارے غلام لونڈی اور نابالغ افراد تین اوقات میں اجازت لے کر اندر آیا کریں۔ نماز فجر سے پہلے اور دوپہر کے وقت جب تم کپڑے اتار دیتے ہو اور نماز عشاء کے بعد یہ تین اوقات تمہارے بدن کھلنے کے ہیں)

ان دو آیات میں سے پہلی آیت سے ثابت ہوا کہ اجنبی آدمی دوسرے کے گھر میں بلا اجازت کبھی بھی داخل نہیں ہوسکتا اور دوسری اس پر دلالت کرتی ہے کہ غلام لونڈی اور نابالغ بچے مذکورہ بالا تین اوقات میں بغیر اجازت اندر نہیں آسکتے۔ بعض کے نزدیک یہ آیات منسوخ ہیں۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ ہمارے نزدیک بھی اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بھی یہ اپنے حال پر ہیں اور منسوخ نہیں لیکن لوگ ان پر عمل کرنے میں سستی کرنے لگے ہیں۔

سورۃ القصص کی منسوخ آیت

(عَلٰی اَنْ تَاْجُرَنِیْ ثَمٰنِیَ حِجَجٍ فَاِنْ اَتْمَمْتَ عَشْرًا فَمِنْ عِنْدِکَ) (۲۸: ۲۷) (اس شرط پر کہ تو میری نوکری کرے آٹھ برس اور اگر دس برس پورے کردے تو وہ تیری طرف سے ہے)

یہ شعیب علیہ السلام کی اپنی بیٹی کو موسیٰ علیہ السلام کے نکاح میں دے دینے کے سلسلے میں ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ عورت کا مہر اس کا باپ لے گا، وہ خود نہ لے گی۔ یہ حکم اس آیت سے منسوخ ہے۔

(وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً) (اور عورتوں کو ان کے مہر خوشی سے ادا کرو)

اس کا مطلب یہ ہے کہ عورتیں خود اپنا مہر لیں گی ان کے باپ نہیں لیں گے۔

سورۃ الاحزاب کی منسوخ آیت

(لَا یَحِلُّ لَکَ النِّسَآءُ مِنْ بَعْدُ) (۳۳: ۵۲) (تیرے لیے موجودہ ازواج کے علاوہ اب اور عورتیں حلال نہیں)

کتب تفاسیر میں مذکور ہے کہ اس آیت کے نزول کے وقت جو نو (۹) ازواج مطہرات حضور ﷺ کے نکاح میں تھیں ان کے علاوہ دیگر عورتوں سے نکاح ممنوع ہو گیا۔ حالاں کہ حقیقت یہ نہیں کیوں کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی علیہ السلام کے لیے کسی بھی عورت سے نکاح حرام نہیں تھا یہاں تک کہ آپ انتقال فرما گئے۔ لہٰذا یہ آیت اپنے ماقبل والی آیت سے منسوخ ہے۔ ماقبل والی آیت یہ ہے۔

(یٰاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَحْلَلْنَا لَکَ اَزْوَاجَکَ الّٰتِیْٓ اٰتَیْتَ اُجُوْرَهُنَّ) (۳۳: ۵۰) (اے نبی ہم نے تیرے لیے تیری وہ بیویاں حلال کردیں جن کے مہر تو دے چکا ہے...... الخ اور

(تُرْجِیْ مَنْ تَشَآءُ مِنْهُنَّ وَتُؤْوِیْ اِلَیْکَ مَنْ تَشَآءُ) (۳۳:۵۱) (تجھے اختیار ہے کہ) پیچھے رکھے ان عورتوں میں سے جسے اور جگہ دے اپنے پاس جسے چاہے......) الخ

یہ بھی ان مقامات میں سے ایک مقام ہے جہاں ناسخ تلاوۃً منسوخ سے مقدم ہے لیکن نزولاً مؤخر ہے۔

سورۃ الاحقاف کی منسوخ آیت

(قُلْ مَا کُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَآ اَدْرِیْ مَایُفْعَلُ بِیْ وَلَا بِکُمْ) (۴۲:۹) (آپ کہہ دیجئے میں نیا رسول نہیں اور نہ ہی مجھے یہ معلوم ہے کہ میرے ساتھ کیا ہونا ہے اور تمہارے ساتھ کیا ہونا ہے)

یعنی کون بخشا جائے گا اور کون عذاب میں مبتلا ہوگا۔ صاحب الاتقان لکھتے ہیں کہ تیرہ سال تک ایسا ہی رہا۔ پھر حدیبیہ والے سال یوم فتح کو یہ آیت نازل ہوئی (لِیَغْفِرَ لَکَ اللّٰهُ مَاتَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِکَ وَمَا تَاَخَّرَ) اس کے نزول سے {قُلْ مَا کُنْتُ بِدْعًا} والی آیت منسوخ ہوگئی۔ جیسا کہ کشاف میں بھی ایسا ہی مذکور ہے۔

سورۂ محمد علیہ السلام کی منسوخ آیت

(حَتّٰی اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ، فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً) (۴۷:۴) (یہاں تک کہ جب تم انہیں خوب قتل کر چکو تو پھر مضبوطی سے قید کر لو بعد میں خواہ احسان کر کے چھوڑ دو یا بدلہ لے کر)

حنفیہ کا کہنا ہے کہ ہمارے نزدیک احسان کر کے یا بدلہ لے کر چھوڑنا جائز نہیں بلکہ قتل کرنا ہے یا غلام بنانا ہے۔ لہٰذا یہ آیت سورۃ براءۃ والی آیت سے منسوخ ہے، لیکن امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ آیت منسوخ نہیں۔ امام کو اختیار ہے کہ خواہ احساناً

چھوڑ دے ، بدلہ لے کر چھوڑ دے ، قتل کردے ، غلام بنالے یا مسلمان قیدیوں کے عوض چھوڑ دے۔

سورۂ حجرات کی منسوخ آیت

(اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ) (۴۹: ۱۳) (اللہ کے نزدیک سب سے باعزت وہی ہے جو سب سے زیادہ پرہیز گار ہے)

کچھ مفسرین کے نزدیک یہ منسوخ ہے، لیکن اصح یہ ہے کہ منسوخ نہیں، لیکن لوگ اس پر عمل پیرا ہونے میں سستی کررہے ہیں۔

سورۂ مجادلہ کی منسوخ آیت

(یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَاجَیْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیْ نَجْوٰکُمْ صَدَقَۃً) (۵۸:۱۲) (اے ایمان والوں جب رسول اللہ ﷺ سے سرگوشی کرنا چاہو تو اپنی سرگوشی سے پہلے صدقہ دو)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے سرگوشی سے پہلے صدقہ واجب ہے یہ حکم اسی آیت کے اگلے حصہ سے منسوخ ہے۔ وھو ھذا:۔

(ذٰلِکَ خَیْرٌ لَّکُمْ وَاَطْھَرُ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ) (۵۸:۱۲) (یہ بات تمہارے لیے بہتر اور زیادہ پاکیزہ ہے۔ پھر اگر تم صدقہ کے لیے کچھ نہ پاؤ بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے)

سورۂ ممتحنہ کی منسوخ آیت

(اِذَا جَآءَ کُمُ الْمُؤْمِنٰتُ مُھٰجِرٰتٍ فَامْتَحِنُوْھُنَّ) (۶۰:۱۰) (جب تمہارے پاس مومن عورتیں ہجرت کر کے آئیں تو ان کا امتحان لو)

(وَاٰتُوْھُمْ مَّآ اَنْفَقُوْا) (اور انہیں دو جو انہوں نے خرچ کیا)

(وَاسْئَلُوْا مَا اَنْفَقْتُمْ) (ان سے طلب کرو جو تم نے خرچ کیا)

قولہ تعالیٰ (وَلْیَسْئَلُوْا مَآ اَنْفَقُوْا) (وہ طلب کریں جو انہوں نے خرچ کیا)

قولہ تعالیٰ (فَاٰتُوا الَّذِیْنَ ذَھَبَتْ اَزْوَاجُھُمْ مِّثْلَ مَآ اَنْفَقُوْا) (جن کی بیویاں چلی گئیں ہیں ان کو اتنا دو جتنا انہوں نے خرچ کیا)

یہ تمام اقوال سورہ ہذا کی آیت نمبر 10 اور 11 میں آتے ہیں۔ ان دونوں آیتوں کا مفہوم یہ ہے کہ جب کسی کافر کی بیوی ایمان لائے اور ہجرت کر کے مسلمانوں کے پاس آ جائے تو اس کے ایمان کا امتحان واجب ہے اور اس کے سابقہ کافر خاوند کو اتنا مال دیا جائے گا جتنا وہ اس ہجرت کرنے والی مومنہ بیوی کو مہر میں دے چکا ہے۔ اس کے برعکس اگر کوئی مسلمان عورت مرتد ہو کر کفار میں چلی جائے تو اس عورت کا خاوند بھی کافروں سے اپنا دیا ہوا مہر لے سکتا ہے اور اگر کافر نہ دیں تو مال غنیمت سے اتنا لے سکتا ہے۔ ان دو آیات کو آیتِ سیف، آیتِ غنیمت اور حدیث نے منسوخ کر دیا ہے اور آخری حکم جو دوسری آیت میں مذکور ہے استحبابی ہے۔

سورۂ مزمل کی منسوخ آیت

(قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا) (۷۳:۱) (رات کو قیام کیا کرو مگر کچھ تھوڑا حصہ (آرام کر لیا کرو))

اس آیت کا مدلول یہ ہے کہ رات کے اکثر حصہ میں قیام اور قرأت واجب ہے۔ اسی سورۃ

کی آخری آیت سے یہ کلمہ منسوخ ہے۔ آخری آیت میں ہے۔

(فَاقْرَءُ وا مَاتَیَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ) (آسانی سے جتنا قرآن پڑھ سکو پڑھا کرو)

یعنی رات کو اتنا قرآن اور قیام واجب ہے جو آسانی سے برداشت ہو سکے۔ پھر پانچ نمازوں کے فرض ہو جانے سے یہ بھی منسوخ ہو گیا۔

سورۃ الدھر کی منسوخ آیت

(وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا) (۸:۷۶) (اور اس کی محبت پر مسکین، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں)

کہا جاتا ہے کہ قیدی سے مراد مشرک قیدی ہے۔ لیکن اب مشرک پر احسان جائز نہیں، لہٰذا صاحب اتقان کی رائے کے مطابق یہ منسوخ ہے۔ کشاف میں ہے کہ تمام علماء کے نزدیک دارالاسلام میں کفار سے احسان جائز ہے، لیکن واجب صدقات ان پر صَرف نہیں کیے جائیں گے۔

یہ ناسخ اور منسوخ آیات ہیں جنہیں میں نے یہاں اجمالاً بیان کر دیا۔ ان شاء اللہ ان میں سے بہت سی اپنے مقامات پر مفصل بیان کروں گا اور اگر ان آیات کو شمار کیا جائے جن کے سبب جاہلیت، ابتدائے اسلام اور پہلی شریعتوں کی بہت سی اشیاء منسوخ ہوئی ہیں اور منسوخ احکام کا قرآن میں تذکرہ نہیں ہے۔ مثلاً قولہ تعالےٰ:۔

(وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا) (تمہارا گھروں میں پیچھے کی طرف سے آنا کوئی نیکی نہیں)

وغیرھا تو ناسخ آیات کی تعداد منسوخ آیات کی تعداد سے کہیں زیادہ ہو گی اور اکثر قرآن ناسخ ہی قرار پائے گا۔

کہ (اِذَا قُرِئَ فَاَنْصِتُوْا) اور فرمایا (مَنْ كَانَ لَهٗ اِمَامٌ فَقِرَاءَةُ الْاِمَامِ لَهٗ قِرَاءَةٌ)

(یعنی امام کی قرأت مقتدی کی قرأت ہے)۔ پہلی حدیث منسوخ اور یہ ناسخ ہے۔ (صفۃ الصلوٰۃ کو کسی دوسرے مقام پر تفصیل سے بیان کیا جائے گا۔ ان شاء اللہ)

۳۔ آیت کا نسخ حدیث سے:

جیسے غیر اللہ کو سجدۂ تعظیمی کا جواز ہے۔ قرآنی آیات (اُسْجُدُوْا لِاٰدَمَ) وغیرہ سے ثابت ہے مگر حدیث (لَوْ كُنْتُ اٰمِرُ اَحَدًا اَنْ يَّسْجُدَ لِاَحَدٍ لَاَمَرْتُ النِّسَآءَ اَنْ يَّسْجُدْنَ لِاَزْوَاجِهِنَّ) الخ سے منسوخ ہے سجدہ تعظیمی کی پوری بحث ہم پہلے کر چکے ہیں یا جیسے ماں باپ اور اہلِ قرابت کو وصیت کرنا قرآن سے ثابت۔ (اَلْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ) مگر یہ حکم (لَا وَصِيَّةَ لِلْوَارِثِ) سے منسوخ ہوا اور یہ حدیث مشہور ہے اور حدیثِ مشہور سے زیادتی علی النص جائز ہے۔

فائدہ:

بعض لوگ کہتے ہیں کہ نبیوں کو سجدہ کرنا قرآن کریم سے ثابت ہے اور ممانعت صرف ظنی احادیث سے تو قرآن کے مقابل میں خبرِ واحد غیر معتبر ہے۔ تو اسکا جواب یہ ہے کہ غیر اللہ کو سجدہ تعظیمی کی ممانعت کی احادیث متواتر المعنی ہیں اور اس کے جواز کی آیات قطعی الثبوت تو ہیں قطعی الدلالت نہیں۔ یعنی دوسری شریعتوں میں سجدۂ تعظیمی کا جواز بطور قطعی نہیں تھا۔ حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کسی شریعت کا حکم نہ تھا۔ اس وقت دنیا میں نہ شریعت آئی تھی نہ نبی کی نبوت اور حضرت یعقوب علیہ السلام کا یوسف علیہ السلام کو سجدہ کرنا حکم شرعی نہ تھا بلکہ خواب کی تعبیر پوری کرنے کے لیے تھا۔ جیسا کہ فرزند کا ذبح کر دینا دینِ ابراہیمی کا مسئلہ نہ تھا بلکہ خواب کی تعبیر پوری کرنے کو تھا۔

لطیفہ: اگر بالفرض مان لیا جائے کہ وہ سجدہ شریعت یعقوبی کا مسئلہ تھا تو چاہیے کہ آج پیر اپنے مریدوں کو سجدہ کریں نہ مرید پیر کو۔ کیوں کہ افضل نے مفضول کو سجدہ کیا تھا یعنی یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو۔ (مرآۃ)

۴۔ حدیث کا نسخ قرآن سے:

جیسے بیت المقدس کا قبلہ ہونا حدیث سے ثابت تھا اور وہ قرآن کی آیت (فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ) سے منسوخ ہے۔ ایسے ہی رمضان کی راتوں میں بیوی سے جماع کی حرمت حدیث سے ثابت تھی مگر وہ آیت (اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ) سے منسوخ ہوگی۔ اس قسم کی بہت سی احادیث ہیں جو آیات سے منسوخ ہوئیں۔ تحقیقِ مزید کے لیے کتاب الاعتبار مصنف علامہ حازمی شافعی دیکھیے۔

خیال رہے کہ قرآن یا حدیث میں جس قدر نسخ ہوتا تھا وہ حضور ﷺ کی زندگی پاک میں ہوگیا۔ اب حضور ﷺ کے وصال شریف کے بعد کسی قسم کا نسخ ممکن نہیں کیوں کہ نہ اب وحی آسکتی ہے اور نہ ہی حدیث لہٰذا اب سارا قرآن اور ساری احادیثِ صحیحہ محکم ہیں۔ چناں چہ یہی وجہ ہے کہ حضور ﷺ کے وصال شریف کے بعد منکرین زکوۃ کی سرکوبی کے وقت سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مخاطب کر کے فرمایا۔ (اَنَّهُ قَدِ انْقَطَعَ الْوَحْيُ وَتَمَّ الدِّيْنُ اَيَنْقَصُ وَاَنَا حَيٌّ) (یعنی وحی بند ہو چکی، دین مکمل ہو چکا میرے جیتے جی دین میں کوئی کمی بیشی نہیں ہو سکتی)۔

نسخ کی وجوہات

نسخ کی چند وجوہات تھیں۔

۱۔ پہلا حکم عارضی طور پر ضرورتاً جاری کیا گیا تھا۔ بعد میں ختم کر دیا گیا۔ جیسے شریعتِ آدم علیہ السلام میں نسلِ انسانی کی بقاء کے لیے بہن سے نکاح اس لیے جائز تھا کہ دوسری عورتیں ملتی نہ تھیں بعد کو یہ حکم منسوخ ہو گیا۔

۲۔ لوگ پہلے کسی حکم کے عادی ہو چکے تھے اور اس کا یکدم چھوڑنا مشکل تھا۔ لہٰذا تدریجاً اسے بند کیا گیا۔ جیسا کہ اہلِ عرب خمر (شراب) کے عادی ہو چکے تھے۔ اسلیے شراب سے نفرت دلائی گئی۔ پھر نشہ کی حالت میں نماز سے روکا گیا پھر بالکل حرام کردی گئی۔ (مسئلہ حرمتِ شراب پر ہمارا رسالہ (اشرف الاجوبۃ فی احکام الاشربۃ) ملاحظہ فرمائیں)۔

۳۔ کبھی نسخ سے محبوب کی عظمت کا اظہار ہوتا ہے جیسا کہ شبِ معراج اولاً پچاس نمازیں فرض ہوئیں۔ پھر پانچ پانچ، دس دس کی معافی ہو کر آخر کار پانچ رہ گئیں تا کہ موسیٰ علیہ السلام کو عظمتِ مصطفیٰ ﷺ کا پتہ لگ جائے کہ انہیں بارگاہِ الٰہی میں بہت باریابی ہے۔ امامِ اہل سنت امام احمد رضا رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔

قصرِ دنیٰ تک کس کی رسائی
جاتے یہ ہیں آتے یہ ہیں

فائدہ:

نیز اسی نسخ سے معلوم ہوا کہ محبوبانِ خدا وفات کے بعد بھی مدد فرماتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے شبِ معراج پچاس نمازیں کم کرا کر پانچ کرادیں حالاں کہ اس وقت موسیٰ علیہ السلام کو وفات پائے تین ہزار برس ہو گئے تھے۔ اسی طرح حضور علیہ السلام بھی بعدِ وصال ہم گناہ گاروں کی مدد کرسکتے ہیں۔ (والتفصیل فی محلہ)

۴۔ کبھی نسخ سے ناسخ کی عظمت معلوم ہوتی ہے جیسے کہ اسلام سے دوسرے ادیان کا نسخ ہونا اگر اول ہی سے اسلام دنیا میں آجاتا تو اس کے قوانین کی برتری دیگر ادیان پر ظاہر نہ ہوتی غرض یہ کہ نسخ میں بہت سی حکمتیں اور مصلحتیں ہیں۔

اعتراضات وجوابات

مسئلہ:

نسخ پر یہود و نصاریٰ دیگر کفار اور بعض نام نہاد مسلمان اعتراضات کرتے ہیں۔ جن میں سے بعض تو علمی اعتراضات ہیں اور بعض محض جہالت کی پیداوار۔ چناں چہ کئی اعتراضات کے جواب صاحب تفسیرِ اتقان و صاحب تفسیرِ نعیمی وغیرہما نے نہایت عمدہ پیرائے میں دیئے ہیں۔ ہم تفسیرِ نعیمی اور دیگر کتب سے استفادہ کرتے ہوئے ان اعتراضات کو بمعہ جوابات نقل کرتے ہیں۔

اعتراض: اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں ارشاد فرماتا ہے (مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ) یعنی (ہمارے قول میں تبدیلی نہیں) اور نسخ میں تبدیلی ہوتی ہے لہٰذا نسخ ناجائز ہے۔

جواب: نسخ کو بعض لوگوں نے اپنی بے علمی کی وجہ سے تبدیلی سمجھا حالاں کہ حقیقت میں وہ تو ایک حکم کی انتہا کا بیان ہے نہ کہ تبدیلی جیسا کہ نسخ کا شرعی معنٰی میں بیان ہوا۔ مثلاً (متوفی عنها زوجها) کی عدتِ وفات کچھ روز کے لیے ایک سال تھی۔ جب وہ مدت گذر گئی حکم بھی ختم ہو گیا۔ لہٰذا یہ تبدیلی قول نہیں۔ نیز اعتراض میں پیش کردہ آیت میں تبدیلی قول سے مراد وعدہ خلافی ہے اسی لیے اس کے آخر میں (وَمَا أَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ) یعنی ہمارا وعدہ خلاف نہیں ہوتا) اور ہم بندوں پر ظلم نہیں کرتے اور نسخ میں خبریں اور وعدے نہیں بدلتے صرف احکام بدلتے ہیں۔ یوں ہی آیت کریمہ (لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمَاتِ اللهِ) کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کی آیات میں پہلی کتابوں کی طرح تحریفِ لفظی نہیں ہو سکتی کیوں کہ (إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ) نیز یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ کے حکمت کو تم نہ بدلو۔

اعتراض: نسخ متکلم کی جہالت یا اس کے عجز سے ہوتا ہے اگر اس کو معلوم ہوتا ہے یہ حکم ہمیشہ کے لیے مفید نہیں ہوگا تو وہ پہلے ہی سے کوئی حکمِ فیصل نازل کرتا۔ جو بعد میں بھیجا وہ پہلے ہی کیوں نہ بھیجا؟

جواب: جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ نسخ کی کئی وجوہات ہوتی ہیں۔ انسانوں کے احوال کے اختلاف سے احکام بھی بدل جاتے ہیں۔ مثلاً ماہر فنِ طبیب اپنے مریض کے لیے اس کی موجودہ حالت کے موافق دوائیں اور غذائیں تجویز کرتا ہے لیکن جوں جوں بیمار کی حالت بدلتی جاتی ہے طبیب کی تجویز کردہ دواؤں میں بھی تبدیلی ہوتی جاتی ہے۔ یہ تبدیلی اس کی جہالت نہیں بلکہ اس کے حکیم حاذق ہونے کی دلیل ہے۔ یونہی اس حکیمِ مطلق نے بعض احکام انسانوں کی مخصوص حالت کے مطابق کسی خاص وقت تک کے لیے نازل فرمائے بعد میں اس حالت کے بدلنے سے حکم بھی بدل دیا۔

اعتراض: تمہاری مندرجہ بالا تقریر جواب تو اس امر کی مقتضی ہے کہ اب بھی اسلام اور قرآن میں نسخ جاری رہے کیوں کہ دنیا کے حالات اب بھی بدل رہے ہیں؟

جواب: ہر چیز اپنے کمال پر پہنچنے سے پہلے تغیر پذیر ہوتی ہے اور کمال پر پہنچ کر ٹھہر جاتی ہے۔ بچہ پہلے ماں کا دودھ پھر کوئی نرم غذا چاول دلیہ وغیرہ استعمال کرتا ہے۔ پھر روٹی پر پہنچ کر ٹھہر جاتا ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں۔ یوں ہی جوانی سے پہلے جسمِ انسانی میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے مگر جوانی پر پہنچ کر تبدیلی بند ہو جاتی ہے کیوں کہ اب آدمی اپنے کمال پر پہنچ گیا۔ اس طرح ادیانِ سابقہ میں تبدیلی ہوتی رہی مسائل میں نسخ کا سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ بشارت آ گئی (اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ) اب کمال کے بعد نسخ اور تبدیلی کیسی؟ (نعیمی)

اعتراض: جب اسلام دینِ کامل ہے تو عیسیٰ علیہ السلام اس کے جزیہ وغیرہ کے احکام کیوں منسوخ فرمائیں گے؟ نیز حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت کے زمانہ میں قرآن کے بعض احکام کیوں منسوخ فرمائے؟ جیسا کہ قرآن نے زکوٰۃ کے مصرف آٹھ بیان فرمائے مگر انہوں نے (مؤلفة القلوب) کو اس سے ساقط کر کے صرف سات مصرف باقی رکھے۔

جواب: حضرت عیسیٰ علیہ السلام جزیہ وغیرہ ہرگز منسوخ نہ فرمائیں گے بلکہ خود حضور ﷺ نے اس کی حد بیان فرمادی کہ جزیہ وغیرہ کا حکم عیسیٰ السلام کی آمد تک ہے۔اس کے ناسخ حضور علیہ السلام ہی ہیں۔عیسیٰ علیہ السلام تو اسے جاری فرمائیں گے۔نیز حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی کوئی حکم منسوخ نہیں کیا۔بلکہ حکم کی علت اٹھ جانے کی وجہ سے حکم خود بخود اٹھ گیا۔ضعفِ اسلام کی وجہ سے مؤلفۃ القلوب زکوٰۃ کے مصرف تھے جب خلافت فاروقی میں اسلام قوی ہوگیا تو یہ ساقط ہوگئے۔جیسا کہ جب زید مال دار تھا تو اس پر زکوٰۃ فرض تھی جب غریب ہوگیا تو اس پر زکوٰۃ واجب نہ رہی۔حقیقت میں حکم زکوٰۃ منسوخ نہ ہوا بلکہ علت بدل جانے سے حکم بدل گیا اور یہ صحابہ (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کے اجماع سے ہوا اور اجماع ناسخ نہیں ہوتا۔مگر دال علی النسخ ہوسکتا ہے۔

اعتراض: اس مقام پر شوافع کی جانب سے احناف پر ایک مشہور اعتراض ہے کہ قرآن کی آیت کی ناسخ قرآن کی آیت ہی ہوسکتی ہے حدیث نہیں کیونکہ حدیث شریف ہے کہ (کَلَامِیْ لَا یَنْسَخُ کَلَامَ اللّٰہِ)(میرا کلام خدا کے کلام کو منسوخ نہیں کرسکتا) اور تم کہتے ہو کہ حدیث سے قرآن منسوخ ہو جاتا ہے ایسے ہی حدیث کی ناسخ حدیث ہی ہوسکتی ہے نہ کہ قرآن۔شوافع حضرات اپنے اصول کی دلیل مندرجہ بالا دلیلِ نقلی کے علاوہ دلیل عقلی بھی بیان کرتے ہیں کہ اگر ہم یہ کہیں کہ حدیث قرآن کی کسی آیت کی ناسخ ہوسکتی ہے تو منکرین اور مجادلین کہیں گے جب رسول خود اللہ تعالیٰ کی تکذیب کررہے ہیں تو ہم رسول کے کہنے سے خدا پر ایمان کیسے لائیں؟ اسی طرح اگر ہم یہ کہیں قرآن حدیث کا ناسخ ہوسکتا ہے تو معترضین کہیں گے جب اللہ تعالیٰ خود رسول کی تکذیب کررہا ہے تو ہم اس کے دعویٰ نبوت کو کیسے تسلیم کریں؟ یہ پیش نظر رہے کہ یہ کلام صرف حدیثِ متواتر اور حدیثِ مشہور میں ہے۔

جواب: جیسا کہ پہلے بار بار ذکر ہوا کہ نسخ فی الواقع کوئی تبدیلی نہیں بلکہ بیانِ محض ہے۔ لہٰذا جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول کے کسی حکم کی انتہا کو بیان کردے۔ یا رسول اللہ ﷺ کسی حکم کی انتہا کو بیان کردے۔ یا یہ مطلب ہے کہ میرا کلام قرآنِ مجید کی تلاوت کو منسوخ نہیں کرسکتا ہے۔ یعنی آیت کا نسخ تلاوت صرف حدیث سے نہیں ہوسکتا اس لیے کلامُ اللہ فرمایا، احکامُ اللہ نہ فرمایا۔ کلام نظم کو کہتے ہیں نہ کہ احکام کو۔ خیال رہے کہ احناف کے نزدیک کم از کم خبر متواتر المعنی یا خبرِ مشہور سے آیت کا نسخ جائز ہے نہ کہ اخبارِ احاد وغیرہ سے۔

سوال: قرآن میں نسخ واقع ہی نہیں؟

جواب: قرآنِ کریم کی بعض آیات یقیناً منسوخ ہیں جیسا کہ ہم نے بالتفصیل آیاتِ منسوخہ کے ماتحت لکھا ہے اور شاہ ولی اللہ صاحب نے بھی "الفوز الکبیر" میں اس کو تسلیم کیا ہے۔

مساجد کو ویران کرنا اور ان میں ذکر اللہ سے روکنا ظلم ہے

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَمَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنۡ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰہِ اَنۡ یُّذۡکَرَ فِیۡہَا اسۡمُہٗ وَسَعٰی فِیۡ خَرَابِہَا ؕ اُولٰٓئِکَ مَا کَانَ لَہُمۡ اَنۡ یَّدۡخُلُوۡہَاۤ اِلَّا خَآئِفِیۡنَ ۬ؕ لَہُمۡ فِی الدُّنۡیَا خِزۡیٌ وَّلَہُمۡ فِی الۡاٰخِرَۃِ عَذَابٌ عَظِیۡمٌ (سورۃ البقرۃ:۱۱۴)

"اور اُس سے بڑھ کر ظالم کون؟ جو اللہ کی مسجدوں کو روکے ان میں نام خدا لیے جانے سے اور ان کی ویرانی میں کوشش کرے۔ ان کو (حق) نہیں پہنچتا تھا کہ مسجدوں میں جائیں مگر ڈرتے ہوئے۔ ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور ان کے لیے آخرت میں بڑا عذاب" (کنز الایمان)

تفسیر:

شانِ نزول:

یہ آیت بیت المقدس کی بے حرمتی کے متعلق نازل ہوئی جس کا مختصر واقعہ یہ ہے کہ روم کے عیسائیوں نے بنی اسرائیل (یہود) پر حملہ کیا۔ ان کے مردان کارآزما کو قتل کیا۔ عورتوں بچوں کو قیدی بنالیا۔ توریت کو جلایا، بیت المقدس کو ویران کیا۔ اس میں نجاستیں ڈالیں، خنزیر ذبح کیے (معاذ اللہ)۔ (روح البیان۔ مظہری۔ اسباب النزول)

خلافتِ فاروقی تک بیت المقدس اسی حال میں رہا۔ پھر امیر المومنین سیدنا عمر فاروق (رضی اللہ عنہ) نے فتح کسریٰ کے بعد اس کو آباد کیا اور وہاں اذان و نمازیں شروع کروائیں۔ پھر بعد میں عیسائیوں نے فتح کر لیا اور تقریباً ایک سو پچیس برس ان کے قبضے میں رہا۔ یہاں تک سلطان

صلاح الدین ایوبی نے ۵۸۵ ھجری میں دوبارہ گھمسان کی جنگیں لڑ کر فتح کرلیا (یعنی) جو کہ تاریخ میں صلیبی جنگوں کے نام سے مشہور ہیں۔ یہاں تک کہ 1967ء میں عرب اسرائیل جنگ میں یہودیوں نے قبضہ کرلیا جو کہ تا حال مسلمانوں کی شامت اعمال کی وجہ سے انہیں کے قبضے میں ہے۔

ایک قول اس آیت کے شان نزول میں یہ بھی ہے کہ یہ مشرکین مکہ کے حق میں نازل ہوئی جنہوں نے ابتدائے اسلام میں حضور سید عالم ﷺ اور آپ ﷺ کے اصحاب کو کعبہ میں نماز پڑھنے سے روکا تھا۔ اور صلح حدیبیہ کے موقع پر بھی نماز اور حج سے منع کیا تھا (خزائن العرفان)

تفسیر:

(مَنْ) استفہامیہ مبتداء محلا مرفوع ہے اور (اَظْلَمُ) اس کی خبر ہے۔ (مَسَاجِدَ اللّٰهِ مَنَعَ) کا مفعول اول ہے اور (اَنْ يُذْكَرَ) اس کا مفعول ثانی ہے اور (سعیٰ) کا عطف (مَنَعَ) پر ہے اور (اُولٰئِكَ) مبتداء ہے اور (مَا كَانَ) اور مابعد اس کی خبر ہے۔ (اِلَّا خَائِفِيْنَ) استثناء اور (يَدْخُلُوا) کی ضمیر سے حال ہے۔ خیال رہے کہ یہاں (مَنْ) استفہام انکاری نفی کے لیے ہے یعنی اس سے بڑھ کر ظالم کوئی نہیں۔

اَظْلَمُ : ظلم سے بنا یعنی کسی کا حق مارنا۔ چوں کہ مسجد کا ویران کرنے والا اللہ رسول ﷺ کا حق مارتا ہے۔ مسلمانوں کا بھی اور خود اپنے نفس کا بھی۔ کیوں کہ اسے چاہیے تھا کہ خود مسجد میں حاضر ہو کر نمازیں پڑھتا کہ اس کا نفس عذاب دوزخ سے بچتا اس لیے رب نے اسے بڑا ظلم فرمایا۔

مِمَّنْ مَنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ : جو اللہ کی مسجدوں کو روکے۔ مساجد مسجد کی جمع منتہی الجموع ہے۔ خاص سجدہ گاہ کو مسجد بفتح الجیم اور پورے عبادت خانہ کو مسجد بکسر الجیم کہتے ہیں۔

اَنْ يُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ: (ان میں نام خدا لیے جانے سے) یہاں بجائے نماز کے ذکر فرمایا کیوں کہ لفظ ذکر نماز، درود شریف، تلاوت قرآن، مجلس وعظ و محفل مولد النبی ﷺ، نعت خوانی،

دینی تعلیم وغیرہ سب کو شامل ہے، لہٰذا جو شخص ان میں کسی چیز کو منع کرتا ہے وہ اس میں داخل ہے، خیال رہے کہ ذکر اللہ دو طرح کا ہے ایک بلا واسطہ اور ایک بالواسطہ۔ اللہ کے پیاروں کا ذکر بالواسطہ خدا ہی کا ذکر ہے۔

وَسعٰی فی خَرَابِھا : (اور ان کی ویرانی میں کوشش کرے) خراب خربٌ سے بنا ہے۔ جس کا معنی ویران ہونا ہے اور اس کا مقابل عمارۃٌ (آباد ہونا) ہے۔ (مفرودات) مساجد کو گرا دینا یا عبادت کرنے والوں یا نماز پڑھنے والوں کو روکنا اور مسجد میں داخل ہونے سے منع کرنا یہ سب تخریب مسجد ہے۔ (کبیر)

اُولٰئِکَ مَا کَانَ لَھُمْ اَنْ یَّدْخُلُوْ ھَا اِلَّا خَائِفِیْن : (ان کو نہ پہنچتا تھا کہ مسجدوں میں جائیں مگر ڈرتے ہوئے)

اُولٰئِکَ: کا مشارالیہ یا تو وہ روم کے عیسائی ہیں جنھوں نے بیت المقدس کی بے حرمتی کی یعنی ان اہلِ کتاب کو اپنے دین کے اعتبار سے وہاں مسجد میں جانا اور اسے ویران کرنا جائز نہ تھا۔ بلکہ چاہیے تھا کہ وہ اللہ سے خوف اور عاجزی کرتے ہوئے آتے کیوں کہ یہ ان کے بھی دینی مقامات تھے۔ یا آئندہ کی خبر دی جا رہی ہے کہ اے مسلمانوں! کچھ غم نہ کرو عنقریب وہ وقت آ رہا ہے جبکہ ان مشرکین کو مسجد حرام میں آنے کی بھی نہ اجازت ہوگی مگر ڈر چھپ کر۔ چناں چہ اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ پورا فرمایا کہ ۹ ہجری میں حضرت ابو بکر صدیق (رضی اللہ عنہ) نے حضور ﷺ کے حکم سے اعلان فرمایا کہ آئندہ کوئی مشرک اس مسجد میں داخل نہ ہو۔ (کبیر)

فاروقِ اعظم (رضی اللہ عنہ) اور عثمان ذوالنورین (رضی اللہ عنہ) کے زمانے میں ملکِ شام بھی عیسائیوں کے ہاتھوں نکل گیا۔ پھر بنی امیہ اور بنی عباس کے زمانے میں قسطنطنیہ اور روم وغیرہ بھی ان کے ہاتھوں سے جاتے رہے۔ (عزیزی)

یا یہ مطلب ہے کہ انہیں مناسب نہیں کہ کسی بری نیت سے مسجد میں آئیں تا کہ مساجد کو سیاسی اڈہ بنائیں۔ بلکہ رب تعالیٰ یا مسلمانوں سے ڈرتے ہوئے عاجزی وانکساری سے آئیں۔

لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ: (ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں بڑا عذاب) یعنی مساجد کو ویران کرنے کا وبال یہ پڑے گا کہ ان کے لیے دنیا میں ذلت ورسوائی ہوگی۔ چناں چہ اہلِ کتاب اور مشرکین کو چند طریقوں سے رسوائی ہوئی۔ جنگوں میں انھوں نے شکست پائی، جزیے ان پر قائم ہوئے، جزیرہ عرب سے نکالے گئے، اپنی زمینوں سے بے دخل کردئے گئے اور ان کے لیے آخرت میں بھی بڑا عذاب ہے۔

فوائد ومسائل

فائدہ نمبرا:

جو شخص مسجد کو ویران کرنے کی کوشش کرے وہ بہت بڑا ظالم ہے۔ ویران کرنا عام ہے چاہے زبان سے ہو یا غلط فتووں اور تحریروں سے یوں ہی مسجد کو گرا دینا یا اذان وجماعت سے روکنا نماز کے اوقات میں تالا لگا دینا۔ پہلی مسجد کے برابر دوسری مسجد محض ذاتی اغراض کی بناء پر تعمیر کرنا تاکہ پہلی مسجد کی رونق کم ہو جائے۔ وہاں کی زیب وزینت کو دور کرنا۔ اذان سن لینے کے بعد بلا عذرِ شرعی مسجد نہ آنا یا کسی مسلمان کو روکنا۔ یہ سب تخریبِ مسجد میں شامل ہے اور تخریبِ مسجد کے مرتکب کو بڑا ظالم اس لیے کہا گیا کہ

۱۔ بعض تو مالی ظلم کرتے ہیں، بعض جانی اور بعض عزت وآبرو کا۔ ان میں بڑا ظالم وہ ہے جو کسی کا گھر غصب کرے۔

ولهذا در مقام بیان شدّتِ ظلم همیں را یاد میکند و میگویند که فلانی خانه فلانی را متصرف شد واز خانه برآورد زیرا که در غصب خانه گویا غصب تمام متعلقات شخص متحقق می شود (عزیزی)

۲۔ غصب کے بھی چند مراتب ہیں کوئی تو چیز کا غاصب ہوتا ہے کوئی اس کے نفع کا مگر بدترین وہ

شخص ہے جو مالک کا ذکر ہی نہ ہونے دے۔

۳۔ بعض غاصب مغصوب پر اصلِ ملکیت کا دعویٰ کرتے ہیں بعض اس کے خریدنے کا مگر وہ غاصب بہت بڑا ظالم ہے جو اصل چیز کو ہی تباہ کردے اور مالک کا نام ہی نہ لینے دے۔ چناں چہ خانۂ خدا (مساجد) کو گرادینے والے یا ان میں اس خالقِ منعم کے نام کے ذکر سے روکنے والے بہت بڑے ظالم ہیں۔(ملخصا تفسیر عزیزی)

فائدہ نمبر۲:

جو شخص مسجد کو آباد کرے بہت بڑے ثواب کا مستحق ہے۔ آبادی کی بھی چند صورتیں ہیں۔ مسجد بنانا، اس میں چٹائیوں، روشنی، وضو کے لیے پانی وغیرہ کا انتظام کرنا اور کسی بھی صحیح العقیدہ صاحبِ علم وفضل امام وخطیب کا تقرر کرنا، نماز پنجگانہ کے لیے حاضر ہونا وغیرہ۔

مسئلہ: حدودِ شرعیہ کے اندر رہتے ہوئے مسجد کو مزین کرنا جائز ہے۔ حدیث شریف میں جو مسجد کی زینت کی ممانعت آئی ہے، اس سے یا تو فخریہ زینت یعنی محض دوسری مسجدوں کے مقابلہ کی غرض سے مراد ہے چناں چہ فرمایا (سَيَأْتِيْ عَلٰى اُمَّتِيْ زَمَانٌ يَتَبَاهُوْنَ فِي الْمَسَاجِدِ) الخ یا ناجائز زینت یعنی جان دار اشیاء کی تصویروں اور فوٹوؤں سے مسجد کو آراستہ کرنا مراد ہے۔ نہ کہ اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لیے مسجد کو سجانا منع ہے۔

فائدہ:

مساجد میں ہر طرح کا ذکر الٰہی جائز ہے۔ بلا واسطہ ذکر اللہ ہو خواہ بلند آواز سے یا آہستہ جیسے تسبیح وتہلیل وتقدیس، تلاوت قرآن ہو یا بالواسطہ ہو۔ حضور علیہ السلام کی نعت خوانی، درود وسلام یا مقبولانِ خدا کی منقبت وغیرہ۔ پھر یہ ذکر اللہ خواہ بلند آواز سے ہو یا آہستہ کیوں کہ آیت میں (اَنْ يُّذْكَرَ) مطلق ہے۔

ہاں جماعتِ اول کے وقت بلند آواز سے ذکر کرنا صرف نمازیوں کے نماز میں خلل کے اندیشہ سے منع ہے۔ جماعتِ اولیٰ کے بعد ہر طرح کا ذکر جائز ہے۔ صحابہ کرام (رضوان اللہ علیہم اجمعین) سے مسجد میں حضور علیہ السلام کی نعت خوانی ثابت ہے۔ خود حضور علیہ السلام نے ہر نماز کے بعد ذکر بالجہر فرمایا۔ چناں چہ مشکوٰۃ باب ذکر الصلوٰۃ میں حدیث ہے کہ۔ (کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اِذَا سَلَّمَ مِنْ صَلٰوتِہٖ یَقُوْلُ بِصَوْتِہِ الْاَعْلٰی لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ) (مشکوٰۃ)

مسئلہ: جس چیز سے مسجد کی جماعت میں کمی ہو وہ منع ہے کیوں کہ در پردہ یہ بھی ویرانی کی کوشش ہے۔ لہٰذا وہاں بد مذہب یا نرا جاہل امام رکھنا، مسجد کے منتظم کا سخت مزاج ہونا، بد بودار چیزیں لے کر جانا، کچا لہسن یا پیاز کھا کر یا حقہ پی کر، بد بودار زخم لے کر وہاں جانا ناجائز کیوں کہ مسلمانوں کو ایذا ہوگی وہ مسجد میں آنا چھوڑ دیں گے۔

مسئلہ: کوشش ہونی چاہیے کہ مسجد کی عمارت اپنے مکانوں سے اعلیٰ اور بلند ہو۔ سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ میں مسجد نبوی شریف نہایت اعلیٰ اور نفیس بنوائی۔

مسئلہ: فتاویٰ قنیہ میں ہے کہ اگر کسی مسجد کی مسلمانوں کو ضرورت نہ رہے اور وہ اس میں نماز پڑھنا چھوڑ دیں اور مسجد کا ماحول اُجاڑ ہو جائے تو اگر اس کا مالک زندہ ہے۔ تو وہ اس کی ملکیت میں واپس چلی جائے گی اور اگر مر گیا ہو تو اس کے وارثوں کی ملک میں چلی جائے گی۔ یہ امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ اور امام محمد رحمۃ اللہ کا مذہب ہے لیکن امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ وہ ہمیشہ مسجد رہے گی اور یہی مفتیٰ بہ قول ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ: مسجدوں میں جھاڑو دینا، انہیں تھوک وغیرہ سے صاف کرنا اور انہیں معطر کرنا بہت بہتر ہے بلکہ مسجد کی جھاڑو حورانِ بہشتی کا مہر ہے۔ (نعیمی)

فائدہ: مسجد کو ویران کرنے والا (ان شاء اللہ) دنیا میں ذلیل وخوار ہوگا اور اس پر غم وخوف طاری رہے گا اور آخرت کا عذاب اس کے علاوہ۔ اس کا مشاہدہ اور تجربہ ہو چکا ہے بلکہ جن

لوگوں نے مسجد کی چیزیں غصب کر کے گھر میں استعمال کیں وہ آخر کار تباہ و برباد ہوئے۔

مسئلہ: تعمیر جدید کے لیے پہلی مسجد کو شہید کرنا (گرانا) جائز ہے۔

مسئلہ: نئے سرے سے مسجد کو تعمیر کرتے وقت اس کا پہلا سامان شہتیر، کڑیاں، بالے اینٹیں وغیرہ فروخت کرنا جائز ہے بشرطیکہ فی الحال اس سامان کی مسجد کو ضرورت نہ رہی ہو اور باقی رکھ چھوڑنے میں ضائع ہو جانے کا خطرہ ہو۔ (فتاویٰ برکاتیہ)

مسئلہ: (اِنَّ الْمَسَاجِدَ لِلّٰهِ) (القرآن) (سب مسجدیں اللہ کی ہیں) لیکن درجے مختلف سب سے افضل مسجد بیت اللہ، پھر مسجد نبوی، پھر مسجد اقصیٰ۔

فائدہ:۔ حضرت سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں چھ باتیں مروت انسانی سے ہیں۔ ان میں تین تو حالتِ اقامت (وطن) میں۔ (۱) تلاوت قرآن (۲) آبادی مسجد (۳) مسلمانوں سے محبت اور تین حالتِ سفر میں (۱) سفر میں خرچ میں فراخی (۲) حسنِ اخلاق (۳) ساتھیوں سے خوش طبعی فی غیر معاصی اللہ (روح البیان)

اس آیت کی تفسیر میں صاحب تفسیر امام فخر الدین (رحمۃ اللہ علیہ) نے فضائل واحکامِ مسجد کے بارے میں کثیر تعداد میں ایمان افروز احادیثِ مبارکہ جمع فرمائیں۔ علاوہ ازیں احکام مسجد کے بارے میں اعلیٰ حضرت مولانا الشاہ احمد رضا فاضل بریلوی کا رسالہ التحریر الجید فی حق المسجد اور بہار شریعت کو ملاحظہ فرمائیں۔

مسئلہ : امام زاہد نے اس آیت کے لفظ (اَنْ یُّذْکَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ) سے یہ استدلال بھی کیا ہے کہ اسم اور مسمی ایک ہی ہیں۔ اس لیے کہ اگر اسم اور مسمی مغائر ہوں تو اسم کے ذکر سے غیر اللہ کا ذکر لازم آئے گا اور غیر اللہ کی عبادت ہوگی۔ پس معتزلہ کا یہ قول باطل ہے کہ اسم اور مسمی میں اتحاد نہیں۔ (تفسیرات احمدیہ)

اعتراض: جیسا کہ آیت کی تفسیر سے معلوم ہوا کہ مشرکین کو مسجد میں آنے کی اجازت نہیں پھر امام ابوحنیفہ (رحمۃ اللہ علیہ) نے کفار کا مسجد میں آنا کیوں جائز رکھا؟

جواب: اس اعتراض کا مکمل جواب تو آیت (اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ) الایۃ کی تفسیر میں دیا جائے گا (ان شاء اللہ) مختصراً یہ خیال رہے کہ آیت (اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ) الخ میں مشرکین کو حج و عمرہ کے لیے مسجد میں داخل ہونے سے روکا جائے گا نہ کہ مطلقاً۔ کیوں کہ حضور ﷺ اپنے کفار مہمانوں اور دیگر سلطنتوں کے ایلچیوں کو مسجد نبوی شریف میں ہی ٹھہراتے تھے یہاں تک کہ ثمامہ ابن اثال کو حالتِ کفر ہی میں مسجد کے ستون سے باندھا تھا لہٰذا آیت کی یہ توجیہ کرنا ضروری ہے۔

اعتراض: اہلِ سنت اپنی مسجدوں سے قادیانی، وہابیہ، دیابنہ، رافضیوں وغیرھم کو کیوں روکتے ہیں ؟ حالاں کہ حضور علیہ السلام نے نجراں کے عیسائیوں کو مسجد نبوی میں اپنی عبادت کرنے کی اجازت دی۔ چناں چہ کسی کو مسجد میں نماز پڑھنے سے روکنا مسجد کو ذکر اللہ سے روکنا ہے۔

جواب: اہلِ سنت ان گمراہوں اور بدعتی فرقوں کو اپنی مساجد میں آنے اور وہاں آکر نماز و جماعت سے اس لیے روکتے ہیں کہ اس سے مسلمانوں میں فساد پھیلتا ہے اور اہلِ مسجد کو ایذا ہوتی ہے۔ چناں چہ عبادت سے نہیں بلکہ شرانگیزی اور فساد سے روکا جاتا ہے۔ بدبودار منہ و لباس والے کو مسجد سے روکا جاتا ہے تاکہ نمازیوں کو ایذا نہ ہو جیسا کہ حدیث شریف ہے کہ (مَنْ اَكَلَ مِنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ الْمُنتعةِ فَلَا يَقْرِبَنَّ مَسْجِدَنَا فَاِنَّ الْمَلَائِكَةَ تَتَاذّٰى مِمَّا يَتَاذّٰى مِنْهُ الْاِنْسُ) ۔ (متفق علیہ) وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ قَالَ (مَنْ اَكَلَ ثُوْمًا اَوْ بَصَلًا فَلْيَعْتَزِلْ مَسْجِدَنَا) (کبیر)
یہ محض غلط ہے کہ حضور علیہ السلام نے عیسائیوں کو مسجد نبوی میں اپنی مذہبی عبادت کی اجازت دی تھی بلکہ ہوا یہ تھا کہ مسلمان نماز پڑھنے لگے تو انہوں نے بھی اپنی مذہبی عبادت شروع

کردی۔ حضور ﷺ نے صحابہ (رضوان اللہ علیہم) کو ان کی عبادت بند کرنے کا حکم نہ دیا بلکہ انہیں اپنی عبادت پوری کر لینے دی۔ جیسا کہ ایک بدوی مسجد میں پیشاب کرنے لگا تو حضور ﷺ نے فرمایا: اس کو نہ روکو جب اس نے پیشاب کر لیا تو آپ ﷺ نے مسجد دھلوادی تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ مسجدوں میں پیشاب کرنا جائز ہے۔ ایسے ہی یہ ہوا۔ کیا معترضین اپنی مساجد میں قادیانیوں، ہندوؤں، سکھوں کو اجازت دیدیں گے کہ وہ وہاں مورتیاں رکھیں اور گھنٹے بجایا کریں؟ (نعوذ باللہ)

جہت قبلہ کا پتہ نہ چلے تو تحری (غوروفکر) کر کے جدھر چاہے منہ کر لے

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَلِلّٰہِ الۡمَشۡرِقُ وَالۡمَغۡرِبُ ۚ فَاَیۡنَمَا تُوَلُّوۡا فَثَمَّ وَجۡہُ اللّٰہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ وَاسِعٌ عَلِیۡمٌ

(سورۃ البقرۃ:۱۱۵)

"اور مشرق و مغرب سب اللہ ہی کا ہے۔ تو تم جدھر موتھ کرو ادھر وجہ اللہ (خدا کی رحمت تمہاری طرف متوجہ ہے) بیشک اللہ وسعت والا علم والا ہے"(کنزالایمان)

قبل ازیں ذکر ہو چکا ہے کہ یہ آیت یا منسوخ ہے یا مؤول۔ لیکن جمہور کا مسلک یہ ہے کہ یہ منسوخ نہیں۔ وجہِ اختلاف یہ ہے کہ لفظ (اَیۡنَمَا) کو اگر (تُوَلُّوۡا) کا مفعول بہ قرار دیں اور (لِلّٰہ) میں لام ملکیت کا ہونے کی وجہ سے معنی یہ کریں کہ بلاد مشرق و مغرب کا مالک اللہ ہی ہے۔ تم جس مکان یا جگہ کی طرف اپنا رخ کرو وہاں اللہ ہی متوجہ ہے۔ اس لیے تم پر اس سلسلے میں کوئی حرج نہیں۔ اس صورت میں بلاشبہ یہ منسوخ ہے۔ یا صلوٰۃ النفل علی الراحلۃ (سواری پر نمازِ نفل) کے بارے میں ہے۔ یا اشتباہ قبلہ کے متعلق ہے اور اگر (اَیۡنَمَا) اپنی اصل پر رہے یعنی (تُوَلُّوۡا) کا مفعول فیہ قرار دیا جائے اور معنی یوں ہوں۔) تم کسی جگہ بھی قبلہ کی طرف رخ کرو تو اس طرف اللہ کی جہت ہے) اس صورت میں اس کے غیر منسوخ اور غیر مؤول ہونے میں کوئی شبہ نہیں بلکہ بابِ قبلہ میں تائید ہے۔ یعنی قبلہ معلوم نہ ہونے کی صورت میں (تحری کے بعد) جدھر بھی منہ کر کے نماز پڑھی جائے درست ہے۔

چنانچہ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یہ آیت تحویلِ قبلہ کے بارے میں ہے کیوں کہ نبی علیہ السلام مکہ مکرمہ میں کعبۃ اللہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے۔ پھر بیت

المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم ہوا تو کفار طعن و تشنیع کرنے لگے تو یہ آیت نازل ہوئی کہ قبلہ کعبۃ اللہ کے ساتھ مختص نہیں بلکہ جس طرف منہ کرو وہ اللہ ہی کی طرف ہے۔ پھر یہ آیت قبلہ کے بیت المقدس سے کعبۃ اللہ کی طرف پھر جانے سے منسوخ ہو گئی۔ کیوں کہ ارشاد ہوا۔ (فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَام) (اپنا رُخ مسجد حرام کی طرف پھیریئے) امام زاہد فرماتے ہیں کہ قرآنِ پاک کی سب سے پہلی آیت یہی ہے جو منسوخ ہوئی۔ صاحب اتقان کا بھی یہی رجحان ہے۔ قاضی بیضاوی نے بھی اسی طرف اشارہ کیا ہے لکھتے ہیں کہ یہ تحویلِ قبلہ کی تمہید ہے۔ نیز اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی مکان یا جہت میں ہونے سے پاک ہے۔ جمہور کے نزدیک آیت کے معنی یہ ہیں کہ بلاد شرق و غرب کا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ اگر تمہیں مسجد اقصیٰ یا مسجد حرام میں عبادت سے روک دیا جائے تو تم کہیں سے بھی کعبۃ اللہ کی طرف مونھ کر کے نماز پڑھ سکتے ہو۔ اس لیے کہ وہ وہی جگہ ہے جس کی طرف مونھ کر کے تمہیں نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ یہ آیت مسافر کے سواری پر نفل کے بارے میں نازل ہوئی۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ایک جماعت پر قبلہ مشتبہ ہو گیا، انہوں نے مختلف اطراف کی طرح مونھ کر کے نماز پڑھی۔ صبح کے وقت انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا تو انہیں معذور قرار دیا گیا۔ چناں چہ یہ آیت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول کے خلاف دلیل ہے کہ اگر کوئی شخص غلطی سے قبلہ کی طرف پیٹھ کر کے نماز پڑھے تو نماز نہ ہوگی۔

صاحب مدارک نے کشاف سے نقل کیا ہے کہ دعا و ذکر میں جس طرف چاہو مونھ کر لو نماز مراد نہیں۔

خلاصہ الکلام:

آیتِ کریمہ کے سببِ نزول میں مختلف اقوال کے پیشِ نظر خلاصہ تفسیر یوں بیان کیا جاسکتا ہے۔اے مسلمانو! اگر مشرکین تم کو مسجدوں میں اللہ کے ذکر سے منع کریں تو تم اس کی پرواہ نہ کرو کیوں کہ اس کی عبادت صرف مسجدوں کی چار دیواری میں ہی محدود نہیں بلکہ سارا مشرق و مغرب اسی کا ہے اور سارے عالم میں سلطنت اسی کی ہے۔تم جہاں کہیں بھی موقع پا کر نماز پڑھ لو گے ادھر ہی اللہ کی رحمت اور اس کی قبولیت ہوگی کیوں کہ اللہ بڑی وسیع مملکت اور بڑے علم والا ہے۔

یا اے مسلمانو! تم بحالتِ سفر نفل نمازیں سواری پر جدھر بھی مونھ کر کے پڑھ لو گے، ادھر ہی اللہ کی رحمت و قبولیت ہے۔

یا اے مسلمانو! تم حالتِ خوف سے جب جہاد میں دوڑتے ہوئے نماز پڑھو اور جہتِ قبلہ کو مونھ کرنا ممکن نہ ہو تو جدھر بھی مونھ کرلو گے، ادھر ہی اللہ کی رحمت ہے۔

یا اے لوگو! تم جدھر منہ اٹھا کر دیکھو وہاں ہی اللہ کی معبودیت ہے۔ ہر جگہ اس کی عبادت ہو رہی ہے لہٰذا تم بھی اس کی عبادت کرو۔

یا اے صحابہ کرام! تم جدھر بھی جہاد کے لیے جاؤ گے ادھر ہی اللہ کی رحمت اور اس کی فتح و نصرت پاؤ گے۔

یا اے کافرو! تم جدھر بھی بھاگ کر جاؤ گے ادھر ہی اللہ کی ذات ہے یعنی اس کے غضب و عذاب سے کہیں بھی امان نہ پاؤ گے۔

خیال رہے کہ اس آیت میں وجہ کے معنی چہرہ، ذات، رضا اور سمت کے ہیں۔اگر چہرہ مراد ہو تو اس کی اضافتِ لفظ اللہ کی طرف تشریفی ہوگی۔جیسے ناقۃ اللہ و بیت اللہ وغیرہ۔اگر ذات مراد ہو تو اس سے رب تعالیٰ کا علم اور رحمت مقصود ہوگی۔اگر رضا مراد ہو تو معنیٰ ظاہر ہیں اور جہت مراد ہو تو مراد اللہ کی پسندیدہ جہت ہے۔صاحب تفسیر کبیر نے وجہ کے معنی قصد اور نیت کے بھی لکھے ہیں۔

یا یہ لفظ وجہ اور دیگر اس قسم کے الفاظ متشابہات سے ہیں۔ جن کی کیفیت سے ہم ناواقف ہیں اور ان کے اصل پر ایمان رکھنا ہمارے لیے ضروری ہے۔ (متشابہات کا مفصل بیان سورہ ال عمران میں آئے گا) (ان شاء اللہ)

فوائد و مسائل:

۱۔ اگر کسی کو سمتِ قبلہ معلوم نہ ہو سکے تو جدھر دل گواہی دے ادھر ہی نماز پڑھ لے۔ اسے ہی اصطلاحِ فقہاء میں تحری کرنا کہتے ہیں۔

۲۔ سفر میں نوافل اور خوف میں ہر نماز جس طرف رخ کر کے پڑھی جائے جائز ہے۔ (ہدایہ)

۳۔ دعا کے واسطے کوئی سمت لازم نہیں۔

اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کا جسم بھی ہے کیوں کہ اس کے لیے وجہ (چہرہ) اور وسعت وغیرہ ثابت کی گئی ہے۔

جواب: اس کا جواب الفاظ کے معنی بیان کرتے ہوئے دیا جا چکا ہے لیکن ایک بزرگ نے خدا تعالٰی کے جسم سے پاک ہونے کی بڑی نفیس دلیل بیان فرمائی کہ حضور ﷺ نے عرش پر پہنچ کر فرمایا (لَا اُحْصِیْ ثَنَآءً عَلَیْکَ اَنْتَ کَمَا اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِکَ) الخ اور یونس علیہ السلام نے مچھلی کے پیٹ میں رہ کر فرمایا (لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحَانَکَ) اگر جسم ہوتا تو کسی خاص جگہ میں ہوتا اور ہر جگہ سے اسے صیغہ حاضر سے خطاب کرنا جائز نہ ہوتا۔ (روح البیان)

اللہ اولاد سے پاک ہے، ذی محرم غلام کو خرید نے سے وہ آزاد ہو جاتا ہے

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰہُ وَلَدًا ۙ سُبۡحٰنَہٗ ؕ بَلۡ لَّہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ کُلٌّ لَّہٗ قٰنِتُوۡنَ (سورۃ البقرۃ:۱۱۶)

''اور بولے خدا نے اپنے لیے اولاد رکھی۔ پاکی ہے اسے بلکہ اسی کی ملک ہے۔ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔ سب اسی کے حضور گردن ڈالے (مطیع فرمان) ہیں'' (کنز الایمان)

شانِ نزول:

یہودی کہتے تھے کہ عزیر علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں۔ نجران کے عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق کہتے تھے کہ اللہ کے بیٹے ہیں۔ مشرکین عرب کہتے تھے کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ ان سب کے رد میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ (اسباب النزول واحدی)

تفسیر:

وَلَدًا: ولد بمعنی مولود (جو جنا گیا) یہ لفظ واحد جمع مذکر مونث چھوٹے بڑے سب پر بولا جاتا ہے۔ چناں چہ قرآن مجید میں ہے (فَاِنۡ لَّمۡ یَکُنۡ لَّہٗ وَلَدٌ) (مفردات) چوں کہ اہلِ کتاب بیٹا مانتے تھے اور مشرکین بیٹی اسی لیے (ولدٌ) فرمایا جو کہ دونوں کو شامل ہے۔

سُبۡحٰنَہٗ: (پاکی ہے اسے) سبحان۔ سبح سے بنا جس کے لغوی معنی تیرنا (کُلٌّ فِیۡ فَلَکٍ یَّسۡبَحُوۡنَ) چوں کہ تیرنے والا کنارے سے دور نکل جاتا ہے اس لیے دور ہونے کے معنی میں

استعمال ہونے لگا۔ چوں کہ جو ذات عیوب سے پاک ہو وہ تمام برائیوں سے دور ہوتی ہے اسلیے پاکی کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ لفظ تسبیح بھی اس سے بنا جس کے معنی رب کو پاک جاننا۔

لفظِ سبحان اللہ تعالیٰ کی تنزیہ اور اس کے صاحب اولاد ہونے سے دوری بیان کرتا ہے یعنی رب ''اب'' (والد) نہیں ہوسکتا کیوں کہ بیٹا باپ کی جنس سے ہوتا ہے۔ رب جنسیت سے پاک ہے نیز بیٹا باپ کا جزو ہوتا ہے۔ بیٹا پیدا کرنے میں ماں کی امداد ضروری ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان باتوں سے پاک ہے۔ بیٹا ثابت کرنے سے رب تعالیٰ کے لیے بیوی ماننا پڑے گی۔ نیز ضروری ہے کہ بیوی خاوند کی کفو یعنی مثل ہو رب تعالیٰ مثلیت سے پاک ہے فرمایا۔ (لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ) نیز فرمایا (وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ) غرض یہ کہ الوہیت اور باپ ہونا کبھی جمع نہیں ہوسکتے۔ (ملخصاً نعیمی وعزیزی)

ممکن ہے کہ تعجب کے لیے سبحان کہا گیا ہو کہ ایسے مواقع پر لوگ بھی سبحان اللہ، معاذ اللہ بول دیتے ہیں۔ (عزیزی)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنھما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے (كَذَّبَنِيْ اِبْنُ آدَمَ وَلَمْ يَكُنْ لَهٗ ذَالِكَ وَ شَتَمَنِيْ وَلَمْ يَكُنْ لَهٗ ذَالِكَ فَاَمَّا تَكْذِيْبُهٗ اِيَّايَ فَزَعَمَ اَنِّيْ لَا اَقْدِرُ اَنْ اُعِيْدَهٗ كَمَا كَانَ وَاَمَّا شَتْمُهٗ اِيَّايَ فَقَوْلُهٗ لِيْ وَلَدٌ فَسُبْحَانِيْ اَنْ اَتَّخِذَ صَاحِبَةً اَوْ وَلَدًا) (رخ) فیض القدیر جلد ۴/۴۷۳)

(ابن آدم نے میری تکذیب کی اور اسے یہ بات شایان نہ تھی اور ابنِ آدم نے مجھے سب و شتم کیا اور یہ بات اسے سزاوار نہ تھی۔ تکذیب تو یہ ہے کہ وہ گمان کرتا ہے کہ میں اس کے مرنے کے بعد جیسا تھا اسطرح پر زندہ نہیں کرسکتا اور سب و شتم یہ ہے کہ وہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بیوی بچوں والا ہے حالاں کہ میں اس سے بالکل پاک ہوں) (اوکمافی الحدیث)

حضرت ابوہریرہ سے بھی اسی مضمون کے قریب قریب روایت ہے کہ (انسان کا مجھ کو گالی دینا یہ ہے) کہ اللہ تعالیٰ بچوں والا ہے حالاں کہ میں (اَحَدٌ صَمَدٌ) ہوں نہ میں نے کسی کو جنا،

نہ میں کسی سے جنا گیا اور نہ کوئی میرے برابر کا ہے۔

بَلْ لَّهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ :(بلکہ اسی کی ملکیت ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے) یہ الفاظ رب تعالیٰ کے اولاد سے پاک ہونے کی دوسری دلیل ہے۔ یعنی زمین و آسمان کی تمام اشیاء اس کی مخلوق اور اس کی ملکیت میں ہیں۔ جو مخلوق ہے وہ بیٹا کہاں؟ کیوں کہ باپ اور بیٹے میں کچھ مناسبت اور مجانست ہونا ضروری ہے۔ یہاں کچھ بھی تعلق نہیں۔ کہاں ممکن، عاجز، مخلوق اور کہاں واجب غنی مستقل خالق؟

كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ : (سب اسی کے حضور گردن ڈالے ہیں) سب اسی کے تابع فرمان ہیں۔ (قَانِتُوْن) قنوت سے بنا جس کا اصل معنیٰ قیام یعنی کھڑا ہونا ہے چناں چہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (اَفْضَلُ الصَّلٰوۃِ طُوْلَ الْقُنُوْتِ) (افضل نماز وہ ہے جس میں طولِ قنوت (زیادہ دیر کھڑا ہونا) ہو) (مسلم، احمد ترمذی)

یا اس کا معنیٰ مطیع ہونا ہے۔ چناں چہ امام احمد نے بسندِ حسن ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قرآنِ کریم میں جہاں کہیں بھی لفظِ قنوت آیا ہے اس سے مراد اطاعت ہے۔ تو مطلب یہ ہوگا کہ زمین و آسمان کی ہر شئی اس کی توحید کی شہادت دینے اور اس کے معبود ہونے کی مقر ہے۔ کیوں کہ ہر ممکن کا وجود بزبانِ حال شہادت دے رہا ہے کہ بندہ ایک ایسے خالق و واجب کا محتاج ہے جس کا کوئی مثل نہیں۔ آیت کریمہ (وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ) (اور کوئی چیز نہیں جو اس کی حمد کے ساتھ تسبیح نہ کرتی ہو، لیکن تم لوگ ان کی تسبیح سمجھتے نہیں) اسی کی نظیر ہے۔ ہر شئی کی شہادت، تحمید و تسبیح، صاحبِ دل، دل کے حواس سے سمجھتے ہیں۔

فائدہ:

حضرت سیدنا امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت سے استدلال فرمایا ہے کہ جو شخص اپنے بیٹے، بیٹی یا دوسرے کسی ذی محرم کا مالک بن جائے تو وہ اس پر آزاد ہو جائے گا۔ کیوں کہ رب تبارک و تعالیٰ نے اپنی ذات سے اولاد کی نفی کو مملوکیت پر مرتب فرمایا ہے یعنی زمین و آسمان کی ہر شئی اس کی مملوک و مطیع ہے اور اس کی مشیت و تکوین کی خلاف ورزی نہیں کر سکتی۔ عالم کے جس فرد میں بھی یہ صفات پائی جائیں گی وہ تکوین میں واجب لذاتہٖ کا ہم جنس نہیں ہو سکتا حالاں کہ باپ بیٹے کا ہم جنس ہونا ضروری ہے معلوم ہوا کہ مملوکیت اور ابنیت میں منافات ہے لہٰذا والد اپنی اولاد کا مالک نہیں ہو سکتا یا بالعکس اولاد اپنے والد کی مالک نہیں بن سکتی بلکہ ملک میں آتے ہی آزاد ہو جائے گا۔ حضرات فقہائے عظام اسی مسئلہ میں حضور علیہ السلام کے اس قول مشہور (مَنْ مَلَكَ ذَارَحِمٍ مَحْرَمٍ عُتِقَ عَلَيْهِ) (جو شخص اپنے کسی محرم رشتہ دار کا مالک ہو تو وہ آزاد ہو جائے گا) کو بھی دلیل بناتے ہیں۔

حضور علیہ السلام کے والدینِ کریمین مومن تھے

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اِنَّآ اَرْسَلْنٰکَ بِالْحَقِّ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ۙ وَّلَا تُسْئَلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِیْمِ

(سورۃ البقرۃ:۱۱۹)

"بے شک ہم نے تمہیں حق کے ساتھ بھیجا خوش خبری اور ڈر سناتا اور تم سے دوزخ والوں کا سوال نہ ہوگا"

تفسیر:

اِنَّآ اَرْسَلْنٰکَ بِالْحَقِّ: (بے شک ہم نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے) اس مقام پر حق سے مراد صداقت، حقانیت، معجزات و آیات یا دلائلِ قدرت، سچا دین وغیرہ ہو سکتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ بالحق میں حق سے مراد قرآن ہے جیسا کہ آیت کریمہ (بَلْ کَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَ ھُمْ) بلکہ جھٹلایا انہوں نے حق کو جب ان کے پاس آیا) میں بھی الحق سے مراد قرآن پاک ہے۔

بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا: (خوش خبری اور ڈر سناتا) بشیر مبشر سے ماخوذ ہے اور مبشر تبشیر سے بنا جس کا معنی خوش کن خبر سنانا، جس سے انسان کے چہرہ پر انبساط ظاہر ہو۔ (مفردات) ایک دوسرے مقام پر آپ کو (مُبَشِّر) بھی فرمایا (اِنَّآ اَرْسَلْنٰکَ شَاھِدًا وَّ مُبَشِّرًا) الآیۃ.

نَذِیْرٌ انذار سے ماخوذ ہے جس کا معنی کسی خوف ناک چیز سے آگاہ کرنے کے ہیں جیسا کہ (فَاَنْذَرْتُکُمْ نَارًا تَلَظّٰی) (پس میں نے تم کو بھڑکتی آگ سے متنبہ کر دیا) یہاں نذیر بمعنی منذر ہے یعنی ڈر سنانے والا اور اس کا اطلاق ہر اس چیز پر ہوتا ہے جس میں خوف پایا جائے۔ خواہ وہ

انسان ہو یا کوئی اور چیز۔ خیال رہے کہ قرآنِ کریم کا اردو زبان میں ترجمہ کرنے والے تمام مترجمین نے لفظ نذیر کا معنی ڈرانے والا کیا ہے۔ لیکن امام احمد رضا فاضلِ بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی لفظ کا معنی ڈر سنانے والا لکھا جو کہ بارگاہِ نبوت میں آپ ﷺ کے کمالِ ادب کی دلیل ہے۔ کیوں کہ پیغمبر علیہ السلام کا کام لوگوں کو ڈرانا نہیں بلکہ اللہ کے عذاب سے متنبہ کرنا ہے۔

وَّلَا تُسْئَلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ :(اور تم سے دوزخ والوں کے بارے میں سوال نہ ہوگا)

جحیم کا اصل الجحمۃ ہے جس کا معنی آگ بھڑ کنے کی شدت۔ اسی الجحیم (فعیل) کے وزن پر صفتِ مشبہ کا صیغہ ہے جسکے معنی دوزخ یا دہکتی ہوئی آگ کے ہیں (مفردات)

اس آیت کے اس جملہ کی دو قرأتیں ہیں۔ ایک جمہور کی قرأت (لَاتُسْئَلُ) الخ نفی مجہول مضارع تو اس بناء پر معنی یہ ہوگا (اے محبوب (ﷺ) آپ سے اس بارے میں پوچھ گچھ نہ ہوگی کہ یہ لوگ ایمان کیوں نہ لائے) کیوں کہ (فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ) آپ کے ذمہ تو صرف پہنچا دینا ہے اور حساب ہمارے ذمہ ہے) اور دوسری قرأت میں (لَا تَسْئَلْ) نہی معروف ہے اور اس صورت میں کتبِ تفاسیر میں دو معنی مرقوم ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ سوال سے نہی کرنا شدتِ عذاب سے کنایہ ہوگا جیسا کہ کسی مصیبت میں مبتلا انسان کو دیکھ کر کہا کرتے ہیں (لَا تَسْئَلْ عَنْهُ) اس کا حال مت پوچھو) (یعنی وہ بہت تکلیف میں ہے یا اس کے بارے میں کیا پوچھتے ہو مجھ میں تو طاقتِ بیان ہی نہیں) یعنی وہ سخت حالت میں ہے۔ دوسرا معنی علامہ بغوی نے عطاء سے روایت کیا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ ایک روز حضور ﷺ نے فرمایا (لَيْتَ شِعْرِىْ مَا فَعَلَ اَبَوَاى) کاش مجھے خبر ہوتی کہ میرے والدین کس حال میں ہیں) تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی اور عبد الرزاق نے کہا کہ مجھ سے ثوری نے موسیٰ بن عبیدہ سے اور موسیٰ نے محمد بن کعب قرظی سے اور انہوں نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کی ہے۔ ایسے ہی ابنِ جریر نے اپنی سند سے اس روایت کو نقل فرمایا ہے۔ تاہم یہ شانِ نزول جو علامہ بغوی وغیرہ نے ذکر کیا ہمارے نزدیک پسندیدہ نہیں اور قوی بھی نہیں کیوں کہ اگر یہ

حدیث پایہ ثبوت کو بھی پہنچ جائے تو یہ محض ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کا خیال ہے اور اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ حضورﷺ نے ایسا فرمایا ہو اور اسی دن اتفاق سے یہ آیت بھی نازل ہوئی ہو۔ تب بھی اس امر پر کوئی دلیل نہیں کہ اصحاب الجحیم سے حضور کے والدینِ کریمین مراد ہوں اور اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ حضورﷺ کے والدین ہی مراد ہیں تو بھی یہ آیت ان کے کفر پر کسی طرح دال نہیں کیوں کہ مومن بھی اپنے بعض گناہوں کے سبب سے جہنم والوں سے ہو سکتا ہے اور پھر شفاعت یا کسی اور وجہ یا مدتِ عذاب کے تمام ہونے سے اس کی مغفرت ہو جاتی ہے۔ امام بخاری نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ رسول اللہﷺ نے فرمایا۔ (مجھے اولادِ آدم کے سب قرنوں میں بہترین اور افضل ترین قرن میں پیدا کیا گیا) (انتھٰی)

اور فرمایا کہ (جب کبھی کسی گروہ کے دو ٹکڑے ہوئے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے مجھے اس میں سے کیا جو بہتر ٹکڑا تھا۔ حتٰی کہ میں اپنے والدین سے پیدا ہوا اور جاہلیت کی ناپاکیوں میں سے کوئی ناپاکی مجھے نہیں لگی اور میں آدم (علیہ السلام) سے لے کر اپنے ماں باپ تک نکاح سے پیدا ہوا ہوں۔ زنا سے پیدا نہیں ہوا ہوں۔ اس لیے میں اپنی ذات سے اور باعتبار آباؤ اجداد کے تم سے بہتر ہوں) اس حدیث کو بیہقی نے دلائل نبوت میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے اور ابو نعیم نے اپنی کتاب میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا۔

خیال رہے کہ حضور پُر نور سید عالمﷺ کے والدینِ کریمین کے ایمان و اسلام پر مفسرین، محدثین کے مختلف اقوال پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض اسی آیت سے استدلال کرتے ہوئے ان کے کفر کے قائل ہیں۔ لکن هذا الكلام تقشعر منه جلود المومنین ، ویر فضه من كان فی عداد المسلمین وهو خطأً صریحٌ والصواب ان فی هذه الایة اصحاب الجحیم هم الیهود والنصاری المذكورون فی الایات السابقة وهذا هو الموافق لنظم الكتاب الكریم وهو مارجحه الامام ابو حیان فی تفسیره. حق یہ ہے کہ آپ کے والدین معظمین موحد، مسلم مومن تھے۔ مخالفین کی اس بارے میں مشہور دلیل

مشکوۃ باب زیارۃ القبور کی وہ حدیث ہے جسے امام مسلم نے روایت کیا کہ حضور علیہ السلام نے اپنی والدہ کی قبر کی زیارت کی خود بھی روئے، دوسروں کی بھی رلایا اور فرمایا میں نے ان کی مغفرت کے لیے رب سے اجازت چاہی تھی نہ ملی اور ان کی قبر کی زیارت کی اجازت چاہی مل گئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ آمنہ خاتونِ جنت مومنہ نہ تھیں (معاذ اللہ) حالاں کہ یہی حدیث ان کے مومنہ ہونے کی دلیل ہے۔ کیوں کہ اگر وہ کافرہ مشرکہ ہوتیں تو زیارتِ قبر کی بھی اجازت نہ ملتی۔ قرآن کریم میں ہے (وَلَا تَقُمْ عَلٰی قَبْرِہٖ اِنَّھُمْ کَفَرُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَمَاتُوْا وَھُمْ فٰسِقُوْنَ) جس سے معلوم ہوا کہ کفار کی قبر کی زیارت منع ہے۔ رہا استغفار کی اجازت نہ ملنا وہ اس لیے نہیں کہ وہ کافرہ تھیں بلکہ اس لیے کہ وہ بے گناہ تھیں کیوں کہ گناہ گار تو وہ ہو جس کو شرعی احکام پہنچیں اور وہ ان کی مخالفت کرے، ان حضرات کو شرعی احکام پہنچے ہی نہ تھے۔ کیوں کہ وہ تو قبل البعثت ہی انتقال فرما گئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ نابالغ بچے کی نماز جنازہ میں دعاءِ مغفرت نہیں ہوتی کہ وہ گناہوں سے پاک ہوتا ہے۔ رہا حضور علیہ السلام کا رونا وہ محبتِ فرزندی کی وجہ سے تھا کہ اگر آج وہ زندہ ہوتیں تو ہماری عظمتِ شان دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی فرماتیں۔

علاوہ ازیں آج تک دلیل قوی تو کجا کسی ضعیف دلیل سے بھی ان دونوں صاحبان (والدینِ کریمین) کی بت پرستی یا عقیدہ کفر ثابت نہیں ہوا بلکہ کتب سیر و احادیث میں ان کے ایسے اقوال ملتے ہیں جن سے ان کے ایمان کا پتہ چلتا ہے۔ چناں چہ امام جلال الدین سیوطی (رحمۃ اللہ علیہ) نے اپنی کتاب (التعظیم والمنہ) میں بروایتِ دلائل النبوۃ ابو نعیم نے حضرت آمنہ خاتون کے بوقتِ وفات حضور ﷺ کے چہرہ انور کو دیکھ کر اشعار نقل کیے۔ جن کا مفہوم یہ ہے۔

"یعنی اے بیٹے! اللہ تجھے برکت دے۔ مجھے یقین ہے کہ تم رب کی طرف سے ساری مخلوق کے نبی ہو گے اور حل و حرم، عرب و عجم میں اسلام پھیلاؤ گے۔ اللہ تمہیں بُت پرستی سے بچائے گا اور دینِ ابراہیمی تجھ سے پھیلائے گا۔ میں تو مر جاؤں گی مگر میرا ذکر قیامت تک رہے گا کیوں کہ میں بہترین چیز یعنی پاک فرزند چھوڑ کر جا رہی ہوں"

خلاصۃ الکلام:

جہاں تک مخالفین کے اعتراضات اور ان کے شافی جوابات کا تعلق ہے وہ تو امام جلال الدین عبدالرحمٰن بن ابی بکر بن محمد السیوطی (رحمۃ اللہ علیہ) نے اپنے چھ عدد رسائل جو کہ خاص اسی موضوع پر تحریر فرمائے۔ امام اہل سنت مولانا الشاہ احمد رضا بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالہ (شمول الاسلام) اور صاحب تفسیرِ روح البیان علامہ اسمعیل حقی رحمۃ اللہ علیہ، حکیم الامت مولانا مفتی احمد یار خاں گجراتی نے تفسیر نعیمی اور رسالہ (القول المقبول) اور قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے تفسیرِ مظہری وغیرہ میں خوب نقل فرمائے ہیں۔ لیکن مقام عقیدت میں مخالف دلائل سے ہمارا وہی حال ہے جیسا کہ علامہ بدرالدین عینی شارح بخاری نے حضور ﷺ کے فضلات شریفہ کی طہارت، عدم طہارت پر بحث کرتے ہوئے لکھا۔ من قال غیر ذالک فاذنی عنہ صمّاء یعنی اس کا خلاف پڑھنے سننے سے ہماری آنکھیں اندھی، کان بہرے اور زبان گونگی ہے۔

مسئلہ امامت

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

وَاِذِ ابۡتَلٰۤى اِبۡرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّىۡ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَمِنۡ ذُرِّيَّتِىۡ ؕ قَالَ لَا يَنَالُ عَهۡدِى الظّٰلِمِيۡنَ (سورۃ البقرۃ:۱۲۴)

"اور جب ابراہیم کو اس کے رب نے کچھ باتوں سے آزمایا تو اس نے وہ پوری کر دکھائیں۔ فرمایا: میں تمہیں لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں۔ عرض کی اور میری اولاد سے فرمایا میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچتا۔"

(کنز الایمان)

تفسیر:

وَاِذِ ابۡتَلٰۤى: (اور یاد کرو) اِذ حروفِ ظرف سے ہے جو فعل کو چاہتا ہے۔ عام مفسرین اس جگہ (اُذۡكُرۡ) نکالتے ہیں۔ چناں چہ قرآنِ حکیم میں بھی بعض جگہ اِذ کے ساتھ (اُذۡكُرۡ) مذکور ہے جیسا کہ (وَاذۡكُرۡ اَخَا عَادٍ اِذۡ اَنۡذَرَ قَوۡمَهٗ) اور فرمایا (وَاذۡكُرۡ عَبۡدَنَاۤ اَيُّوۡبَ اِذۡ نَادٰى رَبَّهٗۤ) اس (اُذۡكُرۡ) کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ یاد کرو یا ان لوگوں سے ذکر کرو۔ خیال رہے کہ وہ چیز یاد دلائی جاتی ہے جو پہلے سے علم میں ہو یا بتا دی گئی ہو یا دکھائی گئی ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ سارے واقعات حضور ﷺ کے علم میں ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس سے پہلے بتائے نہیں گئے کیوں کہ قرآنِ کریم کا نزول تو اب ہو رہا ہے اور آپ نے کوئی کتب تواریخ وغیرہ بھی نہ پڑھی تھیں۔ تو ثابت ہوا کہ وہ سب واقعات عالمِ روحانیت میں حضور ﷺ کو دکھا دیئے گئے تھے۔ اس لیے فرمایا جا رہا ہے اے محبوب ذرا اس واقعہ کو یاد کرو۔ بعض جگہ ارشاد ہوا (اَلَمۡ تَرَ) (یعنی اے محبوب! کیا تم نے وہ

واقعہ نہ دیکھا؟) یعنی دیکھا ہے۔ چناں چہ صاحب تفسیر صاوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی (وَمَا كُنتَ لَدَيْهِمْ) الایۃ کی تفسیر میں لکھا ہے کہ آپ بایں جسم شریف ان کے پاس نہ تھے۔

اس سے حضور ﷺ کا علم غیب بھی ثابت ہوتا ہے اور حاضر و ناضر ہونا بھی۔ ملخصاً (نعیمی و صاوی)

اِبْتَلٰی: یہ لفظ بَلْوٌ یا بَلَاءٌ سے بنا ہے اس کے لفظی معنی آزمانا، تجربہ کرنا، امتحان لینا ہیں۔ بعض حضرات نے جو یہ لکھا کہ اس لفظ کا معنی امتحان لینا درست نہیں کیوں کہ یہ اس صورت میں ہوسکتا ہے جب امتحان لینے والا انجام سے جاہل ہو اور اللہ تعالیٰ اس سے پاک ہے۔ تو مفسرین نے اس کا جواب یہ دیا کہ کبھی تو اپنی واقفیت کے لیے کسی کا امتحان لیا جاتا ہے اور کبھی کسی کو آزمائش میں ڈال کر دوسروں پر اس کے کھرے کھوٹے ہونے کا اظہار کرنے کے لیے ہوتا ہے جس سے اس کی بڑائی اور بھلائی ظاہر ہو جاتی ہے۔ (خزائن العرفان وغیرہ)

اِبْـرَاهِيْـمَ: یہ سریانی زبان کا لفظ ہے۔ تمام قرآن شریف میں یہ لفظ اٹھتر (۷۸) جگہ آیا ہے اور بعض قراء نے ابراھام بھی پڑھا ہے۔ (مظہری) اس کا معنی ابٌ رحیمٌ یعنی مہربان باپ۔ السہیلی کا قول ہے کہ سریانی اور عربی زبان کے بہت سے لفظ ہم معنی اور متقارب اللفظ ہوتے ہیں ان میں یہ ابراہیم بھی ہے چوں کہ آپ بچوں پر بہت مہربان تھے بلکہ مہمان نوازی اور رحم و کرم میں مشہور ہیں۔ امام احمد نے اپنی مسند میں اور حاکم اور بیہقی نے نقل کیا کہ مسلمانوں کے جو چھوٹے بچے مر جاتے ہیں ان کی پرورش آپ اور آپ کی بیوی حضرت سارہ فرماتی ہیں۔ (روح البیان، عزیزی وغیر)

بعض نے کہا! ابراہیم اصل میں ابرم تھا پھر اس میں ھا زیادہ کی گئی جو کہ سریانی میں تفخیم و تعظیم کے لیے ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ لفظ بمعنی بزرگ کے ہے یا چوں کہ آپ مابعد کے سارے پیغمبروں کے والد ہیں، سارے دینوں میں آپ کی عزت ہے حتیٰ کہ مشرکینِ عرب بھی آپ کی عظمت کے قائل تھے اس لیے آپ کا نام نامی ابراہیم (علیہ السلام) ہوا۔

رَبُّـهٗ :قرأت مشہور میں تو لفظ رب کا ضمہ اور ابراہیم کا فتح ہے یعنی ابراہیم کو اس کے رب نے کچھ باتوں سے آزمایا مگر حضرت ابن عباس اور ابوحیوۃ رضی اللہ عنہما کی قرأت میں ابراہیم کا رفع اور لفظ رب کا نصب ہے یعنی ابراہیم علیہ السلام نے چند دعائیں مانگ کر اپنے رب کی رحمت کا اندازہ لگایا کہ وہ مجھ پر کتنا مہربان ہے تو رب تعالیٰ نے ان کی ساری دعائیں منظور فرمالیں۔ (تفسیرات احمدیہ، کبیر)

بِكَلِمٰتٍ :اگر چہ کلمات کلمہ کی جمع ہے جس کا معنی لفظ وضع بمعنی مفرد ہے۔ انسان کے منہ سے نکلی ہوئی بات کو بھی کلمہ کہا جاتا ہے۔ چاہے وہ کلام ہی ہو لیکن اس جگہ اس سے مراد چند احکام یا دعائیں ہیں۔ ان کلمات کے بارے میں مفسرین کے کئی اقوال ہیں۔ قول مشہور یہ ہے کہ وہ دس احکام تھے۔ ان میں سے پانچ کا تعلق سر سے ہے یعنی (۱) سر منڈانا، یا بال کٹانا، اور ایک روایت میں سر میں مانگ نکالنا۔ (۲) مونچھیں ترشوانا۔ (۳) کلی کرنا۔ (۴) مسواک کرنا۔ (۵) ناک میں پانی ڈالنا اور پانچ کا تعلق باقی بدن سے ہے۔ (۱) بغلوں کے بال کاٹنا۔ (۲) ناخن کاٹنا۔ (۳) زیر ناف بالوں کا مونڈنا۔ (۴) پانی سے استنجا کرنا۔ (۵) ختنہ۔ یہ دس چیزیں ابراہیم علیہ السلام پر فرض تھیں اور ہمارے لیے سنت۔

سر کے بالوں کے سلسلہ میں مرد کو اختیار ہے چاہے تو سارے بال منڈادے اور چاہے تو صرف قینچی سے کٹادے۔ عورت کو سر کے بال منڈانا یا کٹانا جائز نہیں۔ صرف ایام حج میں کچھ بال قینچی سے کٹوا سکتی ہے۔ اوپر والے ہونٹ کے برابر مونچھیں ترشوانا سنت ہے اور ایسا نہ کرنے کی سخت وعید ہے۔

کلی کرنا، ناک میں پانی ڈالنا اور مسواک کرنا ہر مرد وعورت کے لیے ہر وضو میں مسنون ہے۔ بغلوں کے بالوں کے سلسلے میں سنت انہیں اکھیڑنا ہے۔ تاہم منڈانا بھی جائز ہے۔ زیر ناف بالوں کو استرے سے مونڈنا سنت ہے اس کام میں چالیس دن سے زیادہ تاخیر مکروہ ہے۔ ناخن کٹانا سنت ہے لیکن بدھ کے روز ناخن کٹوانے سے احتراز کرنا چاہیے۔

مستحب یہ ہے کہ جمعہ کے دن یا ہفتے کے کسی دن ان کاموں سے فراغت کرلی جائے۔ استنجا اگر مخرج نجاست سے بقدر درہم تجاوز نہ کرے تو پانی سے استنجا کرنا سنت ہے اور اگر بقدر درھم یا اس سے زیادہ تجاوز کر جائے تو پانی سے استنجا واجب ہے۔ کہا گیا ہے کہ زیادہ سے زیادہ بارہ سال تک ختنہ کر لینا چاہیے۔

فَاَتَمَّھُن: (تو اس نے وہ پوری کردکھائیں) یعنی ابراھیم علیہ السلام نے وہ سارے احکام بخوشی ادا کیے۔ ارشاد باری تعالٰی ہے (وَاِبْرَاھِیْمَ الَّذِیْ وَفّٰی) یا رب تعالٰی نے ان کی ساری دعائیں منظور فرمالیں۔ (نعیمی)

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

قَالَ اِنِّیۡ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَمِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ ؕ
قَالَ لَا یَنَالُ عَهۡدِی الظّٰلِمِیۡنَ (سورۃ البقرۃ:۱۲۴)

"فرمایا: میں تمہیں لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں۔ عرض کی اور میری اولاد سے، فرمایا: میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچتا)

تعلق:

وَاِذِ ابۡتَلٰی : قال کا ظرف ہے اور اگر (اِذِ ابۡتَلٰی) کو (اُذۡکُرۡ) محذوف کے متعلق مانا جائے تو (قَالَ اِنِّیۡ جَاعِلُکَ) مستقل ہوگا اور جواب سوال مقدر کا بنے گا گویا سائل سوال کرتا ہے جس وقت ابراہیم علیہ السلام نے وہ تمام باتیں پوری کر دیں تو پھر اللہ تعالیٰ نے کیا فرمایا۔ جواب دیا گیا (قَالَ اِنِّیۡ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ) (مظہری)۔

تفسیر:

جاعل اسی جعل سے مشتق ہے جس کے لیے دو مفعولوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ امام اُمّ سے بنا جس کے معنی ہیں قصد کرنا۔ لغت میں ہر پیشوا کو امام کہتے ہیں۔ ذریۃ یا ذرہ سے بنا جس کے معنی ہیں پیدا کرنا یا ذرۃ سے جس کے معنی ہیں پھیلانا، پراگندہ، متفرق ہونا۔ چھوٹی چیونٹی اور ریت کے ذروں کو بھی ذرہ اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ زمین پر پھیلے ہوئے ہوتے ہیں۔ اصطلاح میں آدمی کی چھوٹی اولاد کو ذریۃ کہتے ہیں اور کبھی چھوٹوں بڑوں سب پر بولا جاتا ہے۔ عہد سے مراد وعدۂ امامت (نبوت یا دینی پیشوائی)۔

اس آیت میں اگر امامت سے مراد نبوت ہو تو لفظ ظالم فاسق اور کافر دونوں کو شامل ہے۔ کیوں کہ جمہور اہلِ سنت کے نزدیک انبیاء علیہم السلام جملہ کبائر و صغائر سے معصوم ہوتے ہیں۔

(عمداً کان اوسهواً اوخطأً) (شرح فقہ اکبر) اور اگر امامت سے مراد سلطنت اور حکومت ہے تو ظالم سے مراد کافر اور مشرک ہے جیسا کہ قرآن حکیم میں ہے (اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ) اس صورت میں آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ کوئی کافر مسلمانوں کا حاکم نہیں ہوسکتا۔ اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ فاسق امام امیر ہوسکتا ہے یا نہیں؟ فاسق کو امام بنانا شرعاً تو جائز نہیں لیکن اگر وہ امام بن جائے اور اس کے معزول کرنے میں سخت فتنہ کا خوف ہو تو اس کی امامت پر صبر کرنا چاہیے۔ مگر اس کی اطاعت صرف امرِ معروف میں جائز ہوگی۔ اگر وہ کسی ایسی چیز کا حکم دے جس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہو تو اس کی اطاعت جائز نہ ہوگی کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (لَاطَاعَۃَ لِمَخْلُوْقٍ فِیْ مَعْصِیَۃِ الْخَالِقِ) (رواہ مالک واحمد) رہی وہ آیات جو کہ امراء کی طاعت میں وارد ہیں مثلاً (اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُوْلِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ) اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور امیروں کی جو تم میں ہوں) اور آپ (ﷺ) کا ارشاد (اطاعت کرو اور سنو اگر چہ امیر تمہارا حبشی غلام ہو) تو ان نصوص سے مراد مطلق اطاعت نہیں۔ ان امور میں وہ اطاعت مراد ہے جو شریعت کے مخالف نہیں۔ چناں چہ دوسرے مقام پر فرمایا (فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ) (اگر جھگڑا کرو تم کسی شئی میں تو اس کو اللہ و رسول کی طرف لوٹاؤ، اگر تم اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتے ہو) اس تقریر کے موافق اس آیت سے امام کا معصوم ہونا جیسا کہ روافض کا خیال ہے ثابت نہیں ہوتا۔

مسئلہ: نبی کا معصوم ہونا ضروری ہے اور یہ عصمت نبی اور فرشتہ کا خاصا ہے۔ نبی اور فرشتہ کے سوا کوئی معصوم نہیں۔ اماموں کو انبیاء کی طرح معصوم سمجھنا گمراہی اور بد دینی ہے۔ عصمتِ انبیاء کے یہ معنی ہیں کہ ان کے لیے حفظِ الٰہی کا وعدہ ہو چکا جس کے سبب ان سے صدورِ گناہ محال ہے۔ بخلاف ائمہ واکابرینِ اُولیاء کہ اللہ عزوجل انہیں محفوظ رکھتا ہے۔ ان سے گناہ نہیں ہوتا اگر ہو تو شرعاً محال نہیں۔

مسئلہ: انبیاء علیہم السلام شرک و کفر اور ہر ایسے امر سے جو خلق کے لیے باعثِ نفرت ہو جیسے

کذب وخیانت، جہل وغیرہا صفاتِ ذمیمہ سے نیز ایسے افعال جو وجاہت اور مروت کے خلاف ہیں قبل از نبوت اور بعد از نبوت بالاجماع معصوم ہیں اور کبائر سے مطلقاً معصوم ہیں اور حق یہ ہے کہ عمداً اور قصداً صغائر سے بھی قبل از نبوت اور بعد از نبوت معصوم ہیں۔(شرح فقہ اکبر)

قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ: (فرمایا میں تمہیں لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں) امام اُمَّۃٌ سے بنا ہے جس کا معنی قصد کرنا، لغت میں ہر وہ شئی امام ہے جس کی اقتداء کی جائے خواہ وہ انسان ہو جس کے قول وفعل کی اقتداء کی جائے یا کتاب وغیرہ ہو اور خواہ وہ شخص ہو جس کی پیروی کی جائے حق پر ہو یا باطل پر۔ قرآن مجید میں ہے(وَجَعَلْنَا هُمْ اَئِمَّةً يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ) (ہم نے ان کو پیشوا بنایا تھا وہ لوگوں کو دوزخ کی طرف بلاتے تھے)(مفردات امام راغب رحمۃ اللہ علیہ)

اس مقام پر امامت سے یا تو نبوت مراد ہے یا تمام لوگوں کا دینی پیشوا ہونا کہ تمام ادیان میں آپ کی عزت وعظمت ہو۔ آپ کے بعد تمام شریعتوں میں آپ کے قوانین پر عمل رہے حتیٰ کہ قرآن پاک میں ارشاد فرمایا:(ثُمَّ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ) اور فرمایا (وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرَاهِيْمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ) اور سورہ حج کے آخر میں فرمایا(مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرَاهِيْمَ) اور حضور علیہ السلام کی جمیع امت اپنی نمازوں میں پڑھتے ہیں(اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰى آلِ اِبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ) (کبیر) اصطلاح شریعت میں دینی پیشوا کو امام کہتے ہیں (کبیر)۔

قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ؕ: (عرض کی اور میری اولاد سے) یعنی ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا کہ یہ کرم میری بعض اولاد پر بھی فرما۔ تو ارشاد ہوا۔

قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۲۴﴾: (فرمایا میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچتا)۔ یہاں اس آیت کے ذکر کا مقصد یہ ہے کہ(لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ) سے معتزلہ نے استدلال کیا ہے کہ فاسق کی

امامت جائز نہیں کیوں کہ وہ ظالم ہے اور ظالم کی امامت (سربراہِ مملکت ہونا) اس نص سے جائز نہیں۔ چناں چہ صاحب کشاف اپنی تفسیر میں رقم طراز ہیں: (وقالوا فی ھذا دلیلٌ علی ان الفاسق لایصلح للامامة و کیف یصلح لها من لا یجوز حکمه وشهادته ولا تجب طاعتهٗ ولا یقبل خبره ولا یقدم للصلوة) (صفحہ نمبر ۱/۳۰۹) (یعنی (اور کہا کہ اس میں دلیل ہے کہ فاسق کی امامت کا اہل نہیں ہوسکتا) ایسا شخص امامت کا اہل کیسے ہوسکتا ہے؟ جس کا فیصلہ جائز نہ ہو جس کی گواہی جائز نہ ہو جس کی اطاعت جائز نہ ہو جس کی خبر مقبول نہ ہو جسے نماز میں امام بنانا جائز نہ ہو۔ وغیرہ وغیرہ؟

لیکن اہلِ سنت معتزلہ کے اس قول سے متفق نہیں اور وہ اس کا جواب دیتے ہیں۔ ان کے جواب کا ماحصل یہ ہے کہ اگر امام سے امام متعارف (امامتِ کبریٰ) یعنی (سربراہِ مملکت ہونا) مراد ہے تو پھر ظالم سے مراد کافر ہوگا۔ کیوں کہ (وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ) (البقرۃ آیت نمبر ۲۰۴) کافر مطلقاً ظالم ہے۔ یعنی کافر کو کسی مسلم ریاست کا امیر بنانا جائز نہیں، ور اگر امام سے مراد صاحبِ نبوت ہے تو پھر ظالم اپنے معنی پر ہوگا۔ (الظلم یقال فی ... یکثر وفیما یقل من التجاوز ھذا یستعمل فی الذنب الکبیر وفی الذنب الصغیر) (مفردات) یعنی ظلم کا اطلاق ہر قسم کے تجاوز پر ہوتا ہے۔ خواہ وہ تجاوز قلیل ہو یا کثیر۔ تو آیت کریمہ کا معنی یہ ہوا کہ کوئی فاسق مرتبہ نبوت سے سرفراز نہیں فرمایا جائے گا۔ (مدارک، نعیمی، احمدی وغیرہ) اس قولِ ثانی پر آیت سے یہ استدلال کیا جاسکتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام قبل البعث بھی کذب بیانی یا دیگر ہر قسم کے گناہوں سے معصوم ہوتے ہیں کیوں کہ ہر گناہ ظلم ہے اس لیے کہ وہ تجاوز عن الحق ہوتا ہے۔ کئی گناہوں کو قرآن میں ظلم سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ) (بیضاوی، احمدی)

مسئلہ: امام (امیرِ سلطنت) کا معصوم ہونا شرط نہیں لہٰذا فاسق وظالم کی امامت سلطنت میں جائز ہے اور اس کے حق کے مطابق کیے ہوئے فیصلے جائز ہیں۔ اس کی گواہی جائز اور

نماز میں اس کی امامت مع الکراہت جائز ہے جیسا کہ ہدایہ میں مذکور ہے۔ (ویکرہ تقدیم العبد) لانہ یتفرغ للتعلم (والاعرابی) لان الغالب فیھم الجھل (والفاسق) لانہ لایتھم لامر دینہ ...... (وان تقدمو اجاز) لقولہ علیھم السلام (صَلُّوْ خَلْفَ کُلِّ بِرٍّوَفَاجِرٍ) (اوکما قال علیہ الصلوٰۃ والسلام)۔ا

مسئلہ: اس بات پر اجماع ہے کہ انبیاء عمداً کبھی جھوٹ نہیں بولتے۔ اکثر علماء کے نزدیک سہواً بھی انبیاء سے جھوٹ صادر نہیں ہوتا (احمدی)۔

مسئلہ: جھوٹ کے سوا بقیہ گناہوں سے معصوم ہونے میں تفصیل یہ ہے کہ وہ باجماعِ امت قبل از وحی وبعد از وحی کفر سے معصوم ہوتے ہیں، اسی طرح حشویہ کے علاوہ دیگر جمہور کے نزدیک عمداً ارتکاب کبائر سے معصوم ہوتے ہیں۔

مسئلہ: انبیائے کرام سے ارتکابِ صغائر میں تفصیل یہ ہے کہ جُبائی اور ان کے متبعین کو چھوڑ کر جمہور کے نزدیک عمداً ارتکاب صغائر ناجائز ہے اور سہواً ارتکابِ صغائر بالاتفاق جائز ہے، مگر ایسے صغائر کا ارتکاب ممتنع ہے جو کہ خست ظاہر کریں۔

معتزلہ کا مذہب یہ ہے کہ وحی سے پہلے بھی انبیاء سے ارتکاب کبیرہ ممتنع ہے کیوں کہ اگر ایسا نہ ہوتو ارتکابِ کبیرہ ایسی نفرت کا سبب بن سکتا ہے جو ان کی اتباع سے مانع ہو۔ اس طرح بعثت کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔

حق بات یہی ہے کہ کسی ایسے گناہ کا صدور جو موجبِ نفرت ہو قبل از وحی بھی منع ہے۔ شیعہ کے نزدیک صغیرہ وکبیرہ قبل از وحی و بعد از وحی نبی سے گناہ کا صدور ممتنع ہے لیکن وہ تقیہ کے طور پر اظہارِ کفر کو بھی جائز قرار دیتے ہیں۔ (معاذ اللہ)

فقہِ اکبر میں حضرت سیدنا امام ابوحنیفہ (رحمۃ اللہ علیہ) سے منقول ہے کہ (انہ لا خلاف لاحدٍ فی ان نبیّنا علیہ السلام لم یرتکب صغیرۃ و کبیرۃً طرفۃ عین قبل الوحی وبعدہ)۔ (حقیقت یہ ہے کہ اس بات میں کسی کو اختلاف نہیں کہ ہمارے حضور ﷺ سے قطعاً کوئی

صغیرہ یا کبیرہ گناہ قبل از وحی یا بعد از وحی صادر نہیں ہوا)۔ نیز یہ کہ تمام انبیاء کرام لغزش سے معصوم نہیں اور لغزش یہ ہوتی ہے کہ بنی آدم سے قصد وارادہ کے بغیر صادر ہو اور وقوع کے بعد اس میں استقرار نہ ہو۔ جیسے کوئی شخص راستہ چلتے، گر پڑے۔ اس کا ارادہ گرنے کا ہر گز نہیں ہوتا اور گرنے کے بعد وہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے، گرا نہیں رہتا۔ اس بحث کے بعد ظاہر ہے کہ انبیائے کرام سے اگر کوئی ایسی بات منقول ہو جو بظاہر گناہ یا جھوٹ معلوم ہو تو اگر وہ خبرِ واحد ہے تو اس کا اعتبار ہی نہیں (عقائد قطعیہ میں خبرِ واحد معتبر نہیں مانی جاتی ہے) اور اگر تواتر سے منقول ہے تو اس کا مطلب یقیناً وہ نہیں جو بظاہر نظر آئے۔ تاحدِ امکان اس کی تاویل کی جائے گی۔ ورنہ اسے ترکِ اولیٰ پر حمل کیا جائے گا۔ یا یہ کہ قبل از بعثت ہوگی چناں چہ امام فخر الدین رازی نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کذباتِ ثلاثہ والی حدیث پر بحث کرتے ہوئے خوب لکھا کہ خلیل اللہ علیہ السلام کی طرف کذب کی نسبت کرنے کی بجائے راویانِ روایت کو کاذب کہنا زیادہ آسان ہے۔ لیکن یہ امام رازی کی اپنی رائے ہے۔ زیادہ موزوں یہ ہے کہ راویوں کے صحیح اور ثقہ ہونے کی صورت میں تاویل کی جائے۔ منکرینِ عصمتِ انبیاء علیہم السلام کے تمام اعتراضات کے جوابات بالتفصیل شرح مواقف میں مذکور ہیں۔ علاوہ ازیں اس موضوع پر حکیم الامت مفتی احمد یار خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک رسالہ بنام (قہرِ خدا بر منکرین عصمت انبیاء) لکھا ہے۔ نیز مسئلہ امامت اور عصمتِ انبیاء کے بارے میں ہمارا رسالہ (عقائدِ اسلام) ملاحظہ فرمائیں۔

نتیجہ کلام:

ظالم حکومت کے خلاف خروج (بغاوت) کا حکم؟ ہمارے ہاں اگرچہ فاسق وظالم کو امامتِ صغریٰ وکبریٰ کا منصب جلیل سپرد کرنا جائز نہیں لیکن اگر وہ زبردستی منصب امامت پر قابض ہو جائے تو، کیا اس کی حکومت کو شرعاً تسلیم کرنا ضروری ہے یا کہ نہیں؟ اس مسئلہ کی وضاحت کے لیے آئندہ چند سطور قلم بند کی گئیں ہیں۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

ظالم حکومت کے خلاف خروج کا حکم

اس کی تفصیل تو ان شاء اللہ سورہ حجرات کی تفسیر میں مذکورہ ہوگی۔ مناسبتِ مقام کی وجہ سے کچھ یہاں پر بھی درج کیا جاتا ہے۔ فقہائے کرام نے اس کے لیے مستقل باب باندھے ہیں اور مفسرین نے اس کو خاص طور پر سورہ بقرہ کی اس آیت اور سورہ حجرات کی آیت نمبر ۹ کے ماتحت خروج و بغاوت کے مسائل کا ذکر کیا ہے۔ جو لوگ ایسی ظالم حکومت کے خلاف خروج کریں گے جس کی امامت جبراً قائم ہوئی ہو اور جس کے امراء فاسق ہوں اور خروج کرنے والے عدل اور حدود اللہ کی اقامت کے لیے اٹھے ہوں اور ان کا ظاہر حال یہ بتا رہا ہو کہ وہ خود صالح لوگ ہیں۔ اس صورت میں ان کو ''باغی'' یعنی زیادتی کرنے والا گروہ قرار دینے اور ان کے خلاف جنگ کو واجب قرار دینے میں فقہا کا شدید اختلاف ہے۔ ہم اس کو یہاں بالاختصار بیان کرتے ہیں۔ للتفصیل محلٌ آخر. جمہور فقہاء اور اصحاب الحدیث کی رائے یہ ہے کہ جس امیر کی امارت ایک دفعہ قائم ہو چکی ہو اور مملکت کا امن و امان اور نظم و نسق اس کے انتظام میں چل رہا ہو وہ جو کہ عادل ہو یا ظالم اور اس کی امارت خواہ کسی طور قائم ہوئی ہو۔ اس کے خلاف خروج حرام ہے۔ (اِلَّا یہ کہ وہ کفرِ بواح (صریح) کا ارتکاب کرے)۔

صاحب مبسوط امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں کہ جب مسلمان ایک فرماں روا پر مجتمع ہوں اور اس کے ذریعے ان کو امن حاصل ہو اور راستے محفوظ ہوں۔ ایسی حالت میں اگر مسلمانوں کا کوئی گروہ اس کے خلاف خروج کرے تو جو شخص بھی طاقت رکھتا ہو اس پر واجب ہے کہ مسلمانوں کے اس حاکم فرماں روا کے ساتھ مل کر خروج کرنے والوں کے خلاف جنگ کرے (المبسوط باب الخوارج)

امام نووی شارح مسلم فرماتے ہیں کہ ائمہ یعنی مسلمان فرماں رواؤں کے خلاف خروج اور قتال حرام ہے خواہ وہ فاسق اور ظالم ہی کیوں نہ ہوں۔ اس پر امام نووی نے اجماع کا دعویٰ کیا ہے لیکن اس اجماع کا دعویٰ صحیح نہیں ہے۔ فقہائے اسلام کا ایک بڑا گروہ جس میں اکابر اہلِ علم شامل ہیں خروج کرنے والوں کو صرف باغی قرار دیتا ہے جبکہ وہ امامِ عادل کے خلاف خروج کریں۔ ظالم اور فاسق امراء کے خلاف صلحاء کے خروج کو وہ قرآن مجید کی اصطلاح کے مطابق بغاوت کا مصداق نہیں ٹھہراتے اور نہ ان کے خلاف جنگ کو واجب قرار دیتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ کا مسلک اور عمل ظالم امراء کے متعلق قتال کے معاملہ میں تاریخ داں اہلِ علم حضرات کو معلوم ہے۔ امام ابوبکر جصاص احکام القرآن میں صاف لکھتے ہیں کہ امامِ اعظم اس قتال کو نہ صرف جائز بلکہ سازگار حالت میں واجب سمجھتے تھے۔ (جلد اول صفحہ ۸۱ جلد دوم صفحہ ۳۹)۔ بنی امیہ کے خلاف زید بن علی کے خروج میں انہوں نے نہ صرف خود مالی امداد دی بلکہ دوسروں کو بھی اس کی تلقین فرمائی۔ (بحوالہ سابقہ)

منصور عباسی کے خلاف نفسِ ذکیہ کے خروج میں پوری سرگرمی کے ساتھ نفسِ ذکیہ کی حمایت فرماتے رہے اور اس جنگ کو انھوں نے کفار کے خلاف جہاد سے افضل قرار دیا۔ (الجصاص جلد ۱، صفحہ ۸۱، مناقب الامام ابوحنیفہ للکردری صفحہ ۷۱، ۲/۷۲) پھر فقہائے حنفیہ کا بھی متفقہ مسلک وہ نہیں ہے جو امام سرخسی نے بیان فرمایا ہے بلکہ کمال ابن ہمام ہدایہ کی فتح القدیر میں تحریر فرماتے ہیں (الباغی فی عرف الفقهاء الخارج من طاعته الامام الحق) (فقہاء کے عرف میں باغی وہ ہے جو امامِ حق کی اطاعت سے نکل جائے)

حنابلہ میں سے ابنِ عقیل اور ابن الجوزی امام غیر عادل کے خلاف خروج کو جائز ٹھہراتے ہیں اور اس پر سیدنا حسین (رضی اللہ عنہ) کے خروج سے استدلال کرتے ہیں۔ (الانصاف جلد ۱۰، باب قتال اہل البغی)۔ امام شافعی کتاب الام میں اس شخص کو باغی قرار دیتے ہیں جو امامِ عادل کے خلاف جنگ کرے (۱۳۵/۴)۔ امام مالک کا مسلک مالکی مذہب کی مشہور کتاب (المدونہ) میں

یہ نقل کیا گیا ہے کہ خروج کرنے والے اگر امام عدل کے خلاف جنگ کرنے کے لیے نکلیں تو ان کے خلاف مقابلہ کیا جائے۔

قاضی ابوبکر ابن العربی مالکی (احکام القرآن) میں ان کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ جب کوئی شخص عمر بن عبدالعزیز جیسے امامِ عادل کے خلاف خروج کرے تو اس کو دفع کرنا واجب ہے۔ رہا کسی دوسری قسم کا امام تو اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔ اللہ تعالیٰ کسی دوسرے ظالم کے ذریعہ اُس کو سزا دے گا اور پھر کسی تیسرے ظالم کے ذریعہ ان دونوں کو سزا دے گا۔

ایک اور قول امام مالک کا انہوں نے یہ نقل کیا ہے کہ جب ایک امام سے بیعت کی جا چکی ہو اور پھر اس کے بھائی اس کے مقابلے پر کھڑے ہو جائیں تو ان سے جنگ کی جائے گی اگر چہ وہ امامِ عادل ہوں۔

رہے یہ ہمارے زمانے کے ائمہ، ان کے لیے کوئی بیعت نہیں ہے کیوں کہ ان کے لیے بیعت زبردستی لی گئی ہے۔ پھر مالکی مذہب کا جو مسلک صاحب مدونہ امام سحنون کے حوالہ سے قاضی ابن العربی نے جو بیان کیا ہے وہ یہ ہے کہ (جنگ تو صرف امامِ عادل کے ساتھ مل کر کی جائے گی خواہ پہلا امام عادل ہو یا وہ شخص جس نے اس کے خلاف خروج کیا ہو لیکن اگر دونوں عادل نہ ہوں تو دونوں سے الگ رہو البتہ اگر تمھاری اپنی جان پر حملہ کیا جائے یا مسلمان ظلم کے شکار ہو رہے ہوں تو مدافعت کرو) یہ مسالک نقل کرنے کے بعد قاضی ابوبکر کہتے ہیں (لا نقاتل اِلّا امام عادل یقدمه اهل الحق لانفسهم) جنگ نہیں کریں گے مگر اس امام عادل کے ساتھ جیسے اہلِ حق نے اپنی امامت کے لیے آگے بڑھایا ہو تو جملہ اقوال کا خلاصہ یہ ہے کہ امام عادل کے خلاف خروج صحیح نہیں اور فاسق کے خلاف حسب استطاعت جہاد بالمال والنفس ضروری ہے۔(والله اعلم بحقيقة الاحوال وفی ذالک کفایه لمن له درایته والله ولی الهدایة)

فوائد و مسائل

ا۔ اپنی اولاد یا اہل قرابت کو پیشوا بنانے کی دعا یا کوشش حرام نہیں بلکہ سنتِ خلیل ہے۔ موسیٰ (علیہ السلام) نے کوہِ طور پر عرض کیا تھا کہ (وَاجْعَلْ لِّی وَزِیْرًا مِّنْ اَهْلِی هٰرُوْنَ اَخِی اشْدُدْ بِهٖ اَزْرِیْ) (یعنی اے پروردگار میرے بھائی ہارون کو بھی نبی بنادے) لہٰذا امیر معاویہ کا اپنے بیٹے کو اپنا جانشین بنانے کی کوشش کرنا حرام یا جرم نہیں اور نہ ہی اس بنا پر صحابی رسول ﷺ کو طعن کیا جاسکتا ہے کیوں کہ یزید پلید کا فسق بعد میں ہوا اس وقت تک وہ بظاہر نیک تھا۔ دیکھو ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کے لیے امامت کی دعا کی۔ (نعیمی)

اعتراض: اگر ظالم نبی نہیں بن سکتا تو خود انبیائے کرام نے اپنے کو ظالم کیوں کہا۔ جیسا کہ یونس علیہ السلام نے عرض کیا (اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ) آدم علیہ السلام نے عرض کیا (رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا) اگر انہوں نے سچ کہا تو گناہ ثابت ہوا اور غلط کہا تو جھوٹ ہوا اور یہ بھی گناہ۔

جواب: یہاں ظلم سے مراد غیر ارادی لغزشیں ہیں۔ بڑے لوگ عاجزی اور استغفار کے موقع پر اپنی بھول چوک کو بھی ظلم کہہ دیتے ہیں۔ (کبیر نعیمی)

اعتراض: اگر ابراہیم علیہ السلام سارے جہاں کے امام ہیں تو حضور ﷺ کے برابر ہو گئے بلکہ ان سے بڑھ گئے کیوں کہ ان کی دعوت بھی عام ہو گئی تو پھر حضور ﷺ کو سید المرسلین کیوں کہتے ہیں؟

جواب: ابراہیم علیہ السلام کے متعلق ارشاد ہوا (لِلنَّاسِ اِمَامًا) اور حضور ﷺ کے متعلق فرمایا گیا (لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا) جس سے معلوم ہوا کہ وہ تو تمام لوگوں کے مطلق امام یعنی پیشوا ہیں یعنی قیامت کے دن سب سے پہلے ان کو لباس پہنایا جائے گا۔ باعتبار ملت

ان کوتمام مسلمانوں کا باپ قرار دیا چناں چہ ارشاد ہوا(مِلَّةَ اَبِيكُمْ اِبْرَاهِيمَ) اور حضور ﷺ ملائکہ جنات وغیرہ ساری مخلوق کے نذیر یعنی نبی ہیں۔ چنانچہ فرمایا(بُعِثْتُ اِلَى الْخَلْقِ كَآفَّةً) لھٰذا آپ کی دعوت عام ہے۔ سارے جہان پر حضور ﷺ کا کلمہ پڑھنا لازم ہے۔

فائدہ:

جیسا کہ پہلے مذکور ہو چکا ہے کہ نبی کے لیے معصوم ہونا ضروری ہے کہ کبھی بھی نبی سے شرک وکفر اور گناہ وغیرہ صادر نہیں ہوسکتا کیوں کہ نبی کی اطاعت اور اس کی تعظیم بہر حال لازم ہے۔ مگر خلافت وامامت کے لیے فی الحال فاسق نہ ہونا کافی ہے۔ لہٰذا جو شخص پہلے فاسق یا کافر ہو اور پھر مسلمان ہو جائے اور سچے دل سے توبہ کر کے متقی پرہیز گار بن جائے تو وہ امامتِ صغریٰ وکبریٰ کا اہل بن سکتا ہے۔ کیوں کہ (اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهُ) نیز امیرِ سلطنت کی اطاعت بہر حال لازم نہیں بلکہ اگر خلافِ شرع حکم دے گا تو اس کی اطاعت نہ کی جائے گی بلکہ اس کی مخالفت ضروری ہے۔ شیعہ کی معتبر کتاب نہج البلاغہ میں سیدنا علی المرتضیٰ کا قول موجود ہے کہ (لابدللناس من امیرِ برٍ او فاجر) (یعنی لوگوں کے لیے ایک امیر ضروری ہے چاہے نیک ہو یا فاسق، فاجر) حالانکہ حنفیہ کے نزدیک فاسق وفاجر کو امام بنانا جائز نہیں۔(ملخصاً روح البیان، کبیر، نعیمی وغیرہ)

محبوبانِ خدا سے منسوب چیزیں متبرک ہوتی ہیں

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَاِذۡ جَعَلۡنَا الۡبَیۡتَ مَثَابَۃً لِّلنَّاسِ وَاَمۡنًا ؕ وَاتَّخِذُوۡا مِنۡ مَّقَامِ اِبۡرٰھٖمَ مُصَلًّی ؕ وَعَھِدۡنَاۤ اِلٰۤی اِبۡرٰھٖمَ وَاِسۡمٰعِیۡلَ اَنۡ طَھِّرَا بَیۡتِیَ لِلطَّآئِفِیۡنَ وَالۡعٰکِفِیۡنَ وَالرُّکَّعِ السُّجُوۡدِ (سورۃ البقرۃ:۱۲۵)

''اور یاد کرو جب ہم نے اس گھر کو لوگوں کے لیے مرجع اور امان بنایا اور ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز کا مقام بناؤ اور ہم نے تاکید فرمائی ابراہیم و اسمٰعیل کو کہ میرا گھر خوب ستھرا کرو طواف والوں، اعتکاف والوں اور رکوع وسجود والوں کے لیے۔''

تفسیر:

وَاِذۡ جَعَلۡنَا الۡبَیۡتَ مَثَابَۃً لِّلنَّاسِ وَاَمۡنًا ؕ: (اور یاد کرو جب ہم نے اس گھر کو لوگوں کے لیے مرجع اور امان بنایا) البیت سے مراد کعبہ شریف ہے اور اس میں تمام حرم شریف داخل ہے۔ جس کی حدود یہ ہیں۔ (کذا فی تفسیرات احمدیہ)

مَثَابَۃً لِّلنَّاسِ : (یعنی کعبہ کو ہم نے مرجع بنادیا) کہ چاروں طرف سے لوگ وہاں آتے ہیں یا یہ کہ ثواب کی جگہ بنادی کہ لوگ وہاں حج وعمرہ اور نماز ادا کر کے ثواب حاصل کرتے ہیں۔ چناں چہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ (مسجد حرام کی ایک نماز لاکھ نمازوں کے برابر ہے)۔ (ابنِ ماجہ)

وَاَمۡنًا : (یعنی خانہ کعبہ کو ہم نے امن کی جگہ بنایا)۔ امن بنانے سے مراد ہے کہ حرم کعبہ میں قتل و غارت حرام ہے یا یہ کہ وہاں شکار تک کو امن ہے۔ یہاں تک کہ حرم شریف میں شیر بھیڑیے بھی

شکار کا پیچھا نہیں کرتے بلکہ چھوڑ کر لوٹ جاتے ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ مومن اس میں داخل ہو کر عذاب سے مامون ہو جاتا ہے۔ حرم کو حرم اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس میں قتل، ظلم شکار، حرام و ممنوع ہے۔ (خزائن العرفان، احمدی وغیرہ) اگر کوئی مجرم بھی داخل ہو جائے تو وہاں اس سے تعرض نہ کیا جائے گا۔ (مدارک) لیکن اس کو حرم سے باہر نکلنے پر مجبور کیا جائے گا۔

وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى: (اور ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز کا مقام بناؤ) مقامِ ابراہیم وہ پتھر ہے جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم نے کعبہ معظمہ کی تعمیر فرمائی۔ اس میں آپ کے قدم مبارک کا نشان تھا۔ پھر لوگوں کے ہاتھ پھیرنے سے مٹ گیا۔ ابنِ عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ رکن اور مقام دونوں جنت کے یاقوت ہیں۔ اللہ نے ان کے نور کو سلب کر دیا ہے۔ اگر ان کا نور رہتا تو یہ مشرق سے مغرب تک کو روشن کر دیتے۔ اس کو نماز کا مقام بنانے کا امر استحبابی ہے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ اس نماز سے طواف کی دو رکعتیں مراد ہیں۔ مسلم نے حدیث طویل میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ جب ہم حضور ﷺ کے ہمراہ بیت اللہ تک آئے تو حضور ﷺ نے رکن کو بوسہ دیا اور تین مرتبہ رمل فرمایا اور چار مرتبہ معمول کے مطابق چلے۔ پھر مقامِ ابراہیم کے پاس آئے اور آیت (وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرَاهِيْمَ مُصَلًّى) تلاوت فرما کر نماز پڑھی اور مقام کو اپنے اور بیت اللہ کے درمیان لیا۔

مسئلہ: امام ابوحنیفہ اور مالک رحمہما اللہ کے نزدیک طواف کے ہر سات چکروں کے بعد دو رکعت پڑھنا واجب ہیں۔ (مظہری)

مسئلہ: طواف کی دو رکعت تمام مسجد میں بلکہ مسجد کے باہر بھی بالاتفاق جائز ہیں۔

مسئلہ: اس آیت سے معلوم ہوا کہ بزرگوں کی چیزوں کی تعظیم کرنا اور اس سے برکت لینا قرآنِ کریم سے ثابت ہے۔ امتِ مسلمہ کا اس پر عمل ہے۔ مقامِ ابراہیم ایک پتھر

ہے۔اس کی یہ تعظیم صرف اس لیے نہیں کہ وہ جنتی ہے بلکہ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس پر خلیل اللہ علیہ السلام کے مبارک قدم پڑے۔اسی لیے زمانہ ابراہیمی سے پہلے اس کی وہ تعظیم نہ ہوتی تھی۔جواب ہے کہ تمام لوگوں کے سراس کی طرف جھکتے ہیں۔اس لیے قرآن کریم نے اس پتھر کو مقامِ ابراہیم کہا نہ جنت کا پتھرتا کہ معلوم ہوا کہ اس پتھر کی تعظیم وتوقیر اس لیے ہے کہ وہ ابراہیم علیہ السلام کا جائے قیام ہے۔(نعیمی)

حضرت علامہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کے ماتحت رقم طراز ہیں۔

ولا هل الاعتبار ههنا استنباط وهو ان فی کل مکان مکث فیه رجلٌ من اهل اللّٰه تعالیٰ حینما من الدهر ینزل هناک برکات من السماء و سکینةٌ تجذب القلوب الی اللّٰه تعالیٰ ویتضاعف هناک اجر الحسنات وکذا وزر السئیات (واللّٰه اعلم) (مظہری جلد اول)

بزرگانِ دین یہاں سے یہ استنباط کرتے ہیں کہ جس جگہ اولیاء اللہ میں سے کوئی شخص ایک مدت تک رہے وہاں آسمان سے برکات اور سکینہ اترتی ہے اور اس کے سبب اللہ تعالیٰ کی طرف دل کھنچتے ہیں اور وہاں نیک کام پر اجر کئی گنا ملتا ہے۔ایسے وہاں گناہ کرنے پر عذاب بھی کئی گنا۔

تبرکات کی تعظیم اور ان سے برکت حاصل کرنے کا مسئلہ بہت سی آیات قرآنیہ اور احادیث مبارکہ سے ثابت ہے۔تفصیل کے لیے امام احمد رضا فاضل بریلوی رحمۃ اللہ کا رسالہ ابر المقال اور مفتی احمد یار خاں مرحوم کی (جاء الحق) دیکھئے۔

اجماع امّت حجت ہے

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَكَذٰلِكَ جَعَلۡنٰكُمۡ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوۡنُوۡا شُهَدَآءَ

عَلَى النَّاسِ وَيَكُوۡنَ الرَّسُوۡلُ عَلَيۡكُمۡ شَهِيۡدًا ۔ (سورۃ البقرۃ:۱۴۳)

''اور بات یوں ہی ہے کہ ہم نے تمہیں سب امتوں میں افضل کیا کہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور رہوں یہ رسول تمہارے نگہبان اور گواہ۔''

تفسیر:

(وَكَذٰلِكَ): یہاں ک حرف تشبیہ اور ذالک اسم اشارہ ہے۔ اس میں بہت سے اقوال ہیں کہ تشبیہ کس سے دی جا رہی ہے اور ذالک کا مشار الیہ کیا ہے۔ بعض نے فرمایا کہ اس سے یہدی کی طرف اشارہ ہے یعنی جس طرح ہم نے تم کو سیدھی راہ کی ہدایت کی اسی طرح تم کو امّتِ معتدل (افضل) بنایا یا (وَلَقَدِ اصۡطَفَيۡنٰهُ فِى الدُّنۡيَا) الایۃ کے مضمون کی طرف اشارہ ہے۔ اس تقدیر پر معنی یہ ہوں گے کہ جس طرح ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو برگزیدہ کیا اسی طرح تم کو بہتر امّت بنایا۔ (مظہری) صاحب تفسیرِ کبیر فرماتے ہیں کہ پورے جملے (لِلّٰهِ الۡمَشۡرِقُ) الخ کی طرف اشارہ ہے یعنی جیسے مشرق و مغرب سب اللہ ہی کا ہے لیکن بعض جگہ کو عزت دی کہ اسے قبلہ بنایا۔ ایسے سب اللہ کے بندے ہیں لیکن تمہیں عزت دی کہ سب سے افضل کیا۔ بعض نے کہا کہ یہ اشارہ غیر مذکورہ چیز کی طرف ہے کیوں کہ کبھی کبھی ضمیر بغیر ذکرِ مرجع آ جاتی ہے جیسے کہ (اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰهُ فِىۡ لَيۡلَةِ الۡقَدۡرِ) لیکن ان سب سے بہتر ترجمہ امامِ اہلِ سنّت مولانا الشاہ احمد رضا فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے کہ (کــــذالک) ایک پوشیدہ لفظ کی مبتداء یا خبر ہے اور (ذالک) سے آئندہ کلام کی طرف اشارہ یعنی بات یہی ہے کہ ہم نے تمہیں افضل کیا۔ اس لیے کہ ہم نے تمہیں

افضل کیا کہ اس لیے کہ اس میں محذوفات بھی کم ہیں اور کلام بھی نیا۔ مذکورہ بالا صورتوں میں جملہ محذوف ماننا پڑتا ہے۔(نعیمی)

جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا: (ہم نے تمہیں سب امتوں پر افضل کیا) یعنی ہم نے تم کو اوروں سے بہتر اور عادل علم و معرفت سے آراستہ بنایا۔ امام احمد اور حاکم نے بروایت حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ مرفوعاً بیان کیا اور اس حدیث کو صحیح بھی قرار دیا ہے کہ وسطاً کے معنی عدلاً (معتدل) لفظ وسط ایسی درمیانی جگہ کو کہتے ہیں جس کے ہر جانب کا فاصلہ برابر ہو۔ پھر خصائلِ محمودہ کے لیے مجازاً اس کا استعمال کیا جانے لگا کیوں کہ اچھے خصائل افراط و تفریط کے درمیان ہی ہوتے ہیں۔ جیسے جواد اسراف اور بخل کے درمیانی درجہ کا نام ہے اور شجاعت تہور اور بزدلی کے بین بین۔ پھر اس کا اطلاق خود اس شخص پر ہونے لگا جو خصائلِ محمودہ سے آراستہ ہو واحد جمع مذکر مونث سب پر اس کا اطلاق آتا ہے۔(بیضاوی) چناں چہ ارشاد باری تعالیٰ ہے (قَالَ اَوْسَطُهُمْ) (کہا اس شخص نے جو ان میں سے بہتر تھا)۔

الحاصل امت وسط ایک ایسا اعلیٰ اور اشرف گروہ ہے جو عدل و انصاف اور توسط و اعتدال کی روش پر قائم ہو۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک روز سرورِ عالم ﷺ بعد عصر کے کھڑے ہوئے اور جو کچھ قیامت تک واقعات ہونے والے تھے آپ نے ایک ایک کا ذکر فرمایا حتٰی کہ جب دھوپ درختوں کی چوٹیوں اور دیواروں کی منڈیروں پر چلی گئی تو آپ ﷺ نے کہا دنیا کی عمر اب اتنی ہی باقی ہے جس قدر یہ دن اور اسی قدر یہ گذر چکی جس قدر کہ دن گزر چکا یاد رکھو اس امت (امت محمدیہ) نے ستر کا عدد پورا کیا ہے اور ان سب سے اللہ کے نزدیک یہ امت بہتر اور بزرگ ہے۔(بغوی، ترمذی، ابنِ ماجہ، دارمی)

حضرت ابنِ عباس نے کعب احبار سے دریافت کیا کہ رسول اللہ ﷺ کے اوصاف کا بیان تورات میں کس طرح ہے؟ انہوں نے کہا کہ: ہم نے تورات میں لکھا ہوا پایا کہ وہ محمد بن عبداللہ ہیں، مکہ میں پیدا ہونگے اور طابہ (مدینہ طیبہ) کی طرف ہجرت فرمائیں گے اور ملکِ شام ان کے

قبضہ میں ہو جائے گا، نہ وہ بدزبان ہوں گے اور نہ بازاروں میں شور مچانے والے اور برائی کے بدلے میں برائی نہ کریں گے بلکہ درگزر کریں گے۔ ان کی امت اللہ کی حمد بہت کرنے والی ہوگی۔ ہر سختی اور نرمی، خوشی اور غم کی حالت میں اللہ کی حمد کرے گی۔ بلند جگہ پر چڑھتے ہوئے تکبیر کہے گی اور اپنے دست و پاء کو وضو سے منور کرنے والی ہوگی۔ وسطِ کمر پر تہ بند باندھیں گے۔ نمازوں میں ایسی صف بندی کریں گے جیسی کہ لڑائی میں۔ مسجدوں میں ان کی آوازیں شہد کی مکھی کی آواز سی نرم اور پست ہوں گی۔ لیکن نہ اتنی پست کہ دوسرا نہ سن سکے۔ (دارمی بحوالہ مظہری)

لِتَكُونُوا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ: (کہ تم لوگوں پر گواہ ہو) شہداء شہید کی جمع ہے اور اس کا معنی کسی چیز کا مشاہدہ کرنا خواہ بصر سے ہو یا بصیرت سے اور صرف حاضر ہونے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے (مفردات) گواہ کو شہید اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ موقع پر حاضر ہوتا ہے۔ یعنی قیامت کے روز امت محمدیہ حق تعالیٰ کے سامنے گواہی دے گی کہ انبیآء نے اپنی امت کو احکام پہنچادیے۔ یہاں یہی معنی گواہ ہونے کے ہیں اور (لتکونو) الایۃ امتِ محمدیہ کو عادل بنانے کی علّت ہے۔ اس آیت سے یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ شہادت کے لیے عدالت شرط ہے۔ (مظہری)

مسئلہ: دنیا میں مسلمان کی شہادت مومن کافر سب کے حق میں شرعاً معتبر ہے اور کافر کی شہادت مسلمان پر معتبر نہیں۔

مسئلہ: اموات کے حق میں بھی اس امت کی شہادت معتبر ہے۔ رحمت و عذاب کے فرشتے اس کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ حدیث شریف میں ہے کہ سید عالم ﷺ کے سامنے سے ایک جنازہ گزرا۔ صحابہ (رضی اللہ عنہم) نے اس کی تعریف کی۔ حضور ﷺ نے فرمایا: واجب ہوگئی- پھر دوسرا جنازہ گزرا تو صحابہ (رضی اللہ عنہم) نے اس کی برائی کی۔ حضور ﷺ نے فرمایا: واجب ہوگئی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا کہ حضور کیا چیز واجب ہوئی؟ فرمایا: پہلے جنازے کی تم نے تعریف کی، اس کے لیے جنت واجب ہوئی اور دوسرے کی تم نے برائی بیان کی، اس کے لیے دوزخ واجب ہوئی (کیوں کہ) (أَنْتُمْ شُهَدَآءُ اللّٰهِ فِي الْأَرْضِ) (تم زمین میں اللہ کے

شہداء (گواہ) ہو) (متفق علیہ) بعض روایات میں آتا ہے کہ حضور ﷺ نے پھر یہ آیت تلاوت فرمائی۔

مسئلہ: یہ تمام شہادتیں صلحاءِ امت اور اہلِ صدق کے ساتھ خاص ہیں اور ان کے معتبر ہونے کے لیے زبان کی نگہداشت شرط ہے۔ جو لوگ زبان کی احتیاط نہیں کرتے اور بے جا خلافِ شرع کلمات ان کی زبان سے نکلتے ہیں اور ناحق لعنت کرتے ہیں۔ صحاح کی حدیث میں ہے کہ (روزِ قیامت نہ وہ شافع ہوں گے اور نہ شاہد)۔ (خزائن العرفان)

اس امت کی ایک شہادت یہ بھی ہے کہ آخرت میں تمام اولین و آخرین جمع ہوں گے اور کفار سے فرمایا جائے گا کہ کیا تمہارے پاس میری طرف سے ڈرانے اور احکام پہنچانے والے نہیں آئے تھے؟ تو وہ انکار کریں گے اور کہیں گے کہ کوئی نہیں آیا۔ حضرات انبیاء کرام سے دریافت فرمایا جائے گا وہ عرض کریں گے کہ یہ جھوٹے ہیں ہم نے انہیں تبلیغ کی۔ اللہ تعالیٰ باوجود کہ عالم الغیب ہے مگر اتمامِ حجت کے لیے انبیاء کرام سے گواہ طلب فرمائے گا۔ اس وقت امتِ محمدیہ ﷺ حاضر ہوگی اور گواہی دے گی کہ ان حضرات نے سب احکام پہنچادیئے۔ کفار بولیں گے انہیں کیسے معلوم ہوا؟ یہ تو ہم سے برسوں بعد پیدا ہوئے۔ دریافت کیا جائے گا کہ (اے امت محمد (ﷺ)) تم کیسے جانتے ہو؟ عرض کریں گے۔ یارب تو نے ہماری طرف اپنے رسول محمد مصطفیٰ ﷺ کو بھیجا۔ قرآن پاک نازل فرمایا، ان کے ذریعہ سے ہم قطعی یقینی طور پر جانتے ہیں کہ حضرات انبیاء علیہم السلام نے فرضِ تبلیغ علی وجہ الکمال ادا کیا۔ پھر سید الانبیا ﷺ سے آپ کی امت کی نسبت دریافت فرمایا جائے گا۔ حضور ﷺ اپنے غلاموں کی سچائی اور عدالت کی گواہی دیں گے اور تصدیق فرمائیں گے جس کا ذکر آیت کے آئندہ جز میں آرہا ہے۔ (مظہری، خزائن العرفان) (ملخصاً من البخاری والترمذی، والنسائی، والبیہقی وغیرہ)۔

مسئلہ: اس سے معلوم ہوا کہ اشیاء معروفہ میں شہادت تسامع کے ساتھ بھی جائز ہے یعنی جن چیزوں کا علم یقینی سننے سے حاصل ہو اس پر بھی شہادت دی جاسکتی ہے۔

وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا :(اور یہ رسول تمہارے نگہبان و گواہ) یہاں الرسول سے مراد حضور نبی کریم ﷺ ہیں اور شہید (گواہ) چوں کہ مثلِ رقیب یعنی نگراں و نگہبان کے ہوتا ہے اور رقیب کا صلہ علیٰ آتا ہے اس لیے شہید کا صلہ بھی علیٰ لائے اگر چہ بظاہر لام لانا مناسب معلوم ہوتا تھا (مظہری) یعنی تم تو اوروں کے خلاف گواہی دو گے اور نبی کریم ﷺ تمہاری تائید و تصدیق فرمائیں گے اور تمہارے عادل ہونے کی گواہی دیں گے کہ یہ فاسق و فاجر نہیں کیوں کہ وہ تم میں سے ہر ایک کے سارے حالات سے پورے واقف ہیں۔ (نعیمی)

چناں چہ حضرت الشاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اس مقام پر فرماتے ہیں۔

زیرا کہ او مطلع است بہ نور نبوت بر رتبۂ ہر متدین بدین خود کہ در کدام درجہ از دین من رسیدہ و حقیقتِ ایمان او چیست و حجابی کہ بداں از ترقی محجوب ماندہ است کدام است پس او میشناشد گناهاں شمارا و درجات ایمان شمارا و اعمالِ نیک و بدشمارا ـ واخلاص و نفاق شمارا ولهٰذا شهادت او در دنیا بحکمِ شرع در حقِ امت مقبول و واجب العمل است و آنچه او از فضائل و مناقبِ حاضراں زمان خود مثلِ صحابه و ازواج و اهل بیت یا غائباں از زمان خود مثل ادریس و مهدی و مقتول دجال یا از معایب و مثالب

اس لیے کہ حضور ﷺ اپنے نورِ نبوت سے ہر دین دار کے رتبۂ دینی پر مطلع ہیں کہ وہ میرے دین کے کون سے درجہ پر پہنچا ہے اور اس کے ایمان کی حقیقت کیا ہے اور وہ کون سا حجاب ہے جس کی وجہ سے ترقی سے مجوب رہا ہے۔ پس حضور ﷺ تمہارے گناہوں اور درجاتِ ایمان اور تمہارے نیک و بد اعمال اور تمہارے اخلاص و نفاق کو پہچانتے ہیں لہٰذا آپ کی شہادت دنیا میں بحکم شرع امت کے حق میں مقبول اور واجب العمل ہے اور آپ نے مثل صحابہ اور ازواج اور اہلِ بیت اپنے زمانے کے حاضرین کے فضائل و مناقب یا مثل ادریس و مہدی اور مقتول دجال اپنے زمانہ کے غائبین یا حاضرین و غائبین

حاضراں و غائباں می فرماید اعتقاد بر آں واجب است و ازیں است که در روایات آمده که هر نبی را بر اعمال امتیان خود مطلع میسا زند که فلاں نو امروز چنیں می کند و فلاں چناں تا روز قیامت ادائے شهادت تواند کرد الخ (تفسیر عزیزی)

کے عیوب ونقائص بیان فرمائے ہیں۔اس پر اعتقاد ضروری ہے اور یہی وجہ ہے کہ روایات میں آیا ہے کہ ہر نبی کو اپنے امتیوں کے اعمال پر مطلع کیا جاتا ہے کہ فلاں شخص یہ عمل کرتا ہے اور فلاں اس طرح تا کہ قیامت کے دن گواہی دے سکیں۔

(۲) حضرت الشیخ اسماعیل حقی المتوفی ۱۱۳۷ھ، صاحب تفسیر روح البیان نے بھی اسی مقام پر نقل فرمایا ہے۔

ومعنٰی شهادة الرسول علیهم اطلاعهٗ علی رتبة کل متدین بدینه و حقیقته التی هو علیها من دینه و حجابه الذی هو به محجوبٌ عن کمال دینه فهو یعرف ذنوبهم و حقیقة ایمانهم و اعمالهم و حسناتهم و سیاتهم و اخلاصهم ونفاقهم وغیر ذالک بنور الحق وامته یعرفون ذالک من سائر الامم بنوره علیه الصلوة والسلام

بعض لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ یہ عبارت شاہ صاحب کی نہیں بلکہ الحاقی ہے۔دعوٰی بلا دلیل ہے۔ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ}

سید المحققین سند المحدثین حضرت الشیخ عبدالحق محدث دہلوی قدس سرہ فرماتے ہیں:

با چندیں اختلافات و کثرت مذاہب کہ در علماء امت است یک کس رادریں مسئلہ خلافی نیست کہ آں حضرت ﷺ بحقیقت حیات بی شائبۂ مجاز تو ہم تاویل دائم وباقی است و بر اعمالِ امت حاضر و ناظر ومر طالبان حقیقت را متوجہاں انحضرت را مفیض ومربی است.

اتنے اختلافات اور کثرت مذاہب کے باوجود جو علمائے امت میں ہیں کسی شخص کو اس مسئلہ میں اختلاف نہیں ہے کہ آنحضرت ﷺ بے شائبہ مجاز اور توہم تاویل حقیقی حیات کے ساتھ دائم اور باقی ہیں اور اعمال امت پر حاضر و ناظر ہیں اور طالبانِ حقیقت اور توجہ کرنے والوں کے لیے خصوصی طور پر فیضِ رساں اور تربیت کنندہ ہیں۔

(رسائل اقرب السبل برحاشیہ اخبار الاخیار)

اور علامہ ابن حاج صاحب مدخل فرماتے ہیں:

کہ زائر جب حضور ﷺ کے سامنے کھڑا ہو تو آدابِ زیارت میں یہ ہے کہ یہ تصور کرے کہ میں حضور ﷺ کے سامنے ایسے کھڑا ہوں جیسا کہ وہ اپنی حیات میں ہیں۔(اذلا فرق بین موتہ وحیاتہ اعنی فی مشاهدتہ لامتہ و معرفتہ باحوالهم ونیاتهم وعزائمهم و خواطرهم وذلک عنده جلی لاخفی فیہ...... فلذالک یشهد علیهم) اس مسئلہ کی مزید تفصیل کے لیے (عقائد اسلام) ان کی تحریر کردہ دیکھئے۔

فوائد آیت کریمہ:

۱۔ گواہی لینا اور واقعہ کی تحقیق کرنا علمِ غیب کے منافی نہیں۔ رب تعالیٰ علام الغیوب ہے مگر گواہی اور تحقیقات کے بعد فیصلہ فرمائے گا۔ اسی طرح حضور ﷺ نے جو ام المومنین عائشہ صدیقہ (رضی اللہ عنہا) کی تہمت یا دیگر واقعات کی تحقیقات فرمائی۔ اس سے آپ کی بے

علمی ثابت نہیں ہوتی بلکہ یہ دشمن کا منہ بند کرنے کے لیے کہ کوئی طرفداری کا الزام نہ لگائے۔

۲۔ حضورﷺ کو قیامت تک کے واقعات کی خبر ہے اور آپ سب پر مطلع اور حاضر و ناظر ہیں۔ اس لیے کہ قیامت میں محض سنی ہوئی گواہی تو مسلمان بھی دیں گے۔ اگر حضور کی بھی گواہی سنی ہوئی ہوتی تو کفار اس پر بھی جرح کر دیتے۔ نیز (عَلَیۡکُمۡ شَہِیۡدًا) سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورﷺ ہر مسلمان کے ہر حال سے خبردار ہیں۔ شہید بمعنی مطلع بھی آتا ہے (وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ شَہِیۡدٌ) نیز جیسا کہ پہلے بحوالہ گزرا کہ حضورﷺ اپنے نور نبوت سے ہر شخص کی ایمانی حالت اور اس کا دینی درجہ جانتے ہیں۔ تو حضورﷺ کی امتِ مرحومہ کے بعض اولیآء بھی کرامۃً یہ ساری باتیں جانتے ہیں۔ چناں چہ حضرت سیدنا غوث الثقلین فرماتے ہیں۔

نَظَرۡتُ اِلٰی بِلَادِ اللّٰہِ جَمۡعًا کَخَرۡدَلَۃٍ عَلٰی حُکۡمِ اتِّصَالِیۡ

۳۔ علمآء نے اس آیت کو اجماع امتِ محمدیہ کے احکام میں حجت ہونے کی دلیل ٹھہرایا ہے کیوں کہ اگر مسئلہ اجماعی واجب القبول نہ ہو تو امت کا غیر عادل ہونا لازم آئے گا۔ (مظہری) لہٰذا مسلمانوں کا اجماع حجت لازم القبول اور شرعی دلیل ہوگا۔

۴۔ محافلِ میلاد شریف، گیارھویں، عرس وغیرہ سارے امور مستحب ہیں کیوں کہ عرب و عجم کے مسلمان علماء مشائخ اسے مستحب جانتے اور چوں کہ یہ خدا کے گواہ ہیں اسلیے یہ چیزیں اللہ کے نزدیک بھی مستحب۔

آخر میں ہم تفسیرِ کبیر، عزیزی، خزائن العرفان، روح البیان اور دیگر احادیث صحیحہ سے لی گئی ایک تقریر بطورِ خلاصہ تفسیر کے حکیم الامت مولانا مفتی احمد یار خان رحمتہ اللہ کے الفاظ میں نقل کرتے ہیں پڑھئے اور اپنے ایمانوں کو تازہ کیجئے۔

اے مسلمانوں! جیسے ہم نے تمہیں بہتر قبلہ، بہتر پیغمبر، بہتر کتاب عطا فرمائی ایسے ہی تم پر یہ بھی کرم فرمایا کہ تمہیں عقائد واعمال کے لحاظ سے درمیانی امت بنایا کہ نہ تم یہودیوں کی طرح انبیآء کے دشمن اور نہ عیسائیوں کی طرح ان کو خدا کہو، نہ دہریوں کی طرح خدا کے منکر اور نہ مشرکین کی طرح چند معبودوں کے قائل، نہ جبریوں کی طرح بندے کو بالکل مجبور مانو اور نہ قدریوں کی طرح تقدیر کا انکار کرو غرض یہ کہ تمہارا عقیدہ درمیانہ ہے۔ یہ ہی اعمال کا حال نہ تو تم عیسائی راہبوں اور ہندو جوگیوں کی طرح تارک الدنیا اور نہ ہی دیگر دنیا داروں کی طرح آخرت سے غافل بلکہ تمہارے ایک ہاتھ میں دنیا اور دوسرے میں دین بلکہ تمہاری دنیا بھی دین یا یہ کہ تم کو ساری امتوں کا صدر اور سردار بنایا جیسے مجلس کے بیچ میں سردار اور ہار کے بیچ میں بڑا موتی یا دائرہ کے بیچ میں مرکز یا صف کے درمیان امام ایسے تمام امتوں میں تم صدر نشین ہو کہ سب تمہاری پیروی کریں اور تم سب کے استاد یا ہم نے تمہیں سب سے بہتر امت بنایا کہ تمہیں شریعت بھی دی اور طریقت بھی اور تم میں قیامت تک کے لیے علماء اور اولیاء چھوڑے تمہارا کام تھوڑا اور ثواب زیادہ، تم اس بارش کی طرح ہو جس کا اول بھی بہتر اور آخر بھی تمہارے اول صحابہ تمہارے درمیان اولیآء، علماء اور تمہارے اخیر امام مہدی، عیسی علیہ السلام یا تمہیں عادل امت بنایا کہ تمہاری گواہیوں سے مقدمات کے فیصلے ہوں اور تمہاری گواہی سب پر جاری اور تم پر کسی کی نہ ہو۔ یہ فضائل تمہیں اس لیے دیئے کہ تم دنیا میں لوگوں پر گواہ ہو اس طرح کہ تمہاری گواہی کافر پر بھی معتبر ہو اور اس طرح کہ تم جس کو ولی اور جنتی کہہ دو۔ وہ حقیقت میں ولی ہی ہو اور جسے تم برا اور جہنمی کہہ دو وہ ایسا ہی ہو اور اس طرح کہ جس کام کو تم جائز اور مستحب جانو، وہ ایسا ہی ہو۔ اور جس چیز کو تم بہتر جانو، وہ بہتر۔ گویا تمہاری زبان حق کا قلم ہے۔ اور اس طرح کہ تمہارا اجماع شرعی دلیل ہے یعنی جس چیز کے حلال، حرام ہونے پر تم متفق ہو جاؤ وہ یقیناً ایسی ہی ہو یا کہ تم پچھلے کفار کے خلاف گواہ ہو جبکہ قیامت میں گذشتہ پیغمبروں کی نافرمان امتیں انبیآء کی تبلیغ کا انکار کریں گی اور انھیں رب کے سامنے اتہام لگائیں گی کہ مولی ہم تک تیرے احکام انہوں نے پہنچائے ہی نہیں۔ انبیاء عرض کریں

گے کہ یہ جھوٹے ہیں، ہم نے تبلیغ کی اور انہوں نے نہ مانی، پیغمبروں کو حکم ہوگا کہ آپ تبلیغ کے مدعی ہیں اور یہ لوگ انکاری۔ اپنے گواہ پیش کرو، وہ امتِ مصطفٰی ﷺ کو پیش کریں گے مسلمان انبیآء کی گواہی دیں گے جس پر کفار جرح کریں گے کہ تم پیچھے آئے۔ بغیر دیکھے کیونکر گواہی دے رہے ہو۔ مسلمان عرض کریں گے کہ مولی ہم نے تیرے محبوب ﷺ سے سنا تب حضور ﷺ کی طلبی ہوگی اور آپ مسلمانوں کے متعلق دو گواہیاں دیں گے۔ ایک یہ کہ یہ سچے ہیں، دوسرے یہ کہ خدایا یہ مسلمان گواہ فاسق و فاجر نہیں بلکہ پرہیزگار اور قابل گواہی ہیں۔ تب انبیاء کے حق میں ڈگری ہوگی۔ اور اے مسلمانو! ہمارا یہ آخری پیغمبر ﷺ دنیا میں بھی تمہارا گواہ ہے کہ اس نے فرمادیا کہ جس کام کو مسلمان اچھا جانیں وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھا (مشکوۃ) اور اس نے فرمایا کہ تم زمین پر اللہ کے گواہ ہو جسے تم جنتی کہو وہ جنتی جسے تم دوزخی کہو وہ دوزخی (مشکوۃ باب المشی بالجنازۃ) اور انہوں نے فرمایا (لَا تَجْتَمِعُ اُمَّتِیْ عَلَی الضَّلَالَۃِ) (میری امت گمراہی پر جمع نہ ہوگی) اور انہوں نے فرمایا کہ میری امت میں ایک جماعت ہمیشہ حق پر رہے گی نیز وہ آخرت میں بھی تمہارے عیب چھپائیں گے اور تمہاری خوبیوں کی گواہی دیں گے۔

خیال رہے! کہ قیامت میں چار گواہیاں ہوں گی۔ ایک کاتبینِ اعمال فرشتوں کی۔ قرآن کریم فرماتا ہے (وَجَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّ شَهِيْدٌ) دوسرے انبیاء کرام۔ ارشاد فرمایا (فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا) تیسری امت مصطفٰی ﷺ کی جس کا یہاں ذکر ہوا۔ چوتھے مجرم کے ہاتھ پاؤں کی (وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ)۔ (نعیمی)

نماز میں استقبالِ قبلہ فرض ہے

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

قَدۡ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجۡهِكَ فِى السَّمَآءِ‌ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبۡلَةً تَرۡضٰٮهَا ‌ۖ فَوَلِّ وَجۡهَكَ شَطۡرَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَـرَامِ‌ؕ وَحَيۡثُ مَا كُنۡتُمۡ فَوَلُّوۡا وُجُوۡهَكُمۡ شَطۡرَهٗ ‌ؕ وَاِنَّ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ لَيَعۡلَمُوۡنَ اَنَّهُ الۡحَـقُّ مِنۡ رَّبِّهِمۡ‌ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعۡمَلُوۡنَ

(سورۃ البقرۃ:۱۴۴)

''ہم دیکھ رہے ہیں بار بار تمہارا آسمان کی طرف منہ کرنا تو ضرور ہم تمہیں پھیر دیں گے اس قبلہ کی طرف جس میں تمہاری خوشی ہے۔ ابھی اپنا منہ پھیر دو مسجد حرام کی طرف اور اے مسلمانوں! تم جہاں کہیں بھی ہو اپنا منہ اسی کی طرف کرو اور وہ جنہیں کتاب ملی ہے ضرور جانتے ہیں کے یہ ان کے رب کی طرف سے حق ہے اور اللہ اس سے بے خبر نہیں جو وہ کرتے ہیں۔''

ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں بیت المقدس کی طرف حسب روایت براء ابن عازب رضی اللہ عنہ سولہ یا سترہ ماہ نماز پڑھی۔ حق یہ ہے کہ سولہ ماہ اور کچھ دن پڑھی کیوں کہ حضور ﷺ نے مکہ سے ربیع الاول کی پانچویں تاریخ بروز دوشنبہ ہجرت فرمائی اور مدینہ میں بارھویں ربیع الاول روز دوشنبہ کو تشریف لائے اور تحویل قبلہ کا حکم قول صحیح کے موافق ۱۵ رجب ۲ ہجری واقعہ بدر سے دو ماہ پہلے بوقت زوال ہوا۔ ؁ جمہور علماء نے اسی قول کو معتبر ٹھہرایا۔ اور سترہ مہینے جو بعض کا قول ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ دنوں کو پورا مہینہ شمار کر کے سترہ مہینے کہہ دیتے ہیں۔ بعض روایات جو تیرہ یا انیس یا

اٹھارہ مہینے یا دو ماہ یا دو برس آئے ہیں یہ سب اقوال ضعیف ہیں۔ (مظہری)
مدینہ منورہ کے یہودی کہتے تھے یہ نبی دِین میں تو ہماری مخالفت کرتے ہیں مگر اتباع ہمارے ہی قبلہ کی کرتے ہیں۔ (ہم لوگ اگر بُرے ہیں تو ہمارا قبلہ کیوں اختیار کرتے ہیں؟ اور مشرکینِ عرب کو یہ شکایت تھی کہ حضور ﷺ بنی اسمٰعیل ہو کر بیت المقدس کی طرف نماز کیوں پڑھتے ہیں؟ (ملخصا نعیمی) چنانچہ حضور سید عالم ﷺ کو کعبہ کا قبلہ بنایا جانا پسند خاطر تھا اور آپ اس امید میں آسمان کی طرف بار بار نظر فرماتے تھے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی (خزائن العرفان)۔ ایک روایت میں یوں ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت جبریل سے فرمایا کہ بیت اللہ چوں کہ میرے باپ ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ ہے اس لیے میری خواہش ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے قبلہ بنادے۔ جبریل علیہ السلام نے عرض کیا کہ میں تو مثل آپکے بندہ مامور ہوں اور آپ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مجھ سے زیادہ بزرگ، مقرب اور رب کے بندہ محبوب آپ دعا فرمائیں (یعنی میں تو صرف رب کی ماننے والا ہوں اور آپ ماننے والے بھی اور منوانے والے بھی رب تعالیٰ آپ کی رضا چاہتا ہے) جبریل یہ کہہ کر آسمان پر تشریف لے گئے اور آپ اکثر اللہ کے حکم کے انتظار میں آسمان کی طرف دیکھتے رہتے تھے۔ تب یہ آیت (قَدْ نَرٰی) نازل ہوئی (ملخصا مظہری، روح البیان، نعیمی، کبیر وغیرہ) احکام شرع میں سب سے پہلے یہی امرِ قبلہ منسوخ ہوا (خازن)

تفسیر آیت:

(قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِی السَّمَآءِ) (ہم دیکھ رہے ہیں بار بار تمہارا آسمان کی طرف منہ کرنا) لفظ قد یہاں تکثیر کے لیے ہے۔ رہا یہ امر کہ تکثیر قد کا معنی مجازی ہے یا حقیقی، اس میں دو قول ہیں۔ سیبویہ کی طرف معنیٰ حقیقی منسوب ہے (روح المعانی) اور اگر قد تقلیل کے لیے مانا جائے تو یہ قلت رویت باری کی طرف راجع نہیں بلکہ تقلب وجہ کی طرف یعنی دیکھنے میں کمی نہیں بلکہ چہرہ اٹھانے میں مگر اکثر مفسرین اور مترجمین نے یہاں قد کے معنیٰ تکثیر کو ہی لیا ہے۔ چناں چہ ہم نے

بھی آیت کے ترجمے میں اس ترجمے کو ترجیح دی ہے۔ رب تعالیٰ تمام مخلوق کو دیکھتا ہے مگر کفار کو غضب سے، ہم گنہگاروں کو رحم سے اور حضور علیہ الصلوۃ والسلام کو محبت سے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نبی کریم ﷺ کی ہر ادا کو محبت سے دیکھتا ہے ارشاد فرمایا (الذی یرٰئک حین تقوم و تقلبک فی السّٰجدین) اور فرماتا ہے فَاِنَّکَ بِاَعْیُنِنَا جو حضور کے دامن سے وابستہ ہو جائے وہ بھی اللہ تعالیٰ کی نظرِ محبت میں آجاوے گا۔ (نعیمی)

خیال رہے کہ حضور ﷺ کو مومن کا فر سب ہی دیکھتے ہیں مگر جو اللہ والی محبت کی نظر اور صدیق والی عقیدت کی آنکھ سے دیکھے وہ صحابی بن جاتا ہے۔ اور جو شیطانی نظر اور ابو جہلی آنکھ سے دیکھے وہ پکا کافر ہو جاتا ہے۔

تَقَلُّبَ وُجْهِکَ فِی السَّمَآءِ: تَقَلُّبَ باب تفعل تکرار کے لیے ہے اور وجہ سے مراد چہرہ ہے اور فی الیٰ کے معنی میں ہے۔ یعنی ہم دیکھ رہے ہیں آپکے چہرہ انور کا آسمان کی طرف بار بار پھرنا (اور آپ کی مرضی جان گئے، آپ کی آرزو قبول کرنے کے قابل ہے اور تمنا پوری کرنے کے لائق)

فَلَنُوَلِّيَنَّکَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا: (تو ضرور ہم تمہیں پھیر دیں گے اس قبلہ کی طرف جس میں تمہاری خوشی ہے) بعض نے فرمایا کہ یہاں مضارع حال کے معنیٰ میں ہے۔ نیز یہاں تولّی کے معنی پھیرنا۔ بعض نے فرمایا کہ والی بنانا یا قریب کرنا یا متصل کرنا (مظہری، کبیر، روح وغیرہ) یعنی ہم آپ کو پھیرے دیتے ہیں۔ یا ہم آپکو والی بنائے دیتے ہیں۔ یا ہم آپ کو قریب کر دیتے ہیں۔

قِبْلَةً قبلہ اصل میں بالمقابل شئی کی حالت کو کہا جاتا ہے جیسے جلسہ، قعدہ، وغیرہ اور عرف میں اس جہت کو قبلہ کہتے ہیں جس کی طرف متوجہ ہو کر نماز پڑھی جاتی ہے (مفردات) **تَرْضٰهَا** جس سے آپ راضی ہیں۔ یعنی اس قبلہ کی طرف آپ کو پھیرے دیتے ہیں جس سے آپ چند اغراض صحیحہ پسندیدہ کی وجہ سے راضی ہیں۔ یعنی آپ پہلے قبلہ بیت المقدس سے ناراض نہ تھے بلکہ اس سے بھی آپ راضی تھے کیوں کہ وہ مامور بھا تھا مگر آپ کعبہ سے زیادہ خوش تھے کہ آپ اس کو چند مصالح دینیہ کی وجہ سے چاہتے تھے۔ (مظہری، کبیر، رُوح المعانی)

فَوَلِّ وَجْهَکَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَام :(ابھی اپنا منہ پھیر دو مسجد حرام کی طرف) وجہ کے معنیٰ صرف چہرے کے ہیں مگر یہاں پورا جسم مراد ہے کیوں کہ قبلہ کی طرف پورا جسم چاہئے نہ کہ صرف چہرہ چوں کہ چہرہ ایک بہتر عضو تھا اس لیے اسی کا ذکر ہوا نیز چہرہ سے ہی بعض کی بعض سے تمیز ہوتی ہے اسی لیے وجہ سے کل ذات بھی مراد لی جاتی ہے۔ (کبیر) شطر کے لغوی معنیٰ نصف یا وسط شئی کے ہوتے ہیں (مفردات) نیز اس شئی کو بھی کہتے ہیں جو کسی شئی سے علیحدہ ہو چناں چہ عرب بولتے ہیں دارٌ شطورٌ اس گھر کو کہتے ہیں جو اور گھروں سے جدا ہو پھر اس کا استعمال بمعنی جانب آنے لگا (مظہری) صاحب تفسیر کبیر کے نزدیک یہ لفظ دو معنوں (نصف اور جہت) میں مشترک ہے۔ المسجد سے مراد یہاں وہ مسجد ہے جس کے درمیان کعبہ شریف ہے۔ حرام حرمت سے بنا یعنی حرمت والی مسجد یا حرام حلال کا مقابل ہے یعنی وہ مسجد جس میں قتال، شکار کرنا اور درخت وغیرہ کاٹنا حرام ہے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ مدینہ سے اپنا منہ مسجد حرام کی طرف پھیر لو کیوں کہ ادھر کو منہ کرنا گویا کعبہ ہی کو منہ کرنا ہے۔ بظاہر یہ مناسب معلوم ہوتا تھا کہ بجائے مسجد حرام کے کعبہ فرمایا جاتا کیوں کہ قبلہ تو کعبہ ہی ہے۔ لیکن مسجد حرام اس لیے فرمایا کہ اس طرف اشارہ ہو جائے کہ جو کعبہ سے دُور ہو، اس پر جہت کعبہ کا استقبال واجب ہے، عین کعبہ کا نہیں کیوں کہ یہ تکلیف مالا یطاق ہے۔ چناں چہ ترمذی نے حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ {ما بین مشرق ومغرب کے قبلہ ہے} ظاہر ہے کہ مابین مشرق اور مغرب جہت جنوب ہے اور یہی اہل مدینہ کا قبلہ ہے۔ اس حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ دُور والوں کے لیے جہت کعبہ ہی قبلہ ہے۔ اسی طرح ہر ملک کے لوگوں کا علیحدہ قبلہ ہے۔ چناں چہ پاکستان میں رہنے والوں کا قبلہ دو مغربوں کے درمیان قدرے مائل بجنوب ہے۔

مواہب اور سبیل الرشاد میں مذکور ہے کہ حضور سید عالم ﷺ قبیلہ بنی سلمہ میں ام البشر ابن براء ابن معرور سے ملنے براء کے انتقال کے بعد تشریف لے گئے۔ ام بشر نے حضور ﷺ کے لیے کھانا تیار کیا۔ وہاں آپ کو ظہر کا وقت ہو گیا آپ ﷺ نے مع اصحاب کے مسجد بنی سلمہ میں نماز ظہر

شروع فرمائی جب آپ دو رکعت پڑھ چکے تو حضرت جبریل علیہ السلام نے آ کر عرض کیا کہ بیت اللہ کی طرف نماز پڑھو آپ ﷺ نماز ہی میں کعبہ کی طرف بجانب میزاب پھر گئے۔ جس جگہ مرد تھے وہاں عورتیں آ گئیں اور جہاں عورتیں تھیں وہاں مرد آ گئے (غرض یہ کہ سب نماز میں پھر گئے) اسی واسطے اس مسجد کو مسجد القبلتین (دو قبلوں والی مسجد) کہتے ہیں۔ ابنِ سعد نے کہا کہ واحدی کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک یہ واقعہ نہایت قوی سند سے ثابت ہے (مظہری، وفاء الوفا باخبار دارالمصطفٰی)۔ غرض یہ کہ آپ ﷺ نے ظہر کی دو رکعت تو بیت المقدس کی طرف پڑھیں اور دو رکعت کعبہ کی طرف۔ عباد بن بشر رضی اللہ عنہ آپ کے ساتھ نماز پڑھ کر جا رہے تھے۔ کہ انہوں نے دیکھا کہ بنی حارثہ عصر کی نماز پڑھ رہے ہیں اور رکوع میں ہیں۔ انہوں نے بآواز بلند کہا کہ میں اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بیت اللہ کی طرف نماز پڑھ کر آ رہا ہوں وہ سن کر فوراً بیت اللہ کی طرف پھر گئے اور صحیح بخاری میں براء ابن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اول نماز جو کعبہ کی طرف پڑھی وہ عصر کی نماز تھی۔ یہ حدیث پہلی حدیث کے خلاف ہے کیوں کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے سب سے پہلے ظہر کی نماز پڑھی لیکن تحقیق یہی ہے کہ ظہر ہی کی نماز پڑھی اور دوسری حدیث میں جو عصر کی نماز آئی ہے تو ممکن ہے کہ حضرت براء ابن عازب کو آپ ﷺ کے بنی سلمہ کی مسجد میں ظہر پڑھنے کی اطلاع نہ ہوئی ہو یا ان کی مراد یہ ہو کہ پوری نماز جو سب سے پہلے کعبہ کی طرف پڑھی وہ عصر کی نماز تھی کیوں کہ ظہر کی تو دو ہی رکعتیں پڑھی تھیں یا یہ مقصود ہو کہ اپنی مسجد میں جو حضور ﷺ نے کعبہ کی طرف نماز پڑھی وہ عصر کی نماز تھی اور تحویلِ قبلہ کی خبر قبا والوں کو اگلے روز فجر کی نماز میں ہوئی۔ چناں چہ صحیحین میں ابنِ عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ قباء میں لوگ فجر کی نماز پڑھ رہے تھے۔ کہ ایک شخص نے آ کر کہا کہ رسول اللہ ﷺ کو کعبہ کی طرف متوجہ ہونے کا حکم ہو گیا۔ وہ سب اسی وقت کعبہ کی طرف پھر گئے پہلے ان کے منہ شام کی طرف تھے اور رافع ابنِ خدیج فرماتے ہیں کہ ہم بنی عبدالاشھل میں نماز پڑھ رہے تھے کہ ایک شخص نے آ کر پکارا کہ رسول اللہ ﷺ کو کعبہ کی طرف منہ کرنے کا حکم ہو گیا۔ ہمارا امام یہ سن کر کعبہ کی طرف پھر گیا اور ہم سب بھی پھر گئے۔ (مظہری)

فائدہ:

روایات مندرجہ بالا دال ہیں کہ خبرواحد امورِ دین میں حجت ہے۔

(وَحَیْثُ مَا کُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ) (اور اے مسلمانو! تم جہاں کہیں بھی ہو اپنا منہ اس کی طرف کرو) یہاں اللہ تعالیٰ نے تمام امت کو خطاب فرمایا۔ اول خاص جناب سرورِ کائنات ﷺ کو آپ کی عظمت شان کے لیے خطاب فرمایا تھا۔ اگر چہ آپ ﷺ کو خطاب فرمانا امت کو بھی شامل تھا لیکن عموم حکم کی تصریح اور تاکید کے لیے مستقل طور پر امت مرحومہ کو بھی خطاب سے نوازا (مظہری) (حیث ما کنتم) الخ (تم جہاں کہیں بھی ہو) یعنی خشکی پر ہو یا دریا میں، ہموار زمین پر ہو یا پہاڑ پر مشرق میں ہو یا مغرب شمال میں ہو یا جنوب میں (روح البیان) نماز پڑھتے وقت اپنا منہ اسی کی طرف کرنا ہوگا کیوں کہ وہ الی یوم القیامۃ تمہارا قبلہ ہے۔

خیال رہے! کہ نماز میں قبلہ کو منہ کرنا اکثر فرض ہے۔ اس کے سوا قربانی، تلاوت قرآن اور مرنے کے وقت ادھر منہ کرنا مستحب (فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ) الخ میں امر وجوبی ہے۔

وَاِنَّ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الکتاب لیعلمون اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ: (اور وہ جنہیں کتاب ملی ضرور جانتے ہیں کہ یہ ان کے رب کی طرف سے حق ہے)۔ اوتوا الکتاب سے مراد یہود ونصاری کے علماء ہیں کیوں کہ ان کے عوام کی تو کتابوں پر نظر ہی نہ تھی یعنی یہ اہلِ کتاب خوب جانتے ہیں کہ تحویلِ قبلہ حق ہے کیوں کہ تورات میں موجود ہے کہ نبی آخر الزماں امام القبلتین ہوں گے۔ مگر اب یہ راہب اور پادری عناد اور حسد سے انکار کرتے ہیں اور لوگوں سے کہتے ہیں کہ اگر یہ سچے نبی ہوتے تو ایک قبلہ پر قائم رہتے۔

وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا یَعْمَلُوْنَ: (اور اللہ اس سے بے خبر نہیں جو وہ کرتے ہیں) یعنی جو کچھ وہ حرکتیں کرتے ہیں اللہ اس سے بے خبر نہیں بلکہ ان کو اپنے اس کیے کی سخت سزا ملے گی۔

فوائد و مسائل

ا۔ کعبہ معظمہ کا تا قیامت قبلہ ہونا حضور علیہ السلام کی خوش نودی کے لیے ہے۔ کیوں کہ قبلہ کی صفت تَرْضٰهَا ہے اور اس تَرْضٰهَا کے بعد فَوَلِّ میں ترتیب کی فاء ہے یعنی چوں کہ آپ کعبہ سے راضی ہیں اس لیے ادھر آپ منہ کر لیں جس سے معلوم ہوا کہ سب قانون کے پابند ہیں اور قانون مرضی محبوب کا منتظر بلکہ ان کی مرضی ہی قانون۔

۲۔ کعبہ معظمہ کو حضور علیہ السلام سے یہ عزت ملی کہ وہ تا قیامت سارے مسلمانوں کا سجدہ گاہ بن گیا ورنہ ہو سکتا تھا کہ پہلے پیغمبروں کی طرح شروع سے آپ کا قبلہ کعبہ ہی ہوتا۔ یہ سب کچھ اسی لیے ہوا تا کہ معلوم ہو کہ حضور علیہ السلام کعبہ کے بھی کعبہ ہیں۔ اسی لیے آپ کی ولادت باسعادت کے موقع پر کعبہ معظمہ نے حضرت سیدہ آمنہ خاتون کے مکان یا مقام ابراہیم کی طرف سجدہ کیا۔ (مدارج)

جن کے سجدہ کو محراب کعبہ جھکی
ان بھوؤں کی لطافت پہ لاکھوں سلام

(نعیمی)

اسی لیے نمازی کو حضور علیہ السلام کے بلانے پر نماز کی حالت میں خدمت اقدس میں حاضر ہونا ضروری ہے اور اس کے آنے جانے اور کلام وغیرہ کرنے سے اس کی نماز فاسد نہ ہوگی۔ (مشکوۃ بحوالہ بخاری کتاب فضائلِ قرآن اور اس کی شرح مرقات ایضاً قسطلانی شرح بخاری کتاب التفسیر) نماز کیوں جائے! کہ اگر چہ وہ کعبہ سے پھر امگر کعبہ کے کعبہ کی طرف اور اگر چہ کلام کیا مگر ان سے جنہیں نماز میں سلام کرنا واجب ہے۔ ولنعم ما قال الامام احمد رضا فاضلِ بریلوی قدس سرہ

حاجیو ! آؤ شہنشاہ کا روضہ دیکھو
کعبہ تو دیکھ چکے کعبہ کا کعبہ دیکھو

۳۔ حضور پُر نور سید عالم ﷺ کو راضی کرنے کے لیے اچھے اعمال کرنا شرک نہیں۔ رب تعالیٰ نے جو کعبہ کو قبلہ بنایا جو تمام نیکیوں کی اصل ہے۔ حضور ﷺ کی رضا کے لیے بنایا۔ لہٰذا اللہ رسول کو راضی کرنے کے لیے نماز، روزہ، حج اور دیگر اعمالِ صالحہ تلاوتِ قرآن وغیرہ کرنا ان عبادات کو کامل کردے گا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ (وَاللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اَحَقُّ اِنَّ یر ضُوْہُ) حدیث شریف میں ہے کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ قرآن شریف پڑھ رہے تھے اور حضور ﷺ کھڑے سن رہے تھے جب انہوں نے تلاوت ختم کی آپ ﷺ نے فرمایا (الک اوتیت مزماراً من مزامیر ال داؤد)۔

قرآن شریف سے حدیث کا نسخ ہوسکتا ہے بیت المقدس کو رخ کرنے کی کوئی آیت نہیں وہ حضور ﷺ کے عمل سے ثابت تھا جسے قرآن شریف کی اس آیت نے منسوخ کیا۔

مسئلہ: حالتِ نماز میں استقبالِ قبلہ (قبلہ کی طرف منہ کرنا) عام ہے۔ کہ بعینہٖ کعبہ معظمہ کی طرف منہ ہو جیسے مکہ مکرمہ والوں کے لیے یا اس جہت کو منہ ہو جیسے اوروں کے لیے (در مختار) یعنی تحقیق یہ ہے کہ جو عین کعبہ کی سمت کی خاص تحقیق کرسکتا ہے اگرچہ کعبہ آڑ میں ہو جیسے مکہ معظمہ کے مکانوں میں۔ جبکہ چھت پر چڑھ کر کعبہ کو دیکھ سکتے ہیں تو عین کعبہ کی طرف منہ کرنا فرض ہے جہت کافی نہیں اور جسے تحقیق ناممکن ہو اگرچہ خاص مکہ معظمہ میں ہو اس کے لیے جہت کعبہ کو منہ کرنا کافی ہے۔

مسئلہ: کعبہ کے اندر نماز پڑھی تو جس رُخ چاہے پڑھے کعبہ کی چھت پر بھی نماز ہو جائے گی مگر اس کی چھت پر چڑھنا ممنوع ہے (بہارِ شریعت بحوالہ غنیہ)

مسئلہ: جہت کعبہ کو منہ ہونے کے یہ معنیٰ ہیں کہ منہ کی سطح کا کوئی جز کعبہ کی سمت میں واقع ہو تو

اگر قبلہ سے کچھ انحراف ہے مگر منہ کا کوئی جز کعبہ کے مواجہ میں ہے نماز ہو جائے گی۔ اس کی مقدار ۴۵ درجہ رکھی گئی ہے تو اگر ۴۵ ڈگری درجہ سے زائد انحراف ہے تو استقبال قبلہ نہ پایا گیا، نماز نہ ہوئی۔

مثلاً: اب ایک خط ہے اس ج عمود ہے اور فرض کرو

کہ کعبہ معظمہ عین نقطہ ج کے محاذی (بالمقابل) ہے

دونوں قائمے ا ج اور ج ہ ب کی تنصیف کرتے ہوئے

خطوط د اور ہ ح کھینچے تو یہ زاویے ۴۵، ۴۵ درجے کے ہوئے قائمہ ۹۰ درجہ کا ہوتا ہے اب جو شخص مقام ہ پر کھڑا ہے اگر نقطہ ج کی طرف منہ کرے تو عین کعبہ کو منہ ہے اور اگر دائیں یا بائیں ر یا ج کی طرف جھکے تو جب تک رج یا ج ح کے اندر ہے جہت کعبہ میں ہے اور جب ر سے بڑھ کر آیا ح سے بڑھ کر ب کی طرف کچھ بھی قریب ہوگا تو اب جہت سے نکل گیا نماز نہ ہوگی (فتاویٰ رضویہ، درمختار)

مسئلہ: قبلہ عمارت کعبہ کا نام نہیں بلکہ ساتوں زمین سے آسمانوں تک اس بنا کی محاذات میں جو فضا ہے اس کا نام ہے (وہ فضا قبلہ ہے) تو اگر بالفرض وہ عمارت وہاں سے اٹھا کر دوسری جگہ رکھ دی جائے اور اب

حیات شہداء وانبیاء علیہم السلام

(بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ)

(وَلَا تَقُوۡلُوۡا لِمَنۡ یُّقۡتَلُ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ اَمۡوَاتٌ ؕ

بَلۡ اَحۡیَآءٌ وَّلٰکِنۡ لَّا تَشۡعُرُوۡنَ (سورۃ البقرۃ:۱۵۴)

"اور جو خدا کی راہ میں مارے جائیں انہیں مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں ہاں تمہیں خبر نہیں"۔

شانِ نزول:

یہ آیت شہداء بدر کے حق میں نازل ہوئی۔ لوگ ان شہداء کے بارے میں کہتے تھے کہ فلاں مرگیا اور دنیاوی آسائش سے محروم ہوگیا (خزائن العرفان)۔ کفار منافقین کہتے تھے کہ یہ ایسے دیوانے ہیں کہ تھوڑے اور بے سروسامان بڑی جماعتوں پر حملہ کردیتے ہیں اور صرف حضور علیہ السلام کی خوشنودی کے لیے بے فائدہ اپنی جانیں گنوادیتے ہیں۔ (کبیر)

شہید:

شہید الشہادۃ سے ماخوذ ہے الشہادہ والمشہود کے معنی کسی چیز کا مشاہدہ کرنے کے ہیں خواہ بصر سے ہو یا بصیرت سے اور صرف حاضر ہونے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم میں ہے (عالم الغیب و الشھادۃ) (۵۹-۲۲) لیکن اولیٰ یہ ہے کہ شہود کے معنیٰ صرف حاضر ہونا ہوں اور شہادۃ میں حاضر ہونے کے ساتھ مشاہدہ کا بھی اعتبار کیا جائے۔ (مفردات) اسی لیے گواہ کو شاہد اور گواہی کو شہادت کہتے ہیں کہ وہ جائے واردات پر حاضر ہونے کے ساتھ واقعہ کا مشاہدہ بھی کرتا ہے۔

مقتول فی سبیل اللہ کو بھی شہید اس لیے کہتے ہیں کہ وہ حالت نزع میں ان نعمتوں کا مشاہدہ کر لیتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے تیار کی ہیں۔ یا اس لیے کہ اس کی رُوح باری تعالیٰ کے ہاں حاضر کی جاتی ہے۔ آیت (وَالشُّهَدَاءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ) بھی اس معنی پر دلالت کرتی ہے۔

شہید کے اقسام واحکام

شہداء دو قسم کے ہوتے ہیں۔ (۱) شہید فقہی (۲) شہید حکمی

۱۔ شہید فقہی یا حقیقی وہ ہے جو مسلم ہو عاقل و بالغ ہو، ظلماً مارا جائے اور اس کے قتل پر دیت (خون بہا) واجب نہ ہو یا میدان جنگ میں زخمی ہو کر مردہ پایا جائے اور علاج وغیرہ سے فائدہ نہ اٹھایا ہو۔ ان کے لیے دنیا میں یہ احکام ہیں نہ غسل دیا جائے گا اور نہ ہی کفن، بلکہ انہیں خون آلود کپڑوں میں نماز جنازہ پڑھ کر دفن کر دیا جائے گا۔ اور آخرت میں ان کا بڑا ہی بلند مرتبہ ہوگا اور امام شافعی کے ہاں نماز جنازہ بھی نہیں پڑھی جائے گی۔ کما سیاتی۔

۲۔ شہیدِ حکمی۔ وہ جن پر اگر چہ فقہ کے یہ احکام جاری نہیں ہونگے لیکن آخرت میں ان کو درجہ شہادت ملے گا۔ جیسے پانی میں ڈوب کر مرنے والے۔ آگ سے جل کر مرنے والے، مکان یا دیوار کے نیچے دب کر مرنے والے، اللہ کی راہ میں مرنے والے جیسے حصول علم دین میں۔ جہاد میں۔ حج پر جاتے آتے وغیرہ۔ نیز جو عورت بچہ جننے کی تکلیف میں مر جائے وہ بھی حکماً شہید ہے۔

۳۔ کچھ شہداء ایسے ہیں جن کے لیے دنیاوی احکام تو پورے اترتے ہیں لیکن اخروی نہیں۔ جیسے وہ مقتول جن کی نیت صالح نہ ہو بلکہ لڑائی میں اجرت مقصود ہو یا اظہار شجاعت و مردانگی وغیرہ کے لیے لڑتے لڑتے مارے جائیں چناں چہ مسلم شریف میں حضرت ابو ھریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دن جس کا فیصلہ پہلے ہوگا وہ شہید ہے۔ اسے لایا جائے گا تب رب تعالیٰ اس سے اپنی نعمتوں کا اقرار کرائے گا پھر فرمائے گا

کہ اس کے شکریہ میں تو نے کیا عمل کیا؟ عرض کرے گا کہ تیری راہ میں جہاد کیا تا آنکہ شہید ہوگیا فرمائے گا تو جھوٹا ہے تو نے اس لیے لڑائی کی تھی کہ تجھے بہادر کہا جاوے وہ کہہ لیا گیا۔ (تیرے جہاد اور شہادت کے عوض یہ ہوگیا کہ لوگوں نے تیری واہ واہ کردی تو نے جہاد اسی نیت سے کیا تھا نہ کہ خدمت اسلام کے لیے) ثُمَّ اُمِرَ بِہٖ فَسُحِبَ عَلٰی وَجْھِہٖ حَتّٰی اُلْقِیَ فِی النَّارِ الخ (پھر حکم ہوگا تو اسے منہ کے بل کھینچا جائے گا یہاں تک کہ آگ میں پھینک دیا جائے گا)۔

(یہ اولیت اضافی ہے نہ کہ حقیقی یعنی ریاکاروں میں سے پہلے ریاکار شہید کا فیصلہ ہوگا۔)

۴۔ کچھ مقتول ایسے ہیں جن پر شہداء کے احکام نہ دنیا میں اور نہ آخرت میں جاری ہوتے ہیں۔ جسے امام برحق (جائز شرعی سربراہ مملکت) کا باغی، ڈاکو وغیرہ ان کو نہ غسل دیا جائے گا نہ کفن اور نہ ہی نماز جنازہ پڑھی جائے گی۔

حیات شہداء

شہداء کی زندگی قطعی یقینی ہے۔اس کا انکار کفر ہے۔ کیوں کہ قرآن میں (بَلْ اَحْیَاءٌ) کہ الفاظ میں اس کی تشریح ہے ہاں نوعیت حیات ظنی ہے چناں چہ کسی خاص نوعیت کا انکار کفر نہ ہوگا۔ لیکن شہداء کی یہ زندگی عوام کے شعور سے وراء ہے مگر خواص محسوس کر لیتے ہیں ان سے ملاقات بلکہ کلام وسلام بھی کرتے ہیں۔

حضرت علامہ قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی رحمتہ اللہ اسی آیت کی تفسیر میں رقمطراز ہیں کہ شہداء کے زندہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی ارواح کو جسم کی سی قوت عطا فرماتا ہے۔ اس کے ذریعے سے وہ زمین آسمان جنت سب جگہ کی سیر کرتے ہیں(**وینصرون اولیاء ھم ویدمرون اعداء ھم ان شاء اللہ تعالیٰ من اجل ذالک الحیٰوۃ لا تاکل الارض اجسادھم ولا اکفانھم**) اور اپنے دوستوں کی مدد کرتے ہیں۔اور اپنے دشمنوں کو ہلاک کرتے

ہیں۔اور اسی حیات کی وجہ سے زمین ان کے بدن اور کفن کو نہیں کھاتی (مظہری)

صحیح مسلم میں حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ شہداء کے ارواح اللہ تعالیٰ کے ہاں سبز طائروں میں رہتی ہیں اور جنت میں جہاں چاہیں سیر کرتی ہیں اور عرش کے نیچے جو قندیلیں ہیں ان میں آرام کرتی ہیں۔

حضرت حسن سے روایت ہے کہ شہداء اللہ کے ہاں زندہ ہیں ان کی ارواح کے سامنے رزق پیش کیے جاتے ہیں۔ جس سے انہیں خوشی اور انبساط حاصل ہوتی ہے۔امام زاہد کے کلام میں ہے کہ شہداء رزق کی لذت سے بہرانداز ہوتے ہیں۔ کیوں کہ رب تعالیٰ کا ارشاد (یُرْزَقُوْنَ ؕ فَرِحِیْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ)(ترجمہ) (روزی پاتے ہیں شاد ہیں اس پر جو اللہ نے انھیں اپنے فضل سے دیا)۔

یہاں تک کہ امام شافعی فرماتے ہیں کہ شہید کی نمازہ جنازہ بھی نہ پڑھائی جائے کیوں کہ وہ حکماً زندہ ہیں لیکن صحیح یہ ہے کہ شہداء کی نمازہ جنازہ پڑھی جائے گی۔ کیوں کہ حضور ﷺ نے سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اور دیگر شداء کی نماز جنازہ پڑھی۔ صاحب کشاف نے اپنے مذہب اعتزال پر پختگی کے باوجود حیات شہداء اور تعیم شہداء کا اعتراف کیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے سورہ مومن کی تفسیر میں مفسرین کا قول استشھاداً نقل کیا ہے (ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ شہید کے جملہ اجزاء خواہ وہ جسم میں ذروں جتنے کیوں نہ ہوں جمع کرے اور نعمتوں سے نوازے)۔(احمدی)

نیز یہ اس امر کی بھی دلیل ہے کہ ان کے نزدیک عذاب قبر حق ہے۔

فائدہ:

حضرت علامہ قاضی ثناء اللہ صاحب تفسیر مظہری فرماتے ہیں کہ بعض علماء نے فرمایا کہ یہ حیات شہداء کے ہی ساتھ مخصوص ہے۔(والحق عندی عدم اختصاصها بهم بل حيوة الانبياء اقوى منهم و اشد ظهوراً اثارها فی الخارج حتى لايجوز النكاح بازواج

النبی ﷺ بعد وفاته بخلاف الشهيد) الخ (میرے نزدیک حق یہ ہے کہ یہ حیات شہداء ہی کے ساتھ خاص نہیں۔ بلکہ آثار و احکام سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام میں یہ حیات سب سے زیادہ اور قوی ہے حتٰی کہ اس کا خارج میں اثر یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات سے آپ کے وصال کے بعد بھی نکاح جائز نہیں بخلاف شہید کے اس کی بیوی سے نکاح جائز ہے) اور صدیق اس حیات میں شہداء سے اعلٰی درجہ میں ہیں اور صالحین یعنی اولیاء شہداء کے ساتھ ملحق نہیں ہیں۔ چناں چہ اللہ تعالٰی ارشاد فرماتا ہے اُولٰئِکَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ مِنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّھَدَآءِ والصَّالِحِیْنَ) یعنی یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ تعالٰی نے انعام فرمایا ہے۔ وہ نبی اور صدیق اور شہداء اور صالحین) (ترتیب ذکری سے ترتیب مرتبہ کی طرف اشارہ اکثر کلام میں ہوتا ہے)۔ اسی لیے صوفیائے کرام رحمہم اللہ نے فرمایا (اَرْوَاحُنَا اجسادنا وَاَجْسَادُنا ارواحنا) (ہماری ارواح ہمارے بدن ہیں اور ہمارے بدن ہماری ارواح ہیں)

(قد تواتر عن كثير من الاولياء انَّهُمْ يَنْصُرُوْنَ اَوْلِيَاء هُمْ وَيُدَمِّرُوْنَ اَعْدَاء هُمْ وَيَهْدُوْنَ اِلَى اللّٰهِ تعالٰى من يشآء اللّٰه تعالٰى)

(اولیاء اللہ سے یہ امر تواتر سے ثابت ہے کہ اپنے دوستوں کی مدد کرتے ہیں۔ اپنے دشمنوں کو ہلاک و تباہ کرتے ہیں اور جس کو اللہ کی طرف سے حکم ہوتا ہے اس کو اللہ تعالٰی کی راہ دکھاتے ہیں)

احادیث و اخبار سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء اور شہداء اور بعض صالحین کے بدن کو زمین نہیں کھاتی۔

چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (اِنَّ اللّٰہَ حَرَّمَ عَلَی الْاَرْضِ اَنْ تَاْکُلَ الْاَجْسَاد الانبیاء) اللہ تعالٰی نے زمین پر انبیاء علیہم السلام کا جسم کھانا حرام فرما دیا ہے) (حاکم، ابوداؤد، عن اوس بن اوس) اور ابن ماجہ نے ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے اس حدیث کو روایت کیا ہے۔

امام مالک نے عبدالرحمٰن بن صعصعہ سے روایت کیا ہے کہ عمرو بن الجموح اور عبداللہ بن

جبیر انصاری (رضی اللہ عنہما) کی قبر سیلاب کی وجہ سے دھنس گئی۔ یہ دونوں حضرات اُحد کے دن شہید ہوئے تھے اور دونوں ایک ہی قبر میں دفن کردیئے گئے تھے۔ جب قبر سیل کی وجہ سے خراب ہوگئی تو چاہا کہ انہیں یہاں سے اور جگہ دفن کردیا جائے۔ قبر کھودی گئی تو دیکھا کہ اسی طرح ہیں کوئی تغیر نہیں آیا گویا کل دفن کیے گئے تھے۔ حالاں کہ ان کی شہادت کو اس وقت چھیالیس (۴۶) برس ہوچکے تھے۔ (مؤطا امام مالک، ص ۴۸۲)

مسئلہ: میت کو بعد دفن قبر سے نکالنا جائز نہیں مگر اس صورت میں کہ زمین غصب کی ہوئی ہو یا شفعہ کی زمین ہو یا پانی اور دریا کے قریب ہونے کی وجہ سے اس کے خراب ہونے کا اندیشہ ہو یا دار الحرب کی زمین میں دفن کیا گیا ہو۔ یا مقبرہ آبادی میں آکر پرانا ہوگیا ہو اور وہاں آنے جانے میں قبروں کا خیال نہ کیا جاتا ہو۔ ان صورتوں میں سے کوئی صورت پیش آجائے تو مردہ کو قبر سے نکالنا جائز ہے۔ اسی پر فتوی ہے۔ (مظہری)

بیہقی سے مروی ہے کہ جب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا ارادہ نہر کظامہ کے جاری کرنے کا ہوا تو اس کے بہنے کی جگہ شہداء اُحد کی قبریں واقع ہوئیں۔ تو آپ نے اعلان کرادیا کہ لوگ اپنے اپنے میتوں کو لے جاکر اور جگہ دفن کردیں۔ لوگ آئے تو شہداء کو دیکھا کہ سب تروتازہ ہیں اور بال بڑھے ہوئے ہیں۔ اتفاقاً ایک شہید کے پاؤں پر کدال پڑ گیا تو خون کا ایک فوارہ جوش مارنے لگا اور ایک جگہ سے مٹی کھودی گئی تو تمام جگہ مشک کی خوشبو پھیل گئی۔ اس کو ابنِ ابی شیبہ نے بھی روایت کیا اور بیہقی نے اس کو حضرت جابر (رضی اللہ عنہ) سے نقل کیا اور اس میں اتنا زیادہ ہے کدال حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے پاؤں پر پڑا تھا۔ (مظہری، جذب القلوب)

بوقتِ ذبح جانور پر اللہ کا نام لیا جائے نہ کہ غیر اللہ کا

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيۡكُمُ الۡمَيۡتَةَ وَالدَّمَ وَلَحۡمَ الۡخِنۡزِيۡرِ وَمَاۤ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيۡرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنِ اضۡطُرَّ غَيۡرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَاۤ اِثۡمَ عَلَيۡهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ (سورۃ البقرۃ:۱۷۳)

"اس نے یہی تم پر حرام کیے ہیں، مردار اور خون اور سور کا گوشت اور وہ جانور جو غیرِ خدا کا نام لے کر ذبح کیا گیا تو جو ناچار ہو نہ یوں کہ خواہش سے کھائے اور نہ یوں کہ ضرورت سے آگے بڑھے تو اس پر گناہ نہیں بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔"

یہ آیت قرآن پاک میں ۴ جگہ پر آئی ہے (۱) اول یہی مقام (۲) سورہ مائدہ میں (۳) سورہ انعام میں (۴) سورہ نحل میں۔ سورہ بقرہ اور سورہ مائدہ یہ تو دونوں مدنی ہیں لیکن سورہ انعام باستثنیٰ چند آیات کے اور سورہ نحل یہ دونوں مکی ہیں۔ انما کلمہ حصر ہے، مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ حصر اضافی ہے حصر حقیقی نہیں اور بہت سارے جانور جن کا ذکر قرآنِ مجید میں نہیں وہ رسول اللہ ﷺ کے فرمانِ عالی شان سے حرام قرار دیئے گئے۔ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ کا حرام کردہ اس کا بھی وہی حکم جو اللہ تعالیٰ کے حرام کیے ہوئے کا حکم ہے۔ سورہ توبہ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے (ولا یحرمون ماحرم اللہ ورسولہ) (الایۃ) نیز ارشاد باری تعالیٰ ہے (ویحل لھم الطیبت ویحرم علیھم الخبائث) (الایۃ) جو چیزیں قرآن میں حرام کی گئیں وہ اللہ کی حرام فرمائی ہوئی ہیں جیسے سؤر، مردار وغیرہ اور جو چیزیں حدیثِ پاک میں حرام فرمائی گئیں وہ رسول اللہ ﷺ نے حرام فرمائیں جیسے کتا، بلا وغیرہ۔ معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کو اللہ نے حرام فرمانے کا اختیار دیا ہے (تفسیر نور العرفان)

المیتة : (**والمیتة حیوان مات من غیر زکوة وقد کان من شانها الذکاة**) (مظہری) (یعنی میتہ وہ جانور ہے جو بغیر ذبح مر جائے اور اس کا ذبحہ کرنا فرض ہو۔)

ف: اس کا صرف کھانا حرام ہے بعض دیگر منافع جائز ہیں مثلاً اس کی کھال پکا کر جوتے وغیرہ بنا سکتے ہیں۔

الدم: بمعنی خون اس سے بہتا ہوا خون مراد ہے جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد فرمایا (اَوْ دَماً مَسْفُوْحا) تلی اور کلیجی جائز ہے (نور العرفان)

لحم الخنزیر : خنزیر کا گوشت۔ خیال رہے کہ سؤر کے تمام اجزا حرام ہیں۔ سورہ انعام میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا (**فانہ رجس**) اور رجس یعنی پلید چیز حرام ہی ہوتی ہے۔ لحم خنزیر کی تخصیص اسلیے ہے کہ مقصود و معظم وہی ہے اور باقی تمام اجزاء اس کے تابع ہیں چنانچہ مظہری میں ہے۔

وانما خص اللحم بالذکر لانہ معظم مایقصد من الحیوان وسائر اجزائہ کالتابع لہ(**وَمَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ**) (ترجمہ) (اور وہ جانور جو غیرِ خدا کا نام لے کر ذبح کیا گیا)۔

تمام معتبر تفاسیر میں مظہری، روح المعانی، روح البیان، کبیر وغیرہ میں اس کا یہی مفہوم بیان کیا گیا ہے کہ جس جانور پر بوقتِ ذبح غیرِ خدا کا نام پکارا جائے تو وہ حرام ہے جیسا کہ مشرکین (**کانو یذبحون باسم الھتھم ای یقولون باسم الات والعزی**) بلکہ امام ابوبکر احمد بن علی رازی حنفی جصاص متوفی ۳۷۰ھ اپنی شہرہ آفاق تفسیر احکام القرآن (۱/ ۱۴۵) میں تمام مسلمانوں کا اس پر اتفاق نقل فرماتے ہیں۔ (**ولا خلاف بین المسلمین ان المراد بہ الذبیحة اذا اھل بھا بغیر اللہ عند الذبح**) بلکہ شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی نے بھی اپنے فارسی ترجمہ قرآن میں اسی کو ثابت رکھا ہے چنانچہ آپ لکھتے ہیں ''**وآنچہ ذکر کردہ شد نام غیر خدا بر ذبح وے**'' معلوم ہوا کہ ذبح سے پہلے اگر کسی جانور پر غیرِ خدا کا نام لیا جائے جیسا کہ نور دین کی گائے، فتح محمد کا بکرا، ایسے ہی وہ جانور جن کو کسی بزرگ کی طرف منسوب کر کے

نام زد کردیا جائے۔ جیسے غوث اعظم کا بکرا یا خواجہ اجمیری کی گائے اور بوقت ذبح ان پر اللہ کا نام لیا جائے، ایسے جانوروں کا گوشت کھانا قطعاً یقیناً حلال ہے بلکہ قرآن کریم کے اندر مذکور ہے کہ مشرکین بحیرہ، سائبہ وصیلہ، حامی، وغیرہ جانور اپنے بتوں کے لیے نذر مانتے تھے اور ان سے کسی طرح کا فائدہ اٹھانا اپنے اوپر حرام کر لیتے تھے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ان کا رد فرمایا۔ سورہ مائدہ میں ہے (ماجعل اللہ بحیرۃ ولا سائبۃ ولا وصیلۃ ولا حام ولا ولکن الذین کفروا یفترون علی اللہ الکذب واکثرھم لا یعقلون) ۵ ۱۰۳ مفسر قرآن مفتی احمد یار خان صاحب گجراتی رحمۃ اللہ علیہ اس آیہ کریمہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں ان جانوروں کا گوشت حرام نہیں ہوگیا بلکہ حلال ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جانور کی زندگی میں اس پر کسی کا نام پکارنا اسے حرام نہیں کر دیتا۔ ہاں ذبح کے وقت غیرِ خدا کا نام پکارنا حرام کر دے گا اگر یہ جانور حرام ہوتے تو پھر کفار سچے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی مذمت فرما کر ارشاد فرمایا کہ یہ کافر اللہ پر جھوٹا اختراء باندھتے ہیں اور بے عقل ہیں۔ مزید وضاحت کرتے ہوئے اورنگ زیب عالم گیر بادشاہ کے استاذ ملاجیون رحمۃ اللہ علیہ تفسیرات احمدیہ میں فرماتے ہیں (وان ذکر مفصولا بان یقول قبل التسمیۃ وقبل ان یضجع الذبیحۃ اوبعدہ لاباس بہ ھکذافی الھدایۃ ومن ھھنا علم ان البقرۃ المنذورۃ للاولیاء کما ھو الرسم فی زماننا حلال طیب لانہ لم یذکر اسم غیر اللہ علیھا وقت الذبح وان کانوا ینذرونھالہ) (صفحہ ۲۹)(ترجمہ) (اور اگر غیر اللہ کا ذکر علیحدہ ہو یعنی بسم اللہ سے پہلے جانور کو لٹانے سے پہلے یا بعد تو اس میں کوئی حرج نہیں ہدایہ میں یہی لکھا ہے۔)۔

یہاں سے معلوم ہوا کہ ہمارے زمانہ میں جو گائے وغیرہ بزرگوں کے نام کی نذر کر دیتے ہیں۔ حلال طیب ہے کیوں کہ وقت ذبح تو غیر اللہ کا نام نہیں لیتے۔ اگرچہ غیروں کی نذر مانتے ہیں۔

صحاح میں مروی ہے کہ حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے قربانی کے جانور پر اپنی امت کا نام لیا۔ بلکہ خود حضرت علی رضی اللہ عنہ دو قربانیاں دیتے ایک قربانی کو حضور علیہ السلام کے لیے نامزد

کرتے اور دوسری اپنے لیے جیسا کہ ترمذی میں ہے معلوم ہوا کہ ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام پکارنا حرام کرتا ہے۔ آگے پیچھے جانور پر خواہ کسی بزرگ کا نام لیا جائے اور بوقتِ ذبح اللہ کا نام لیا جائے تو ایسا جانور یقیناً حلال وطیب ہے اور اس کا کھانا مسلمانوں کے لیے رَوا اور جائز ہے۔ بلکہ فتاوٰی عالمگیری (صفحہ۴۷) میں یہاں تک لکھا ہے (مسلم ذبح شاة المجوسی لبیت نارھم او الکافر لا لھتھم توکل لانہ سمی اللہ) (ترجمہ) (اگر کسی مجوسی نے اپنے آتش کدہ کے لیے یا کسی مشرک نے اپنے باطل خداؤں کے لیے کسی جانور کو نام زد کیا اور کسی مسلمان نے اللہ تعالیٰ کا نام لے کر اسے ذبح کر دیا تو اسے کھایا جائے گا کیوں کہ مسلمان نے اسے اللہ تعالیٰ کا نام لے کر ذبح کیا ہے۔)

سوال: حضرت مولانا علامہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے تفسیر عزیزی میں (مااھل بہ لغیر اللہ) کا ترجمہ یہ نہیں کیا ہے بلکہ وہ صرف جانور کو غیر اللہ کے نام پر نامزد کرنے کو حرام کہتے ہیں۔

جواب: شاہ صاحب صرف نام زدگی کو حرام نہیں کہتے بلکہ وہ اس نامزد جانور کو حرام کہتے ہیں جس میں ذابح نے تقرب الی غیر اللہ کی نیت کی ہو اور اگر تقرب الی غیر اللہ نہ ہو بلکہ صرف نذر و نیاز عرفی ہو اور وہ جانور شرائط کے مطابق اللہ تعالیٰ کے نام پر ذبح کیا گیا ہو اور اس پر ایصالِ ثواب کے لیے کسی بزرگ کا نام لے دیا جائے تو جائز ہے جیسا کہ انہوں (شاہ عبدالعزیز) نے اپنے فتاوٰی میں تصریح فرمائی ہے۔ چناں چہ فرماتے ہیں۔

"نذر اولیا کہ برائے قضاء حوائج معمول و مرسوم است اکثر فقہا بحقیقۃ آں پے نبردہ اند و آں رابر نذر خدا قیاس کردہ حکم ہر دو برآوردہ اند کہ اگر نذر بالا ستقلال برائے آں ولی است باطل و اگر برائے خدا است و ذکر ولی برائے بیان مصرف است صحیح

است لیکن حقیقت ایں نذر آنست که اهداء ثواب اطعام و انفاق و بذل مال بروح میت که امریست مسنون و ازروئے احادیث صحیحه ثابت است مثل ماورد فی الصحیحین من حال ام سعد وغیرها دریں نذر مستلزم میشود پس حاصل ایں نذر آنست که آں نسبت مثلا اهدا ثواب هذا القدر الی روح فلاں وذکر ولی برائے تعین عمل منذور است نه برائے مصرف و مصرف ایں نذر نزد ایشاں متوسلاں آں ولی میباشنداز اقارب و خدمه و هم طریقاں وامثال ذلک وهمین است مقصود نذر کنند گاں بلاشبه و حکمه انه صحیح یجب الوفاء به لانه قربة معتبرة فی الشرع " (فتاوی عزیزی صفحہ ۱۲۱۔۱۲۲، جلد اول)

"اولیاء اللہ کے لیے نذر جو حاجات کے پورا کرنے کے لیے معمول و مروج ہے اکثر فقہاء اس کی حقیقت کے درپے نہیں ہوئے۔ انہوں نے اس کو نذرِ خدا پر قیاس کر لیا اور دونوں کا حکم بیان کیا اگر ولی کے لیے نذر بالاستقلال ہے تو یہ باطل ہے اور اگر نذر تو خدا کے لیے اور ولی کا ذکر بیان مصرف کے لیے ہے تو صحیح ہے۔ اس نذر کی حقیقت یہ ہے کہ اس طعام وغیرہ کا ثواب میت کی روح کو پہنچایا جاتا ہے اور یہ امر مسنون اور احادیث صحیحہ سے ثابت ہے جیسے حضرت سعد کی والدہ کے کنویں کا ذکر صحیح بخاری میں اور صحیح مسلم میں موجود ہے۔ اس نذر کا پورا کرنا ضروری ہوتا ہے پس اس نذر کا حاصل یہ ہے کہ اس طعام وغیرہ کا ثواب فلاں ولی کو پہنچے۔ نذر ولی کا ذکر اس لیے نہیں کیا جاتا کہ وہ اس نذر کا مصرف ہے۔ اس کا مصرف تو اس ولی کے قریبی رشتہ دار خدام درگاہ اور ہم مشرب لوگ ہوتے ہیں۔ ولی کا نام صرف اس عمل کو متعین کرنے کے لیے لیا جاتا ہے۔ نذر کرنے والوں کا بلاشبہ بس یہی مقصد ہوا کرتا

ہے اور اس کا حکم یہ ہے کہ ایسی نذر صحیح ہے اور اس کو پورا کرنا ضروری ہے کیوں کہ یہ ایسی طاعت ہے جو شرعاً معتبر ہے۔"

" و نذر و نیاز هر روزه که در درگاه می آید بقدر حاجت در اولاد و خدام صرف باید نمود و متولی جمع و تقسیم یک کس امین را باید ساخت و تقسیم بر رؤس احیا از اولاد و خدام باید نمود وما لند تقسیم خمس بزوی القربیٰ" (فتاویٰ عزیزی صفحہ ۳۶)

"اور وہ نذر و نیاز جو درگاہ میں ہر روز آتی ہے بقدر حاجت صاحب مزار کی اولاد اور خادموں میں صرف کرنی چاہیے اور متولی کے لیے لازم ہے کہ اس نذر و نیاز کی جمع و تقسیم کے لیے کسی امین کو مقرر کردے وہ صاحب مزار کی اولاد اور احباب اور خدام میں تقسیم کردے جیسا کہ خمس کی تقسیم ذوی القربیٰ پر ہے۔"

" ونیز ازیں است که حضرت امیر و ذریه طاهره او را تمام امت بر مثال پیران و مرشداں می پرستندو امور تکوینیه را با ایشاں وابسته میدانند و فاتحه و درود صدقات و نذر و منت بنام ایشاں رائج و معمول گردیده چنانچه با جمیع اولیاء الله همیں معامله است }۔ (تحفہ اثناعشریہ صفحہ ۴۴۵)

"اور یہ بھی اسی قسم سے ہے جو تمام امت حضرت امیر رضی اللہ عنہ اور ان کی اولادِ طاہرہ کو پیروں اور مرشدوں کی طرح مانتے ہیں اور دنیا کے کاموں کو ان سے متعلق جانتے ہیں اور فاتحہ اور درود اور نذر و صدقات ان کے واسطے مروج و معمول ہو گئے۔ جیسا کہ تمام اولیاء اللہ کے ساتھ یہی معاملہ ہے"

فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ : اضطرار مصدر معلوم مجبور ہونا یا مجہول مجبور کیا جانا۔ پہلا حکم جو گزر چکا وہ اختیاری حالت کا تھا اب حالت غیر اختیاری کو

بیان کیا جارہا ہے۔ مضطر وہ ہے جو حرام چیز کھانے پر مجبور ہو اور اس کو نہ کھانے سے خوف جان ہو خواہ تو شدت کی بھوک یا ناداری کی وجہ سے جان پر بن جائے اور کوئی حلال چیز ہاتھ نہ آئے یا کوئی شخص حرام کھانے پر جبر کرتا ہو اور اس سے جان کا اندیشہ ہو ایسی حالت میں جان بچانے کے لیے حرام چیز کا قدر ضرورت یعنی اتنا کھالینا جائز ہے کہ خوف ہلاکت نہ رہے۔ (خزائن العرفان)

اضطراری حالت کا بیان قرآن پاک میں متعدد مقامات پر آیا ہے۔ مثلاً سورہ انعام میں ہے (قد فصل لکم ما حرم علیکم الا ما اضطررتم الیہ) (اَلآیۃ ۱۱۹) اور سورہ مائدہ میں ہے (فمن اضطر فی مخمصۃ غیر متجانف لاثم) (الآیۃ ۳) قانون یہ ہے کہ حرام چیزوں کا مفصل ذکر ہوتا ہے اور جس چیز کو حرام نہ فرمایا گیا ہو، وہ حلال ہے۔ (نور العرفان)

قصاص کا بیان

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا كُتِبَ عَلَيۡكُمُ الۡقِصَاصُ فِى الۡقَتۡلٰى ؕ اَلۡحُرُّ بِالۡحُـرِّ وَالۡعَبۡدُ بِالۡعَبۡدِ وَالۡاُنۡثٰى بِالۡاُنۡثٰى ؕ فَمَنۡ عُفِىَ لَهٗ مِنۡ اَخِيۡهِ شَىۡءٌ فَاتِّبَاعٌ ۢ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَاَدَآءٌ اِلَيۡهِ بِاِحۡسَانٍ ؕ ذٰلِكَ تَخۡفِيۡفٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ وَرَحۡمَةٌ ؕ فَمَنِ اعۡتَدٰى بَعۡدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ ۱۷۸ وَلَـكُمۡ فِى الۡقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِى الۡاَلۡبَابِ لَعَلَّكُمۡ تَتَّقُوۡنَ

(سورۃ البقرۃ:۱۷۸،۱۷۹)

"اے لوگوں جو ایمان لائے ہو تمہارے لیے مقتولوں میں قصاص فرض کیا گیا ہے۔ آزاد آدمی کو آزاد کے بدلے اور غلام کو غلام کے بدلے اور عورت کو عورت کے بدلے (قتل کیا جائیگا)۔ ہاں اگر کسی قاتل کو اس کے بھائی کی طرف سے معاف کر دیا جائے تو ولی مقتول کے لیے اچھے طریقے سے پیروی اور قاتل کے ذمہ اچھے طریقے سے (خون بہا) کا ادا کرنا ہے۔ یہ تمہارے رب کی طرف سے تخفیف اور رحمت ہے۔ اس پر بھی جو زیادتی کرے اس کے لیے درد ناک عذاب ہے۔ اے عقل مندوں تمہارے لیے قصاص میں زندگی ہے تا کہ تم بچ جاؤ"

شانِ نزول:

زمانۂ جاہلیت میں لوگوں کا دستور یہ تھا کہ ایک قوم یا قبیلے کے لوگ اپنے مقتول کو جتنا قیمتی سمجھتے تھے۔ اتنی ہی قیمت کا خون اس قوم یا قبیلے سے لینا چاہتے تھے جس کے آدمی نے اسے قتل کیا ہو مقتول کے بدلے محض قاتل کی جان لینے سے ان کی تشفی نہیں ہوتی تھی۔ چناں چہ وہ اپنے ایک

آدمی کا بدلہ بیسیوں آدمیوں سے لینا چاہتے تھے۔ اسی طرح اگر ایک قبیلہ کا معزز آدمی دوسرے قبیلے کے کسی چھوٹے آدمی کے ہاتھ سے مارا جائے تو مقتول کے ورثہ یہ چاہتے تھے کہ اس کے بدلے قاتل کے خاندان کے کئی آدمی مارے جائیں۔ یا قاتل کے علاوہ اس خاندان کا کوئی معزز فرد قتل کیا جائے۔ اسی طرح اگر قاتل عورت یا غلام ہو تو اس کے بدلے مرد اور آزاد کے قتل سے اپنے دل کو ٹھنڈا کرتے تھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اور اس میں حکم دیا کہ مقتول کے بدلے قاتل اور صرف قاتل ہی سے قصاص لیا جائے۔ قطع نظر اس سے کہ قاتل کون اور مقتول کون؟ قاتل کی جگہ کسی دوسرے کی جان نہ لی جائے۔

تفسیر:

بعض الفاظ کی تشریح لفظی (کتب علیکم) اس کا معنی فرض علیکم } ہے۔ تم پر قصاص فرض و لازم کیا گیا ہے۔ جیسا کہ دوسرے مقام پر (کتب علیکم الصیام) اور (کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت ان ترک خیراً الوصیة للوالدین) ارشاد فرمایا۔ اور آیت مواریث کے نزول سے قبل وصیت فرض تھی۔ اور اسی معنی میں فرض نماز کو صلوۃ مکتوبہ کہا جاتا ہے۔

قصاص:

هو ان یفعل به مثل ما فعل به من قولک اقتص اثر فلان اذا فعل مثل فعله قال اللہ تعالیٰ (فارتدا علیٰ آثارهما قصصاً) وقال تعالیٰ (وقالت لاخته قصّیه) ای ابتغی اثره. قصاص کا معنی خون کا بدلہ۔ یعنی آدمی کے ساتھ وہی کیا جائے جو اس نے دوسرے آدمی کے ساتھ کیا۔ مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ قاتل نے مقتول کو جس طریقے سے قتل کیا ہو بعینہ اسی طور پر قاتل کو قتل کیا جائے۔ بلکہ مطلب یہ ہے جس طرح قاتل نے دوسرے کی جان لی ہے۔ اسی طرح اس کی بھی جان لی جائے۔ اور اس کی تفصیل اور ائمہ کا اختلاف آگے بیان ہو رہا

ہے۔(ان شاء اللہ تعالیٰ) احناف نے اس آیت میں لفظ القتلیٰ کے عموم سے یہ استدلال کیا ہے کہ قصاص مومنوں پر واجب ہے۔ جب کہ وہ قتل کریں۔ مقتول جو بھی ہو۔ مسلم ہو یا کافر ذمی۔ مرد ہو یا عورت غلام ہو یا آزاد کیوں کہ لفظ القتلیٰ سب کو شامل ہے۔ اور جب تک دلالت خصوص قائم نہ ہو، عموم لفظ کی اتباع ہم پر واجب ہے اور آیت میں ایسی کوئی چیز نہیں جس سے یہ ثابت ہو کہ آیت بعض مقتولوں میں قصاص کو واجب کرتی ہے۔ دون بعض۔

اور اگر کوئی شخص سوال کرے کہ آیت خصوصی حکم فی بعض القتلیٰ میں دو وجہ سے دلالت کرتی ہے۔

۱۔ (فمن عفی له من اخیه شئی فاتباع بالمعروف) لفظ اخیہ اس امر پر دال ہے کہ کافر مقتول حکم قصاص سے خارج ہے۔ اور قصاص صرف مسلمان مقتول ہی کا لیا جانا چاہیے۔ کیوں کہ کافر مسلمان کا بھائی نہیں ہوتا ہے۔

۲۔ قولہ تعالیٰ (الحر بالحر والعبد بالعبد والانثیٰ بالانثیٰ) خصوص مقتولین پر دال ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ استدلال غلط ہے۔ دو وجہ سے ایک یہ کہ جب اول خطاب سب کو شامل ہو تو اس پر جب خصوصی لفظ سے عطف کیا جائے۔ تو وہ عموم لفظ کی تخصیص کا موجب نہیں ہوتا۔ نحو قولہ تعالیٰ (والمطلّقٰت یتربصن بانفسهن ثلاثة قروء) اس آیت میں مطلقات عام ہے۔ تین طلاق سے مطلقہ ہوں یا کم سے پھر اس پر اس قول کا عطف کیا گیا۔ (فاذا بلغن اجلهن فامسکوهن بمعروف او سرحوهن بمعروف) وقولہ تعالیٰ (وبعولتهن احق بردهن) اور یہ حکم مطلقہ مادون الثلاث کے ساتھ خاص ہے اور اس سے ثلاثہ قروء کے سبب ایجاب میں کوئی تخصیص نہیں ہوتی۔ (ونظائر هذا کثیرة) فی القرآن اور دوسری وجہ استدلال کی غلطی کی یہ ہے کہ لمن اخیه میں اخوت سے مراد نسبی اخوت ہے نہ کہ دینی وقولہ تعالے (والی ثمود اخاهم هوداً) اور قولہ تعالیٰ (الحر بالحر) الخ ماقبل کی تاکید اور بیان ہے۔ (ذکر الحال التی خرّج علیه

الکلام) جیسا کہ ہم شان نزول میں ذکر کر چکے ہیں۔علاوہ ازیں (الحر بالحر والعبد بالعبد) عموم اول کی بعض صورتوں کی تفسیر ہے۔اور اس سے قتلی میں تخصیص ثابت نہیں ہوتی جیسا کہ حضور ﷺ نے سود کے بیان میں الحنطة بالحنطة ......مثلا بمثل میں چھ اصناف کا ذکر فرمایا۔اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حکم ربٰو صرف ان اصناف ستہ میں مقصور ہے۔اسی طرف (الحر بالحر (کتب علیکم القصاص فی القتلی) میں عموم لفظ کے اعتبار کا نافی نہیں ہے۔ (قتل العبد بالحر) اور (قتل الانثی با الذکر) پر سب کا اجماع ہے۔یہ بھی اس امر کی دلیل ہے کہ الحر بالحر نے ما قبل میں تخصیص پیدا نہیں کی بلکہ اس کو مزید مؤکد کر دیا ہے۔

اگر کوئی شخص کہے کہ قصاص فرض کیسے ہوسکتا ہے حالاں کہ ولی مقتول عفو و قصاص میں مخیّر ہے۔ہم کہتے ہیں کہ قصاص ولی پر فرض نہیں بلکہ قاتل پر فرض ہے۔لقولہ تعالیٰ (کتب علیکم القصاص فی القتلی) قصاص ولی پر نہیں بلکہ اس کا حق ہے۔اور یہ وجوب علی القاتل کی نفی نہیں کرتا۔اگرچہ ولی قصاص لینے میں مخیّر ہے۔

آیتِ مذکورہ میں القتلی کے عموم پر دیگر نظائر قرآنی۔

۱۔ قولہ تعالیٰ (ومن قتل مظلوماً فقد جعلنا لولیہ سلطانا) (اور جو شخص مظلوماً قتل کیا جائے تو ہم نے اس کے ولی کے لیے قصاص مقرر کیا ہے) لفظ مَـــنْ عام ہے اور تمام ان مقتولوں کو شامل ہے جو ظلماً قتل کیے جائیں۔اور ولی مقتول کے لیے سلطان ہے اور سلطان سے مراد یہاں پر بالاتفاق قود (قصاص ہے) تو گویا یوں کہا گیا۔ (فقد جعلنا لولیہ قودا) اس لیے کہ آیت کے جس معنی پر اتفاق ہو جائے تو گویا وہ منصوص ہے۔

۲۔ (وکتبنا علیہم فیھا ان النفس بالنفس) اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ توراۃ میں بنی اسرائیل پر یہ فرض کیا گیا تھا کہ نفس کا نفس کے بدلے قصاص ہوگا۔اور یہ تمام مقتولوں میں ایجاب قصاص کے عموم کا مقتضی ہے اس استدلال کی تفصیل یوں ہے کہ شرائع

من (قبلنا حجة لنا مالم یرد نسخ فی دیننا) پہلی شریعتیں ہمارے لیے حجت ہیں جب تک ہماری شریعت میں ان کا نسخ وارد نہ ہو۔ لیکن یہ امر پیش نظر رہے کہ شرائع سابقہ ہمارے لیے اس وقت حجت ہونگی جب ان کا ثبوت ہماری شریعت سے ہو۔ ورنہ موجودہ توراۃ وانجیل بوجہ تحریف قابل احتجاج نہیں فافهم.

۳۔ ونظیرہ قولہ تعالیٰ (فمن اعتدیٰ علیکم فاعتدوا علیه بمثل ما اعتدیٰ علیکم) اس آیت میں بھی مَنْ عام ہے۔ (وذلک عمومٌ فی سائر القتلیٰ)

۴۔ ایضا قولہ تعالیٰ (وان عاقبتهم فعاقبوا بمثل ماعوقبتم به) اس آیت کا عموم بھی اس امر کا مقتضی ہے۔ حر، عبد، انثی، ذکر، مسلم، ذمی سب میں قصاص واجب ہے۔

مسئله فی قتل الحر با لعبد

احرار (آزاد) اور عبید (غلاموں) کے مابین قصاص کے بارے میں فقہا نے اختلاف کیا ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ اور ابو یوسف اور محمد اور زفر رحمہم اللہ نے فرمایا۔ (لاقصاص بین الاحرار والعبید الا فی الانفس ویقتل الحر بالعبد) آزاد اور غلام میں نفس میں قصاص ہے۔ یعنی مادون النفس میں نہیں ہے۔ آزاد اگر غلام کو قتل کردے تو اس سے قصاص لیا جائے گا۔ جس طرح کہ غلام سے جب وہ کسی آزاد کو قتل کردے۔ اور ابن ابی لیلی رحمہ اللہ علیہ کے نزدیک جس طرح آزاد اور غلام میں نفس میں قصاص ہے اس طرح مادون النفس تمام جراحات میں بھی قصاص ہے جبکہ مساواۃ فی القصاص ممکن ہو اور امام مالک رحمہ اللہ علیہ کے نزدیک حر اور عبد کے مابین جراح میں قصاص نہیں اور غلام آزاد کے بدلے قتل کیا جائے گا اور آزاد غلام کے بدلے نہیں۔ امام لیث ابن سعد رحمہ اللہ علیہ فرماتے ہیں جب جنایت غلام سے واقع ہو تو اس سے قصاص لیا جائے گا۔ اور آزاد سے غلام کے لیے قصاص نہیں لیا جائے گا اور اگر غلام کسی آزاد کو قتل کردے تو ولی مقتول کے

لیے جائز ہے کہ وہ اس غلام قاتل پر قبضہ کر لے۔ اس صورت میں وہ اسی کا غلام ہو جائے گا اور اگر غلام آزاد پر جنایت کرے تو اور وہ جنایت مادون النفس ہو تو اگر مجروح چاہے تو اس سے قصاص لے سکتا ہے اور امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جس جگہ قصاص فی النفس ہو سکتا ہے وہاں قصاص فی الجروح بھی ہو سکتا ہے اور (لا يقتل الحر بالعبد ولا يقتص له منه فيما دون النفس)

حنفیہ نے اپنے قول پر یہ دلیل پیش کی ہے کہ اس آیت میں مقتولوں کے قصاص کا بیان ہے۔ اور یہ حکم اپنے عموم کے اعتبار سے تمام مقتولوں کو شامل ہے۔ اور مادون النفس میں قصاص کا اس آیت میں ذکر ہی نہیں۔ نیز اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد (ولكم في القصاص حيوة يا اولى الالباب) سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ قصاص اسلیے واجب ہے۔ کہ اس میں ہمارے لیے حیات ہے۔ اور یہ خطاب حر اور عبد سب کو شامل ہے۔ اس لیے کہ اولی الاباب سب کو شامل ہے لہٰذا جب علت سب جگہ موجود ہے۔ تو بعض پر اقتصار جائز نہیں اور من جهة السنّة نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد بھی اس کا مؤید ہے۔ (المسلمون تتكافأ دماء هم) (مسلمانوں کے دماء میں مساوات ہونی چاہیے) وهو عام في العبيد والا حرار فلا يخص منه شئى الا بدلالة) نیز حدیث صحیح سب میں وارد ہے۔ (عن عبدالله بن مسعود قال قال رسول الله ﷺ لايحل دم رجل مسلم يشهد ان لااله الا الله وانى رسول الله الافى احدى ثلث التارک للاسلام المفارق للجماعة والثيب الزانى والنفس بالنفس) اس حدیث میں خصوصی طور پر اس مسئلہ میں محل استدلال لفظ النفس بالنفس ہے۔ اس میں حر اور عبد میں کوئی فرق نہیں بیان کیا گیا۔

(واجب القصاص في النفس بالنفس وذالك موافق لما حكى الله مما كتبه على بنى اسرائيل من ذالک فحكمه باقٍ علينا } (جصاص) ایضاً. a لعن ابن عباس قال قال رسول الله ﷺ العمد قودٌ الاّ ان يعفو ولى المقتول) (الجصاص سنده) یہ حدیث دو معنی پر دلالت کرتی ہے۔ (ا) ہر قتل عمد میں قصاص کا وجوب اور یہ قصاص قاتل

عبد پر بھی ہوگا۔

قصاص کے ساتھ مال کا دینا واجب نہیں۔ اس لیے کہ حدیث میں صرف قود (قصاص) ہی ذکر ہے۔ اگر قصاص اور مال میں تخییر ہوتی تو مال کا بھی قصاص کے ساتھ ضرور ذکر ہوتا۔ اور قیاس بھی چاہتا کہ غلام کے بدلے آزاد کو قتل کیا جائے۔ اس لیے کہ غلام بھی اس طرح محقون الدم ہے جس طرح آزاد اور وہ قاتل کا لڑکا نہیں ہے۔ اور نہ اس کی ملک ہے تو من وجہ حر اجنبی کے مشابہ ہو ا۔ تو دونوں میں قصاص واجب ہوا جیسا کہ غلام کے آزاد کو قتل کی صورت میں واجب ہوتا ہے۔ (لوجود العلة) جو حضرات آزاد کے غلام کو قتل کرنے کی صورت میں عدم قصاص کے قائل نہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ غلام میں نقصان رقیت مانع قصاص ہے۔ جواب یہ ہے کہ انفس میں مساواۃ کا اعتبار نہیں ہے۔ (انما یعتبر فی مادونها) اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر دس آدمی مل کر ایک شخص کو قتل کر دیں تو سب کو اس ایک کے بدلہ قتل کیا جائے گا۔ اور مساوات کا اعتبار نہیں ہوگا۔

اسی طرح اگر ایک شخص صحیح الجسم سلیم الاعضاء کسی مفلوج مریض مدقوق مقطوع الاعضاء کو قتل کر دے تو اس سے قصاص لیا جائے گا۔ اسی طرح اگر کوئی مرد عورت کو قتل کر دے (مع نقصان عقلها ودينها) اور عورت کی دیت بھی مرد کی دیت سے ناقص ہوتی ہے۔ تو اس مرد سے بھی قصاص بدستور لیا جائے گا۔ پس ثابت ہوا کہ انفس میں ایجاب قصاص میں مساواۃ کا کوئی اعتبار نہیں۔ اور کامل سے ناقص کا قصاص لیا جائے گا۔ اور یہ حکم مادون النفس کو شامل نہیں۔ اس لیے کہ بالاتفاق شل ہاتھ کے بدلے درست ہاتھ نہیں کاٹا جائیگا۔ اور تندرست آدمی کو بیمار کے بدلے قتل کیا جائے گا۔ (وروى الليث عن الحكم ان علياً وابن مسعود قالا من قتل عبداً عمداً فهو قود) چوں کہ یہ مسئلہ حنفیہ اور غیر حنفیہ میں نہایت معرکتہ آلاراء ہے۔ اس لیے ہم نے اس کو قدرے تفصیل سے بیان کر دیا ہے۔ وفيه كفاية لمن له دارية والله ولى الهداية. (والله اعلم)

(القصاص بین الرجال والنساء)

مردوں اور عورتوں کے درمیان قصاص کا حکم

فقہاء نے اس مسئلہ میں بھی اختلاف کیا ہے کہ مردوں اور عورتوں میں قصاص ہے یا نہیں۔ امام اعظم ابوحنیفہ، ابویوسف، محمد زفر اور ابن شبرمہ رضی اللہ عنھم نے فرمایا کہ مردوں اور عورتوں میں النفس میں قصاص ہے۔ اور مادون النفس جراحات میں نہیں ہے۔ اور ابن شبرمہ سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ مرد عورت میں مادون النفس بھی قصاص ہے۔ اور ابی لیلی، امام مالک، لیث اوزاعی اور امام شافعی رحمھم اللہ تعالیٰ کے نزدیک مردوں اور عورتوں میں نفس میں قصاص ہے اور مادون النفس میں بھی ہے۔ مگر امام لیث فرماتے ہیں کہ جب مرد عورت پر جنایت کرے تو وہ عورت کو تاوان دے اور اس سے قصاص نہیں لیا جائے گا۔ اور عثمان البتی کا قول ہے کہ جب عورت مرد کو قتل کردے تو اس کو مرد کے بدلے قتل کیا جائے گا۔ اور اس کے مال سے نصف دیت بھی لی جائیگی۔ اسی طرح اگر عورت مرد کو زخمی کردے تو اس کا بھی یہی حکم ہے۔ اور اگر مرد عورت کو قتل کردے یا زخمی کردے تو اس پر قصاص ہے۔ (ولا یرد علیہ شئیٌ) اور سلف سے بھی اس بارے میں اختلاف چلا آیا ہے۔ اور تمام وہ آیات جن میں قصاص کا ذکر ہے ان میں کسی میں بھی دیت کا ذکر نہیں اور قصاص کے ساتھ دیت کا حکم دینا زیادہ فی النص ہے۔ اور زیادت فی النص موجب نسخ ہوتا ہے۔ اور حدیث ربیع بنت نضر کی بھی احناف مؤید ہے۔ (کذاذکرہ الجصاص فی احکام القرآن)

واللہ اعلم

قتل المومن بالکافر

امام ابوحنیفہ، ابو یوسف، محمد زفر ابن ابی لیلی اور عثمان البتی قدس سرھم فرماتے ہیں کہ مسلم کو ذمی کے بدلے قتل کیا جائے گا اور ابن شبرمہ ثوری اور اوزاعی اور امام شافعی (رحمھم اللہ تعالیٰ) کے نزدیک نہیں قتل کیا جائے گا۔ اور امام مالک اور لیث بن سعد (رحمھم اللہ تعالیٰ) فرماتے ہیں۔ (ان قتلہ غیلۃً قتل بہ والا لم یقتل) آیت کی تفسیر کے شروع میں ہم نے وہ آیتیں ذکر کردی ہیں جن کا ظاہر یہ ہے کہ مسلم کو ذمی کے بدلے قتل کیا جائے گا۔ اس لیے کہ حکم قصاص میں مسلم اور ذمی میں کوئی فرق نہیں کیا گیا۔ مزید مندرجہ ذیل احادیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

عن ابی ھریرۃ ان رسول اللہ ﷺ خطب یوم فتح مکۃ فقال الا ومن قتل قتیلاً فولیہ بخیر النظرین بین ای یقتص او یاخذ الدیۃ)

ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے دن خطاب فرمایا، بس فرمایا خبردار جس نے کسی آدمی کو قتل کیا تو اس کا ولی دو امر میں سے بہتر کا مختار ہے۔ یا تو اس سے قصاص لے لے یا دیت لے لے)

(وعن ابی شریح الکعبی عن النبی ﷺ مثلہ وحدیث عثمان و ابن مسعود و عائشہ عن النبی ﷺ لا یحل دم امرئ مسلم الا باحدیٰ ثلثٍ زناً بعد احصان و کفر بعد ایمان وقتل نفس بغیر نفسٍ)

(اور ابی شریح الکعبی نے نبی کریم ﷺ سے اسی طرح روایت کی اور حدیث عثمان اور ابن مسعود اور عائشہ (رضی اللہ عنہم) نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: ان تین میں سے ایک کے علاوہ کسی شخص کا خون مسلمان پر حلال نہیں۔ شادی شدہ شخص کا زنا کرنا اور ایمان کے کے بعد کفر اور بغیر نفس۔ کسی نفس کو قتل کرنا) (واللہ اعلم)

(وعن ابن عباس ان النبی ﷺ قال العمد قودٌ) (ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: قتل عمد میں قصاص ہے)

اوران روایات کا عموم قتل المسلم بالذمی کا مقتضی ہے۔

(وعن عبدالرحمن بن السلمانی ان النبی ﷺ اقاد مسلماً بذمی وقال انا احق من وفی بذمته) (نبی کریم ﷺ نے مسلمانوں سے ذمی کا قصاص لیا اور فرمایا کہ میں اس کے ذمہ کو پورا کرنے کا زیادہ حق رکھتا ہوں)

وروی طحاوی......عن محمد بن المنکدر میں اور عن النبی ﷺ مثلہ اور امام طحاوی نے محمد بن منکدر کی روایت حدیث عبدالرحمٰن کے مثل روایت کی ہے اور حضرت عمر، علی اور عبداللہ (رضی اللہ عنھم) سے بھی قتل مسلم بالذمی کی روایت کی گئی ہے۔ جصاص رازی اپنی سند سے ابی الجنوب اسدی سے روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص اہل حیرہ سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی اے امیر المومنین ایک مسلمان نے میرے بیٹے کو قتل کر دیا ہے اور میرے پاس گواہ ہیں پس گواہ آئے اور انہوں نے گواہی دی آپ نے ان کے بارے میں تحقیق کی تو ان گواہوں کا تزکیہ کیا گیا تو حضرت علی (رضی اللہ عنہ) نے مسلمان کو حکم دیا کہ بیٹھ جائے اور اس حیری کو تلوار دی اور فرمایا کہ اس کو مسلمان کے ساتھ باہر جبانہ (جنگل) میں لے جاؤ تا کہ یہ اس کو (اپنے لڑکے کے بدلے) قتل کر دے اور ہم نے اس کو تلوار پکڑا دی تو حیری نے تاخیر کی۔ تو قاتل کے بعض رشتہ داروں نے اس حیری سے کہا کہ کیا تو دیت لے لے گا جس سے تو عیش کرے گا اور ہم پر تیرا احسان بھی ہوگا اس نے کہا ہاں اور تلوار کو میان میں داخل کر دیا اور حضرت علی کی خدمت میں واپس آیا۔ آپ نے فرمایا کہ شاید انہوں نے تجھے بُرا بھلا کہا اور دھمکی دی۔ اس نے کہا لا واللہ ولیکن میں نے قصاص کی جگہ دیت قبول کر لی پس حضرت علی نے فرمایا تو بہتر جانتا ہے پھر حضرت علی قوم

کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا ہم نے تو ان کو دیا جو کچھ دیا تا کہ معلوم ہو جائے ان کے خون اور دیت کا وہی حکم ہوتا ہے جو مسلمانوں کا ہوتا ہے اور نزال بن شبرہ سے روایت ہے کہ ایک مسلمان آدمی نے ایک عبادی نصرانی کو قتل کر دیا تو اس کا بھائی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو حضرت عمر نے یہ حکم لکھ کر بھیجا کہ قاتل کو قتل کر دیا جائے۔ تو لوگ مقتول کے ولی جبیر سے کہنے لگے کہ اس کو قتل کر دے تو اس نے کہا، حتی یاتی الفیظ تو حضرت عمر نے حکم فرمایا کہ قاتل کو قتل نہ کیا جائے اور مقتول کی دیت دے دی جائے۔ رازی فرماتے ہیں کہ وہ مسلمان قاتل بڑا بہادر اور شہ سوار تھا اس لیے حضرت عمر نے دوبارہ یہ حکم دیا تا کہ مقتول کے وارث بطور صلح دیت لے لیں۔ واللہ اعلم۔

(وعن علی و عبداللہ بن مسعود قالا اذا قتل یھودیا او نصرانیا قتل بہ)
(حضرت علی اور ابن مسعود سے مروی ہے کہ جب مسلمان کسی یہودی یا عیسائی کو قتل کر دے تو اس مسلمان کو قتل کیا جائے گا) ایسے ہی عمر بن عبدالعزیز نے فرمایا۔

مانعین قتل مسلم بالذمی کے دلائل

مانعین نے مسلم کو ذمی کے بدلے قتل نہ کرنے پر یہ دلائل پیش کیے ہیں۔

۱۔ عن النبی ﷺ لا یقتل مسلم بذمی ولا ذو عھد فی عھدہ رواہ قیس بن عباد حارثہ بن قدامہ و ابو جحیفہ مسلمان کو ذمی کے بدلے قتل نہ کیا جائے اور نہ کسی ذو عہد کو اس کے عہد میں اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے دریافت کیا گیا کہ کیا آپ کے پاس رسول اللہ ﷺ کی طرف سے قرآن کے سوا اور کوئی عہد ہے؟ تو آپ نے فرمایا صرف حضور علیہ السلام کی ایک تحریر ہے جو میری تلوار کے غلاف میں ہے اور اس میں ہے کہ

مسلمانوں کے خون مساوی ہیں اور کسی مومن کو کافر کے بدلے قتل نہ کیا جائے اور نہ کسی ذی عہد کو اس کے عہد میں۔

اور حدیث عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ عن النبی ﷺ قال یوم فتح مکہ (لا یقتل مومن بکافرٍ ولا ذو عہد فی عہدہ) مثلہ عن عبداللہ بن عمرو.

جواب: اس خبر کی متعدد تاویلیں ہو سکتی ہیں جس سے سابقہ آیات اور احادیث میں تطبیق ہو جاتی ہے۔

1. حضور علیہ السلام کا یہ خطبہ فتح مکہ کے دن تھا اور زمانہ جاہلیت میں قبیلہ خزاعہ کے ایک شخص نے قبیلہ ھذیل کے ایک شخص کو قتل کر دیا تھا۔ جاہلیت کی عداوت کی بناء پر۔ تو حضور علیہ السلام نے فرمایا (الا ان کل دم کان فی الجاھلیہ فھو موضوع تحت قدمی ھاتین لا یقتل مومن بکافرٍ ولا ذو عھد فی عھدہ) (خبردار جاہلیت کا ہر خون میرے ان قدموں کے نیچے پامال کر دیا گیا ہے۔ کسی مومن کو کافر کے بدلے قتل نہیں کیا جائے گا اور نہ کسی ذی عہد کو اس کے عہد میں) یعنی کسی مسلمان کو اس کافر کے عوض نہیں قتل کیا جائے گا جسے مسلمان نے زمانہ جاہلیت میں قتل کیا اور یہ) (کل دم) الخ کی تفسیر ہو جائے گی کیوں کہ یہ ایک ہی خطاب میں مذکور ہے اور اہل مغازی نے ذکر کیا ہے کہ کفار سے عہدِ ذمہ فتح مکہ کے بعد کیا گیا۔ اس سے قبل نبی اکرم ﷺ اور مشرکین کے مابین ایک مدت تک کے معاہدے تھے نہ کہ وہ اسلامی ذمہ اور حکم میں داخل تھے اور فتح مکہ کے موقع پر آپ (ﷺ) کا یہ فرمانا کہ (لا یقتل مومن بکافرٍ) اس میں کافر سے مراد کافر معاہد ہے کیوں کہ اس وقت کوئی ذمی تھا ہی نہیں اور حضور (ﷺ) کا ارشاد (لا ذو عھد فی عھدہ) بھی اسی پر دال ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ (فاتموا الیھم عھدھم الی مدتھم) وقال (فسیحو فی الارض اربعۃ اشھر) اور اس وقت مشرکوں کی دو قسمیں تھیں ایک وہ حربی جن کا حضور علیہ السلام سے کوئی معاہدہ نہیں تھا اور دوسرے وہ حربی جن سے ایک

مدت تک کے لیے عہد تھا اور اہل ذمہ اس وقت تک تھے ہی نہیں۔ (فانصرف الکلام الی الضربین من المشرکین)

4. اس خبر کا مضمون اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہاں نفی قصاص حربی معاہدہ پر مقصور ہے دون الذمی یہ اس لیے ذو عہد فی عہدہ کو ماقبل پر عطف کیا گیا ہے اور یہ اگر ماقبل سے الگ ہوتو ایجاب فائدہ میں مستقل بنفسہٖ نہیں ہے۔ (فھو اذا مفتقر الی ضمیر و ضمیرہ ما تقدم ذکرہٗ) اور یہ ظاہر کہ کافر جس کے عوض مسلمان ذوعہد کو قتل نہیں کیا جائے گا وہ حربی مستامن ہے۔ (فثبت ان مرادہ مقصور علی الحربی) پس اگر کوئی شخص یوں کہے کہ حدیث ابی جحیفہ عن علی عن النبی ﷺ میں صرف (لایقتل مومن بکافرٍ) ہے اور عہد کا ذکر نہیں ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی کافر کے بدلے مسلمان کا قتل جائز نہیں۔ ہم کہیں گے یہ حدیث ایک ہی ہے۔ بعض راویوں نے عہد ذکر نہیں کیا اور اگر بالفرض اصل حدیث ایک نہ ہوتو اس دوسری روایت کو بھی پہلی روایت کے مطابق بنایا جائے گا۔ اس لیے کہ یہ بات ثابت نہیں کہ حضور علیہ السلام نے دو وقتوں میں یہ ارشاد فرمایا ہے۔ ایک دفعہ مطلقاً بغیر ذکر ذی العہد کے اور دوسری مرتبہ مع ذکر ذی العہد۔ ایضاً مانعین حضرات نے حضور علیہ السلام کے ارشاد گرامی (المسلمون تتکا فادماء ھم) سے استدلال کیا ہے اور یوں کہا ہے کہ کافر کا دم مسلمان کے دم کے مکافی نہیں ہے۔ (وھذا لا دلالۃ فیہ علی ماقالوا) اس لیے کہ (المسلمون تتکا فا دمائھم غیر مسلمین) کے دماء کی مکافات کی نفی نہیں کرتا اور اس ارشاد کا فائدہ ظاہر ہے کہ حر و عبد، شریف و وضیع، صحیح و سقیم میں مکافات ثابت ہے۔ (فھذہ کلھا فوائد ھذا الخبر و الحکایۃ) اور قتل المسلم بالذمی پر ایک یہ بھی دلیل ہے کہ اس امر پر سب کا اتفاق ہے کہ اگر مسلمان کافر ذمی کا مال چوری کرے تو مسلمان کا ہاتھ کاٹا جائے گا جیسا کہ مسلمان کا مال چوری کرنے سے کاٹا جاتا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اگر مسلم ذمی کو قتل کردے تو اس سے

قصاص لیا جائے کیوں کہ حرمتِ دم حرمت مال سے اعظم ہے۔ چناں چہ اگر غلام اپنے مولی کی چوری کرے تو اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جاتا اور اگر قتل کرے تو قصاص میں قتل کیا جاتا ہے۔ (لان حرمة الدم اعظم من حرمة المال) اور امام مالک اور لیث کا یہ فرمانا کہ قتل غیلہ میں مسلمان بطور حد قتل کیا جائے گا نہ بطور قصاص اس لیے صحیح نہیں کہ جن آیات اور احادیث میں اس قتل کا ذکر ہے ان میں غیلہ اور غیر غیلہ میں کوئی فرق نہیں کیا گیا ہے اور ان کا عموم قتل علی وجہ القصاص کا موجب ہے۔ (لا علی وجه الحد فمن خرج عنها بغير دلالته كان محجوجاً) واللہ اعلم

قتل الوالد بولده

(باپ کا اولاد کے بدلے قتل)

عام فقہاء کے نزدیک باپ سے اولاد کا قصاص نہیں لیا جائے گا اور اس کے ذمہ بجائے قصاص کے دیت ہوگی جو اسی کے مال سے لی جائیگی۔ (وعليه الحنيفه والا وزاعی والشافعی) اور باپ دادا کا اس مسئلہ میں ایک ہی حکم ہوگا اور حسن بن صالح بن حی نے کہا ہے کہ دادا سے پوتے کا قصاص لیا جائے گا اور حسن مذکور دادا کی شہادت پوتے کے حق میں جائز قرار دیتے ہیں اور باپ کی شہادت بیٹے کے حق میں جائز نہیں سمجھتے تھے اور عثمان البتی قول ہے کہ اگر باپ بیٹے کو عمداً قتل کرے تو اس کو قتل کیا جائے گا (وقال مالک يقتل به) اور امام مالک سے یہ بھی حکایت کی گئی ہے کہ باپ اگر بیٹے کو ذبح کر دے تو باپ کو اس کے عوض قتل کیا جائے گا۔ (وان حذفه بالسيف لم يقتل به)

عام فقہاء کی دلیل

1. عن عمر قال سمعت رسول اللہ ﷺ یقول لا یقتل والد عن ولدہ) حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے میں نے سنا ہے کہ حضور نے فرمایا کہ والد کو اس کی اولاد کے بدلے قتل نہیں کیا جائے گا۔ یہ خبر مستفیض اور مشہور ہے۔ حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے صحابہ کے سامنے یہ حکم نافذ فرمایا اور کسی نے اس میں اختلاف نہیں کیا۔ پس یہ خبر اسی طرح خبر مستفیض متواتر کے حکم میں ہوگئی۔ جیسا کہ حدیث (لا وصیۃ لوارث) (ایضاً عن عمر بن الخطاب قال سمعت رسول اللہ ﷺ یقول لا یقاد الاب بابنہ. ایضا عن ابن عباس قال قال رسول اللہ ﷺ لا یقاد الوالد بولدہ) دونوں حدیثوں کا مطلب یہ ہے کہ والد سے اولاد کے بدلے قصاص نہیں لیا جائے گا۔ ایضا

نبی علیہ السلام سے مروی ہے کہ حضور نے فرمایا (انت ومالک لابیک) (تو اور تیرا مال تیرے باپ کا ہے) اس حدیث میں حضور علیہا السلام نے نفسِ ولد کو والد کی طرف ایسے ہی نسبت کیا ہے جیسے اس کے مال کو اور اس اضافت کا اطلاق قصاص کی نفی کرتا ہے۔ جیسا کہ غلام کی اضافت اس کے مالک کی طرف مانع قصاص ہے اور باپ اگرچہ بیٹے کے مال کا فی الحقیقت مالک نہیں ہے تاہم ہمارے استدلال کے لیے اطلاق اضافت کافی ہے کیوں کہ قصاص شبہ سے ساقط ہو جاتا ہے اور اس اضافت کی صحت سقوط قصاص کا شبہ ہے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا (ان اطیب ما اکل الرجل من کسبہ وانّ ولدہ من کسبہ وقال علیہ السلام ان اولادکم من کسبکم فکلوا کسب اولادکم) پس حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان حدیثوں میں اولاد کو کسب الرجل سے قرار دیا جیسا غلام کو اس کا کسب قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا سقوط قصاص کے لیے یہ شبہ پیدا ہوگیا (وان الحدود تندرء

بالشبهات) اللہ تعالیٰ نے فرمایا (ووصینا الانسان بوالدیه حملته امه وهناً علیٰ وهنٍ و فصاله فی عامین ان اشکرلی ولوالدیک الی المصیر وان جاهداک علی ان لا تشرک الایة) اس آیت میں کافر والدین سے مصاحبت بالمعروف کا حکم دیا گیا ہے اور شکر والدین کو اپنے شکر سے مقرون کیا ہے اور اسی طرح دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے (اما یبلغن عندک الکبر احدهما او کلاهما فلا تقل لهما اف ولا تنهر هما وقل لهما قولاً کریماً واخفض لهما جناح الذل من الرحمة وقل رب ارحهما کما ربیانی صغیرا) ان آیات میں اولاد کو والدین کے حق میں جس حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے وہ والد سے قصاص لینے کے بالکل متضاد ہے نیز حضور علیہ السلام نے حنظلہ بن ابی عامر الراھب الفاسق کو اپنے اس باپ کو قتل کرنے سے منع فرمایا۔ حالاں کہ وہ مشرک تھا اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کا محارب اور جنگِ احد میں حضور علیہ السلام کے مقابلے میں قریش کا ساتھی تھا۔ اگر بیٹے کے لیے باپ کو قتل کی کسی حالت میں اجازت ہوتی تو ابی عامر راھب کے قتل کے اجازت حضرت حنظلہ کو ضرور مل جاتی۔ (فلما نهاه علیه السلام عن قتله فی هذه الحال علمنا انه لا یستحق قتله بحالٍ)

اسی طرح ہمارے اصحاب نے فرمایا کہ اگر باپ بیٹے کو تہمت لگائے تو باپ پر حد قذف نہیں ہوتی۔ یوں ہی اگر بیٹے کا ہاتھ کاٹ دے تو اس سے قصاص نہیں لیا جائے گا اور اگر باپ کے ذمہ بیٹے کا قرض ہو۔ تو اس کے عوض باپ کو قید نہیں کیا جائے گا۔ اس لیے کہ یہ امور مذکورہ آیات قرآنیہ کی ضد ہیں اور بعض فقہاء کے نزدیک باپ بیٹے کے مال کا حقیقتاً مالک ہے۔ جس طرح اپنے غلام کی کمائی کا اور ان کے نزدیک اگر باپ بیٹے کے مال سے کچھ لے لے تو اسے واپس کرنے کا حکم نہیں دیا جائے گا۔ سقوط قصاص کے لیے تو فقہاء کا یہی اختلاف کافی ہے، اور اس سے قبل جو دلائل ہم نے پیش کیے وہ اس کے علاوہ ہیں۔ ان دلائل سے آیات قصاص کی تخصیص جائز ہے۔ (ویدل هذا الامر علی ان الوالد غیر مراد بها) (واللہ اعلم)

دو یا زیادہ اشخاص کا ایک شخص کے قتل میں شریک ہونا

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے (ومن یقتل مؤمنا متعمداً فجزاء ہٗ جھنم خالدا فیھا) (اور جو شخص کسی مومن کو قتل کردے اس کی جزا جہنم ہے دراں حالاں کہ اس میں ہمیشہ رہے گا) الایۃ اور نیز فرماتا ہے (ومن قتل مومناً خطأً فتحریر رقبۃ مومنۃٍ) اور جو شخص کسی مومن کو غلطی سے قتل کردے تو اس کے ذمہ ایک مومن رقبہ (غلام یا کنیز) کا آزاد کرنا ہے) یہ وعید اس شخص کو بھی شامل اور لاحق ہے جو قتل میں دوسرے آدمی کیساتھ شریک ہوا اور اگر دس 10 آدمیوں نے مل کر ایک آدمی کو عمداً قتل کیا تو ہر ایک اس وعید میں داخل ہوگا اسی طرح اگر دس 10 آدمیوں نے مل کر ایک شخص کو خطاء قتل کیا۔ تو وہ سب قتل خطاء کی وعید میں شامل ہوں گے اور سب پر مستقل کفارہ لازم ہوگا۔

اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے (ومن اجل ذالک کتبنا علی بنی اسرائیل انہ من قتل نفساً بغیر نفس او فسادٍ فی الارض فکانما قتل الناس جمیعاً) لہٰذا جماعت نے مشترکہ طور پر اگر ایک آدمی کو قتل کیا تو ان میں ہر ایک قاتل للنفس کے حکم میں ہوگا اور اس باب میں اور بھی بہت سی فروع اور جزئیات ہیں جنہیں اس مقام پر امام ابوبکر الرازی نے احکام القرآن میں مع الدلائل بیان فرمایا ہے۔ (وترکناھا خوفاً من الاطناب من احتاج الی التفصیل فلیراجع الی احکام القرآن)

ما یجب لولی قتیل العمد

اللہ تعالیٰ نے فرمایا (کتب علیکم القصاص فی القتلی) نیز فرمایا (وکتبنا علیھم فیھا ان النفس بالنفس) ایضاً (ومن قتل مظلوماً فقد جعلنا لولیہٖ سلطانا) اور

ائمہ دین نے اس پر اتفاق کیا کہ سلطان سے مراد یہاں قصاص کماۃ اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا (وان عاقبتم فعاقبوا بمثل ماعوقبتم به) نیز فرمایا (فمن اعتدی علیکم فاعتدوا علیه بمثل ما اعتدیٰ علیکم) ان تمام آیات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ قاتل پر صرف قصاص واجب ہے۔ لاغیر اور فقہا نے اس بارے میں اختلاف کیا ہے۔ کہ قتل عمدہ کا موجب کیا ہے امام اعظم ابوحنیفہ اوران کے اصحاب اور امام مالک بن انس اور ثوری اور ابن شبرمہ اور حسن بن صالح نے فرمایا کہ ولی مقتول صرف قصاص لے سکتا ہے۔ اور قاتل کی مرضی کے بغیر دیت نہیں لے سکتا ہے۔ اور امام شافعی اور زاعی اور لیث کے نزدیک ولی کو اختیار ہے چاہے قصاص لے اور چاہے دیت اگر چہ قاتل ناراض ہو۔ قول اول کی دلیل یہ ہے کہ قرآن کریم کی مذکورہ آیات کا ظاہر یہی ہے کہ قاتل پر قصاص واجب ہے۔ دون المال اور (علی وجه التخیر) مال کا واجب کرنا جائز نہیں (الا بمثل مایجوز نسخهٔ لان الزیادة فی نص القرآن) تو جب نسخہ اور قران کریم کی یہ آیت بھی اس پر دلالت کرتی ہے۔ (یاایهاالذین امنوا لاتاکلوا اموالکم بینکم بالباطل الا ان تکون تجارة عن تراضٍ منک) پس اہل اسلام کو آپس میں ایک دوسرے کا مال لینا بغیر اس کی رضامندی کے جائز نہیں (ای یحوز علی وجه التجارة وبمثله) اور حدیث میں اسی طرح وارد ہے حضور ﷺ نے فرمایا (لایحل مال امرء مسلم الا بطیبة من نفسة الحدیث) اگر قاتل مال دینے پر راضی نہ ہو اور اس کا نفس مال دینے پر خوش نہ ہو۔ تو اس سے جبراً مال لینا ممنوع ہے۔

اور ابن عباس (رضی اللہ عنہ) سے مروی ہے قال رسول اللہ ﷺ (العمد قودٌ الایعفو ولی المقتول) یعنی قتل عمد میں قصاص ہے مگر یہ ولی مقتول معاف کردے اسی طرح ابن عباس سے طاؤس نے ایک دوسری روایت بھی کی ہے اس میں بھی صرف قتل عمد میں قصاص کا ذکر ہے۔ تو حضور ﷺ کا صرف قصاص پر حکم عمد کو مقصور کرنا اس امر کی دلیل ہے کہ اخذ دیت کا ولی کو اختیار نہیں (الا برضا القاتل قوله تعالیٰ فمن عفی له من اخیه شیٌ فاتباع بالمعروف واداءٌ الیه باحسان) کی تفسیر اس کا تقاضا کرتی ہے۔

کیفیت قصاص

قال اللہ تعالیٰ (یاایھاالذین امنوا کتب علیکم القصاص فی القتلی) دوسری آیت میں فرمایا (والحرمات قصاص فمن اعتدی علیکم فاعتدوا علیه بمثل ما اعتدیٰ علیکم) اور فرمایا (وان عاقبتم فعاقبوا بمثل ماعوقبتم به) ان آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ قصاص لیتے وقت استیفائے مثل واجب ہے۔ اور جس پر جنایت واقع ہوتی ہے وہ یا مقتول کا ولی جانی (جنایت کرنے والے) پر بدلہ لیتے ہوئے زیادتی نہیں کرسکتا ہے۔ اور کیفیت قصاص میں فقہا میں اختلاف ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ، ابویوسف، محمد زفر رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک قصاص صرف تلوار سے لیا جائے گا۔ چاہے قاتل نے مقتول کو کسی اور طریقہ سے قتل کیا ہو۔

اور ابن القاسم نے امام مالک سے روایت کی ہے۔ کہ اگر قاتل نے لاٹھی یا پتھر یا آگ یا پانی میں ڈبونے سے قتل کا اقدام کیا ہے تو قصاص میں اس کو بھی اسی طرح قتل کیا جائے گا۔ اور اگر ایک مرتبہ ایسا کرنے سے وہ نہ مرا تو بار بار اسی فعل کا اس پر تکرار کیا جائے گا یہاں تک کہ مر جائے (وان زاد علی فعل القاتل)

اور ابن شبرمہ کے نزدیک قاتل کو اسی طرح ماریں گے جس طرح اس نے مقتول کو مارا ہے۔ لیکن اتنا ہی ماریں گے جتنا اس نے مارا ہے۔ اس پر اضافہ نہیں کریں گے۔ اور امام شافعی کے نزدیک اگر قاتل نے کسی کو پتھر سے مارا یہاں تک مارا کہ وہ مر گیا۔ پس اگر وہ اس طرح نہ مرا تو اس کو تلوار سے قتل کر دیا جائے گا۔

......مولانا غلام علی اوکاڑوی......

روزہ کا لغوی اور شرعی معنی اور اس کی مشروعیت کی تاریخ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ

عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (سورۃ البقرۃ:۱۸۳)

"اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کیے گئے جیسے کہ اگلوں پر فرض ہوئے

کہ کہیں تمہیں پرہیزگاری ملے"

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: چوں کہ روزہ کا حکم دیا جا رہا ہے جو نفس پر بھاری ہے لہٰذا مسلمانوں کو پیارے خطاب سے پکار کر ان کی عزت افزائی فرمائی اور ہمت بڑھائی۔ "یا" کہہ کر پیاروں کو پکارا اور (ایھا) کی تنبیہ سے ان کی غفلت دور کی اور (امنوا) فرما کر ان کے محبوب ہونے کی گواہی دی کہ اے وہ لوگوں جو ایمان لا کر ہمارے ہو چکے، ہماری ہر سخت و نرم بات قبول کرو۔ اگر آگ میں گرنے کو فرمائیں تو کود جاؤ اگر تمہیں کسی پسندیدہ چیز سے ہٹائیں تو ہٹ جاؤ کیوں کہ تقاضائے محبت یہی ہے لہٰذا تم سے فرماتے ہیں۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ: کتب کے معنی ہیں لکھے گئے یا لازم کیے گئے۔ صیام کا مادہ صوم ہے جس کے لغوی معنی ہیں باز رہنا۔ چھوڑنا اور سیدھا ہونا۔ اسی لیے خاموشی کو صوم کہتے ہیں۔ (انی نذرت للرحمن صوما فلن اکلم) الخ کیوں کہ اس میں کلام سے باز رہنا ہے۔ دوپہر کو صوم النہار کہتے ہیں۔ کیوں کہ سورج جب آسمان کے درمیان پہنچتا ہے تو معلوم ہوتا ہے گویا کچھ دیر کے لیے رک گیا ہے۔ ایسے ہی اہل عرب (صامت الریح) ہوا درست ہو گئی اور (صام الفرس) گھوڑا کھڑا ہو گیا وغیرہ بولتے ہیں۔ اور شریعت میں مسلمان کا صبح صادق سے آفتاب ڈوبنے تک بانیتِ

عبادت کھانا، پینا اور ہم بستری کا ترک کرنا صوم ہے یعنی روزہ۔ یہاں فرضیتِ صیام سے مراد ماہِ رمضان کے روزے ہیں نہ کہ عاشورہ یا ہر ماہ کے درمیانی تاریخوں کے روزے۔ لہٰذا یہ آیت ان احادیث کی ناسخ ہے جن سے ان روزوں کی فرضیت ثابت ہے نسخِ حدیث بالقرآن درست ہے۔
كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُم: چوں کہ روزہ نفس پر دشوار تھا اسے آسان کرنے کے لیے فرمایا گیا یہ تم پر ہی فرض نہیں ہوا بلکہ پہلی امتوں پر بھی تھا۔ ذرا ہمت سے کام لینا کہیں ان کے مقابلہ میں ناکام نہ ہو جاؤ۔ یہ تشبیہ محض نفسِ وجوب میں ہے نہ کہ ہر جہتِ کیفیت وقت وغیرہ میں ہے۔ تفسیر کبیر، احمدی اور مظہری وغیرہ میں ہے کہ آدم علیہ السلام سے عیسیٰ علیہ السلام تک ہر امت پر روزے فرض رہے چناں چہ آدم علیہ السلام پر ہر مہینہ کی تیرھویں، چودھویں، پندرھویں کے روزے اور موسیٰ علیہ السلام کی قوم پر عاشورہ کا روزہ فرض رہا۔ بعض روایتوں میں ہے کہ سب سے پہلے نوح علیہ السلام نے روزے رکھے (در منثور) صاحب تفسیر کبیر نے فرمایا کہ عیسائیوں پر ماہ رمضان کے روزے فرض تھے چوں کہ قمری مہینے موسموں میں گھومتے رہتے ہیں اور گرمی کے روزوں میں اتنی تکلیف ہوتی تھی اس لیے انہوں نے شمسی مہینے سے اپنے لیے موسمِ بہار کے روزے لازم کر لیے تا کہ گرمی سے بچے رہیں اور بدلنے کے عوض بیس روزے بڑھا کر بجائے تیس کے پچاس بنا دیئے۔ ایسے ہی یہودیوں پر بھی رمضان کے روزے فرض تھے۔ انہوں نے بھی یہ چھوڑ کر ایک عاشورہ اختیار کیا کیوں کہ اس دن موسیٰ علیہ السلام کو فرعون سے نجات ملی۔
لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ: اس کا تعلق کتب سے ہے اور اس جملہ میں روزہ کی حکمت کا ذکر ہے یعنی تم پر روزے اس لیے فرض کیے گئے تا کہ تم جہنم کی آگ سے بچو یا پرہیز گار بن جاؤ کیوں کہ نفسِ امارہ کھانے پینے سے قوی ہوتا ہے جب روزہ سے اس کی قوت ٹوٹے گی تو تمہیں گناہ کی طرف رغبت بھی کم ہوگی اور پرہیز گاری بھی حاصل ہوگی۔

خلاصہ تفسیر:

اے مسلمانو! تمہیں ایک ایسا عمل بتایا جا رہا ہے جو کہ تقویٰ کی اصل ہے۔ وہ یہ کہ تم پر

روزے فرض کیے جاتے ہیں مگر یہ تمہارے واسطے نئی بات نہیں تم سے پہلوں پر بھی فرض رہ چکے ہیں۔ تم اس پر کاربند ہو جاؤ تاکہ تمہیں تقویٰ اور پرہیزگاری حاصل ہو۔

(روزہ)

روزہ شعبان ۲ ہجری میں فرض ہوا۔ پہلے صرف ایک روزہ یعنی عاشورہ کے دن کا فرض ہوا۔ پھر یہ منسوخ ہو کر ہر چاند کی ۱۳۔۱۴۔۱۵ کے روزے فرض کیے گئے۔ پھر یہ بھی منسوخ ہو کر ماہ رمضان کے روزے فرض ہوئے۔ مگر لوگوں کو اختیار تھا چاہے روزہ رکھیں چاہے فدیہ ادا کریں یعنی ہر روزہ کے عوض آدھا صاع تقریباً ۲ کلو گندم یا ایک صاع جَو تقریباً ۴ کلو صدقہ کردیں پھر یہ اختیار منسوخ ہو کر روزے لازم ہوئے مگر یہ پابندی رہی کہ رات کو سونے سے پیش تر کھاؤ سو کر کچھ نہیں کھا سکتے۔ پھر حضرت صرمعہ کا واقعہ پیش آنے پر صبح تک کھانے پینے کا اختیار دیا گیا۔ مگر جماع پھر بھی حرام رہا۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا واقعہ پیش آنے پر یہ بھی حلال کردیا گیا۔ اس آیت میں ان سب چیزوں کا اجمالی ذکر ہے۔ تفصیل اگلی آیات میں آرہی ہیں (احمدی) یوں سمجھو کہ اولاً کلمہ پڑھنا فرض ہوا پھر نماز، پھر زکوۃ، پھر روزے، پھر جہاد، پھر حج (روح البیان) درمنشور نے فرمایا کہ نماز میں بھی تبدیلیاں ہوئیں اور روزہ میں بھی۔ نماز معراج میں پچاس فرض ہو کر پانچ پانچ کم ہو کر پانچ رہیں پھر اولاً دو رکعت تھیں پھر چار ہوئیں۔

(روزے کے اسرار)

روزہ میں صدہا حکمتیں ہیں۔ اسی لیے ہر قوم اس کو عبادت جانتی رہی اور جانتی ہے۔ اگرچہ طریقوں میں قدرے اختلاف ہو۔ (۱) روح عالم اجسام میں آنے سے پہلے کھانے پینے وغیرہ سے پاک وصاف تھی۔ اسی لیے گناہوں سے محفوظ رہی اجزائے جسم کا بھی یہی حال تھا۔ جب یہ

دونوں ملے تو جسم روح کی وجہ سے غذاؤں کا حاجت مند ہوا اور گناہوں میں مبتلاء۔ ضرورت تھی کہ اب بھی کچھ روز ان کو مرغوب غذاؤں سے باز رکھا جائے تا کہ انہیں اپنی پہلی حالت یاد رہے اور پہلے کی طرح اب بھی گناہوں سے بچنے کی خصوصی مشق ہوتی رہے۔ (۲) روزہ سے بھوک برداشت کرنے کی عادت پیدا ہوتی ہے اگر کبھی کھانا میسر نہ ہو تو انسان گھبراتا نہیں۔ (۳) بھوک بہت سی بیماریوں کا علاج ہے۔ اب بھی ڈاکٹر طبیب کہتے ہیں کہ فاقہ بہت سی بیماریوں کا علاج ہے کیوں کہ اس سے معدہ کی اصلاح ہوتی ہے۔

(روزہ کے فضائل)

بیہقی شعب الایمان میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ راوی کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے شعبان کے آخری دن میں وعظ فرمایا: (اے لوگو! تمہارے پاس عظمت والا، برکت والا مہینہ آیا وہ مہینہ جس میں ایک رات ہزار مہینوں سے بہتر ہے اس کے روزے اللہ تعالیٰ نے فرض کیے اور اس کی رات میں قیام (نماز پڑھنا) تطوع (یعنی سنت ہے) جو اس میں نیکی کا کوئی کام کرے تو ایسا ہے جیسے اور کسی مہینے میں فرض ادا کیا اور اس میں جس نے فرض ادا کیا تو ایسا ہے جیسے اور دنوں میں ستر فرض ادا کیے۔ یہ مہینہ صبر کا ہے اور صبر کا ثواب جنت ہے اور یہ مہینہ مواسات کا ہے اور اس مہینے میں مومن کا رزق بڑھایا جاتا ہے۔ جو اس میں روزہ دار کو افطار کرائے اس کے گناہوں کے لیے مغفرت ہے اور اس کی گردن آگ سے آزاد کر دی جائے گی اور اس افطار کرانے والے کو ویسا ہی ثواب ملے گا جیسا روزہ رکھنے والے کو ملے گا بغیر اس کے کہ اس کے اجر میں سے کچھ کم ہو۔ ہم نے عرض کی، یا رسول اللہ ﷺ ہم میں کا ہر شخص وہ چیز نہیں پاتا جس سے روزہ افطار کرائے حضور ﷺ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ یہ ثواب اس شخص کو دے گا جو ایک گھونٹ دودھ یا ایک خرما یا ایک گھونٹ پانی سے روزہ افطار کرائے اور جس نے روزہ دار کو پیٹ بھر کھانا کھلایا اس کو اللہ تعالیٰ میرے حوض سے پلائے گا کہ کبھی پیاسہ نہ ہوگا یہاں تک کہ جنت میں داخل ہو جائے یہ وہ

مہینہ ہے کہ اس کا اوّل رحمت ہے اور اس کا اوسط مغفرت ہے اور آخر جہنم سے آزادی ہے اور جو اپنے غلام پر اس مہینے میں تخفیف کرے یعنی کام میں کمی کر لے اللہ تعالیٰ اسے بخش دے گا اور جہنم سے آزاد فرما دے گا۔ صحیحین و سنن، ترمذی و نسائی میں سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (جنت میں آٹھ دروازے ہیں۔ ان میں ایک دروازہ ریان ہے اس دروازے سے وہی جائیں گے جو روزہ دار ہیں۔)

بخاری و مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا (جو ایمان کی وجہ سے اور ثواب کے لیے رمضان کا روزہ رکھے گا اس کے اگلے گناہ بخش دیئے جائیں گے اور جو ایمان کی وجہ سے اور ثواب کے لیے رمضان کی راتوں کا قیام کرے گا اس کے اگلے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے اور جو ایمان کی وجہ سے اور ثواب کے لیے شب قدر کا قیام کرے گا اس کے اگلے گناہ بخش دیئے جائیں گے)

امام احمد و حاکم اور طبرانی کبیر اور ابن ابی الدنیا اور بیہقی شعب الایمان میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (روزہ، قرآن بندے کے لیے شفاعت کریں گے، روزہ کہے گا اے رب میں نے کھانے اور خواہشوں سے دن میں اسے روک دیا، میری شفاعت اس کے حق میں قبول فرما۔ قرآن کہے گا اے رب میں نے اسے رات میں سونے سے باز رکھا میری شفاعت اس کے بارے میں قبول کر۔ دونوں شفاعتیں قبول ہوں گی) (والاحادیث فی هذا الباب کثیرہ مانقلنا ها روما للاختصار)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ؕ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ؕ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (سورۃ البقرۃ: ۱۸۴)

''گنتی کے دن ہیں تو تم میں جو کوئی بیمار یا سفر میں ہو تو اتنے روزے اور جنہیں اِس کی طاقت نہ ہو وہ بدلہ دیں ایک مسکین کا کھانا پھر جو اپنی طرف سے نیکی زیادہ کرے تو وہ اس کے لیے بہتر ہے اور روزہ رکھنا تمہارے لیے زیادہ بھلا ہے اگر تم جانو''

تفسیر:

ایام جمع یوم کی ہے۔ جس کے حقیقی معنی ہیں ''دن''۔ کبھی مجازاً وقت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ یہاں حقیقی معنی ہی مراد ہیں۔ معدودات جمع معدودۃ کی ہے اس کا مادّہ عدّ جس کا معنی گنتی شمار پھر کبھی کمی یا تیار کرنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ یہاں یا تو گنے ہوئے دن مراد ہیں یا تھوڑے یا تیار مقرر کیے ہوئے یعنی تم پر روزے فرض ہیں گنتی کے یا تھوڑے دنوں کے یا ان دنوں میں جو اس عبادت کے لیے پہلے سے مقرر کر دیئے گئے ہیں۔ معدودات سے یا تو رمضان کے دنوں کی کمی بیان کی گئی ہے یا ان کی فضیلت یعنی تھوڑے سے گنتی کے دن ہیں جب کہ اے لوگو! گیارہ ماہ کھاتے پیتے رہتے ہو تو ان گنے چنے دنوں میں رب کے لیے روزے بھی رکھ لیا کرو۔ یا یہ کہ رمضان کے دن اور ان دنوں کی گھڑیاں گنی جاتی ہیں۔ دوسرے مہینوں کی تاریخیں بھی لوگوں کو بمشکل یاد ہوتی ہیں یا یہ کہ یہ ماہ مبارک روزہ داروں کے لیے ہلکا ہوتا ہے کہ گنتے شمار کرتے گزر جاتا ہے ہاں روزہ چوروں کے لیے بھاری جیسے قیامت کا دن مومن کو بقدر چار رکعت نماز او کافروں کو پچاس ہزار سال کا یا ان تاریخوں اور ان میں ہونے والے کاموں کو فرشتے گنتے رہتے

ہیں تاکہ ان کے ہر لقمہ، پانی کے ہر قطرے بلکہ مومن کی ہر ادا پر ثواب دیا جائے۔ غرض یہ کہ معدودتو یہ دن ہیں مگر عاد یعنی گننے والے مسلمان یا رحمت کے فرشتے۔

فمن کان منکم مریضاً :اس جملے میں روزہ قضاء کرنے کی صورتوں میں سے ایک صورت کو بیان کیا گیا۔ یہاں مرض سے مراد وہ بیماری ہے جس میں روزہ نقصان دے من شرطیہ ہے۔ کان سے مراد بیماری موجود ہونا اس کا قوی اندیشہ ہونا ہے۔اس کی تین صورتیں ہیں۔ایک یہ کہ کوئی بیمار ہے اور روزے سے بیماری بڑھنے کا خوف ہو، دوسرے یہ کہ روزے سے بیماری لمبی ہونے کا اندیشہ، تیسرے یہ کہ فی الحال تو تندرست ہے مگر تجربہ یا طبیب حاذق بتاتا ہے کہ روزہ سے بیمار ہو جائے گا ان سب صورتوں میں قضاء کر سکتا ہے۔

او علی سفرٍ: علی بمعنی فی ہے اور سفر کے معنی ہیں کھلنا چوں کہ پردیس میں جانے سے دنیا کے حالات ظاہر ہوتے ہیں اس لیے اسے سفر کہتے ہیں۔اسی لیے جھاڑو کو مِسْفَرہ، ایلچی کو سفیر، صبح کے اجالے کو اسفار اور کتاب کو سِفر، عورت کے بے نقاب ہونے کو اسفرار کہا جاتا ہے ان سب میں کھلنے کے معنی موجود ہیں (کبیر) اور فقہاء کے نزدیک ۹۳ کلومیٹر کا ارادہ کر کے وطن سے نکل جانے کا نام سفر ہے اور جب تک کہیں پندرہ دن ٹھہرنے کی نیت نہ کرے وہ مسافر ہی ہوگا۔چوں کہ بیماری کے اندیشے سے بھی قضاء جائز ہے مگر سفر کے ارادے سے قضاء جائز نہیں بلکہ اس کے لیے سفر میں ہونا ضروری ہے۔اسی لیے یہاں علی سفرٍ فرمایا گیا۔

فعدۃ من ایامٍ اخر :ایام اخر سے مراد بیمار کے تندرست ہو جانے کا زمانہ ہے اور مسافر کے لیے وطن واپس آنے کا یا کہیں پندرہ روز کی نیت سے ٹھہر جانے کا وقت۔یعنی ان پر دوسرے زمانہ میں اتنے گئے ہوئے روزے رکھنا ضروری ہیں۔یا ان پر اس زمانہ کی شمار دوسرے وقت میں پوری کرنا واجب ہے ان دونوں صورتوں میں روزہ بالکل ساقط نہیں ہوتا بلکہ موخر کر دیا گیا۔

وعلی الذین یطیقونہ :اس جملے میں تیسرے گروہ کا ذکر ہے جس پر نہ روزہ واجب نہ قضاء۔یطیقون اطاقۃٌ سے بنا ہے جس کا مادہ طوقٌ ہے یعنی گلے کا ہار، گلے کی زنجیر کو بھی اسی لیے طوق کہا جاتا ہے کہ وہ ہار کی طرح گردن کو گھیرے ہوئے ہوتی ہے۔ پھر قدرت انسانی کو طاقت

کہنے لگے کیوں کہ وہ کام کو گھیر لیتی ہے۔ کبھی کام بمشقت کرنے کو بھی طاقت کہتے ہیں یعنی آسانی سے کر لینے کو سہولت اور مشقت سے کرنے کو طاقت کیوں کہ اس صورت میں کام انسان کو گھیر لیتا ہے۔ یہاں اس میں تین احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ اس سے طاقت وَر اور قدرت رکھنے والے انسان مراد ہیں اور یہ آیت (فمن شَهِدَ منکم الشهر فلیصمه) سے منسوخ ہے۔ کیوں کہ پہلے روزے کا اختیار تھا جو چاہے رکھے اور جو چاہے فدیہ دے پھر آئندہ آنے والی آیت (فمن شهد منکم الشهر فلیصمه) سے یہ اختیار منسوخ ہو کر روزہ ہی فرض ہوا۔

دوسرے یہ کہ اس سے وہ بوڑھے مراد ہیں جنہیں روزہ میں مشقت ہو اور آئندہ طاقت آنے کی امید نہ ہو انہیں فدیہ کی اجازت دی گئی۔ تیسرے یہ کہ اس کا مصدر اطاقۃ باب افعال سے ہے اور اس کا ہمزہ سلب کے لیے ہو اور اس سے وہ بیمار وغیرہ مراد ہیں جنہیں تن درست ہونے کی امید نہ ہو اس صورت میں یہ آیت غیر منسوخ ہے۔ (کبیر) نیز جس شخص پر روزے ہوں اور وہ بغیر قضا کیے مر گیا اگر فدیہ کی وصیّت کر گیا تو ورثہ تہائی مال سے فدیہ ادا کر دیں یہ مجبور بھی اسی آیت میں داخل ہے۔ سب سے زیادہ مجبور تو یہی شخص ہے اور اگر میت وصیت نہ بھی کر گیا ہو تب بھی ورثہ استحباباً اس کا فدیہ دے دیں۔ لیکن عدم وصیت کی صورت میں ورثہ قبل از تقسیم میراث اس وقت تک دے سکتے ہیں جب کہ ان میں کوئی وارث یتیم یا غائب نہ ہو۔

فدیة طعام مسکین : یہ علی الذین کا مبتدا ہے یا یجب فعل محذوف کا فاعل۔ فدیہ فدیٰ یا فداءٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں مصیبت سے حفاظت اور لازم، بدلہ، نچھاور۔ قربان ہو جانے کو فدا ہو جانا اسی لیے بولتے ہیں کہ اس سے دوسرے کی جان کی حفاظت کی جاتی ہے۔ جرمانہ کو اسی لیے فدیہ کہا جاتا ہے کہ وہ لازم معاوضہ ہے۔ طعام اسم مصدر ہے بمعنی مطعوم یعنی خوراک اگرچہ یہ مطلق ہے جس میں ہر غذا داخل ہے۔ مگر اس سے مراد ایک مسکین کو دو وقتہ پیٹ بھر کھانا کھلا دینا مراد ہے۔ یا آدھا صاع گندم یا ایک صاع جَو، کش مش یا اس کی قیمت کی دوسری چیز باجرہ، مکئی چاول وغیرہ کا مالک کر دینا یہ ایک روزے کا فدیہ ہے یعنی جو لوگ روزہ کی طاقت نہ رکھتے ہوں ان پر ہر دن کے عوض ایک مسکین کی خوراک واجب ہے اور شاہ ولی اللہ صاحب نے فوز کبیر میں لکھا

ہے کہ اس سے مراد صدقہ فطر ہے۔

فمن تطوّع خیراً : تطوّع طوع سے بنا ہے۔ جس کے لفظی معنی شوق، خوشی نفلی عبادت کو تطوّع اس لیے کہتے ہیں کہ انسان اپنی خوشی سے کرتا ہے نہ کہ شرعی مجبوری سے۔ خیراً کے معنی بھلائی ہیں۔ یہاں زیادتی فدیہ مراد ہے یعنی جو شخص اپنی خوشی سے مقدار مقررہ سے زیادہ دے دے (فھو خیر لہ) یہ زیادتی اس کے لیے بہتر ہے۔

وان تصوموا خیر لکم : میں یاتو مسافروں اور ان بیماروں کو خطاب ہو رہا ہے جو بمشقت روزہ رکھ سکیں یا ان بوڑھوں سے گفتگو ہے جنہیں فدیہ کی اجازت دی گئی یعنی اے مسافروں اور بیماروں! اگر چہ تمہیں قضا کرنے کی اجازت ہے یا اے بوڑھوں! اگر چہ تمہیں فدیہ کا اختیار ہے لیکن اگر ہمت کر کے روزہ رکھ لو تو تمہیں زیادہ ثواب ملے گا۔

(فوائد و مسائل)

۱۔ ہر بیماری میں روزہ کی قضا جائز نہیں۔ صرف اس میں جائز ہے جس میں روزہ نقصان دے مگر ہر سفرِ شرعی میں قضا جائز خواہ سفر نقصان دے یا نہ دے جیسا کہ علی سفر سے معلوم ہوا یعنی علیکم سفر نہ کہا گیا کہ تم پر سفر سوار ہو بلکہ فرمایا گیا کہ تم سفر پر ہو اور سفر تمہیں کوئی تکلیف نہ دے جب بھی روزہ قضا کر سکتے ہو۔

۲۔ مجبوری دُور ہوتے ہی قضا واجب ہے مثلاً مسافر کے پندرہ روزے رہ گئے گھر آ کر پانچویں روز مَرا تو ان پانچ کی پکڑ ہوگی چاہیے کہ سفر سے آتے ہی اور بیماری سے اچھا ہوتے ہی قضا شروع کر دے۔

۳۔ سفر میں روزہ رکھنا بہتر نہ رکھنا جائز جیسا کہ (خیر لکم) سے معلوم ہوا۔ مگر مسافر پر نماز کا قصر واجب ہے کیوں کہ حدیث شریف میں ہے کہ یہ نماز کی کمی اللہ کا صدقہ ہے۔ فاقبلوھا تم اسے قبول کرو۔ اقبلوا امر ہے امر وجوب کو چاہتا ہے۔ خیال رہے کہ مسافر کے نماز اور روزے میں دو طرح کا فرق ہے۔ ایک یہ کہ اسے سفر میں روزہ نہ رکھنا جائز ہے واجب نہیں

،مگر نماز کا قصر اس پر فرض ہے۔ دوسرے کہ مسافر چھوٹے روزوں کی قضا کرے گا۔ مگر ان دو رکعتوں کی قضا نہیں جو اسے حالت سفر میں معاف کر دی گئیں۔ لہٰذا مسافر کے روزوں پر اس کی نماز کو قیاس کرنا درست نہیں اس کے متعلق مذہب حنفی نہایت قوی ہے۔

۴۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ بدنی عبادت کا فدیہ مال بن سکتا ہے لہٰذا میت کے ذمہ اگر نمازیں رہ گئیں تو ان کا فدیہ دینا درست ہے ایک نماز کا فدیہ ایک روزے کی طرح ہوگا۔

۵۔ سال میں پانچ دن روزہ حرام ہے۔ عید الفطر، بقر عید اور بقر عید کے تین دن بعد مسافر، مریض ان دنوں کے علاوہ قضا کریں۔

مسئلہ: محض بیماری کے وہم پر روزہ نہ رکھنا جائز نہیں بلکہ تجربہ کار نیک اور قابل طبیب کے کہنے سے یا خود تجربہ سے بیماری میں اضافہ کا اندیشہ معتبر ہے۔

مسئلہ: حاملہ یا دودھ پلانے والی عورت کو روزہ سے اپنی یا بچے کی جان یا بیماری کا اندیشہ ہو تو افطار جائز ہے۔

مسئلہ: جو شخص 92 کلومیٹر کے فاصلے پر جانے کا قصد رکھتا ہو اور درمیان میں سفر توڑنے کا ارادہ بھی نہ ہو تو وہ مسافر ہے لہٰذا ایکسپریس گاڑی کا ڈرائیور اور گارڈ جن کی گاڑیاں پہلی مرتبہ 92 کلومیٹر پر ہی ٹھہرتی ہیں مسافر ہیں اور پسنجر ٹرین کے ملازمین اور بسوں کے ڈرائیور مسافر نہیں کیوں کہ یہ ہر اسٹیشن اور اسٹاپ پر کام کرتے ہوئے یعنی سفر توڑتے ہوئے جاتے ہیں لہٰذا ان پر پوری نماز واجب ہے اور روزہ بھی۔

مسئلہ: جو شخص صبح سے پہلے سفر کو نکل جائے وہ افطار کر سکتا ہے اور جو طلوع فجر کے بعد وطن سے نکلے اس پر روزہ واجب ہے کیوں کہ یہاں علی سفر فرمایا گیا۔

مسئلہ: اگر مقیم نے روزہ رکھ کر توڑ دیا پھر وہ مسافر ہو گیا تو کفارہ ساقط نہ ہوگا اگر تندرست نے روزہ رکھ کر توڑا اور اس دن بیمار ہو گیا تو کفارہ معاف ہے (احمدی)۔

مسئلہ: روزوں کی قضا لگاتار واجب نہیں الگ الگ بھی رکھ سکتا ہے جیسا کہ ایام اخر سے معلوم ہوا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۖ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ۖ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۫ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ

(سورۃ البقرۃ:۱۸۵)

''رمضان کا مہینہ جس میں قرآن اتارا گیا لوگوں کے لیے ہدایت اور رہ نمائی اور فیصلہ کن روشن باتیں۔ تو تم میں سے جو کوئی پائے یہ مہینہ تو ضرور اس کے روزے رکھے اور جو بیمار یا سفر میں ہو تو اتنے روزے اور دنوں کے رکھے۔ اللہ تم پر آسانی چاہتا ہے اور تم پر دشواری نہیں چاہتا۔ اور اس لیے کہ تم گنتی پوری کرو اور اللہ کی بڑائی بولو اس پر کہ اس نے تمہیں ہدایت کی اور تا کہ تم شکر گزار رہو''

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ : شَهر کے معنی ہیں ظاہر ہونا۔ اسی سے شہرت اور مشہور اور اشتہار ہے۔ چوں کہ چاند دیکھتے ہی مہینہ کی شہرت ہو جاتی ہے۔ اس لیے اسے شھر کہا جاتا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ بڑی بستی کو فارسی میں اسی لیے شہر کہتے ہیں کہ وہ دیہات میں مشہور ہوتی ہے۔ رمضان یا تو رحمٰن کی طرح اللہ کا نام ہے چوں کہ اس مہینہ میں رات دن اللہ کی عبادت ہوتی ہے۔ لہٰذا اسے شہر رمضان یعنی اللہ کا مہینہ کہا جاتا ہے۔ اسی لیے بعض روایات میں آیا کہ یہ نہ کہو رمضان آیا اور گیا بلکہ کہو ماہِ رمضان آیا اور گیا۔ جیسے مسجد و کعبہ کو اللہ کا گھر کہتے ہیں کہ وہاں اللہ کے ہی کام ہوتے ہیں ایسے ہی رمضان اللہ کا مہینہ ہے کہ اس مہینہ میں اللہ کے ہی کام ہوتے ہیں۔ روزہ تراویح وغیرہ تو

ہیں ہی اللہ کے مگر بحالت روزہ جو تجارت، نوکری وغیرہ کی جاتی ہے وہ بھی اللہ کے کام قرار پاتے ہیں مگر صحیح تر یہ ہے کہ رمضان آیا رمضان گیا کہنا جائز ہے جب کہ مراد اس سے رمضان ہو یا یہ رمضاءؔ سے مشتق ہے۔ رمضاء موسم خریف کی بارش کو کہتے ہیں جس سے زمین دُھل جاتی ہے اور ربیع کی فصل خوب ہوتی ہے چوں کہ یہ مہینہ بھی دل کی گرد و غبار دھو دیتا ہے اور اعمال کی کھیتی ہری بھری رہتی ہے۔ اسلیے اسے رمضان کہتے ہیں یا یہ رمضٌ سے بنا جس کے معنی ہیں گرمی یا جلنا۔ چوں کہ اس زمانہ میں مسلمان بھوک پیاس کی تپش برداشت کرتے ہیں یا یہ گناہوں کو جلا ڈالتا ہے اس لیے اس کو رمضان کہتے ہیں۔

اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ : اُنْزِلَ انزال سے بنا اکثر ایک دم اتارنا کے معنی میں آتا ہے فیہ کا مرجع ماہ رمضان ہے۔ لفظ قرآن یا تو قرءٌ سے بنا جس کے معنی جمع ہونے کے ہیں۔ لہٰذا قرآن کو قرآن اس لیے کہتے ہیں کہ یہ بھی سارے اولین آخرین کے علموں کا مجموعہ ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے (نزلنا علیک الکتب تبیاناً لکل شیء) نیز یہ تمام بکھروں کو جمع کرنے والا، ہندی، سندھی، عربی، عجمی، لوگ ان کے لباس، طعام، زبان، طریق زندگی سب الگ الگ، ان کے جمع ہونے کی کوئی صورت نہ تھی لیکن قرآن کریم نے سب کو جمع فرمادیا اور ان کا نام رکھا مسلمان۔ فرمایا (سماکم المسلمین)

یا قراۃ سے بنا ہے تو اس کے معنی پڑھی ہوئی چیز۔ تو اس کو قرآن اس لیے کہتے ہیں کہ پہلے انبیائے کرام کتابیں یا صحیفے حق تعالیٰ کی طرف سے لکھے ہوئے عطا فرمائے گئے۔ لیکن قرآن کریم پڑھا ہوا اُترا کہ جبریل امین علیہ السلام حاضر ہوتے اور پڑھ کر سُنا جاتے۔ نیز جس قدر قرآن مجید پڑھا گیا اور پڑھایا جاتا ہے اس قدر کوئی دینی دنیوی کتاب دنیا میں نہیں پڑھی گئی۔ یا قرنٌ سے بنا ہے تو قرن کے معنی ہیں ملنا اور ساتھ رہنا۔ تو اب اس کو قرآن اس لیے کہتے ہیں کہ حق اور ہدایت اس کے ساتھ ہے، نیز اس کی سورتیں اور آیتیں ہر ایک بعض بعض کے ساتھ ہیں کوئی کسی سے مخالف نہیں۔ نیز اس میں عقائد اور اعمال اور اعمال میں سیاسیات، عبادات، معاملات تمام ایک ساتھ جمع

نہیں۔ نیز یہ مسلمان کے ہر وقت ساتھ رہتا ہے دنیا میں ساتھ رہتا ہے، دنیا میں ساتھ اور آخرت میں بھی ساتھ، دنیا میں اسطرح ساتھ ہوا کہ بچپن میں، جوانی میں، بڑھاپے میں ساتھ ہے بلکہ ہر جگہ ساتھ۔ تخت پر، تختے پر، گھر میں، مسجد میں، آبادی میں، جنگل میں، سوتے میں، جاگتے میں، مصیبت میں، آرام میں، سفر میں، حضر میں ساتھ ہے۔ بلکہ ہر حال میں ساتھ مرتے وقت ساتھ قبر میں ساتھ، حشر میں ساتھ کہ نور بن کر آگے آگے چلے گا اور راستہ بتائے گا اور جب مسلمان جنت میں پہنچ جائے گا تو فرمایا جائے گا پڑھتا جا اور چڑھتا جا۔ غرض یہ کہ یہ مبارک چیز کبھی بھی ساتھ نہیں چھوڑتی۔

چوں کہ رمضان شریف میں قرآن کریم لوح محفوظ سے آسمان دنیا کی طرف آیا اور بیت العزت میں محفوظ کیا گیا۔ پھر وہاں سے تئیس سال کے عرصے میں حضور علیہ السلام پر بحسب ضرورت تھوڑا تھوڑا اُترتا رہا۔ یا حضور علیہ السلام پر اترنے کی ابتداء رمضان میں ہوئی کہ بقول صاحب رُوح البیان پہلی وحی یعنی اقراء باسم ربک الخ پانچ آیتیں سترہ رمضان دوشنبہ کے دن بوقت سحر نازل ہوئیں۔ یا جبریلِ امین ہر رمضان پورا قرآن کریم حضور علیہ السلام کو سنایا کرتے تھے اس لیے فرمایا گیا کہ رمضان میں قرآن اتارا گیا۔

هُدًى لِّلنَّاسِ : ھدی یا تو مصدری معنی میں ہے یا اسم فاعل کے معنی میں ہے یعنی یہ رمضان یا قرآن لوگوں کو ہدایت دینے والا یا اس میں لوگوں کے لیے ہدایت ہے۔ ہدایت کے معنی رہبری کرنا یا منزل مقصود کا پتا یا نشان دینا، ہدایت دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک فقط راستہ دکھا دینا دوسرے مقصود پر پہنچا دینا۔ یہاں پر پہلا معنی مراد ہے۔ قرآنی ہدایت کا بیان بذریعہ حدیث ہے اگر حدیث کا انکار کر دیا جائے تو نہ نماز کے معنی سمجھ میں آتے ہیں نہ زکوٰۃ کے۔ رمضان کا ہادی ہونا اس طرح ہے کہ رمضان لوگوں کے دل بدل دیتا ہے اس کے آنے سے مسجدوں میں رونق آجاتی ہے، تلاوت و ذکر کثرت سے شروع ہو جاتے ہیں، پھر صرف ہدایت ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ (وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى) (ہدایت کی کھلی نشانیاں ہیں)۔

وَالْفُرْقَانِ : یہ لفظ فرقٌ سے بنا ہے۔اس کے معنی ہیں فرق کرنے والی چیز قرآن کو فرقان اس لیے کہتے ہیں کہ حق وباطل، سچ جھوٹ،مومن اور کافر میں فرق کرنے والا ہے۔

فَمَنْ شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ : فمن کی فا یا تو زائد ہے یا تفریع کی ہے یا ترتیب کی یا جزائیہ ہے۔اس من سے مراد عاقل بالغ مسلمان ہیں۔ شَهِدَ یا تو شہود سے بنا ہے جس کا معنی حاضری یا حضر میں ہونا (سفر کا مقابل) اس صورت میں الشھر مفعول فیہ ہوگا۔یعنی جو اس مہینا میں مسافر نہ ہو بلکہ مقیم ہو تو روزے رکھے یا مشاہدہ سے بنا یعنی تم میں سے کوئی ماہ رمضان کا سن کر یا چاند دیکھ کر یا حساب لگا کر گنتی کو پورا کر کے یا عقل سے مشاہدہ کرلے تو اس میں روزہ رکھے۔یا تم میں سے جو بھی ماہ رمضان پالے اس طرح کہ اس مہینہ میں ایک منٹ کے لیے بھی ہوش آجائے تو وہ سارے مہینے کے روزے رکھے۔فقہاء فرماتے ہیں کہ اگر ایک شخص رمضان کا چاند دیکھے اور اس کی گواہی کسی وجہ سے قبول نہ ہو تو اس پر روزہ فرض ہے لیکن عید کے چاند کا یہ حکم نہیں اس مسئلہ کا ماخذ یہ آیت ہے۔

اس آیت سے فدیہ کا حکم منسوخ ہوگیا کہ پہلے طاقت ور مسلمانوں کو بھی فدیہ کا اختیار تھا جیسا کہ پچھلی آیت میں ایک قول بیان ہُوا۔اب ہر امیر غریب پر روزہ ہی فرض ہے۔چوں کہ اس میں احتمال تھا کہ شاید بیماروں اور مسافروں کی رعایت بھی اس حکم سے منسوخ ہو چکی ہو،اس وہم کو دُور کرنے کے لیے ان دونوں کا حکم پھر دُہرایا گیا تا کہ معلوم ہو کہ یہ رعایتیں باقی ہیں۔چنانچہ ارشاد ہُوا(وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ) الخ تفسیر پہلے گذر چکی ہے۔

يُرِيدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ : یُسر کے معنی ہیں سہولت یا آسانی۔اس لیے مالداری کو یسار کہتے ہیں کہ اس میں آسانی ہوتی ہے۔بائیں ہاتھ کو یسریٰ کہا جاتا ہے کہ داہنے ہاتھ کی مدد کر کے کام کو آسان کرتا ہے۔جنت کا نام بھی یسر ہے کہ وہاں ہر طرح کی آسانی ہے۔یعنی رب تم پر آسانی چاہتا ہے اسی لیے اس نے بچوں اور دیوانوں کو روزہ معاف کر دیا اور بیمار و مسافر کو مہلت دے دی۔

وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ : عسر یسر کا مقابل ہے، بمعنی دشواری اور سختی یعنی تم پر سختی نہیں چاہتا۔

وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ : تکملوا اکمال سے بنا ہے۔ جس کے معنی ہیں پورا کرنا اور عدۃ بمعنی شمار ہے۔ یعنی روزہ کے لیے ماہ رمضان اس لیے مقرر ہوا تا کہ تم جانو اور تمہیں شمار کرنے میں آسانی ہو چوں کہ شمسی مہینوں کی جنتری کتابوں میں ہوتی ہے اور قمری مہینوں کی آسمان پر کہ ہر شخص چاند دیکھ کر تاریخ کا پتہ لگا سکتا ہے اور اس کی ابتداء وانتہاء کی خبر رب دیتا ہے۔ حدیث پاک میں ہے کہ: چاند دیکھ کر روزے شروع کرو اور چاند دیکھ کر ہی افطار۔ اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ رمضان خواہ ۲۹ کا ہو یا ۳۰ کا تم ثواب کامل پاؤ گے۔ (ان شاء اللہ تعالیٰ)

وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ : تکبروا تکبیر سے بنا جس سے یا تو اللہ کی حمد کرنا مراد ہے یا تکبیرِ عید کہنا اور ہدیٰ سے مراد یا تو ماہ رمضان کی ہدایت کرنا یا روزہ کی توفیق دینا یعنی تم خدا کا شکر کرو کہ اس نے تمہیں ایسا اچھا مہینہ روزوں کے لیے بتایا۔ یا رمضان ختم کر کے شوال کا چاند دیکھ کر تکبیر کہو یا عید الفطر کے دن تکبیر کہتے ہوئے عیدگاہ جاؤ (کبیر احمدی) یا زائد تکبیروں والی نماز یعنی نمازِ عید ادا کرو کیوں کہ اس نے تمہیں ان روزوں کی توفیق دی۔

وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ : یعنی تم اس ماہ مبارک کا شکریہ ادا کرو یا روزوں سے فارغ ہو کر عید کی خوشیاں مناؤ کہ رب کی نعمت پر خوش ہونا بھی شکر ہے۔ ارشاد باری ہے (فبذالک فلیفرحوا)

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اُحِلَّ لَكُمۡ لَيۡلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمۡ ؕ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمۡ وَاَنۡتُمۡ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمۡ كُنۡتُمۡ تَخۡتَانُوۡنَ اَنۡفُسَكُمۡ فَتَابَ عَلَيۡكُمۡ وَعَفَا عَنۡكُمۡ ۚ فَالۡـٰٔنَ بَاشِرُوۡهُنَّ وَابۡتَغُوۡا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمۡ ص (سورۃ البقرۃ:۱۸۷)

"روزوں کی راتوں میں اپنی عورتوں کے پاس جانا تمہارے لیے حلال ہوا۔ وہ لباس ہیں تمہارے لیے اور تم لباس ہو ان کے لیے۔ اللہ نے جانا کہ تم اپنی جانوں کو خیانت میں ڈالتے تھے تو اس نے تمہاری توبہ قبول کی اور تمہیں معاف فرمایا۔ تو اب ان سے صحبت کرو اور طلب کرو جو اللہ نے تمہارے نصیب میں لکھا ہو"

شان نزول:

پہلی شریعتوں میں افطار کے بعد عشاء تک کھانا پینا اور عورتوں سے جماع کرنا حلال تھا بعد نماز عشاء یہ سب چیزیں رات میں بھی حرام ہو جاتی تھیں۔ شروع اسلام میں بھی یہی حکم رہا پھر صرمہ بن قیس انصاری کا واقعہ پیش آ جانے پر صبح تک کھانا پینا درست ہوا۔ جس کا تفصیلی واقعہ اس آیت کے اگلے جز میں آ رہا ہے۔ پھر ایک دفعہ چند حضرات نے عشاء کی نماز کے بعد اپنی بیویوں سے جماع کر لیا منجملہ ان کے حضرت عمر رضی اللہ عنہ بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میں آپکی بارگاہ میں اپنے خطائے نفس کی معذرت چاہتا ہوں۔ تب یہ آیت کریمہ اُتری جس میں گزشتہ خطاء کی معافی اور آئندہ کے لیے صبح تک جماع کی اجازت دی گئی (تفسیر کبیر، درمنثور، مظہری وغیرہ)۔

اُحِلَّ لَكُمۡ لَيۡلَةَ الصِّيَامِ :اُحِلَّ حِلٌّ سے بنا جس کے معنی ہیں کھل جانا، جائز کاموں کو حلال

اور زمینِ حرم کے ماسوا کو حل اس لیے کہتے ہیں کہ ان پر سے وہ حرم والی پابندیاں اٹھادیں گئیں۔ لکم میں لام نفع کا ہے اور خطاب سارے مسلمانوں سے ہے۔ یعنی یہ حکم تمہارے نفع کے لیے ہے لہٰذا روزوں کی راتوں میں نہ تو صحبت تم پر حرام ہے نہ فرض بلکہ محض مباح و جائز کیوں کہ حرام میں نہ کرنے کی پابندی ہوتی ہے اور فرض میں کرنے کی پابندی۔ ان پابندیوں سے تم پر تنگی ہوگی اور مقصود ہے تم پر آسانی کرنا۔

اَلرَّفَثُ اِلٰی نِسَآئِکُمْ: رفث کے لغوی معنی فحش بات کرنا ہے جو سب کے سامنے نہ کی جاسکے۔ اصطلاح میں عورت سے جماع کی باتیں کرنا رفث کہلاتا ہے لیکن یہاں جماع ہی مراد ہے۔ کیوں کہ پہلے یہ ہی حرام تھا نہ کہ جماع کی باتیں۔ نساء کم سے مراد اپنی بیویاں یا لونڈیاں ہیں یعنی تمہارے لیے رمضان کی راتوں میں اپنی عورتوں کے پاس جماع کے لیے جانا حلال ہے۔

هُنَّ لِبَاسٌ لَّکُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ: لباس لبسّ سے بنا جس کے معنی ڈھانکنا اور چھپانا۔ دھوکہ کو التباس، مشابہ لگنے کو لبس اسی لیے کہتے ہیں کہ اس میں اصل شئی چھپ جاتی ہے۔ کپڑے کو بھی لباس اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اس سے سَتر چھپایا جاتا ہے۔ یہاں چند وجہ سے عورت مرد کا اور مرد کو عورت کا لباس کہا گیا۔ (۱) بوقت جماع ہر ایک دوسرے سے اس طرح ملتے ہیں جیسے بدن سے لباس (۲) شوہر بیوی کے اور بیوی شوہر کے خفیہ راز ایسے چھپاتا ہے جیسے بدن کو لباس (۳) عورت کو مرد اور مرد کو عورت کی ہر وقت ایسی ضرورت ہے جیسے ہر موسم میں کپڑے کی (۴) مرد کی وجہ سے عورت اور عورت کی وجہ سے مرد تمام دنیوی طعنے، الزام اور بہتان سے بچ جاتے ہیں۔ غیر شادی شدہ مرد، عورت کو ہر طرح کے عیب لگ سکتے ہیں۔ نکاح کی وجہ سے یہ دونوں ایسے محفوظ ہو گئے جیسے کپڑے کی وجہ سے سردی گرمی سے بدن۔ اسی لیے بعض علماء نے لباس کے معنی پردہ کیے ہیں۔

عَلِمَ اللّٰهُ: علم سے مراد یا تو علم ازلی ہے یا علم مشاہدہ یعنی اللہ نے ازل سے ہی جان لیا تھا۔ یعنی

یہ تبدیلی قانون طے شدہ پروگرام کے مطابق ہوئی۔ اتفاقاً یا اچانک نہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ دنیاوی حکمران اپنے قانون اپنے بے علمی کی وجہ سے بدلتے ہیں اولاً غلط قانون بنادیتے ہیں پھر درست لیکن رب کے ہاں یہ تبدیلی مخلوق کی مصلحتوں کی بناء پر ہوتی ہے۔

اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ .تختانون خیانت سے بنا جس کا مادہ خون ہے اس کے معنی ہیں بے وفائی، حال کا بدلنا، امانت مار لینا، بدعہدی کرنا، یہاں بے وفائی کے معنی میں ہے۔ یا امانت مارنے کے معنی میں۔ بعض نے فرمایا کہ خون باب افتعال میں آ کر ارادہ خیانت کے معنی میں ہوتا ہے (کبیر) یعنی اللہ تعالیٰ نے ازل میں جان لیا تھا کہ اگر تم پر جماع حرام رہا تو تم اپنے نفسوں کے بارے میں اللہ سے بدعہدی کر بیٹھو گے۔ یا اللہ کی امانت میں خیانت کر ڈالو گے۔

فوائد:

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔

۱۔ جس جگہ یا وقت کو کسی بڑی چیز سے نسبت ہو جائے۔ اس جگہ اور وقت کو بھی عظمت و عزت حاصل ہو جاتی ہے۔ ماہ رمضان کی عزت یہ بیان کی گئی کہ اس میں قرآن اترا۔ اسی قاعدے سے حضور علیہ السلام کی ولادت پاک کا مہینہ، تاریخ، دن، وقت بہت افضل ہے کیوں کہ اس میں صاحب قرآن تشریف لائے بلکہ بعض عاشق ربیع الاول شریف کو رمضان سے افضل مانتے ہیں۔ کیوں کہ حضور علیہ السلام قرآن سے افضل ہیں۔ اسی لیے کعبہ کا دیکھنے والا حاجی اور قرآن پڑھنے والے قاری اور حضور علیہ الصلوۃ والسلام کو دیکھنے والا صحابی اور صحابی کا درجہ بہت بڑا ہے۔ کوئی ولی، قطب، غوث، اوتاد ابدال صحابی کے درجہ کو نہیں پہنچا۔ یاد رہے کہ کلام الٰہی جو رب تعالیٰ کی صفت ہے وہ تمام مخلوق سے اعلیٰ ہے۔

۲۔ رب کی نعمت ملنے پر تکبیریں کہنا۔ خوشی منانا، شکریہ ادا کرنا بہت بہتر ہے جیسا کہ (ولتکبروا اللہ) سے معلوم ہوا۔ حضور ﷺ بھی رمضان کی آمد پر صحابہ کرام کو مبارک باد

اور خوش خبری دیتے تھے۔ اسی جگہ صاحب رُوح البیان نے فرمایا کہ خوشی پر مبارک باد دینا حدیث سے ثابت ہے لہٰذا شب ولادت مصطفیٰ (ﷺ) میں ہر جائز خوشی منانا بہت ثواب ہے۔

۳۔ جس کی آمد پر خوشی کرنا بہتر اس کے وداع پر اظہار غم بھی ثواب۔ دیکھو نکاح کے وقت خوشی سنّت اور طلاق اور شوہر کی وفات پر اظہار غم اور عدت میں سوگ کرنا ضروری۔ لہٰذا رمضان کے وداع پر غم ناک جمعۃ الوداع میں فراقیہ الفاظ کہنا جائز تا کہ لوگ بقیہ وقت کی قدر کریں اور کچھ رب کی عبادت کریں اسے بدعت کہنا نادانی ہے۔

۴۔ نماز عید اور اس میں زائد تکبیرات کا ہونا اور عیدگاہ کے راستہ میں تکبیریں کہتے ہوئے جانا اسی آیت سے ثابت ہے۔

۵۔ خوشی پر نعرہ تکبیر لگانا اس آیت سے ثابت ہے۔ نیز مسلم شریف کے اخیر میں حدیث ہجرت ہے۔ حضور ﷺ کے مدینے پہنچنے پر انصار بازاروں میں یا محمد (ﷺ) یا رسول اللہ ﷺ کے نعرے لگاتے پھرتے تھے۔ نیز مدینہ شریف میں داخل ہونے سے قبل اہلِ مدینہ نے حرہ قباء کے عقب میں رسول اللہ ﷺ کا استقبال کیا اور اظہار مسرت کے لیے نعرہ تکبیر بلند کیا جس کی آواز بنی عمرو بن عوف میں پہنچی یہ قبیلہ موضع قباء میں مدینہ سے جنوب کی طرف دو میل کے فاصلے پر آباد تھا (سیرت رسول عربی (ﷺ) ۔مولانا نور بخش توکلی)۔

۶۔ اگر دیوانہ یا بے ہوش ماہ رمضان میں ایک منٹ کے لیے بھی ہوش میں آ جائے تو اس پر سارے مہینے کے روزے فرض ہیں، کیوں کہ اس نے مہینہ پا لیا اور جو پورا مہینہ بے ہوش رہا اس پر روزے واجب نہ ہوئے کہ اس نے مہینہ پایا ہی نہیں۔

مسائل

مسئلہ ماہ رمضان میں افطار و سحر کا وقت بڑا مبارک ہے۔اس وقت دعائیں مانگی جائیں اور بہتر یہ ہے کہ افطار کسی حلال چیز سے کرے۔خرمے یا پانی سے افطار کرنا سنت ہے۔

مسئلہ: روزہ دار کو افطار کرانے میں روزہ کا ثواب ملتا ہے مگر اس سے روزے والا ثواب سے محروم نہ ہوگا اور نہ ہی افطار کرانے والے پر روزہ معاف ہوگا۔

مسئلہ: افطار میں جلدی اور سحری میں دیر کرنا مستحب ہے۔مگر اتنی جلدی یا دیر نہ کرے کہ روزے ہی میں شبہ ہو جائے۔

فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ :اس جگہ توبہ سے مراد اجازت جماع اور عفو سے مراد اس میں گنجائش اور وسعت دینا یعنی رب نے تمہاری توبہ قبول فرمائی اور تمہاری خطا کو معاف فرما دیا۔

فَالْئٰنَ بَاشِرُوهُنَّ :باشِروا بشرہ سے ہے جس کے معنی ظاہری کھال مباشرت کا معنی کھال سے کھال ملانا یہاں جماع مراد ہے۔یہ امر وجوب کے لیے نہیں بلکہ جواز کے لیے ہے یعنی جب کہ رب تعالیٰ نے تمہیں اجازت دی تو تم اپنی بیویوں سے روزوں کی راتوں میں جماع کر سکتے ہو۔ خیال رہے کہ عمر میں ایک بار بیوی سے جماع کرنا نہایت ضروری ہے یہ اس کا حق ہے کہ اس کے بغیر وہ فسخ نکاح کا دعوٰی کر سکتی ہے اور قاضی اسلام مرد کو ایک سال کی مہلت علاج کے لیے دے کر ایک سال کے بعد نامردی کی وجہ سے نکاح فسخ کر سکتا ہے اور کم از کم چار ماہ میں ایک بار صحبت کرنا دیانۃً ضروری ہے کہ بلا وجہ دیر لگانا ممنوع ہے۔اسی لیے ایلاء کی مدت چار ماہ ہے۔امیر المومنین سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے کسی سپاہی کو چار ماہ سے زیادہ باہر رہنے کی اجازت نہ دی اس سے زیادہ میں اپنی قوت کا لحاظ چاہیے نقصان وہ حد تک نہ پہنچے۔

وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُم :یہاں ما سے مراد اولاد ہے یا اپنی بیویاں یا محل جماع یا شب قدر

اور رمضان کی بافراغت عبادت اور کتب یا تو بمعنی جعل کے ہے یا بمعنی قدر (تقدیر میں لکھا) یا اپنے معنی میں ہے۔ یعنی جماع سے وہ اولاد تلاش کرو جو رب نے تمہارے نصیب میں لکھی۔ یا جماع ان عورتوں سے کرو جو تمہارے لیے حلال کی گئیں۔ یا جماع اس حالت میں اور اس مقام میں کرو جو تمہارے لیے حلال کیا گیا۔ یا یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ جماع کر کے بافراغت ہو کر شب قدر اور رمضان کی عباذات تلاش کرو جس کا تمہارے لیے فیصلہ کیا گیا ہے۔ کیوں کہ غلبۂ شہوت سے تمہارا دل مطمئن نہیں ہوتا۔ اب تمہارے دل کو سکون رہے گا جس سے تم بخوبی عبادت کر سکو گے۔ خیال رہے! نیک اولاد کے حاصل کرنے کے لیے صحبت کرنا ثواب ہے اور اس کی دعا مانگنا سنت انبیآء علیھم السلام ہے حضرت ابراہیم اور زکریا علیھما السلام نے نیک فرزند کی دعائیں مانگی۔ حضرت مریم کی والدہ حنہ نے نیک بچی کی دعا مانگی۔ مگر یہ دعا صرف اس لیے ہو کہ بچہ دین کی خدمت کرے اور ہمارے لیے صدقہ جاریہ ہو۔ اسی طرح اس لیے صحبت کرنا کہ اس سے دل کو سکون میسر ہو اور عبادت میں دل لگے ثواب ہے (احمدی)

فوائد:

۱۔ بعض اوقات بڑوں کی خطا چھوٹوں کے لیے باعثِ عطا بن جاتی ہے۔ بعض بزرگوں سے جماع خطاً ہوا لیکن اس کی وجہ سے تاقیامت مسلمانوں کو اجازت ہو گئی۔ اسی لیے کہا گیا کہ خطائے بزرگان گرفتن خطا است۔

۲۔ رب تعالیٰ کا اکثر قانون یہ ہے کہ اپنے بندوں کو رعایتیں کسی مقبول کے طفیل دیتا ہے۔ تا کہ لوگ کبھی ان مقبولوں سے بے نیاز نہ رہیں۔

۳۔ اگر دنیوی کام بھی نیک ارادہ اور نیت خیر سے کیے جائیں تو ان پر ثواب ملتا ہے۔ دیکھو جماع میں نیک اولاد حاصل کرنے کا با اطمینان عبادت کرنے کی نیت کا حکم دیا گیا ہے۔ کھانے پینے چلنے پھرنے کا بھی یہی حال ہے اسی لیے کہا جاتا ہے کہ امورِ مباح حسنِ نیت سے عبادت بن جاتے ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ص ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ج وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ لا فِى الْمَسٰجِدِ ط تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ط كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ (سورۃ البقرۃ:۱۸۷)

"اور کھاؤ اور پیو یہاں تک کہ تمہارے لیے ظاہر ہو جائے سفیدی کا ڈورا سیاہی کے ڈورے سے پھوٹ کر پھر رات آنے تک روزے پورے کرو اور عورتوں کو ہاتھ نہ لگاؤ جب تم مسجدوں میں اعتکاف سے ہو یہ اللہ کی حدیں ہیں ان کے پاس نہ جاؤ اللہ یونہی بیان کرتا ہے لوگوں سے اپنی آیتیں کہ کہیں انہیں پرہیز گاری ملے"

شان نزول:

شروع اسلام میں روزہ کی راتوں میں سونے سے پہلے کھانے پینے کی اجازت تھی۔سونے یا عشاء کے بعد سب کچھ حرام ہو جاتا تھا۔ایک صحابی رسول ﷺ صرمہ ابن قیس محنتی آدمی تھے کہ دن بھر محنت کرتے تھے۔ایک دن روزہ کی حالت میں دن بھر کام کیا شام کو گھر آئے بیوی سے کھانا مانگا وہ پکانے میں مصروف ہوئیں یہ لیٹ گئے تھکے ہوئے تو تھے ہی آنکھ لگ گئی جب بیوی نے کھانا تیار کر کے ان کو جگایا تو انہوں نے کھانے سے انکار کر دیا کیوں کہ اب کھانا حرام ہو چکا تھا اور اسی حالت میں دوسرا روزہ رکھ لیا جس سے بہت کمزور ہو گئے اور دوپہر کو غشی آ گئی ان کے حق میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔(مظہری)

عدی بن حاتم (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ میں سفید اور کالے ڈورے سے دنیاوی دھاگے سمجھا میں نے دونوں قسم کے دھاگے اپنے تکیہ کے نیچے رکھے اور رات کو انھیں اٹھ اٹھ کر دیکھتا تھا کہ ان کا رنگ کب ظاہر ہو۔ مجھے تو کچھ بھی نظر نہ پڑا صبح کے وقت بارگاہ نبوت ﷺ میں حاضر ہو کر یہ واقع عرض کیا آپ ﷺ نے تبسم فرماتے ہوئے فرمایا کہ تب تو تمہارا تکیہ بڑا فراخ ہے یعنی وہ ڈورے جو یہاں مراد ہیں تمہارے تکیہ کے نیچے نہیں آسکتے اس سے تو دن کی سفیدی اور رات کی سیاہی مراد ہے۔ تب لفظ (مِنَ الْفَجْرِ) اترا جس سے آیت کا مقصد ظاہر ہوا۔ (تفسیر نعیمی)

مذکورہ اجازت کے بعد بعض حضرات حالت اعتکاف میں رات کو مسجد سے گھر جاتے اور جماع کرتے اور غسل کر کے پھر مسجد میں آبیٹھتے تب اعتکاف کے احکام نازل ہوئے جس میں فرمایا گیا کہ رات کو جماع کی اجازت اس کے لیے ہے جو معتکف نہ ہو۔ (روح البیان)

تفسیر: وَ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا: یہ حکم بھی جواز کے لیے ہے اور روزہ داروں سے خطاب ہے یعنی رمضان کی راتوں میں کھاتے پیتے رہو۔

حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمْ: یہ کھانے پینے اور جماع تینوں ہی کی انتہا ہے۔ یتبین بین سے بنا ہے جس کا معنی ظاہر ہونا ہے۔ باب تفعل میں آکر معنی ہوئے کہ خوب ظاہر ہو جائے یا تو اس طرح کہ تم خود دیکھ لو یا اس طرح کہ علم اوقات یعنی معتبر جنتری سے معلوم کرو۔ فقط شبہ معتبر نہیں۔

(نوٹ) آج کل علم اوقات میں امام اہل سنت مفتی اعظم پاکستان مولانا سید ابوالبرکات رحمۃ اللہ علیہ کا مرتب شدہ نقشہ دست یاب ہے جو کہ نہایت مستند ہے سالہا کا تجربہ شدہ ہے۔

الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ: خیط دھاگے کو کہتے ہیں۔ اسی لیے سوئی کو مخیط اور درزی کو خیاط کہتے ہیں کہ انھیں دھاگے سے تعلق ہے۔ چوں کہ سب سے پہلے صبح کی سفیدی مشرق میں ڈورے کی طرح باریک سی نمودار ہوتی ہے۔ جس کے ساتھ رات کی سیاہی بھی باریک ڈورے کی طرح بن جاتی ہے اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ کالے اور سفید دو ڈورے ملے ہوئے ہیں، لہٰذا اس

حالت کو سفید اور کالے ڈوروں سے بیان کیا۔ تاکہ معلوم ہو کہ روزہ پو پھٹتے ہی شروع ہو جاتا ہے چوں کہ صبح کاذب میں بھی کالے اور سفید دو لمبے ڈورے پڑتے ہیں اس لیے فرمایا گیا کہ من الفجر جس سے معلوم ہوا کہ شرقاً غرباً لمبے ڈورے مراد نہیں کیوں کہ اس وقت رات ہی ہوتی ہے۔ بلکہ جنوباً شمالاً ڈورے مراد ہیں جس سے وقت فجر ہو جاتا ہے۔ فجر کے لغوی معنی ہیں جاری ہونا، ظاہر ہونا، پھیلنا اور چیرنا اعلانیہ گناہ گار کو فاجر اس لیے کہتے ہیں کہ اس کا فسق ظاہر ہے۔ چوں کہ صبح کے وقت نور پھیل جاتا ہے اور رات کی ظلمت اس سے چر جاتی ہے۔ اس لیے اسے فجر کہا جاتا ہے۔ یہاں تک سحری کی انتہا اور روزہ کی ابتداء بیان ہوئی اب روزہ کی انتہا کا ذکر ہے۔

ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ : یعنی روزہ شروع کر کے سارا دن کھانے پینے اور جماع سے باز رہو رات تک کہ رات کے آتے ہی روزہ ختم کر دو اور نہ تو رات میں روزہ رکھو اور نہ رات کی سیاہی پھیلنے کا انتظار کرو اور نہ ہی روزہ وصال رکھو۔ یہ امر وجوبی ہے کیوں کہ جیسے صبح سے روزہ شروع کر دینا فرض ہے ایسے ہی رات آنے پر افطار کرنا فرض ہے۔

خیال رہے کہ چند صورتوں میں کھانا پینا فرض شرعی ہے۔ ایک جب کہ بھوک و پیاس سے جان نکلنے کا اندیشہ ہو۔ دوسرا روزہ افطار کے وقت کہ وصال کا روزہ حرام ہے۔ تیسرے جب کسی کو حضور ﷺ کھانے پینے کا حکم دیں اور حکم بھی شرعی ہو محض مشورہ نہ ہو۔ باقی تمام حالات میں کھانا پینا سنت یا مباح ہے۔ لیکن روزہ یا نماز میں حرام۔ لہٰذا مرن برت رکھ کر جان دے دینا یا بھوک ہڑتال کرنا سخت منع ہے۔ کہ (كُلُوا) کے حکم کے خلاف ہے۔ یہاں تک تو روزہ کی ابتداء انتہاء اور اس کی پابندیاں بیان ہوئیں چوں کہ بعض لوگوں کو گمان تھا کہ اعتکاف بھی روزے ہی کی طرح ہے لہٰذا اس میں بھی دن بھر جماع حرام اور رات کو جائز۔ یہ وہم دور کرنے کے لیے فرمایا گیا۔

وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ : اس کے لفظی معنی ہم پہلے بتا چکے ہیں۔ یہاں جماع مراد ہے نہ کہ فقط چھونا۔ یعنی ان عورتوں سے جماع نہ کرو جب کہ۔

وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ لا فِى الْمَسٰجِدِ : عاکفون عکف سے بنا جس کے معنی ہیں ٹھہرنا اور پکڑنا۔

مقیم کو بھی عاکف کہا جاتا ہے۔ شریعت میں بہ نیت عبادت مسجد میں ٹھہرنے کا نام اعتکاف ہے۔ مساجد مسجد کی جمع ہے مسجد بفتح جیم سجدہ گاہ کو کہتے ہیں۔ مسجد بکسر جیم نماز کی جگہ یا مکان یہاں یہی معنی مراد ہیں، مردوں کے لیے وہ مسجدیں مراد ہیں جن میں پنجگانہ نماز ہوتی ہو۔ عورتوں کے حق میں وہ جگہ مراد ہے جسے وہ اپنے گھر میں نماز کے لیے خاص کریں۔ وہ وہاں ہی اعتکاف کر سکتی ہے۔ اگرچہ یہاں مردوں سے خطاب ہے لیکن عورتیں بھی اس میں داخل ہیں۔ لہٰذا شوہر اور بیوی میں سے کوئی بھی اعتکاف میں ہو تو جماع حرام ہوگا۔

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ : اس میں روزہ اور اعتکاف کے سارے مذکورہ احکام کی طرف اشارہ ہے۔ حدود حد کی جمع ہے جس کے معنی انتہا یا آڑ اور روکنا، محروم کو محدود کہتے ہیں کہ وہ رزق سے رکا ہوا ہے۔ دربان کو حداد کہا جاتا ہے کہ وہ غیروں کو اندر جانے سے روکتا ہے۔ لوہے کو حدید، چھری کی دھار کو حد تیز نظر کو بھی حدید کہا جاتا ہے کیوں کہ اس میں بھی منع اور روک ہے۔ چناں چہ ارشاد باری تعالیٰ ہے (فبصرک الیوم حدید) پ ۲۶
منطقی لوگ جامع مانع تعریف کو حد کہتے ہیں کیوں کہ وہ بھی غیر کو داخل نہیں ہونے دیتی (کبیر) یہاں آڑ کے معنی میں ہے یعنی یہ احکام اللہ کی مقرر کی ہوئی حدود اور آڑیں ہیں جس پر حق اور باطل کی انتہا ہے ان کی مخالفت اور ان سے آگے بڑھنا منع ہے۔

فَلَا تَقْرَبُوْهَا : تمہیں چاہیے کہ ان کے قریب بھی نہ آؤ۔

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ : یعنی ہم نے روزہ اور اعتکاف کے احکام نہایت صاف و واضح بیان فرمائے، ایسے ہی اور احکام بھی بیان کرتے ہیں یا کریں گے۔ (لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ) تا کہ مسلمان بے تکلف تقوی اور پرہیز گاری حاصل کریں۔

(اعتکاف کے فضائل ومسائل)

اعتکاف بہت قدیم عبادت ہے گزشتہ پیغمبروں کے دین میں بھی جاری تھی۔رب تعالیٰ نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا تھا کہ (**طھر ابیتی للطائفین و العاکفین**) (میرے گھر یعنی کعبہ معظمہ کو طواف کرنے والوں اور اعتکاف کرنے والوں کے لیے پاک وصاف رکھو) معلوم ہوا کہ دینِ ابراہیمی میں اعتکاف تھا۔اس کے بے شمار فضائل ہیں۔

۱۔ بعض دینوں میں ترک دنیا بہترین عبادت ہے۔اسلام نے اس طرح ترک دنیا کرایا جس سے دنیوی کاروبار بھی بند نہ ہوں اور لوگ تارک الدنیا بھی ہو جائیں یعنی ماہ رمضان میں کچھ دن گھر بار چھوڑ کر بال بچوں سے منہ موڑ کر خانہ خدا میں آ بیٹھیں اور جلوت سے نکل کر خلوت کے مزے لیں۔یہ ترک دنیا جوگی اور سادھو بننے سے بدر جہا بہتر ہے۔

۲۔ معتکف اس بھکاری کی طرح ہے جو غنی کے دروازہ پر اڑ کر بیٹھ جائے اور کہے کہ میں تو لے کر ہی جاؤں گا ایسے ہی یہ بھی اللہ کے دروازے پر اڑ کر بیٹھ جاتا ہے کہ بغیر لیے نہیں ہٹتا، دروازہ والے کو اپنے دروازہ کی لاج ہوتی ہے، مسجد والے کو اپنے دروازے کا لحاظ ہے وہ ضرور دے کر ہی بھیجے گا مگر اخلاص شرط ہے۔

۳۔ اعتکاف میں انسان کو دنیا سے منہ موڑ لینے کی تعلیم ہے اور یہ ہی صدق و اخلاص کا دروازہ ہے۔

۴۔ اعتکاف سے انسان رب کی رحمت خاص کے قابل ہو جاتا ہے۔موسیٰ علیہ السلام سے چالیس دن کا اعتکاف کروا کر تورات دی گئی۔

۵۔ صوفیائے کرام بھی خاص اعمال کے لیے چلّے کیا کرتے ہیں۔یہ بھی ایک قسم کا اعتکاف ہے جس سے انہیں صفائی قلب حاصل ہوتی ہے۔حدیث شریف میں ہے جو شخص اخلاص کے ساتھ چالیس راتیں اللہ تعالیٰ کے لیے گزارتا ہے حق سبحانہ وتعالیٰ حکمت کے چشمے اس کے

قلب سے اس کی زبان پر جاری کر دیتا ہے۔ اعتکاف میں انسان کو غور وفکر کا موقع ملتا ہے۔ صوفیائے کرام فرماتے ہین کہ ایک ساعت کی فکر ایک سال کے ذکر سے افضل ہے۔ انسان اس زمانہ میں اپنے گناہوں اور رب کی رحمتوں کو یاد کر کے توبہ واستغفار بھی کر لیتا ہے۔

(مسائل اعتکاف)

اعتکاف کی تین قسمیں ہیں۔

۱۔ واجب کہ اعتکاف کی منت مانی یعنی زبان سے کہا، محض دل میں ارادہ سے واجب نہ ہوگا۔

۲۔ سنت مؤکدہ یعنی رمضان کے پورے عشرہ اخیرہ یعنی آخر کے دس دن میں اعتکاف کیا جائے۔

۳۔ ان کے علاوہ جو اعتکاف کیا جائے وہ مستحب سنت غیر موکدہ ہے (درمختار، عالمگیری)

مسئلہ: اعتکاف واجب کی مدت کم از کم ایک دن اور ایک رات ہے۔ اس میں روزہ بھی شرط ہے۔

مسئلہ: بیسویں رمضان کے سورج ڈوبنے سے عید کے چاند دیکھنے تک اعتکاف کرنا سنت موکدہ علی الکفایہ ہے کہ اگر بستی میں کسی نے بھی نہ کیا تو سب ترکِ سنت کی وجہ سے گنہگار ہوئے اور اگر ایک نے ہی کر لیا تو سب بری الذمہ ہو گئے۔

مسئلہ: اگر بیسویں رمضان کو بعد نماز مغرب نیت اعتکاف کی تو سنت موکدہ ادا نہ ہوئی لہٰذا چاہیے کہ بیسویں رمضان کو جب نماز عصر پڑھنے آئے تو عید کا چاند دیکھ کر وہاں سے نکلے۔

مسئلہ: اعتکاف نفل یا مستحب کے لیے کوئی مدت مقرر نہیں اور نہ ہی روزہ شرط ہے۔ انسان جب بھی مسجد میں آئے تو اپنے داہنے پاؤں سے اس میں داخل ہو اور یہ کہہ لے کہ میں نے اعتکاف کی نیت کی اس سے چار فائدے حاصل ہونگے۔ (۱) جب تک مسجد میں رہے گا اعتکاف کا ثواب پائے گا۔ (۲) مسجد میں کھانا پینا بھی جائز ہوگا۔ (۳) مسجد

میں سو بھی سکے گا۔ (۴) مسجد میں دنیوی جائز بات بھی کر سکے گا۔

مسئلہ: مسجد جامع ہونا تو اعتکاف کے لیے شرط نہیں بلکہ مسجد جماعت میں بھی ہوسکتا ہے۔ مسجد جماعت وہ ہے جس میں امام موذن مقرر ہوں اگر چہ اس میں پنجگانہ جماعت نہ ہوتی ہو۔

مسئلہ: عورت کو مسجد میں اعتکاف مکروہ ہے بلکہ وہ گھر میں ہی اعتکاف کرے مگر اس جگہ جو اس نے نماز پڑھنے کے لیے مقرر کر رکھی ہو۔ اس کو مسجد بیت کہتے ہیں اور وہ اس جگہ کو پاک وصاف رکھے۔

مسئلہ: معتکف ضروریات انسانی (پیشاب، پاخانہ، غسل واجب، وضو وغیرہ) کے سوا کسی کام کے لیے بھی مسجد سے باہر نہیں نکل سکتا ہے۔

مسئلہ: مسجد سے مراد وہ جگہ ہے جہاں نماز پڑھی جاتی ہے۔ غسل خانے، وضو کی جگہ، جوتے اتارنے کی جگہ وغیرہ اس حکم میں مسجد سے باہر ہیں بلا ضرورت معتکف یہاں بھی نہ آئے۔

مسئلہ: اعتکاف واجب میں معتکف کو مسجد سے بلا عذر شرعی نکلنا حرام ہے۔ اگر نکلا اگر چہ بھول کر نکلا ہو یوں ہی اعتکاف سنت بھی بغیر عذر نکلنے سے جاتا رہتا ہے۔

مسئلہ: عورت نے مسجد بیت میں اعتکاف واجب یا سنت کیا تو بغیر عذر وہاں سے نہیں نکل سکتی اگر چہ وہاں سے نکلی اور گھر میں ہی رہی تو بھی اعتکاف جاتا رہا۔

مسئلہ: اگر کوئی اعتکاف سنت میں (جو کہ عشرہ اخیرہ رمضان میں ہوتا ہے) بدن میں پسینہ وغیرہ سے بُو پیدا ہو جائے کی صورت میں یا غسل نماز جمعہ کے لیے نکلا تو اس کا اعتکاف جاتا رہا چاہیے کہ وہ اس ایک دن کی قضاء کرلے۔

مسئلہ: معتکف کو مسجد میں کھانا، پینا، سونا اور دنیوی جائز کلام کرنا جائز ہے۔

مسئلہ: :اعتکاف میں عورتوں سے جماع بوس وکنار وغیرہ سب حرام ہے۔

(تفصیل کے لیے بہار شریعت حصہ پنجم کا مطالعہ بھی فرمایئے)

مسئلہ اجابتِ دعاء

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَ اِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیۡ عَنِّیۡ فَاِنِّیۡ قَرِیۡبٌ ؕ اُجِیۡبُ دَعۡوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلۡیَسۡتَجِیۡبُوۡا لِیۡ وَلۡیُؤۡمِنُوۡا بِیۡ لَعَلَّهُمۡ يَرۡشُدُوۡنَ (سورۃ البقرۃ:۱۸۶)

"اور اے محبوب جب تم سے میرے بندے مجھے پوچھیں تو میں نزدیک
ہوں دعا قبول کرتا ہوں پکارنے والے کی جب مجھے پکارے تو انہیں
چاہیے میرا حکم مانیں اور مجھ پر ایمان لائیں کہ کہیں راہ پائیں"

شانِ نزول:

ابن جریر ابن ابی حاتم ابن مردویہ ابوالشیخ وغیرہم نے اپنی اسناد سے روایت کیا ہے، کہ ایک اعرابی رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور پوچھا یارسول اللہ ﷺ ہمارا رب کہاں ہے اگر قریب ہے تو اس سے چپکے چپکے دعا کریں اور دور ہے تو اس کو پکاریں حضور ﷺ نے سن کر سکوت فرمایا۔ اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی۔ (و اذا سالک عبادی عنی) الخ۔
عبدالرزاق نے حسن سے روایت کی ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا یارسول ہمارا پروردگار کہاں ہے؟ اس کے جواب میں یہ آیت نازل فرمائی۔ یہ حدیث مرسل ہے۔ (مظہری)۔ کلبی نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ مدینہ کے یہود نے جناب رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا اے محمد یہ تو بتاؤ کہ پروردگار ہماری دعا کس طرح سنتا ہے تم تو کہتے ہو کہ آسمان کی ہم سے پانچ سو برس کی مسافت ہے اور ہر آسمان کا اتنا ہی حال ہے اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی فرماتے ہیں کہ سائل کو اللہ تعالیٰ نے جو لفظ عبادی (میرے بندے) کے معزز خطاب سے سرفراز فرمایا ہے اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ

سائل یہودی کافر نہ ہوگا (واللہ اعلم) مفسرین نے کہا ہے کہ (انی قریب) کے یہ معنی ہیں کہ علم کے اعتبار سے تمہارے قریب ہوں کوئی چیز مجھ پر پوشیدہ نہیں یا یہ کہ میری رحمت قریب ہے یہ تاویل اس لیے کی گئی ہے کہ کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ اس قرب سے قربِ مکانی مراد ہے اور اللہ تعالیٰ مکان سے منزہ اور پاک ہے۔ قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ حق یہ ہے کہ یہ اللہ سبحانہ کو بندوں سے قربِ حقیقی ہے اور اس کا ادراک عقل سے ممکن نہیں صرف وحی یا فراست صادقہ سے اس کا ادراک ہوسکتا ہے۔

(اُجِیۡبُ دَعۡوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ) (قبول کرتا ہوں دعا کرنے والے کی دعا جب وہ مجھ سے دعا کرتا ہے)

فَلۡیَسۡتَجِیۡبُوۡا لِیۡ: تو چاہیے کہ وہ بھی میرا حکم مانیں یعنی مجھ سے ہی اپنی دعا کی قبولیت طلب کریں اور بعض نے کہا ہے کہ (یستجیبوا لی) کے یہ معنی ہیں کہ بندوں کو بھی چاہیے کہ جب میں ان کو طاعت کے لیے بلاؤں تو قبول کرلیں جیسا کہ میں ان کی دعائیں قبول کرتا ہوں۔

(وَلۡیُؤۡمِنُوۡا بِیۡ) اور چاہیے کہ ایمان پر قائم اور جمے رہیں۔ یہ معنی اس لیے یہاں کیے ہیں کہ اصل ایمان تو پہلے ہی سے لائے ہوئے تھے اب جو ایمان کا حکم ہوا ہے تو یہی مراد ہے کہ ایمان پر جمے رہو۔

(لَعَلَّهُمۡ یَرۡشُدُوۡنَ) تاکہ وہ سیدھا راستہ پائیں یا تو یہ معنی کہ گزشتہ خصال کے پابند رہو اور اللہ تعالیٰ سے اپنی مراد پانے کی امید رکھو اور یا یہ معنی کہ خصال گزشتہ پر کار بند رہو۔ تاکہ مراد پاؤ۔ رشد وہیابی غی (گمراہی) کی ضد ہے۔ رشد سے مراد مقصود پر پہنچنا ہے۔ اعتراض: بندہ بارہا دعا کرتا ہے اور قبول نہیں ہوتی، اس کی کیا وجہ ہے حالاں کہ اللہ تعالیٰ نے دعا قبول کرنے کا وعدہ فرمایا ہے اور وعدہ خلافی اس کی شان کے لائق نہیں ہے۔ حضرات مفسرین نے اس کے مختلف جواب دیئے ہیں۔ علامہ بغوی صاحب معالم میں فرماتے ہیں کہ اس آیت کے معنی میں اختلاف ہے۔ بعض نے تو یہ کہا ہے کہ دعا کے معنی یہاں طاعت کے ہیں اور اجابت (قبول کرنا) کے معنی ثواب دینے

کے ہیں اس لیے کچھ اعتراض وارد نہیں ہوتا اور بعض نے کہا ہے کہ اس آیت کے معنی خاص ہیں اگر چہ الفاظ عام ہیں معنی یہ ہیں کہ میں دعا کرنے والے کی دعا اگر چاہوں تو قبول کرتا ہوں۔ چناں چہ دوسرے مقام پر فرمایا (فیکشف ماتدعون الیه ان شاء) یعنی (تم جو مصیبت کے زائل کرنے کی دعا کرتے ہو تو اگر اللہ چاہے تو یہ مصائب دفع کردے گا) یا یہ معنی ہیں کہ میں دعا قبول کرتا ہوں اگر قبول کرنا تمہارے لیے بہتر ہو۔ یا یہ معنی ہیں کہ دعا قبول کرتا ہوں اگر بندے کسی امرِ محال کے طالب نہ ہوں اور بعض نے کہا کہ آیت عام ہے لیکن معنی قبول کے یہ ہیں کہ میں اس کی پکار کو سنتا ہوں، رہی یہ بات کہ اس کی تمنا اور آرزو بر آنا تو یہ دوسری بات ہے۔ آیت میں اس سے تعرض نہیں اور بعض نے کہا ہے کہ معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ دعا قبول کرتا ہے سو اگر مقدر میں اس کے وہ امر ہو جس کے لیے دعا کی ہے تو مل جاتا ہے اور اگر نہ ہو تو اس دعا کا یا تو آخرت میں ثواب ملتا ہے یا دنیا میں کوئی برائی اور تکلیف اس سے دور ہو جاتی ہے۔

عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو کوئی روئے زمین پر اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے یا تو اللہ تعالیٰ اس کی مانگی ہوئی شئی عطا فرماتا ہے یا کوئی برائی اس کی مثل دور کرتا ہے مگر یہ جب ہے کہ کسی گناہ یا قطعِ رحم کی دعا نہ کر بیٹھے۔ (رواہ البغوی)

اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو مسلمان کسی حاجت کے واسطے اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو تو اللہ تعالیٰ یا تو اس کو وہ حاجت دیتا ہے اور یا اس کے لیے ذخیرہ کر رکھتا ہے وہاں اس کو ملے گی۔ ترمذی نے حضرت جابر رضی اللہ سے مرفوعاً اس مضمون کو روایت کیا ہے۔ کچھ الفاظ کا تفاوت ہے اور بعض نے کہا کہ اللہ تعالیٰ مومن کی دعا اسی وقت قبول فرماتا ہے یعنی پکار کا جواب دیتا ہے لیکن اس کی مراد اس لیے موخر کرتا ہے تا کہ وہ دعا کرے تو اس کی آواز سنے اور جس کو اللہ تعالیٰ دوست نہیں رکھتا (اس کی دعا) اس کی مراد اور آرزو جلد پوری کر دیتا ہے کیوں کہ اس کی آواز کو پسند نہیں کرتا اور بعض نے کہا کہ دعا کے بہت سے آداب و شرائط ہیں اور وہ شرائط قبولیت کے اسباب ہیں۔ جو شخص ان سب اسباب و آداب کو

حاصل کرلیتا ہے اس کی دعا قبول ہوتی ہے اور جو اس میں کمی کرتا ہے تو وہ دعا میں حد سے تجاوز کرنے والوں میں شمار ہوتا ہے۔اس لیے قبولیت کا مستحق نہیں ہوتا۔حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کا ذکر کیا جو سفر میں ہے اور اپنے ہاتھ آسمانوں کی طرف دعا کے لیے اٹھاتا ہے اور پراگندہ بال وحال ہے (یعنی اسباب قبولیت مجتمع ہیں) لیکن حالت یہ ہے کہ کھانا بھی اس کا حرام اور پینا بھی اس کا پہننا حرام اور اب تک غذا بھی حرام پھر بھلا دعا کہاں قبول ہو۔اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے الحاصل بعض دعاؤں کی عدم قبولیت یا قبول میں دیر کی کوئی نہ کوئی وجہ ہوتی ہے جو اوپر مذکورہ ہوئی ہیں-واللہ اعلم۔

ملا احمد جیون استاد اورنگ زیب عالمگیر رضی اللہ عنہ تفسیرات احمدیہ میں اس آیت کے ماتحت فرماتے ہیں کہ اس آیت سے یہ استدلال کیا جاسکتا ہے کہ قضاء حوائج اور رد بلیات کے لیے دعاؤں میں اثر بلیغ ہے۔بعض معتزلہ اس کے منکر ہیں۔صاحب قصیدہ بدر الامالی فرماتے ہیں (وللدعوات تاثیر بلیغ. وقد ینفیه اصحاب الضلال) اجابتِ دعا اور اس کے شرائط و آداب کے بیان میں کتب اوراد بھرپور ہیں۔

(وفی ذالک کفایه واللّٰه والی الهدایه)

فائدہ:

اس آیت میں اذا دعان کے عموم سے دعا بعد الجنازہ کے جواز پر بھی استدلال کیا جاسکتا ہے اور مبسوط، (ص ۶۷/۲ اور بدائع صنائع، ص ۱/۳۱۱) میں اس دعا کے جواز کا صریح ثبوت بھی موجود ہے۔

مالِ حرام کھانے کی حرمت

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (سورۃ البقرۃ:۱۸۸)

"اور آپس میں ایک دوسرے کا مالِ ناحق نہ کھاؤ اور نہ حاکموں کے پاس ان کا مقدمہ اُس لیے لے جاؤ کہ لوگوں کا کچھ مال ناجائز طور پر کھالو جان بوجھ کر"

شانِ نزول:

عبدان حضرمی اور امرا القیس کندمی میں کچھ زمین کے متعلق جھگڑا تھا۔ان دونوں نے یہ مقدمہ حضور علیہ السلام کی بارگاہ میں پیش کیا۔جس میں عبدان تو مدعی تھے اور امراء القیس مدعا علیہ مدعی کے پاس کوئی گواہ نہ تھا۔مدعا علیہ کو قسم کا حکم ہوا۔انہوں نے قسم کھانے کی تیاری کرلی۔حضور علیہ السلام نے وہ آیت کریمہ پڑھی کہ (اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ) الخ جس پر وہ قسم سے رک گئے اور وہ دونوں رونے لگے۔ہر ایک کہتا تھا یہ زمین میری نہیں میرے اس بھائی کی ہے۔اس پر یہ آیت کریمہ اُتری حضور علیہ السلام نے جنت کی خوش خبری دی۔(احمدی روح البیان)

تفسیر:

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ : اگرچہ (تَاْكُلُوْا) اکلٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں کھانا مگر یہاں کھانا، پینا، پہننا وغیرہ ہر قسم کے استعمال کی ممانعت مقصود ہے۔اسی لیے اموال کو جمع فرمایا گیا اور (اموالکم) سے یا تو خود اپنے ذاتی مال مراد ہیں یا ایک دوسرے کا مال،

مگر (بَیْنَکُمْ) سے ظاہر یہی ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کا مال مراد ہیں۔ باطل، بطلٌ سے بنا ہے۔ جس کے معنی ہیں جاتا رہنا اور مٹ جانا۔ شریعت میں ہر ناجائز اور غلط چیز کو باطل کہا جاتا ہے، کیوں کہ وہ مٹنے والی ہے۔ یہاں اس سے خرچ اور آمدنی کے تمام ناجائز طریقے مراد ہیں۔ شراب خوری، حرام کاری، فضول خرچی یہ سب باطل خرچ ہیں اور رشوت، غصب، لوٹ، چوری، جھوٹی قسمیں، جوا، خیانت وغیرہ ناجائز پیشے یہ سب باطل آمدنیاں یعنی نہ تو تم اپنے مال غلط طور پر خرچ کرو اور نہ آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقے سے حاصل کر کے استعمال کرو۔

وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ : یہ (لَاتَاْكُلُوْا) پر معطوف ہے اور لَا کے تحت میں ہے اور (تُدْلُوْ) ادلاءٌ سے بنا جس کا مادہ دَلْوٌ ہے اور اس کا معنی لٹکانا ڈول کو دلو اس لیے کہتے ہیں کہ وہ کنویں میں لٹکایا اور چھوڑا جاتا ہے۔ (فَاَدْلٰى دَلْوَه) نسبی رشتہ کو بھی اسلیے اِدْلَاءٌ بولتے ہیں کہ جیسے ڈول سے پانی حاصل کرتے ہیں۔ ایسے ہی اس سے میراث پاتے ہیں۔ یہاں مراد مقدمہ لے جانا ہے، کیوں کہ اس کے ذریعے مال حاصل کیا جاتا ہے۔ اس لیے حکام کے نذرانہ کو رشوت کہا جاتا ہے۔ کہ وہ رشاؤ سے بنا جس کے معنی رسی کے ہیں۔ جیسے بذریعہ رسی بھرا ہوا ڈول کھینچا جاتا ہے ایسے ہی بذریعہ رشوت مال حاصل کیا جاتا ہے۔ (کبیر بحوالہ تفسیر نعیمی)

بھا کا مرجع مال ہے۔ حکام حاکم کی جمع ہے اور اس سے یا تو شرعی قاضی مراد ہے یا ظالم حاکم۔ (احمدی) یعنی مال کے غلط مقدمات حکام کے پاس نہ لے جاؤ۔

لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ : یہاں بھی اکل سے یعنی کھانے سے مراد اخذ یعنی لینا ہے۔

فریق:

یہاں اس سے مراد کچھ حصہ ہے۔ یعنی حکام کے پاس مال کے جھوٹے مقدمے اس لیے نہ لے جاؤ کہ حاکموں کو رشوتیں وغیرہ دے کر لوگوں کا کچھ مال کھاؤ۔ (وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ) یعنی جبکہ تم اپنا جھوٹا ہونا اور مقدمہ کا غلط ہونا جانتے ہو۔

خلاصہ تفسیر:

اے مسلمانوں! تم آپس میں ایک دوسرے کے مالوں پر ناجائز قبضہ نہ کرو اور انہیں غلط طریقہ سے استعمال میں نہ لاؤ اور اپنے ظلم پر مدد لینے کے لیے جھوٹے مقدمات حاکموں کے پاس اس نیت سے نہ لے جاؤ کہ انہیں کچھ دے دلا کر یا جھوٹی گواہی قائم کر کے اور حکام کو فریب دے کر اور ان سے غلط فیصلے لے کر لوگوں کے مال ناجائز طور پر کھاؤ حالاں کہ تم جانتے ہو کہ ہم اس مقدمے میں جھوٹے ہیں۔

فوائد:

اس آیت کریمہ سے چند فوائد حاصل ہوئے۔(۱) حرام طریقوں سے حاصل کیا مال بھی حرام ہے۔ مثلاً شراب کی تجارت حرام۔ تو اس کے ذریعے جسطرح بھی مال حاصل کیا جائے حرام ہی ہوگا۔ شراب بیچ کر یا بکوا کر، کھینچ کر یا کھچوا کر خریدار کے گھر پہنچا کر ہر ذریعہ کا پیسہ حرام ہے۔ مگر اس جگہ اس کی تین صورتیں ہیں۔(۱) بیع باطل اور باطل مزدوریوں سے حاصل کیا ہوا پیسہ تو کمانے والے کی ملک میں ہی نہیں آئے گا۔ سود کا، شراب کا، گانے بجانے اور ناچنے کا پیسہ کمانے والے کی ملک ہی نہیں اس پر واجب ہے کہ یا تو مالکوں کو واپس کر دے اور اگر ان کا پتہ نہ چلے تو ان کے نام خیرات کر دے۔(۲) حلال کمائیوں کا پیسہ حلال ہے اگر چہ کوئی اس سے گناہ بھی کرے مثلاً کسی نے مکان یا دوکان کرائے پر دی، کرایہ دار نے اس میں شراب خانہ وغیرہ لگایا مالک مکان کو کرایہ کا پیسہ حلال ہے۔ کہ اس نے مکان رہنے کے لیے دیا جو حلال ہے۔ شراب خانہ لگانا رہنے والے کا اپنا گناہ ہے۔ یہ سب مسائل بالباطل سے حاصل ہوئے مزید تحقیق کے لیے شامی و عالم گیری کتاب البیوع واجارات میں دیکھو۔(نعیمی)

(۳) ناجائز فائدہ لینے اور جھوٹے مقدمے بنانے کے لیے حکام سے ملنا۔ ان پر اثر ڈالنا۔ رشوتیں وغیرہ دینا حرام ہے۔ صحیح حدیث میں عبداللہ بن عمرو سے مروی ہے کہ لعن

رسول اللہ ﷺ (الراشی والمرتشی) رواہ ابوداؤد و ابن ماجہ رواہ الترمذی عنہ وعن ابی ھریرہ و رواہ احمد والبیھقی فی شعب الایمان و زاد والرائش یعنی الذی یمشی بینھما (مشکوٰۃ ، رزق الولاۃ و ھدایاھم) (رسول اللہ ﷺ نے رشوت دینے اور لینے والے پر لعنت فرمائی) اور بیہقی نے لفظ والرائش کی زیادتی کی یعنی وہ شخص جو کہ راشی اور مرتشی کے درمیان سودا طے کرانے والا ہو اس پر بھی لعنت۔ تاہم اس حدیث کی شرح میں حضرت علامہ علی القاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

(الرشوۃ ما یعطی لابطال حق او لا حقاق باطل اما اذا اعطی یتوسل بہ الی حق او لیدفع عن نفسہ ظلماً فلا باس بہ) (مرقاۃ صفحہ ۲۴۸/ ۷) رشوت وہ ہے جو کسی کا حق باطل کرنے کے لیے یا باطل کو حق ثابت کرنے کے لیے دی جائے۔ لیکن جب اپنا حق حاصل کرنے کے لیے یا اپنی ذات سے دفع ظلم کے لیے ہو تو اس میں حرج نہیں۔ حاصل کلام۔ کہ اپنا حق حاصل کرنے یا یا دفع ظلم کے لیے دینا رشوت نہیں۔ تاہم رشوت لینا ہرگز جائز نہیں۔ بلکہ ناجائز فائدہ اٹھانے کی غرض سے حاکم بننا بھی ناجائز (منہ)

(۴) حاکم کا غلط فیصلہ حرام کو حلال نہ کردے گا۔ حضور علیہ السلام نے مدعی و مدعا علیہ سے فرمایا (تم میرے پاس اپنے مقدمے لاتے ہو۔ ممکن ہے کہ تم میں سے کوئی تیز زبان ہو اور اس کے دلائل سن کر ہم اس کے حق میں فیصلہ کردیں اگر وہ واقعی اس کا حق دار نہ ہو تو یہ چیز اس کے لیے جہنم کا ٹکڑا ہے) مگر یہ مالی احکام میں ہے۔

اعتراض: جب کہ حاکم کا غلط فیصلہ حرام کو حلال نہیں کردیتا یعنی اس کا فیصلہ ظاہر پر ہوتا ہے نہ کہ حقیقت پر تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ حاکم کا فیصلہ ظاہر و باطن پر کیوں مانتے ہیں۔ انہوں نے یہ کیوں فرمایا کہ اگر حاکم جھوٹے گواہوں پر کسی کے نکاح کا فیصلہ کردے تو وہ عورت حقیقتاً اس کی بیوی ہے۔ کہ اس سے جماع بھی حلال اور اس کی اولاد بھی حلال؟ (امام بخاری وغیرہ)

جواب: جیسا کہ پہلے واضح کر دیا گیا ہے کہ یہ آیت مالی معاملات کے بارے میں ہے۔ ان میں امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی وہی فرماتے ہیں جو آیت فرما رہی ہے۔ ہاں نکاح طلاق وغیرہ وہ معاملات جنہیں قاضی ابتداءً خود بھی جاری کر سکتا ہے ان میں اس کا فیصلہ ظاہر و باطن دونوں طرح جاری ہوگا۔ لہٰذا اگر اس نے جھوٹی گواہیوں پر نکاح اور طلاق وغیرہ کا حکم دے دیا تو حقیقتاً وہ اس کی بیوی ہوگی۔ یا نکاح سے نکل گئی۔ کیوں کہ قاضی کبھی رعیت کے نکاح بھی کرتا ہے، اور فسخ نکاح بھی۔ امام صاحب کی دلیل یہ حدیث ہے کہ حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کے پاس ایک شخص نے کسی عورت سے اپنا نکاح ہونے پر دو گواہ قائم کر دیئے۔ آپ نے نکاح کا حکم دے دیا۔ اس عورت نے عرض کیا کہ میرا نکاح اس سے نہ ہوا تھا یہ جھوٹی گواہیاں ہیں۔ اب آپ نکاح پڑھا دیجئے تا کہ جماع حرام نہ ہو تو آپ نے فرمایا ان گواہوں کی گواہی اور میرا فیصلہ ہی تیرا نکاح ہے (روح المعانی۔ شرح بخاری) اس سے معلوم ہوا کہ ایسے معاملات میں قاضی کا فیصلہ ہر طرح نافذ ہوتا ہے۔

خیال رہے کہ حاکم کے فیصلے اپنے علم پر نہیں ہوتے بلکہ شرعی ثبوت پر ہوتے ہیں۔ اگر کوئی حاکم کسی کو صرف اپنی آنکھ سے زنا کرتا دیکھ لے مگر شرعی گواہی یا مجرم کا اقرار نہ ہو تو اسے رجم نہیں کر سکتا ورنہ ظالم حکام اس کی آڑ میں بڑے بڑے ظلم کر ڈالتے۔ اسی لیے حضور ﷺ اپنے ذاتی علم پر شرعی فیصلے نہ فرماتے تھے بلکہ شرعی ثبوت پر فرماتے یہی وجہ تھی کہ واقعہ افک میں حضور ﷺ نے باوجود جاننے کہ (واللہ ما علمت فی اهلی الا خيرا) فرمایا، اپنی طرف سے کوئی فیصلہ نہ فرمایا۔ یہاں تک کہ سورہ نور میں خود اللہ تعالیٰ نے ام المومنین رضی اللہ عنہا کی برائت بیان فرمائی۔

۵۔ بے خبری کی غلطی معاف ہے اسی لیے یہاں (وانتم تعلمون) کی قید لگائی لہٰذا اگر کوئی کسی چیز کو غلطی سے اپنا سمجھ کر اس پر قبضہ کر لے یا حاکم جھوٹی گواہیوں پر بے خبری میں فیصلہ کر دے تو وہ گناہ گار نہیں۔ خیال رہے۔ کہ مسئلہ کی بے خبری معتبر نہیں، بلکہ وہ واقعہ کی بے خبری کا ذکر ہے۔ (تفسیر نعیمی)

(حرام وحلال کی پہچان)

اس مقام پر صاحب تفسیر کبیر نے بحوالہ احیاء العلوم حرام وحلال پہنچاننے کا نہایت عمدہ طریقہ بیان کیا- یہ کہ مال یا تو خود بخود ہی حرام ہوگا یا خود تو حلال مگر غلط کمائی کی وجہ سے اس کا استعمال حرام ہوگیا ہوگا۔ جو خود حرام ہے اسے حرام لعینہ کہتے ہیں۔اس کی تحقیق یہ ہے کہ مال تین قسم کے ہیں۔(۱) معدنیات جیسے ہیرے، موتی پتھر وغیرہ (۲) نباتات ترکاریاں، سبزیاں اور جڑی بوٹیاں (۳) حیوانات (جانور)۔ معدنیات میں سے جو صحت کو نقصان دیں وہ حرام باقی سب حلال لہٰذا موتی اور دیگر جواہرات جو مضر نہ ہوں وہ حلال۔ اگر سنکھیا بھی کسی خاص طریقے سے کھائی جائے جس سے نقصان نہ ہو تو حلال۔ ایسے ہی گیرو چونہ وغیرہ دواؤں اور پان وغیرہ میں کھائے جاتے ہیں اور نقصان دہ چیزیں حرام مٹی، پتھر، راکھ وغیرہ حرام ہیں کیوں کہ یہ بیمار کر دیتی ہیں۔نباتات میں سے مہلک اور مضر صحت اور نشہ پیدا کرنے والی چیزیں حرام، باقی سب حلال۔ بھنگ، چرس، افیون نشہ دیتی ہیں لہٰذا حرام ہیں یونہی قاتل جڑی بوٹیاں حرام اس کے سوا باقی ہر ترکاری گھاس وغیرہ سب حلال۔ حیوانات کی تفصیل آئندہ (احلت لکم بھیمة الانعام) کے تحت آئے گی (ان شاء اللہ العزیز) رہے وہ مال جو خود تو حلال ہوں مگر غلط کمائی کی وجہ سے ان کا استعمال حرام ہوگیا اس کی تفصیل یہ ہے کہ مال کی ملکیت یا تو اپنے اختیار سے حاصل ہوگی یا بغیر اختیار جیسا کہ میراث کا مل جانا۔ اختیار والی ملکیت یا تو بغیر عطائے مالک حاصل ہوگی جیسے شکار کا جانور اور گھر میں دفینہ کا نکل آنا یا مالک کی عطاء سے لیکن اس کی پھر دو صورتیں ہیں۔ یا جبراً جیسے مال غنیمت یا حق شفع وغیرہ یا اس کی خوشی سے۔ خوشی کی صورت میں یا تو کسی عوض سے ہوگی جیسے تجارت، مہر، اجرت وغیرہ یا بغیر عوض جیسے ہبہ، وصیت وغیرہ۔

خلاصہ یہ کہ آمدنی کی چھ صورتیں ہیں (۱) غیر مملوکہ مال جس پر قبضہ کیا جاوے جیسے کان، شکار، جنگل کی لکڑیاں یا وہاں کا گھاس اور نہر کا پانی پینا وغیرہ۔ (۲) دوسرے یہ کہ مالک سے جبراً لیا جاوے جیسے رعایا سے ٹیکس اور جنگ میں کفار کا مالِ غنیمت وغیرہ۔ (۳) تیسرے وہ جو مالک کی رضامندی سے بالعوض حاصل کیا جائے جیسے جائز تجارت و نکاح وغیرہ۔ (۴) چوتھا یہ کہ مالک کی رضا سے بلاعوض حاصل ہو۔ جیسے جائز ھبہ، صدقہ، وصیت وغیرہ۔ (۵) پانچویں یہ کہ جو کسی کا مال بغیر اختیار حاصل ہو جائے جیسے میراث۔ (۶) چھٹے یہ کہ کسی کا مال ناجائز طریقے سے حاصل کیا جاوے جیسے چوری، سود اور حرام پیشے۔ پہلے پانچ طریقوں سے حاصل کیا ہوا مال حلال اور آخری چھٹے طریقے سے حاصل شدہ مال حرام ہوگا۔

اسلامی تقویم کا بیان

یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْاَھِلَّةِ ؕ قُلْ ھِیَ مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ؕ وَلَیْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ ظُھُوْرِھَا وَلٰکِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰی ۚ وَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ اَبْوَابِھَا ۪ وَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ

(سورۃ البقرۃ:۱۸۹)

''تم سے نئے چاند کے متعلق پوچھتے ہیں، تم فرمادو وہ وقت کی علامتیں ہیں، لوگوں اور حج کے لیے اور یہ کچھ بھلائی نہیں کہ گھروں میں ان کی پچھلی طرف سے آؤ اور ہاں بھلائی تو پرہیز گاری ہے اور گھروں میں دروازوں سے آؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو اس امید پر کہ فلاح پاؤ''

شانِ نزول:

اس آیت کے دو جز ہیں اور دو ہی شانِ نزول (یَسْئَلُوْنَکَ) سے والحج تک کا ایک شانِ نزول ہے اور لیس البر سے (تُفْلِحُوْنَ) تک دوسرا۔ پہلے جز کا شانِ نزول یہ ہے کہ ایک بار حضرت معاذ بن جبل اور ثعلبہ ابن غنم نے حضور علیہ السلام سے پوچھا کہ یا رسول اللہ ﷺ چاند کا کیا حال ہے کہ یکساں نہیں رہتا شروع تاریخوں میں ڈورے کی طرح باریک ہوتا ہے۔ پھر بڑھتے بڑھتے پورا ہو جاتا ہے اور پھر گھٹتے ہوئے پہلی کی طرح باریک؟ ان کے جواب میں یہ آیت اتری (درمنشور، خزائن العرفان)

دوسرے جز کا شانِ نزول یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں کچھ لوگ حج کا احرام باندھ کر اپنے گھروں میں دروازہ سے نہ آتے جاتے تھے بلکہ مکانوں کی پچھلی طرف توڑ کر داخل ہوتے تھے۔ ہاں بنی قریش، بنی خزاعہ اور بنی عامر، بنی ثقیف کے لوگ دروازے سے ہی آمد و رفت رکھتے تھے۔

ان قبیلوں کے سوا جو کوئی دروازوں سے آتا جاتا اسے فاجر کہتے تھے۔ ایک دفعہ حضور علیہ السلام اور رفاعہ انصاری احرام باندھے ہوئے دروازے سے نکلے۔ لوگ رفاعہ کو فاجر کہنے لگے۔ حضور ﷺ نے ان سے پوچھا کہ تم تو انصار سے ہو نبی قریش سے نہیں۔ تم دروازہ سے کیوں نکلے؟ انہوں نے عرض کیا کہ میں بھی قریش سے ہی ہوں کیوں کہ آپ کے دین پر ہوں اور آپ کا فرماں بردار اور غلام کا شمار مولیٰ کے ساتھ ہے ان کے اس پیارے جواب کی تائید میں یہ آیت کریمہ آئی جس سے اس قاعدے کو مٹادیا گیا۔ (احمدی، درمنشور)

تفسیر:

یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْاَهِلَّةِ: اَهِلَّهٗ ہلال کی جمع ہے۔ پہلی دوسری رات کے چاند کو ہلال کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد قمر اور چودھویں کے چاند کو بدر یعنی اے محبوب علیہ السلام لوگ آپ سے نئے چاند کے متعلق سوال کرتے ہیں کہ یہ باریک کیوں ہوتا ہے۔ یسئلونک میں صحابہ کرام کی منقبت بھی ہے اور حضور علیہ السلام کی نعت بھی۔ منقبت تو اس طرح کہ سارے مسلمانوں پر اس پوچھنے والے صحابی کا احسان ہے جس کے سوال کی وجہ سے یہ آیت مسلمانوں کو ملی۔ صحابہ کے سوالات و حالات آیات کے شان نزول ہیں۔ تورات وانجیل کی آیات کے شان نزول نہ تھے۔ وہ سب یک دم آ گئیں تھیں لہٰذا صحابہ کے احسانات تا قیامت لوگوں پر رہیں گے۔ نعت اس طرح کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے سوال گویا رب تعالیٰ سے سوال ہے۔ پوچھتے ہیں حضور سے جواب دیتا ہے رب تبارک وتعالیٰ۔

قُلْ هِیَ مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ: اگرچہ جواب تو رب تعالیٰ نے دیا مگر قُلْ کہلوا کر کہ سوال بھی آپ سے تھا اور جواب بھی آپ کی طرف سے ہو جائے۔ مَوَاقِیْتُ میقات کی جمع جس کا مادہ وَقْتٌ ہے۔ وقت کسی کام کے زمانے کو کہتے ہیں۔ میقات وقت معلوم کرنے کا آلہ اور ذریعہ جیسے وَعْدٌ سے معیاد کبھی وقت کی انتہا کو بھی میقات کہہ دیتے ہیں (جیسے فَتَمَّ مِیْقَاتُ

رَبّہ) ھلال مہینا کا اختتام اور احرام باندھنے کی جگہ، حلت ختم ہونے کا مقام ہلال کو مہینہ کا میقات اوران میقات اور مقامات کو حج کا میقات کہا جاتا ہے۔ لـلـنـاس سے مراد لوگوں کے دنیوی اور دینی کاروبار ہیں چوں کہ دینی معاملات میں حج کو ایک خاص عزت حاصل تھی کہ ساری عبادتیں زمین کے ہر حصہ میں ہو جاتی ہیں مگر حج صرف مکہ معظمہ میں ہی ادا ہوتا ہے اس لیے اسے علیحدہ بیان کیا۔ یعنی آپ ﷺ فرمادو کہ یہ چاند لوگوں کے کاروبار اور عبادات خصوصاً حج کے اوقات کی علامتیں ہیں اور ان کے معلوم کرنے کا ذریعہ ہیں۔ اس سے قرض کی مدت، عورتوں کی عدت، سالوں کے شمار، لوگوں کی عمریں، ماہ رمضان اور عید بقر اور عید کا پتہ لگتا ہے اور اسی سے حج اور اس کی تاریخیں معلوم ہوتی ہیں۔ چوں کہ چاند کے ضمن میں حج کا ذکر بھی آ گیا اسی لیے اس کے متعلق ایک ضروری مسئلہ بھی بیان فرمایا گیا اور لوگوں کو ان کی سخت غلطی پر خبردار کیا گیا۔ ارشاد ہُوا۔

وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا: بیوت جمع بیت کی ہے یہ بیوتت سے ماخوذ ہے جس کے معنی شب گزارنا ہیں۔ گویا کوٹھڑی میں چوں کہ رات گزاری جاتی ہے اس لیے اسے بیت کہتے ہیں۔ ظہور جمع ظہر کی ہے یعنی کھلی ہوئی چیز یا کھلا ہوا حصہ چوں کہ انسان کی پیٹھ اور گھر کی پچھیت (پچھلی دیوار) بالکل ظاہر ہوتی ہے۔ اس لیے اسے ظہر کہا جاتا ہے یعنی موسمِ حج میں گھروں میں پچھلی طرف سے آنا جانا نیکی نہیں بلکہ ایک بے کاری مصیبت ہے۔

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى: یعنی حقیقی بھلائی اس کی بھلائی ہے جو گناہوں سے بچے۔ یا حقیقی نیک وہ ہے جو پرہیز گار ہو گھروں سے پیچھے آنا جانا بے کار ہے۔ لہٰذا

وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا: یہ امر اباحت کا ہے جس میں اس غلط عقیدہ کی تردید ہے اور ممکن ہے کہ وجوب کے لیے ہو کہ ان کی رسمِ جاہلیت توڑنے کے لیے دروازوں سے آنا اس وقت واجب کر دیا گیا ہو۔ ابواب جمع باب کی ہے۔ باب دروازہ کو کہتے ہیں خواہ شہر کا ہو یا مکان کا۔ کبھی ذریعہ کو بھی باب کہہ دیا جاتا ہے (**فتحنا علیھم ابواب کل شئی**)

یہاں گھر کے اصل دروازے مراد ہیں جو آنے جانے کے لیے بنائے جاتے ہیں۔ یعنی تم لوگ

ایام حج میں اپنے گھروں میں اصل دروازوں سے ہی جاؤ تا کہ یہ غلط رسم ٹوٹے اور ساتھ ہی یہ بھی خیال رکھنا۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ :اللہ سے ڈرتے رہو اور اس کے شرعی احکام نہ بدلو اور نہ اس کے افعال پر اعتراض کرو۔

لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ: تا کہ تم حقیقی بھلائی اور ہدایت پا کر دونوں جہانوں میں کامیابی حاصل کرو۔ اس آیت سے وہ لوگ عبرت پکڑیں جو کہ نماز، روزہ چھوڑ کر سینہ کوبی یا بھنگ چرس پینے یا آگ جلانے اور اس پر دھونی دے کر بیٹھنے یا آج کل کے حرام گانے بجانے کو قوالی کہہ کر انہیں عبادت اور کارِ ثواب سمجھ بیٹھے ہیں اللہ تعالیٰ سچی سمجھ نصیب فرمائے۔ آمین

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ امت مصطفیٰ (ﷺ) کی ایک یہ بھی خصوصیت ہے کہ اس نے اپنے نبی ﷺ سے بہت کم سوالات کیے۔ دوسری امتوں کی طرح اپنے پیغمبر کو سوالات سے پریشان نہ کیا۔ چناں چہ قرآنِ کریم نے ان کے کل چودہ (۱۴) سوالات نقل فرمائے۔ آٹھ تو سورہ بقرہ میں (۱) رب کہاں ہے۔ (۲) چاند کیوں گھٹتا بڑھتا ہے۔ چھ آگے آتے ہیں۔ ایک سورہ مائدہ میں کہ کیا کیا چیزیں حلال ہیں۔ ایک سورہ انفال میں کہ انفال کا کیا مصرف ہے۔ ایک سورہ بنی اسرائیل میں کہ رُوح کیا ہے۔ ایک سورہ کہف میں کہ ذوالقرنین کے حالات کیا ہیں۔ ایک سورہ طٰہٰ میں پہاڑوں کے متعلق ایک سورہ نازعات میں قیامت کے بارے میں۔ (نعیمی ملخصا)

بعض مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ (اتیان البیوت من الظھور) یعنی گھروں میں پچھلی طرف سے آنے سے مراد اپنی بیوی کے ساتھ دبر یعنی جائے پاخانہ میں جماع کرنا ہے اور اتیانا من الابواب (یعنی اپنے گھروں میں دروازوں کی طرف سے آؤ) سے مراد اپنی بیوی سے محل جماع میں وطی کرنا ہے۔ اس صورت میں اس آیت میں شیعوں کا رد ہے جو کہ اس

کے شدومد سے قائل ہیں۔اس کی تفصیل ان شاءاللہ (فَأْتُوا احرثكم انی شئتم) میں آرہی ہے۔(احمدی)

فوائد:

۱۔ حضور علیہ السلام کی امت بڑی عزت والی ہے کہ رب تعالیٰ ان کے سوالات کی قدر و منزلت فرماتا ہے کہ جوابات بھی دیتا ہے اور ان کے سوالات کا ذکر بھی فرماتا ہے تاکہ قیامت تک ان کا ذکر خیر رہے۔ پہلی کتابیں ایک دم بغیر کسی سوال و جواب کے نازل ہوجاتی تھیں۔

۲۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا بارگاہ الٰہی میں بڑا درجہ ہے کہ سوال تو ان سے ہو اور جواب رب تعالیٰ خود دے مگر اپنا جواب ان سے کہلوائے۔

۳۔ قمری مہینے شمسی مہینوں سے افضل ہیں کہ رب تعالیٰ نے تاریخیں معلوم کرنے کے لیے ہی چاند کو گھٹایا بڑھایا۔ شمسی مہینوں کی جنتری انسانوں نے بنائی قمری کی خود رب تعالیٰ نے۔ شمسی تاریخیں بے دلیل قمری تاریخوں کی دلیل موجود کہ جاہل آدمی بھی چاند دیکھ کر تاریخ کا پتہ لگالیتا ہے۔ شمسی مہینوں میں چند سال کے بعد فرق کرنا پڑتا ہے کہ چار سال بعد فروری 29 دن کا اور کچھ سال بعد ہندی سال بجائے 12 مہینہ کے 13 کا کرنا پڑتا ہے تاکہ موسم ٹھیک بیٹھیں مگر قمری مہینہ ان مصیبتوں سے آزاد۔

۴۔ اسلامی کام قمری مہینا سے ہوں گے لہٰذا روزے، زکوۃ، حج، عدت وغیرہ میں قمری مہینے معتبر ہونگے۔ کیوں کہ چاند کو میقات (وقت کا آلہ) فرمایا گیا۔

۵۔ بے کار سوال کا بہتر جواب دینا چاہیے دیکھو پوچھنے والوں نے چاند کی تبدیلی کی وجہ پوچھی جو ان کے لیے فائدہ مند نہ تھی مگر رب نے اس کی حکمت بتائی جس سے انہیں مثبت فائدہ ہوا۔

۶۔ بے کار کام چھوڑ دینے چاہیے۔

اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کو علمِ غیب نہیں کیوں کہ حضور نے سائل کا

جواب خود نہ دیا بلکہ رب نے دیا پھر بھی چاند کے گھٹنے بڑھنے کی وجہ نہ بتائی۔ اگر آپ کو علمِ غیب ہوتا تو بغیر انتظارِ وحی خود ہی وجہ بتا دیتے۔ (دیوبندی)۔

جواب: تم لوگوں نے بڑا کام کیا کہ رب پر بے علمی کا الزام نہ لگایا اور یہ نہ کہہ دیا کہ سائل نے پوچھا تو کچھ تھا جواب کچھ اور دیا معلوم ہوتا ہے کہ رب کو بھی اس گھٹنے بڑھنے کی وجہ معلوم نہ تھی افسوس ہے کہ آج ہر علم ہیئت جاننے والا جانتا ہے کہ چوں کہ چاند کا نور آفتاب سے ہے اور چاند بھی گول اور سورج بھی اور جب گول چیز کسی گول چیز سے روشنی لے تو آدھی روشنی ہوگی اور آدھی تاریک لہٰذا چاند آدھا روشن رہتا ہے اور آدھا تاریک۔ پھر چوں کہ چاند کبھی آفتاب سے قریب ہوتا ہے کبھی دُور اس لیے کبھی تو اس کا پورا نورانی حصہ زمین کی طرف ہوتا ہے کبھی بعض حصہ اور کبھی پورا تاریک رخ اس طرف ہوتا ہے۔ اس لیے یہ اختلاف ہے۔ ایک آٹھویں جماعت والا بچہ کو یہ علم ہو مگر عالم الاولین والاخرین کو نہ ہو یہ کیسے ممکن ہے؟ (نعیمی)

جناب یہ چاند جس کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے آج امریکہ روس والے اربوں ڈالر خرچ کر کے اس کی طرف محوِ پرواز ہیں اور سطح چاند پر قدم رکھنے کے دعویٰ کو نہایت فخر سے بیان کر کے دنیا والوں کو ورطہ حیرت میں ڈال رہے ہیں، لیکن ہمارے آقا و مولیٰ حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے وہ قوت، طاقت، تصرف عطا فرمایا کہ زمین پر کھڑے ہوئے انگلی کا اشارہ فرمائیں تو یہ چاند دو ٹکڑے ہو کر آپ کے قدموں میں آ گیا اور شب معراج یہی چاند آپکی گردِ راہ بن کے رہ گیا۔ چاند کے بارے میں آپ کے علم شریف میں نقص کا جویاں ہونا سراسر مقامِ نبوت سے ناآشنائی ہے۔

سورج الٹے پاؤں پلٹے چاند اشارے سے ہو چاک
اندھے منکر دیکھ لے قدرت رسول اللہ ﷺ کی

کسی انسان کا چاند پر قدم رکھنے کا دعویٰ محالات سے نہیں اور نہ ہی کسی شرعی دلیل سے متصادم ہے۔ (منہ)

اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ اپنی طرف سے عبادات ایجاد کرنا جرم ہے دیکھو کفارِ عرب

نے گھر کے پیچھے سے آنا عبادت جانا جس کی تردید کردی گئی، لہٰذا ختمِ خواجگان، محفلِ میلاد، گیارھویں وغیرہ کو عبادات یا باعث ثواب جاننا مردود ہے۔ (دیابنہ)

جواب: اس کے چند جواب ہیں۔ ایک یہ کہ ان کا یہ کام عبث تھا جو عبادت نہیں بلکہ گناہ ہے۔ محفلِ میلاد، ختمِ خواجگان وغیرہ عبث نہیں بلکہ اس میں صدہا خوبیاں ہیں۔ قرآن خوانی، نعت خوانی، خیرات وغیرہ، لہٰذا یہ باعث ثواب۔ دوسرے یہ کہ کفارِ عرب اس عبث فعل کو فرض جانتے تھے کہ جو اس پر پابندی نہ کرے اسے فاجر کہتے تھے اور واقعی جائز کام کو فرض جاننا سخت غلطی ہے۔ کوئی مسلمان ان امورِ خیر کو فرض نہیں جانتا۔ ہاں منکر کو وہابی جانتا ہے کہ یہ وہابیوں کی علامت ہے۔ تیسرے یہ کہ رب نے کفار کے اس فعل کو شرک یا کفر نہ فرمایا بلکہ صرف یہ فرمایا کہ اس کو بھلائی جاننا غلطی ہے بھلائی تقوے میں ہے یہ تو بے فائدہ کام ہے۔ تمہاری طرح شرک و کفر نہ کہا۔ چوتھے یہ کہ اگر اپنی طرف سے کارِ خیر ایجاد کرنا گناہ ہو تو پھر (من سن سنة حسنة فی الاسلام) کا کیا مطلب ہوگا۔ علاوہ ازیں تمہارے فرقہ کے مدرسے اور ان میں بایں ہیت کذائی، تعلیمِ قرآن، اعرابِ قرآن سب ہی گناہ ہونگے کیوں کہ یہ بھی اس زمانہ میں نہ تھے بعد کی ایجاد ہے۔ میلادِ پاک کی عداوت میں اپنے گھر کو کیوں آگ لگاتے ہو۔ پانچویں کسی جائز کام کو حرام جاننا سخت جرم ہے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے (كُلُوْا مِن طَيِّبٰتِ ما رَزَقْنٰكم) اہلِ عرب حج کے زمانے میں گھر کے دروازوں سے آنا جو کہ مباح تھا اسے حرام جانتے تھے اسی لیے ان پر یہ عتاب ہوا۔ تم لوگ بھی میلاد شریف وغیرہ حلال و مباح چیزوں کو بلا دلیل حرام جانتے ہو تو انہیں کی طرح مجرم ہو۔

خیال رہے! کہ جیسے مباح (جائز) چیز کو فرض سمجھنا جہالت یا بے دِینی ہے ایسے ہی مباح چیز کو حرام جاننا بھی بے دِینی ہے جس میں تم لوگ گرفتار ہو۔

(نوٹ) بدعت کسے کہتے ہیں اس بارے میں ہم نے اپنے رسالہ ''تحقیق سنت و بدعت'' میں خوب وضاحت کردی ہے۔

قتال

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

وَقَاتِلُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ الَّذِيۡنَ يُقَاتِلُوۡنَكُمۡ

وَلَا تَعۡتَدُوۡا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الۡمُعۡتَدِيۡنَ (سورۃ البقرۃ:۱۹۰)

"اور اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑائی کریں اور زیادتی نہ کرو بے شک اللہ زیادتی کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا"

بعض مفسرین نے فرمایا کہ ابتدائے اسلام میں حق تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو مشرکین کے قتل کرنے سے روک دیا تھا۔ پھر جب حضور علیہ السلام مدینہ کو ہجرت فرما گئے تو اس آیت میں حکم دیا گیا۔ کہ جو تم سے قتال کرے اس سے تم بھی قتال کرو۔ ربیع فرماتے ہیں کہ جہاد کے بارے میں یہ آیت اول نازل ہوئی۔ پھر اس کے بعد یہ حکم ہو گیا کہ (اقتلوا المشرکین کافۃ) تمام مشرکوں کو قتل کرو خواہ ان میں سے کوئی تم سے قتال کرے یا نہ کرے۔ اس تقدیر پر (ولا تعتدوا) کے معنی یہ ہوں گے کہ قتال کی ابتدا مت کرو۔ اس تفسیر پر یہ حکم منسوخ ہوگا۔ (مظہری، احمدی) اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ جہاد کی اجازت میں سب سے پہلی آیت (اذن للذین) (حج) اور (اُذِنَ لِلَّذِيۡنَ يُقٰتَلُوۡنَ بِاَنَّهُمۡ ظُلِمُوۡا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصۡرِهِمۡ لَقَدِيۡرُ) نازل ہوئی...... اگر چہ اس آیت کے نزول پر کسی نے قتال نہیں کیا۔ لیکن اس کا معنی ہے کہ ان لوگوں کے لیے قتال کی اجازت دے دی گئی جو یہ جانتے تھے کہ کفار ان کے قتل وقتال کو جائز سمجھتے ہیں پھر اس کے بعد ان کفار سے قتال فرض کر دیا گیا۔ چناں چہ فرمایا (وَقَاتِلُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ الَّذِيۡنَ يُقَاتِلُوۡنَكُمۡ) پھر تمام کفار سے قتال کا حکم فرما دیا گیا اور فرمایا (فاقتلوا المشرکین) (الآیت) اور احکام القران ابن العربی میں ہے کہ صحیح یہی ہے کہ آیۃ اذن للذین یقاتلون} الایہ

پہلے نازل ہوئی کیوں کہ وہ مکی ہے اور یہ آیت مدنی ہے اور کہا گیا ہے کہ (الذین یقاتلونکم) سے مراد تمام وہ کافر ہیں جن سے قتال متوقع ہے۔ کیوں کہ وہ سب مسلمانوں کے دشمن ہیں اور موقع ملنے پر مسلمانوں سے قتال کے خواہاں ہوتے ہیں، لہٰذا وہ سب مقاتلین کے حکم میں ہے یعنی بالفعل لڑائی کریں یا نہ کریں۔ اور جن سے لڑائی کی توقع نہیں ہے۔ جیسے شیخ فانی، بچے، پاگل، لولے لنگڑے، اندھے، بیمار، عورتیں وغیرہ ان کا قتل جائز نہیں اس لیے کہ وہ قتال کی طاقت ہی نہیں رکھتے اس لیے فرمایا (ولا تعتدوا) یعنی ان سے نہ لڑو جو لڑنے کی طاقت وصلاحیت نہیں رکھتے۔ اس کے علاوہ دوسرے معانی بھی کیے گئے ہیں۔ حد سے نہ بڑھو یعنی قتل کے بعد ان کا مُثلہ نہ کرو۔ اس لیے کہ اواخر اسلام میں مثلہ سے منع فرما دیا گیا تھا۔ یا معاہدین سے جنگ نہ کرو جب تک وہ اپنے عہد پر قائم ہیں یا دعوتِ اسلام سے پہلے جنگ نہ کرو۔ پہلے اسلام کی دعوت دو قبول کر لیں تو فبہا ورنہ جزیہ کا حکم دو اور اگر جزیہ سے بھی انکار کر دیں تو پھر حکم قتال ہے۔ ان معانی کی رُو سے آیت کا حکم باقی ہے اور آیت منسوخ نہیں ہے۔ (کذا فی التفسیرات الاحمدیہ عن البیضاوی مع زیادۃ)

وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ: (مار ڈالو ان کو جہاں کہیں ان کو پاؤ) مقاتل بن حبان کا قول ہے کہ یہ حکم (ولا تقاتلوهم عندالمسجد الحرام) سے منسوخ ہے، یعنی مسجد حرام کے پاس ان سے جنگ نہ کرو۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت منسوخ نہیں بلکہ مخصص ہے۔ اقتران کی وجہ سے اس لیے کہ ناسخ منسوخ سے متراخی ہوتا ہے۔

وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ: (اور نکال دو ان کو جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا ہے) یعنی مکہ سے چناں چہ فتح مکہ کے دن ان لوگوں کے ساتھ وہی کیا گیا جو یہ مسلمانوں سے کرتے تھے۔

وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ: (اور فتنہ قتل سے بڑھ کر ہے) اس جگہ فتنہ سے مراد کفر و شرک ہے اور مسلمانوں کو مسجد حرام سے روکنا اور اشد کے یہ معنی ہیں۔ باعتبار گناہ کے اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت

بُرا ہے اور قتل سے یہ مطلب ہے کہ مسلمان ان کو قتل کریں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ایک خاص وقت میں یہ قتل مباح کر دیا تھا۔ (مظہری، ابن جریر)

وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ : (اور نہ لڑو ان سے مسجد حرام کے پاس جب تک کہ نہ لڑیں وہ تم سے اس جگہ۔ پس اگر وہ تم سے لڑیں تو تم ان کو قتل کرو) یعنی حرم میں قتال کی ابتداء نہ کرو۔ اگر کفار قتال شروع کریں تو تم بھی ان سے وہیں لڑو۔ حرم سے مراد حرم شریف، مسجد الحرام کے گرد و نواح کا تمام علاقہ مراد ہے جسے اصطلاح میں حرم کہتے ہیں۔ بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ یہ حکم ابتدائے اسلام میں تھا کہ بلدِ حرام میں قتال کی ابتدا حلال نہ تھی۔ پھر آیت (وقاتلوھم حتی لاتکون فتنه) (اور لڑو ان سے یہاں تک کہ فساد (عقیدہ) باقی نہ رہے) سے یہ حکم منسوخ ہو گیا۔ یہ قول قتادہ کا ہے اور مقاتل نے فرمایا کہ اس حکم کو سورۃ براۃ کی آیت سیف نے منسوخ کیا ہے۔ صاحبِ مظہری کہتے ہیں کہ میرے نزدیک حق یہ ہے کہ اس آیت کا حکم باقی ہے منسوخ نہیں ہے اب بھی حرم میں قتال کی ابتدا کرنا ویسے ہی حرام ہے اور یہی قول مجاہد اور دیگر بہت سے علماء کا ہے۔ (وبہ قال مجاہد وابوحنیفہ وابن العربی) اور اس قول کی تائید بخاری و مسلم کی یہ حدیث کرتی ہے کہ ابن عباس اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے روز فرمایا کہ اس شہر کو اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین کی پیدائش کے دن با حرمت کر دیا ہے۔ اس لیے قیامت تک اللہ کا حرام کردہ حرام رہے گا۔ مجھ سے پہلے کسی کو اس میں قتل و قتال کی اجازت نہیں ہوئی اور میرے واسطے بھی دن کی ایک ساعت کے لیے صرف حلال ہوا ہے۔ اس کے بعد بدستور قیامت تک حرام ہے۔ یہاں کی گھاس کانٹا وغیرہ نہ کاٹا جائے نہ یہاں کا شکار بھگایا جائے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کہ مکہ میں ہتھیار اٹھانا کسی کو حلال نہیں۔ (رواہ مسلم)

كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ : کافروں کی یہی جزا ہے۔ یعنی جیسا انہوں نے کیا ہے۔ ایسا ہی ان کے ساتھ کیا جائے۔

فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ : (پھر اگر وہ باز آجائیں تو بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے) یعنی اگر وہ قتال و شرک سے باز رہیں تو اللہ تعالیٰ ان کی گذشتہ خطائیں بخشنے والا اور مہربان ہے۔ جیسا کہ سورۃ انفال میں فرمایا: (قُلْ لِلَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا ان ینتھوا یغفر لھم ما قد سلف) (کافروں سے کہہ دیجئے کہ اگر وہ باز آجائیں تو ان کے گذشتہ گناہ بخش دیئے جائیں گے) اور ان شاء اللہ اس کی مزید تحقیق وہاں آئیگی۔

وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ؕ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ : اور ان سے یہاں تک لڑو کہ فساد (عقیدہ) باقی نہ رہے اور دین اللہ ہی کے لیے ہو جائے۔ سو اگر وہ باز آجائیں تو (کسی پر بھی) سختی نہیں بجز ظلم کرنے والوں کے)

وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ: قاتلوھم کی ھم ضمیر مشرکین کی طرف راجع ہے اور فتنہ سے مراد کفر و شرک اور فساد ہے۔ (وَيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ) یعنی اللہ وحدہ لا شریک کی ہی اطاعت اور عبادت رہ جائے۔ غیر کو معبود اور مطاع مطلق نہ بنایا جائے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ (مجھ کو قتال کا حکم دیا گیا ہے جب تک لوگ شہادت دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں محمد ﷺ اللہ کے (سچے) رسول ہیں اور نماز قائم کریں اور زکوۃ ادا کریں۔ جب ان امور کو کریں گے تو اپنی جان و مال مجھ سے بچالیں گے۔ لیکن ان کے مال و جان میں ان کا حساب اللہ پر ہے) (بخاری و مسلم) علامہ بغوی نے فرمایا ہے کہ اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بت پرست سے صرف اسلام ہی قبول کیا جائے گا۔ اگر وہ اسلام سے انکار کرے گا تو قتل کر دیا جائے گا۔

میں کہتا ہوں کہ اس آیت سے یہ مستنبط نہیں ہوتا کیوں کہ کفر میں بت پرست اور مجوسی اور کتابی سب برابر ہیں (الکفر ملة واحدة) دین مقبول تو حق تعالیٰ کے نزدیک اسلام ہی ہے اور فتنہ جس طرح بت پرست سے ہوتا ہے ایسا ہی کتابی اور مجوسی سے بھی ہوتا ہے اور اطاعت اور قبول

جزیہ سے دونوں کا فتنہ جاتا رہتا ہے اور جزیہ کا ثبوت اللہ تعالیٰ کے قول حتیٰ سے ہوتا ہے۔ (جیسا کہ سورۃ برات میں آئے گا) اگر یہ آیت نہ ہوتی تو کسی سے بھی جزیہ قبول نہ کیا جاتا۔ جب اس آیت سے اہل کتاب سے جزیہ لینا معلوم ہوا تو مجوسی اور بت پرست سے بھی لینا امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک قیاساً ثابت ہوا کیوں کہ دینِ باطل میں سب شریک ہیں ہاں عرب کے بت پرستوں سے بالاتفاق جزیہ قبول نہیں کیا جاتا۔ کیوں کہ ان کا کفر غلیظ ہے۔ قرآن ان میں نازل ہوا اور اللہ کے نبی ﷺ ان میں ظاہر ہوئے اور ان سے صرف مقاتلہ ہے یا ان کو اسلام قبول کرنے کا حکم ہے قال اللہ تعالیٰ (تقاتلونھم او یسلمون) (ھدایہ) اور سوائے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے دیگر ائمہ کے نزدیک بت پرستوں سے جزیہ ثابت نہیں (مظہری وغیرہ)

فان انتھوا فلا عُدْوانَ اِلاَّ عَلَی الظّٰلِمین : یعنی اگر کفار جزیہ دے کر حرب وشرک سے باز رہیں۔ تو پھر ان کو قتل کرنے اور قید کرنے اور لوٹنے کی اجازت نہیں۔ سوائے ان ظالموں کے جو شرک اور حرب پر باقی رہیں۔ حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے جناب سید عالم ﷺ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ اگر میری کسی کافر سے مڈبھیڑ ہو جائے اور دونوں آپس میں لڑیں۔ پھر وہ میرے ایک ہاتھ کو تلوار مار کر کاٹ ڈالے پھر کسی درخت کی آڑ میں مجھ سے بچ جائے اور جب میں اس کو قتل کرنے کا قصد کروں۔ تو (لا الٰہ الا اللہ) بول اٹھے۔ تو آیا میں اس کو کلمہ پڑھنے کے بعد قتل کروں؟ فرمایا اس کو مت قتل کر کیوں کہ بالفرض اگر تو نے قتل کر دیا تو قتل کرنے سے پہلے جو تیرا مرتبہ تھا وہ اس کا اب ہے اور کلمہ پڑھنے سے پہلے جس مرتبہ پر وہ تھا وہ تیرا اب (قتل کرنے کے بعد) ہوگا (بخاری ومسلم)

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اَلشَّهۡرُ الۡحَرَامُ بِالشَّهۡرِ الۡحَرَامِ وَالۡحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ؕ فَمَنِ اعۡتَدٰى عَلَيۡكُمۡ فَاعۡتَدُوۡا عَلَيۡهِ بِمِثۡلِ مَا اعۡتَدٰى عَلَيۡكُمۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الۡمُتَّقِيۡنَ (سورۃ البقرۃ:۱۹۴)

''حرمت کا مہینہ حرمت کے مہینے کے بدلہ میں ہے اور حرمت کی چیزوں میں برابری سرابری ہے۔ تو جو کوئی تم پر زیادتی کرے تم بھی اس پر زیادتی کرو۔ جیسی اس نے کی اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جانتے رہو کہ اللہ پرہیز گاروں کے ساتھ ہے''

اس آیت کی تفسیر سے پہلے اس کا شان نزول بیان کیا جاتا ہے۔ کیوں کہ آیت کا صحیح مفہوم شانِ نزول کے بیان ہی سے سامنے آئے گا۔ ابن جریر نے قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضور سرور کائنات ﷺ اور آپ کے اصحاب رضی اللہ عنہم عمرہ کی نیت سے مدینہ منورہ سے ذیعقد ۶ ہجری میں نکلے اور بعض ھدایا (منا میں جانور ذبح کرنے کے جانور) ان کے ساتھ تھے۔ جس وقت حدیبہ میں پہنچے تو حضور علیہ السلام کو مشرکوں نے روک لیا۔ آخر کار اہل مکہ سے اس امر پر مصالحت ہوئی کہ اس سال تو آپ تشریف لے جائیں اور سال آئندہ تشریف لائیں جناب رسالت مآب ﷺ مع صحابہ واپس تشریف لے گئے اور اگلے سال ذیعقد ۷ ہجری میں پھر تشریف لائے اور عمرہ ادا کیا اور مکہ معظمہ میں تین شب قیام فرمایا مشرکین آپ کے روکنے پر فخر کرتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کو دوسرے سال اسی مہینے میں مکہ میں داخل ہونے کا شرف عطا فرمایا جس میں مشرکین نے آپ کو روکا تھا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

اَلشَّهۡرُ الۡحَرَامُ بِالشَّهۡرِ الۡحَرَامِ وَالۡحُرُمٰتُ قِصَاصٌ: پہلے شہر حرام سے مراد

ذیعقد ۷ ہجری ہے۔ جس میں حضور مکہ میں گئے اور عمرہ ادا کیا اور دوسرے اشہر الحرام سے ۶ ذیعقد مراد ہے جس میں مشرکین نے حضور علیہ السلام کو عمرہ سے روک لیا تھا۔ قصاص کے معنی مساوات (برابری) کے ہیں مطلب یہ ہے کہ حرمت کی چیزوں میں برابری جاری ہوتی ہے اور بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ یہ آیت گزشتہ آیتہ ﴿ قاتلوا فی سبیل اللہ ﴾ کے لیے بمنزلہ علت اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جب سال آئندہ جناب رسول اللہ ﷺ عمرہ کے لیے تشریف لے گئے تو مسلمانوں کو یہ خوف ہوا کہ ایسا نہ ہو کے مشرکین اپنا عہد پورا نہ کریں اور گزشتہ سال کی طرح پھر بیت اللہ سے روکیں اور حرم اور احرام اور ماہ حرام میں جنگ واقع ہو جائے۔ اس پر حق تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ مطلب یہ ہوا کہ اے مسلمانوں! اگر مشرکین ماہ حرام کی حرمت کا لحاظ نہ کریں اور تم سے جنگ کریں، تو تم بھی قتال کرو کیوں کہ یہ ان کے کرتوت کا بدلہ ہے۔ یہ تفسیر مضمون لاحق (فمن اعتدی) کے الخ بہت مناسب ہے۔

فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ : (جو تم پر زیادتی کرے تم اس پر اُسی قدر زیادتی کرو) یعنی اگر کوئی با حرمت مقام یا با حرمت ماہ اور احرام کی حالت میں تم پر زیادتی کرے تو تم اس پر اسی قدر زیادتی کرو۔ جوابی زیادتی کو محض مشاکلت کی بنا پر زیادتی کہا گیا ہے ورنہ درحقیقت جوابی کاروائی زِیادتی نہیں۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِیْنَ : اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ ڈرنے والوں کے ساتھ ہے یعنی ان کی مدد کرتا ہے اور ان کے حال کی اصلاح فرماتا ہے، یعنی اس معیت خداوندی سے مراد معیت جسمانی یا زمانی نہیں کیوں کہ اللہ تعالیٰ جسم جسمانیات، زمان زمانیات سے پاک ہے بلکہ مدد اور نصرت کا ساتھ ہونا مراد ہے۔ (واللہ اعلم باسرار کتابہ)

اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنا، مال کو ضائع کرنا نہیں

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

وَاَنۡفِقُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَلَا تُلۡقُوۡا بِاَيۡدِيۡكُمۡ اِلَى التَّهۡلُكَةِ

وَاَحۡسِنُوۡا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُحۡسِنِيۡنَ (سورۃ البقرۃ:۱۹۵)

''اور خرچ کرو اللہ کی راہ میں اور اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ پڑو اور بھلائی کرو بے شک بھلائی کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے''

شانِ نزول:

اس آیت کے شانِ نزول میں دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ حضرت ابو ایوب انصاریؓ فرماتے ہیں کہ جب فتوحاتِ اسلامیہ کافی ہو گئیں اور اسلام خوب پھیل گیا تو ہم نے مشورہ کیا کہ اب تک تو ہم لوگ اپنے گھر بار اور مال وغیرہ سے غافل رہ کر اشاعتِ اسلام میں مشغول رہے اب جبکہ رب نے دین کو خوب پھیلا دیا۔ تو آؤ اب گھروں میں بیٹھ کر دنیاوی کام کاج کریں اور باقی زندگی آرام سے بسر کریں۔ اس پر یہ آیت کریمہ اتری جس میں انہیں جہاد چھوڑنے اور گھر بیٹھ رہنے کی سخت ممانعت کی گئی کہ جہاد چھوڑ کر اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو فنا نہ کرو۔ چنانچہ ابو ایوب انصاری آخر عمر تک مصروفِ جہاد رہے اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانے میں قسطنطنیہ میں شہید ہوئے اور وہاں ہی شہر پناہ میں مدفون ہوئے مسلمان اب تک ان کی قبر شریف سے شفا اور برکت پاتے ہیں۔ (روح البیان۔ مظہری)

دوسرا قول یہ ہے کہ جب مسلمان عمرہ قضاء کے لیے مکہ معظمہ جانے لگے تو ایک جماعت فقراء صحابہ کی حاضرِ خدمت ہو کر عرض کرنے لگی کہ ہمارے پاس نہ پیسہ ہے نہ توشہ اور اغیار ہمیں کچھ دیتے نہیں تب یہ آیت کریمہ اتری جس میں مالدار مسلمانوں کو ایسے غرباء کی مدد کرنے

رغبت دی گئی۔ (احمدی)

وَاَنْفِقُوا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ : اَنْفِقُوا انفاق اور نفق سے بنا ہے۔ اس کے لغوی معنی ہیں۔ بکھیرنا الگ الگ ہونا۔ اس لیے جس کا زبان اور دل ایک نہ ہوا اسے منافق کہتے ہیں کیوں کہ اس کا دل زبان سے علیحدہ ہے۔ رائج سکہ کو نافقہ کہتے ہیں کیوں کہ وہ ایک جگہ مشکل سے جمع ہوتا ہے خرچ کو بھی نفقہ اس لیے کہتے ہیں کہ اس میں مال بکھیر دیا جاتا ہے۔ کسی کی جیب میں پچاس روپے ہیں بازار جا کر کچھ کپڑے والے کو، کچھ غلے والے کو، کچھ مٹھائی میں صرف کر دے تو پیسہ جیب میں جمع تھا متفرق ہو گیا۔ جائز جگہ خرچ کرنے کو نفقہ یا انفاق کہا جاتا ہے۔ فضول خرچی کو اسراف اور نا جائز جگہ خرچ کرنے کو تبذیر کہتے ہیں۔ یہاں انفقوا کا مفعول ظاہر نہ کر کے اشارۃ یہ بتا دیا کہ جان، مال، علم، عزت آبرو جس چیز کی اسلام کو ضرورت پڑ جائے خرچ کر ڈالو (فی سبیل اللّٰہ) سے مراد دین اور دینی چیزیں ہیں۔ جہاد، زکواۃ، حج، عمرہ، غریبوں کی مدد بال بچوں کی پرورش غرضیکہ جس چیز میں رضائے الٰہی ہو وہ سب اس میں شامل ہیں۔ (روح البیان)

یعنی اپنی ہر چیز عبادت اور دینی کام میں خرچ کرو۔ اس جملہ کی زندہ جاوید تفسیر حضرت سیدنا امام حسین اپنے خون سے کربلا کے ذرات پر اس طرح لکھ گئے جو کہ آج تک کسی کے مٹائے نہ مٹی نہ مٹے گی۔ اللہ تعالیٰ نے مالدار مسلمانوں کو نمازیوں، حاجیوں، علماء، طلباء پر خرچ کرنے کا بہت تاکیدی حکم دیا تا کہ قوم میں ان چیزوں کا شوق پیدا ہو۔ بازار میں وہی مال زیادہ آتا ہے جس کی قوم میں کھپت ہو۔ اسی قسم کے افراد قوم میں زیادہ پیدا ہوتے ہیں جنکی قوم میں قدر ہو۔ اگر نمازیوں حاجیوں، عالموں کی قدر ہوگی تو یہ طبقے زیادہ پیدا ہونگے۔

وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ : تُلْقُوْا سے بنا جس کے معنی ڈالنا اور ملانا بِاَیْدِیْکُمْ کی ب یا زائدہ ہے اور ایدی سے مراد جان اور ذات چوں کہ اکثر کام ہاتھ سے ہوتے ہیں اسی لیے ید (ہاتھ) سے ذات اور جان مراد لیتے ہیں۔ یا ب استعانت کی ہے اور تُلْقُوْا کا مفعول اَنْفُسَکُمْ پوشیدہ ہے اَیْدِیْ بمعنی ہاتھ یعنی اپنی جان کو ہلاکت میں نہ ڈالو اپنی جان کو اپنے

ہاتھوں ہلاکت میں نہ ڈالو (روح المعانی)

تَهْلُكَة اسم مصدر ہے یعنی ہلاکت، ہلک اور ہلاکت موت کو بھی کہتے ہیں۔ اور کسی چیز کے ہاتھ سے نکل جانے کو بھی جیسے (هَلَكَ عَنِّي سُلْطَانِيَه) اور بگاڑ اور فساد کو بھی ہلاک کہا جاتا ہے جیسے (يهلك الحرث والنسل) اور تہلکہ ہلاکت کے اسباب کو بھی کہتے ہیں یعنی اے مسلمانو! تم بخیل بن کر یا جہاد چھوڑ کر دنیا میں مشغول ہو کر یا لوگوں کی امداد ترک کر کے یا فضول خرچی سے اپنا مال برباد کر کے یا بے موقعہ جہاں شکست یقینی ہو جنگ کر کے یا بے سروسامان کسی طاقتور سے لڑ کر اپنی جانوں کو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ ڈالو۔

اَحْسِنُوا: مسلمانوں سے یا اپنے اہل قرابت یا فقراء سے یا کفار رعایا سے یا بحالت جنگ لوگوں سے بھلائی مہربانی کرو کیوں کہ (اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ) اللہ بھلائی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

فوائد:

(۱) بخل اور اسراف دونوں ہی ہلاکت کا سبب ہیں۔ ان دونوں سے بچ کر درمیانی چال اختیار کرنا چاہیے۔ (۲) سانپ سے اپنے آپ کو کٹوانا۔ زہر پینا غرضیکہ کسی طرح بھی خودکشی کرنا حرام ہے۔ (۳) خطرہ کی جگہ بلا احتیاط بلاضرورت جانا جیسے بے ہتھیار میدان جنگ میں جانا منع ہے کہ یہ بھی اپنے آپ کو ہلاک کرنا ہے۔ (۴) بھوک ہڑتال کرنا۔ مرن برت رکھنا حرام ہے کہ اس میں اپنی ہلاکت کا سامان خود مہیا کرنا ہے مسلمانوں نے یہ حرکتیں ہندوؤں سے سیکھی ہیں۔ اسلام یہ چیزیں نہیں سکھاتا۔

مسائل

مسئلہ: جہاں طاعون ہو وہاں نہ جاؤ۔ کیوں کہ اس میں بھی اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے مگر جہاں تم ہو اور طاعون آ جائے وہاں سے نہ بھاگو۔ (تفسیر احمدی خزائن عرفان)

مسئلہ: خودکشی کرنے والے پر نماز جنازہ پڑھی جائے۔ مع اختلاف ہاں اپنے ماں باپ کے قاتل پر نماز جنازہ نہ پڑھو ایسے ہی دفن کردو یونہی ڈاکو جبکہ ڈاکہ زنی کہ موقع پر مارا گیا۔ بار بار گلا گھونٹ کر لوگوں کو مارنے والا، امام برحق کے خلاف بغاوت کرنے والا۔ اپنی ظالم برادری کی (خدا اور رسول کے احکامات کو پس پشت ڈال کر) محض عصبیت کی وجہ سے ناجائز مدد کرنے والا لحدیث (لیس منا من دعا الی عصبیته او قاتل عصبية) ان تمام کی نماز جنازہ بھی نہیں پڑھی جائے گی۔ (در مختار)

مسئلہ: :امت موسوی میں توبہ کے لیے خودکشی جائز تھی (فَاقْتُلُوا اَنْفُسَكُمْ) مگر ہمارے ہاں حرام لہٰذا زانی یا قاتل خودکشی نہیں کرسکتا بلکہ اپنے آپ کو قاضی کے سپرد کردے وہ اس پر حد جاری کرے۔ (تفسیر احمدی)

مسئلہ: سلطان اسلام کو چاہیے کہ یقینی شکست کے موقع پر جنگ نہ کرے صلح وغیرہ سے ٹال دے۔ (تفسیر کبیر)

مسئلہ: سارا مال خیرات کر کے خود فقیر بن جانا ٹھیک نہیں کیوں کہ اس آیت کے یہ معنی بھی کیے گئے ہیں کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرو مگر سب خیرات کر کے اپنے آپ کو فقیری سے ہلاک نہ کرلو۔

مسئلہ: کوئی نیکی معمولی سمجھ کر چھوڑ نہ دو کہ کبھی ایک گھونٹ پانی جان بچالیتا ہے اور کبھی کوئی گناہ معمولی سمجھ کر نہ کرلو کہ کبھی چھوٹی چنگاری گھر جلادیتی ہے بعض گناہ گار صرف اسی لیے بخشش دیے جائیں گے کہ انہوں ایک دفعہ راستہ سے کانٹا ہٹادیا تھا۔ (تفسیر از حکیم الامت مفتی احمد یار خان رحمتہ اللہ علیہ)

حج کا بیان

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَاَتِمُّوا الۡحَجَّ وَالۡعُمۡرَةَ لِلّٰهِ فَاِنۡ اُحۡصِرۡتُمۡ فَمَا اسۡتَيۡسَرَ مِنَ الۡهَدۡىِ
وَلَا تَحۡلِقُوۡا رُءُوۡسَكُمۡ حَتّٰى يَبۡلُغَ الۡهَدۡىُ مَحِلَّهٗ فَمَنۡ كَانَ مِنۡكُمۡ مَّرِيۡضًا
اَوۡ بِهٖۤ اَذًى مِّنۡ رَّاۡسِهٖ فَفِدۡيَةٌ مِّنۡ صِيَامٍ اَوۡ صَدَقَةٍ اَوۡ نُسُكٍ فَاِذَآ اَمِنۡتُمۡ فَمَنۡ
تَمَتَّعَ بِالۡعُمۡرَةِ اِلَى الۡحَجِّ فَمَا اسۡتَيۡسَرَ مِنَ الۡهَدۡىِ فَمَنۡ لَّمۡ يَجِدۡ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ
اَيَّامٍ فِى الۡحَجِّ وَسَبۡعَةٍ اِذَا رَجَعۡتُمۡ تِلۡكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ذٰلِكَ لِمَنۡ لَّمۡ يَكُنۡ
اَهۡلُهٗ حَاضِرِى الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيۡدُ الۡعِقَابِ

(سورۃ البقرۃ:۱۹۶)

''اور حج وعمرہ اللہ کے لیے پورا کرو۔ پھر اگر تم روکے جاؤ تو قربانی بھیجو جو میسر آئے اور اپنے سر نہ منڈاؤ جب تک کہ قربانی اپنے ٹھکانے نہ پہنچ جائے۔ پھر تم میں جو بیمار ہو یا اس کے سر میں کچھ تکلیف تو بدلہ دے روزے یا خیرات یا قربانی سے''

شان نزول:

لیلیٰ ابن امیہ سے روایت کہ حضور ﷺ مقام جعرانہ میں تھے کہ ایک شخص آپ کی خدمت میں جبہ پہنے اور خوشبو لگائے حاضر ہوا اور پوچھنے لگا کہ یارسول اللہ ﷺ میں عمرہ کیوں کر ادا کروں یعنی یہ محرم تھا۔ مگر بے خبری سے سلا ہوا کپڑا اور خوشبو استعمال کررہا تھا۔ اس نے یہ سوال کیا ہی تھا کہ یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا سائل کہاں ہے اسے بلا کر حکم دیا خوشبو دھو ڈال، اپنا جبہ اتار دے (بغیر سلے ہوئے کپڑے پہن اور جو حج میں کرتا ہے وہ عمرہ میں کر) (درمنثور)

تفسیر:

وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ: اَتِمُّوا اتمام سے بنا جس کے معنی پورا کرنا، کامل کرنا، انتہا کو پہنچانا۔ یہاں ہر معنی بن سکتے ہیں۔ حَجٌّ ح کے زبر سے یعنی قصد اور ارادہ حِجٌّ ح کے زیر سے بمعنی سال اور برس چوں کہ حج سال میں ایک بار ہوتا ہے اور اس میں بیت اللہ کا ارادہ بھی کیا جاتا ہے۔ لہٰذا اسے حج کہتے ہیں۔ عمرہ عمرٌ سے بنا ہے۔ بمعنی زندگی چوں کہ یہ عبادت عمر بھر میں ہر وقت کی جاسکتی ہے اس لیے اسے عمرہ کہا جاتا ہے۔ اور ممکن ہے کہ عمرہ بمعنی آبادی ہو چوں کہ بیت اللہ اس عبادت کی بدولت ہر وقت آباد رہتا ہے۔ لہٰذا اسے عمرہ کہا جاتا ہے۔ یہ حکم یا استحبابی ہے کیوں کہ پہلے حج فرض نہ تھا صرف مستحب تھا (وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ) سے فرض ہوا۔ اور عمرہ بھی سنت ہے نہ کہ فرض۔ یا حج و عمرہ ایک ساتھ ختم کرنا بھی یعنی قِران مستحب ہے۔ اور ممکن ہے کہ امر وجوبی ہو کیوں کہ عمرہ بھی شروع کردینے سے واجب ہو جاتا ہے۔ اسلیے پورا کرنے کا حکم دیا گیا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اَتِمُّوْ حج کے تعلق سے وجوب کے لیے اور عمرہ کے لحاظ سے استحباب کے لیے ہو۔ جیسے (صلوا علیہ) میں ایک بار درود پڑھنا فرض اور اس سے زیادہ مستحب یا سنّت۔ خیال رہے! یہاں رب تعالیٰ نے حج کرنے کا حکم نہیں دیا بلکہ حج و عمرہ تمام و کامل کرنے کا کہ حج صحیح طور پر کیا جائے۔ عمر میں ایک دو بار تو یہ نعمت نصیب ہوتی ہے۔ بہت مشقت اور خرچ سے نصیب ہوتی ہے پھر مکمل کیوں نہ ادا کی جائے نیز جوانی میں حج کیا جائے۔ کیوں کہ بڑھاپے میں حج مکمل نہیں ہوسکتا اتمّوا میں اس جانب بھی اشارہ ہے۔ افسوس کہ اکثر حجاج اتمام کا اہتمام نہیں کرتے۔

حج و عمرہ کے اتمام کی چند صورتیں ہیں۔ صحیح طور پر ادا کرنا۔ حلال کمائی سے ادا کرنا۔ حج و عمرہ ملا کر یعنی حج قِران کرنا۔ ایام حج میں گھر سے احرام باندھ کر جانا وغیرہ۔ اور حضور سید عالم ﷺ کے اس دنیا سے پردہ فرمانے کے بعد تا قیامت مدینہ منورہ کی حاضری بھی حج کے اتمام ہی سے ہے۔ کہ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے (جس نے حج کیا مگر میری زیارت نہ کی اس نے مجھ پر جفا کی)

حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی حیات میں جو حج ہوا اس میں حضور انور ﷺ خود حج میں موجود تھے۔ اس لیے ان حجاج کا مدینہ پاک حاضر ہونا ضروری نہ تھا۔ اب وہ بات نہیں غرضیکہ یہ سب حج کے متمات میں سے ہیں۔ یعنی اے مسلمانو! حج وعمرہ شروع کر کے ناقص نہ چھوڑو بلکہ پورا کرو مگر خیال رہے کہ دنیوی غرض سے نہ ہو بلکہ محض لِلّٰہِ رضائے الٰہی کے لیے ہو۔ کفار کی طرح فقط میلہ دیکھنے، بازار سے چیزیں خریدنے اپنی قومی بڑھائی بیان کرنے کے لیے نہ ہو بلکہ بہتر ہے کہ اس میں تجارت یا اور کوئی دنیوی غرض بھی شامل نہ ہو۔ پیسہ بھی حلال خرچ ہو یہ سب باتیں اَتِمُّوْا اور لِلّٰہِ سے حاصل ہوئیں۔ نیز حج سے لوگ حاجی کی عزت، عظمت، خدمت بھی کرتے ہیں۔ حج میں مختلف ملکوں کی سیر بھی ہوتی ہے۔ حج میں تجارت کا موقع بھی ہاتھ آتا ہے اندیشہ تھا کہ حاجی ان اغراض سے حج کرے۔ اس لیے فرمایا گیا۔ حج وعمرہ تو پورا کرو مگر عزت، خدمت، تجارت سیرو تفریح کے لیے نہیں بلکہ محض اللہ کی رضا کے لیے کرو۔ ہاں حج خالص اللہ کے لیے ہو اور اس ضمن میں جائز تجارت بھی کرے تو کوئی گناہ نہیں۔

فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ: اس کا مصدر احصار اور مادہ حصر ہے۔ بمعنی روکنا اسی لیے چٹائی کو حصیر کہتے ہیں کہ وہ ایک جگہ پڑی رہتی ہے۔ بعض نے کہا حصر تو بیماری کے روکنے کو اور احصار بیماری اور دشمن دونوں کے روکنے کو کہا جاتا ہے۔ یہاں بھی دونوں رکاوٹیں مراد ہیں۔ یعنی اے مسلمانو! اگر تم احرام باندھنے کے بعد کسی دشمن یا بیماری کی وجہ سے روک لیے جاؤ کہ حج وعمرہ نہ کر سکو تو۔

فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ: اِسْتَيْسَرَ يُسْرٌ سے بنا بمعنی آسانی اور یہاں تَيَسَّرَ کے معنی میں ہے۔ هَدْيٌ هَدْيَةٌ کی جمع ہے بمعنی تحفۃ لَيَهْدِيَتكم وَتَفْرَحُون } شریعت میں ھدی وہ اونٹ یا گائے یا بھیڑ بکری ہے جو خانہ کعبہ قربانی کے لیے لے جائی جائے۔ گویا حاجی رب کی بارگاہ میں یہ تحفہ لے کر حاضر ہوتا ہے یعنی تم اگر احرام کے بعد حج سے روک لیے جاؤ تو تم پر وہ ھدی واجب ہے جو تمہیں میسر ہو۔

وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ: تَحْلِقُوْا حَلْقٌ سے بنا بمعنی منڈوانا یہاں سر منڈوانے سے حلال ہونا مراد ہے۔ یعنی تم اس وقت تک سر منڈا کر حلال نہ ہو جب تک۔

حَتّٰی یَبْلُغَ الْھَدْیُ مَحِلَّہٗ :ھدی اپنی جگہ پہنچ جائے۔ مَحِلٌّ حُلُوْلٌ سے بنا بمعنی نزول یہ ظرف زماں بھی ہوتا ہے اور مکاں بھی۔ قرض کی میعاد ختم ہونے کو مَحِلُّ الدَّیْن کہتے ہیں۔ ھدی کی قربانی کی جگہ یا وقت کو محل ھدی کہا جاتا ہے۔ مذہب حنفی میں اس قربانی کی جگہ حرم ہے۔ اس کو دم احصار کہتے ہیں۔ کیوں کہ دوسری جگہ ارشاد ہوا (ثُمَّ مَحِلّھا الی الْبَیْت العتیق) وہ ایک اس کی تفسیر ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جو معذور بعد احرام مکہ معظمہ نہ پہنچ سکے تو وہ کسی کے ہاتھ ایک اونٹ یا گائے یا بکری وہاں بھیج دے اور اس سے پوچھ لے کہ تم یہ جانور کس تاریخ کو ذبح کرو گے اس وقت تک احرام ہی میں رہے۔ جب وہ دن آئے تب یہ اپنا سر منڈوا کر احرام کھولے اور سال آئندہ اس کی قضاء کرے یہاں خود ہی ذبح کرنا جائز نہیں۔ ہاں اگر حدودِ حرم میں پہنچ کر معذوری پیش آئی تو وہاں خود ہی ذبح کر کے احرام کھول دے جیسا کہ حضور علیہ السلام نے صلح حدیبیہ میں کیا۔

فَمَنْ کَانَ مِنْکُمْ مَرِیْضًا : مریض سے وہ بیمار مراد ہے جسے سر منڈانا ہی پڑ جائے یعنی بحالتِ احرام سر منڈانا حرام مگر جو بیمار ہو۔

اَوْ بِہٖ اَذًی مِنْ رَّاسِہٖ : سے مراد عام سر کی تکلیف ہے۔ زخم ہو یا دردِ سر یا شقیقہ یا جوں وغیرہ کوئی بھی تکلیف جو بغیر سر منڈائے نہ دور ہو۔ یعنی جو شخص بیمار ہو یا اس کے سر میں کوئی تکلیف ہو وہ حرم تک ھدی پہنچنے کا انتظار نہ کرے بلکہ پہلے ہی سر منڈا دے۔ پھر اس کے بعد۔

فَفِدْیَۃٌ : یہاں علیہ یا وَجَبَ پوشیدہ ہے۔ فدیہ فِدَاء ٌ سے بنا جس کے معنی نثار ہونا۔ کسی پر قربان ہونا۔ یہاں بدلہ مراد ہے۔ کیوں کہ وہ بھی جرم کو مٹا دیتا ہے۔ یعنی اس پر اس کوتاہی کا بدلہ واجب ہے۔

مِنْ صِیَامٍ اَوْ صَدَقَۃٍ اَوْ نُسُکٍ : تین روزے رکھے یا تین صاع (بارہ کلو) گیہوں چھ مسکینوں پر صدقہ کر دے یا اونٹ گائے بکری میں سے جو چاہے ذبح کرے اور اختیار کے لیے ہے۔ مجبوراً سر منڈانے والے کو اختیار ہے کہ ان میں سے جو چاہے کرے۔

حج کے مسائل:

حج ۹ ھجری میں فرض ہوا۔ حج دو ہیں۔ حج اکبر اور حج اصغر یعنی عمرہ۔ حج عمر میں ایک بار مال دار پر فرض ہے اور عمرہ سنت۔ حج کے لیے مہینا اور تاریخیں مقرر ہیں مگر عمرہ میں نہیں جب چاہو کرلو۔ عمرہ میں احرام شرط اور طواف کرے اور صفا و مروہ کے درمیان دوڑنا رکن۔ یعنی عمرہ صرف یہ ہے کہ حرم سے باہر احرام باندھ کر طواف کرے اور صفا و مروہ کی سعی کر کے احرام کھول دے۔ حج میں تین فرض اور پانچ واجب ہیں۔ (۱) احرام (۲) عرفات میں ٹھہرنا اور (۳) طواف زیارت تو فرض ہیں۔ اور مزدلفہ میں ٹھہرنا۔ صفا و مروہ کی سعی اور جمروں پر کنکر مارنا، طواف وداع کرنا اور سر منڈانا یا کٹوانا واجب ہیں۔ (تفسیر احمدی و خزائن عرفان)

اقسام حج آئندہ بیان ہوں گی ان شاء اللہ۔ باقی حج کے تفصیلی مسائل کے لیے بہار شریعت حصہ ششم مطالعہ فرمائیں۔

فوائد:

۱۔ تمتع یا افراد سے قران افضل ہے۔ جیسا کہ (اتموا الحج والعمرہ) سے معلوم ہوا۔

۲۔ چاہیے کہ حج میں دنیوی کام کی نیت نہ کرے جیسا کہ لِلّٰہِ سے معلوم ہوا۔

۳۔ نفل شروع کر دینے سے واجب ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ اَتِمُّوا سے معلوم ہوا جب نفلی حج و عمرہ شروع کر دینے سے واجب ہو جاتے ہیں تو نفل نماز روزہ کا بھی یہی حال ہے ابتداء یہ نفل ہوتے ہیں مگر شروع کر دینے سے واجب ہو جاتے ہیں۔ کہ ان کا توڑ دینا منع اور اگر توڑ دیئے گئے تو قضا واجب رب تعالیٰ فرماتا ہے (لاتبطلوا اعمالکم) آلایۃ لھٰذا یہ آیت احناف کی قوی دلیل ہے۔ شوافع کے خلاف ان کے ہاں نفلی عبادت توڑ دینے سے قضاء واجب نہیں ہوتی۔ (احکام القرآن)

۴۔ احصار کی قربانی حرم میں ہی ذبح ہو سکتی ہے۔

۵۔ حج اور عمرہ دونوں کے احصار کا یکساں حکم ہے۔

۶۔ حج میں مرد کے لیے بال کٹوانے سے سر منڈانا افضل ہے کیوں کہ یہاں سر منڈانے کا ذکر ہے۔ نیز حدیث شریف میں سر منڈانے والوں کے لیے تین بار اور کتروانے والوں کے لیے ایک بار دعا فرمائی نیز حضور علیہ ﷺ نے بھی احرام کھولتے وقت سر منڈایا تھا۔

۷۔ ھدی کا جانور صرف حرم شریف میں ہی ذبح ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ حتی یبلغ الھدی الآیۃ سے معلوم ہوا۔

۸۔ ھدی کے لیے حرم شریف کی زمین شرط ہے کسی اور جگہ ذبح نہیں ہو سکتی مگر قربانی کے لیے حرم شرط نہیں وہ ہر جگہ ہو سکتی ہے۔ جن لوگوں نے قربانی کا انکار کرتے ہوئے حرم کی شرط لگائی اور ان آیات سے استدلال کیا انہوں نے سخت غلطی کی قربانی اور ہے اور ہدی کچھ اور (تفسیر نعیمی)

مسائل

مسئلہ: عورت کے لیے سر منڈوانا یا بال کٹوانا حرام ہے۔ حضور علیہ السلام نے ان عورتوں پر لعنت فرمائی جو مردوں کی سی شکل بنائیں۔ (یونہی مردوں پر بھی جو عورتوں کی سی شکل بنائیں)۔ ہاں عورتیں احرام کھولتے وقت بالوں کے اوپر والے حصہ سے ایک پورا بھر کتروا دیں۔

مسئلہ: حج کے علاوہ مردوں کے لیے بال رکھنا سنتِ نبوی ﷺ ہے۔ اور سر منڈانا سنت مرتضوی مگر چوں کہ حدیث شریف میں وہابیوں کی علامت سر منڈانا فرمائی گئی (سیما ھُمُ التَّحلِیق) اس سے بچے کے سر کا بعض حصہ کٹوانا اور بعض رکھنا مکروہ ہے۔ جیسے انگریزی بال (بودا) وغیرہ

مسئلہ: مردوں کو عورتوں کی طرح لمبے بال رکھنا چوٹی باندھنا عورتوں کی طرح مانگ نکالنا مکروہ ہے۔

مسئلہ: حج کا فرض چھوٹ جانے سے حج جاتا رہتا ہے۔ مگر واجب چھوٹ جانے سے قربانی واجب اور سنت رہ جانے سے صدقہ لازم۔ جیسے نماز کا فرض رہ جائے تو نماز فاسد۔ واجب رہ جائے تو سجدہ سہو واجب۔

مسئلہ: بال کتروائیں تو سر میں جتنے بال ہوں ان کے چہارم بالوں میں سے کتروانا ضروری ہے۔ لہٰذا احتیاطاً ایک پورے سے زیادہ کتروائیں کہ بال چھوٹے بڑے ہوتے ہیں۔ ممکن ہے کہ چہارم بالوں میں سب ایک ایک پورا نہ ترشے جاسکے (بہار شریعت) چہارم سے مراد چوتھائی حصہ ہے۔

حج تمتع کا بیان

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِى الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِى الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (سورۃ البقرۃ:۱۹۶)

''پھر جب تم اطمینان سے ہوتو جو حج سے عمرہ ملانے کا فائدہ اٹھائے اس پر قربانی ہے جیسی میسر آئے۔ پھر جسے مقدور نہ ہوتو تین روزے حج کے دنوں میں رکھے اور سات جب اپنے گھر پلٹ کر جائے یہ پورے دس ہوئے یہ حکم اس کے لیے ہے جو مکہ کا رہنے والا نہ ہو اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ اللہ کا عذاب سخت ہے''

فَاِذَآ اَمِنْتُمْ : یہ امن سے بنا جس کے معنی اطمینان بلا کا مقابل۔یعنی جب تم احصار سے امن میں ہو مثلاً دشمن کا خوف جاتا رہے۔یا مریض تھے تن درست ہو گئے اور اب تک اپنے احرام سے حلال نہیں ہوئے یا یہ کہ پہلے ہی سے امن میں تھے۔

فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ : تمتع متاعٌ سے بنا بمعنی نفع یا نفع حاصل کرنا سامان کو اسی لیے متاع کہتے ہیں کہ اس سے نفع ملتا ہے۔شریعت میں عمرہ کا حج کے ساتھ ملانا تمتع کہلاتا ہے۔یہاں لغوی معنی مراد ہیں یا شرعی اور اس میں قران و تمتع دونوں داخل ہیں کیوں کہ دونوں ہی میں قربانی دینا ہوتی ہے۔یعنی جو شخص حج کے مہینوں میں عمرہ کو حج کے ساتھ ملا کر متمتع ہوا۔بعض مفسرین نے کہا کہ معنی یہ ہیں کہ جو شخص اپنے عمرہ سے حلال ہو کر احرام میں جو چیزیں ممنوع ہو گئی

تھیں ان سے احرام حج تک نفع حاصل کرتا رہا لیکن اس تفسیر پر قران کا ذکر نہ آئے گا اور نیز اس تقدیر پر بِالْعُمْرَةِ کی با کے کچھ معنی نہ ہوں گے کیوں کہ تمتع (نفع مند ہونا) تو احرام کی ممنوعات سے حاصل ہوا۔ عمرہ سے کہاں حاصل ہوا۔ پس پہلی تفسیر لفظاً معناً دونوں طرح اولیٰ ہے۔ یہ تمام صورتیں غیر ھدی والے تمتع کی ہیں۔ اس کا مزید ذکر آگے آئے گا۔

فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ: یہاں علیہ پوشیدہ ہے۔ یعنی اس پر قربانی واجب ہے۔ جو بھی میسر ہو اونٹ یا گائے یا بکری۔ خیال رہے کہ مذہب حنفی میں یہ شکریہ کی قربانی ہے۔ لہٰذا دسویں ذوالحجہ کو ذبح ہوگی۔ اور خود کرنے والا بھی کھا سکے گا گویا کہ یہ حج و عمرہ کے جمع ہونے کا شکریہ ہے۔ نیز یہ قربانی واجب ہے خواہ تمتع کرنے والا فقیر ہو۔ ہاں عید الاضحیٰ کی قربانی فقیر، مسافر پر واجب نہیں ہوتی۔ (خزائن)

فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ : جو کوئی قربانی نہ پائے یا تو جانور ہی میسر نہ ہو یا اس کے پاس قیمت نہ ہو یا کوئی بازاری قیمت سے بہت مہنگی بیچ رہا ہو۔ (کبیر)

فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ : یعنی جس کو قربانی میسر نہ ہو تو وہ تین دن کے روزے زمانہ حج میں رکھے۔ یہاں يَجِبُ فعل پوشیدہ ہے یعنی اس پر تین دن کے روزے واجب ہیں۔ زمانہ حج میں یہاں حج سے مراد حج کے مہینے ہیں۔ یعنی شوال، ذیعقد اور دس دن ذوالحجہ کے مگر چاہیے کہ یہ روزے حج اور عمرہ کے احراموں کے درمیان رکھے خواہ لگاتار ہوں یا علیحدہ۔ مگر بہتر یہ ہے کہ ساتویں، آٹھویں، نویں ذی الحجہ میں لگاتار رکھے علاوہ ازیں یوم نحر (قربانی کا دن) اور ایام تشریق کو روزہ رکھنا حرام ہے۔ اسلیے ان دنوں کے روزے سے یہ واجب بھی ادا نہ ہوگا۔ صحیحین میں سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ دو دن کے روزوں سے رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ایک تو وہ دن جس میں فرض روزے ختم کرتے ہو یعنی یوم عید الفطر اور دوسرا وہ دن جس میں اپنی قربانی کا گوشت کھاتے ہو (متفق علیہ) عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور علیہ السلام نے ایام تشریق کے روزوں سے منع فرمایا (مظہری)

مسئلہ: جس شخص کو سر منڈانے سے پہلے روزے رکھنے کے دوران یا روزے رکھنے کے بعد ہدی مل جائے اس پر ہمارے نزدیک ذبح واجب ہے کہ یہ شخص خلف پر عمل کرنے سے بیشتر اصل پر قادر ہو گیا۔ اس کی مثال ایسی ہو گئی جیسے کوئی تیمم سے نماز پڑھتا تھا کہ پانی مل گیا اور اگر ہدی بعد سر منڈانے کے پائی اور وہ روزہ رکھ چکا تو اس پر ھدی اتفاقاً واجب نہیں جیسے کسی نے تیمم سے نماز پڑھ لی اور پھر پانی پایا تو اس پر نماز کا اعادہ نہیں۔ اگر ایام حج میں یہ تین روزے فوت ہو گئے تو ایک قربانی اس کے ذمہ واجب ہو گئی۔ (ملخصاً مظہری)

وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ : (اور سات جب تم لوٹو) رجوع کے معنی پلٹنا ہیں مگر یہاں حج سے فارغ ہونا مراد ہے۔ یعنی جو قربانی نہ پائے وہ تین روزے تو حج کے مہینوں میں حج سے پہلے ادا کرے اور سات روزے حج سے فارغ ہو کر۔

تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ : (یہ دس پورے ہوئے) چوں کہ پچھلی عبارت سے وہم پڑ سکتا تھا کہ واؤ بمعنی اَوْ کے ہو اور مطلب یہ ہو کہ یا تو حج سے پہلے تین روزے رکھ لو اور یا حج کے بعد سات۔ نیز احتمال تھا کہ کوئی کاتب سبع کو غلطی سے تسع لکھ جائے یا پڑھنے والا تسع (نو) پڑھ لے۔ نیز یہ بھی احتمال تھا کہ سبع (سات) سے مراد پہلے تین روزے مل کر سات ہوں یعنی تین تو حج سے پہلے اور چار بعد کل سات۔ ان تمام وہموں کو دور کرنے کے لیے فرمایا کہ یہ کل دس ہوئے۔ پھر شاید کوئی یہ وہم کرتا کہ ان روزوں کا ثواب قربانی سے کم ہے اور اس سے تمتع ناقص ہوگا۔ اسلیے فرمایا گیا کاملة کہ یہ دس روزے قربانی کی طرح ہی کامل ہیں ان سے تمتع بھی کامل ہوگا۔

لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِى الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ : (یہ اس کے لیے ہے جو کہ مکہ کا رہنے والا نہ ہو) ذالک سے تمتع کی طرف اشارہ ہے۔ اھلہ ' سے گھر والے یعنی بال بچے مراد ہیں۔ حاضر غائب کا مقابل ہے۔ بمعنی موجود مقیم ہونا یا وہاں کا باشندہ ہونا مراد ہے۔ مسجد حرام سے حرم شریف بلکہ سارا داخل میقات مراد ہے۔ یعنی یہ تمتع ان لوگوں کو جائز ہے جو میقات کے اندر

باشندہ نہ ہوں باہر سے حج کے لیے آئے ہوں۔ (احمدی) کیوں کہ مکہ یا میقات والوں کو زمانہ حج میں عمرہ کرنا منع ہے۔ چوں کہ باہر کے لوگ بار بار یہاں نہیں آسکتے لہٰذا انہیں ایک ہی سفر میں حج و عمرہ کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ مکہ والے ہر وقت کر سکتے ہیں لہٰذا وہ زمانہ حج میں عمرہ کر کے باہر سے آنے والوں کی تکلیف کا باعث نہ بنیں۔ (وَاتَّقُوا اللّٰہَ) اے مسلمانو! ادائے عبادت میں رب سے ڈرتے رہو اس کے احکام کی مخالفت نہ کرو۔ خصوصاً حج اور احرام اور زمین حرم میں (وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ) یہ یاد رکھو! اللہ کا عذاب بہت سخت ہے تاکہ تم سے کوئی گناہ صادر نہ ہو لہٰذا حج کرنے اور حاجی بن جانے کے بعد بھی اس سے ڈرتے رہو یہ نہ سمجھو کہ اب تو ہم حاجی بن گئے جو نیک و بد اعمال چاہیں کریں۔ حج کر لینا آسان مگر حج کو سنبھالنا بہت دشوار ہر وقت ڈرتے رہو کہ کہیں ایسی حرکت نہ ہو جائے جس سے حج وغیرہ سارے اعمال برباد ہو جائیں۔ یا گناہ گاروں! مایوس نہ ہونا اللہ غفار ہے اور اے نیک کارو دلیر نہ ہونا اللہ قہار و جبار ہے۔

حج کی قسمیں:

(۱) افراد بالحج (۲) افراد بالعمرۃ (۳) قِران (۴) تمتع۔ افراد بالحج یہ ہے کہ صرف حج کا احرام باندھ کر وہ ہی ادا کرے اس کے ساتھ عمرہ نہ کرے اس کا احرام دسویں ذوالحج کو طواف زیارت سے کھلے گا۔ افراد بالعمرۃ یہ ہے کہ صرف عمرہ کا احرام باندھ کر عمرہ ہی کرے۔ اگر اسی سفر میں اسی سال حج بھی کر لیا تو تمتع ہو گیا۔ تمتع کی دو صورتیں ہیں۔ ایک ھدی والا اور دوسرا بغیر ھدی کا ھدی والے تمتع کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے صرف عمرہ کا احرام باندھے۔ اور حج کے مہینوں میں عمرہ کر کے بغیر احرام کھولے مکہ معظمہ میں رہے۔ اور آٹھویں ذوالحجہ کو اس احرام پر حج کا احرام بھی باندھ کر حج ادا کرے۔ بغیر ھدی کا تمتع یہ ہے کہ اولاً صرف عمرہ کا احرام باندھے۔ اور مکہ معظمہ پہنچ کر عمرہ کر کے احرام کھول دے آزادی سے رہے پھر آٹھ تاریخ کو حج کا احرام باندھ کر حج کرے آج کل عام حاجی یہی کرتے ہیں اور یہ تمتع اس آیت میں مراد ہے۔

قران یہ ہے کہ حج و عمرہ دونوں کو ایک ہی احرام میں جمع کر لے یعنی دونوں کا احرام باندھے مکہ معظمہ پہنچ کر پہلے عمرہ کے افعال ادا کرے پھر بغیر احرام کھولے حج کے افعال بھی ادا کر کے دسویں ذی الحجہ کو احرام کھولے۔

فوائد:

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔(۱) اہل مکہ بلکہ داخل میقات والوں کے لیے نہ تمتع نہ قران۔(۲) تمتع کی قربانی شکریہ کی ہے نہ کہ کسی جرم کی کیوں کہ زمانہ حج میں عمرہ کی اجازت ملنا خدا کی نعمت ہے نیز ایک سفر میں چھوٹے بڑے دو حج کر کے جانا بھی خدا کا عین کرم قربانی اس کا شکریہ ہے نہ کہ کسی گناہ کا کفارہ۔ خیال رہے کہ ذبیحہ دو قسم کے ہیں۔ ذبیحہ عادت، ذبیحہ عبادت۔ ذبیحہ عادت تو وہ ہے جو دن رات ہم کھانے پینے کے لیے جانور ذبح کرتے رہتے ہیں۔ ان پر نہ عذاب نہ ثواب۔ ذبیحہ عبادت وہ ہے جو رب تعالیٰ کو راضی کرنے کے لیے کیا جاوے۔ اس ذبیحہ کی دو قسمیں ہیں۔ ذبیحہ جنایت، ذبیحہ شکر۔ ذبیحہ جنایت تو حج یا عمرہ میں ہی ہوتا ہے جبکہ کوئی واجب چھوٹ جائے اس ذبیحہ کی نہ تاریخ مقرر ہے نہ اس سے مجرم خود کھا سکتا ہے۔ ذبیحہ شکر تین قسم کے ہیں۔ بچہ کا عقیقہ، بقر عید کی قربانی، تمتع یا قران کا ذبیحہ اس ذبیحہ کی تاریخ بھی مقرر ہے اور خود کرنے والا بھی کھا سکتا ہے۔(۳) مرد اپنے بیوی بچوں کے مقیم ہونے سے مقیم مانا جائے گا۔ کیوں کہ اس آیت میں بال بچوں کے مقیم ہونے کا ذکر کیا گیا۔ لہٰذا جہاں کسی کی بیوی مقیم ہو کر موجود ہو وہاں پہنچ کر یہ شخص مقیم ہوگا نہ کہ مسافر۔ نماز پوری پڑھے گا نہ کہ قصر۔ مثل مشہور ہے کہ سُسرال کے سفر میں قصر نہیں مگر یہ رخصت سے پہلے جبکہ بیوی وہاں مقیمہ ہو۔ جب بیوی کو سُسرال سے رخصت کر کے لے آیا تو اب دوبارہ سُسرال کے ہاں متصور نہ ہوگا۔ (فتاوی رضویہ)۔(۴) حقیقی اہل بیت بیوی بچے ہیں۔ لڑکی نکاح کے بعد جب شوہر کے گھر چلی جائے تو وہ اس کی اہل بیت مجازی ہوگی۔ اس آیت میں اہل سے بیوی اور اپنے گھر میں رہنے والے بچے

ہی مراد ہیں۔ اگر کسی کی بیٹی مکہ معظمہ میں رہتی ہو مگر یہ خود کہیں اور کا رہنے والا ہو تو بھی اسے تمتع جائز ہوگا۔

لہٰذا رافضیوں کا ازواج مطہرات کو حضور علیہ الصلوۃ والسلام کا اہل بیت نہ ماننا باطل ہے۔ وہ اس آیت کا کیا مطلب کریں گے۔ اہلِ بیتِ رسول اللہ ﷺ کے جو فضائل قرآنِ کریم میں وارد ہوئے اس میں ازواجِ پاک حقیقتاً داخل ہیں اور اولاد شریف مجازاً یا بطریقہ عموم مجاز (تفسیر نعیمی وغیرہ)

مسئلہ: بدنی عبادت کا فدیہ مالی عبادت ہو سکتی ہے جیسے کہ مالی عبادت کا فدیہ بدنی عبادت ہو جاتی ہے۔ دیکھو تمتع والے پر قربانی واجب ہے مگر قدرت نہ ہونے پر اس کے عوض دس روزے۔ قربانی مالی عبادت ہے اور روزہ بدنی عبادت لیکن قرآنِ کریم نے روزے کا کفارہ ایک مسکین کا کھانا قرار دیا۔ لہٰذا میت کی طرف سے حیلہِ اسقاط جائز ہے کہ اس میں میت کی چھوٹی ہوئی نمازوں کا فدیہ مال سے دیا جاتا ہے۔

مسئلہ: خدا کی نعمت کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے۔ دیکھو حج و عمرہ کے اجتماع کی نعمت کا شکریہ قربانی سے کرایا گیا لہٰذا محفلِ میلاد و عید معراج منانی اور اس دن عبادتیں کرنی جائز ہیں۔

مسئلہ: حج کے میقات (احرام باندھنے کی جگہ) پانچ ہیں۔ یمن اور جنوب مشرق ایشیا والوں کے لیے جبکہ وہ بحری جہاز پر براستہ عدن جائیں یلملم پہاڑ، مدینہ والوں کے لیے ذو الحلیفہ، عراق والوں کے لیے ذاتِ عرق، شام والوں کے لیے جحفہ، نجد والوں کے لیے قرن ان حدود کے اندر رہنے والوں کو میقاتی کہتے ہیں اور انہی کے لیے تمتع منع ہے۔ ان سے باہر رہنے والوں کو آفاقی کہتے ہیں جن کے لیے تمتع وغیرہ سب حلال۔

مسئلہ: صرف حج تمتع کی قربانی میں روزے کافی ہو جاتے ہیں۔ عام قربانیوں میں کافی نہیں وہاں قربانی ہی کرنی پڑے گی۔

مسئلہ: احناف کے نزدیک سب سے افضل قران پھر تمتع پھر افراد۔

اعتراض: اس آیت سے تمتع کا جواز بلکہ اس بہتر ہونا معلوم ہوا مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت کے زمانہ میں تمتع کو بند کر دیا اور فرمایا کہ دو متعہ حضور کے زمانہ میں تھے۔ ان سے منع کرتا ہوں اور کرنے والے کو سزا دوں گا۔ ایک متع نکاح، دوسرے متع حج۔ انہوں نے قرآن پاک کی صریح مخالفت کی (رافضی)

جواب: متع نکاح کا جواب تو ان شاء اللہ نکاح کی آیتوں میں آئے گا کہ یہ حضورﷺ کے زمانہ میں ہی منسوخ ہو چکا تھا۔ ہاں حج کے ہر تمتع سے منع نہ کیا بلکہ خاص اس تمتع سے جو صحابہ کرام نے حج وداع کے موقع پر کیا تھا۔ یعنی حج کا احرام باندھ کر اس پر عمرہ کر کے حلالی ہو جانا چوں کہ زمانہ جاہلیت میں اس کو بہت گناہ جانتے تھے۔ اس رسم کو توڑنے کے لیے ضرورتاً حضور علیہ السلام نے کرایا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اب ایسا تمتع کوئی نہیں کر سکتا کیوں کہ اب وہ ضرورت نہ رہی اور واقعی مسئلہ بھی یہی ہے (تفسیر کبیر، صفحہ نمبر 153/5 طبع ثانی طہران) ان کے فرزند عبداللہ بن عمر اس زمانہ میں بھی موجودہ تمتع کیا کرتے تھے۔

اعتراض: تمہاری تفسیر سے معلوم ہوا کہ اہلِ بیت بیوی ہے مگر حدیث میں آتا ہے کہ جب آیت کریمہ (اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْت) نازل ہوئی تو حضور علیہ السلام نے فاطمہ زہرہ حسن و حسین و علیؓ کو کمبل شریف میں لے کر فرمایا کہ اے اللہ یہ میرے اہلِ بیت ہیں پس انھیں پاک فرمادے حضورﷺ کی بیوی ام سلمہ نے بھی کمبل میں آنا چاہا مگر انھیں یہ کہہ کر روک دیا (مَکَانَکِ اَنْتِ عَلٰی خَیر) (وہاں ہی رہو تم خیر پر) ہو اس سے معلوم ہوا اہل بیت میں بیوی داخل نہیں بیٹی داخل ہے۔

جواب: یہ حدیث تو ہمارے کلام کی تائید کرتی ہے کہ ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا کہ تم تو خیر پر ہو یعنی اس آیت میں داخل ہی ہو تمھیں رب نے پاک فرما ہی دیا تمہارے لیے دعا کی چنداں ضرورت نہیں۔ میں رحمت الٰہی کو وسیع کرنے کے لیے اپنے دیگر اہل قرابت کو بھی اہل بیت کہہ کر ان کے لیے طہارت مانگ رہا ہوں۔ دیکھو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی اسی کمبل میں داخل فرمایا۔ دوسرے دن حضرت عباس کے گھر جا کر ان پر اور ان کے بچوں پر بھی یہ کرم فرمایا۔ حالاں کہ سیدنا علی اور آل عباس رضی اللہ عنہم حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی اولاد نہیں۔ جیسے کوئی بادشاہ وزیر سے کہے کہ تم اپنے اہلِ قرابت کو ہمارے پاس لاؤ ہم ان سب کو انعام دیں گے۔ وزیر اپنے پڑوسیوں بلکہ محلہ داروں کو بھی لے جا کر کہے کہ حضور یہ بھی میرے قریبی ہیں انھیں انعام سے نوازا جائے گا یہ وزیر کا کرم ہے (تحفہ اثنا عشریہ بحوالہ نعیمی) غرض یہ کہ صحیح یہ ہے کہ حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی بیویاں اور اولاد دونوں ہی اہل بیت ہیں اور اہلِ سنت ان سب کے خادم اور نام لیوا ہیں۔

حج کے مہینے

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَجُّ اَشۡهُرٌ مَّعۡلُوۡمٰتٌ فَمَنۡ فَرَضَ فِيۡهِنَّ الۡحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوۡقَ وَلَا جِدَالَ فِى الۡحَجِّ وَمَا تَفۡعَلُوۡا مِنۡ خَيۡرٍ يَّعۡلَمۡهُ اللّٰهُ وَتَزَوَّدُوۡا فَاِنَّ خَيۡرَ الزَّادِ التَّقۡوٰى وَاتَّقُوۡنِ يٰۤاُولِى الۡاَلۡبَابِ (سورۃ البقرۃ:۱۹۷)

''حج کے کئی مہینے ہیں جانے ہوئے تو جو ان میں حج کی نیت کرے تو نہ عورتوں کے سامنے صحبت کا تذکرہ ہو اور نہ کوئی گناہ اور نہ کسی سے جھگڑا حج کے وقت تک ہو اور تم جو بھلائی کرو اللہ اسے جانتا ہے اور توشہ ساتھ لو کہ سب سے بہتر توشہ پرہیزگاری ہے اور مجھ سے ڈرتے رہو اے عقل والوں!''

تعلق:

پچھلی آیت میں تمتع کا ذکر تھا اور تمتع میں عمرہ وحج کے مہینوں میں ادا کرنا ضروری ہے لہٰذا اب حج کے مہینے بیان کیے جا رہے ہیں۔ پچھلی آیت میں حج وعمرہ پورا کرنے کا حکم تھا جس سے شبہ ہوسکتا تھا کہ حج بھی عمرہ کی طرح ہمیشہ کیا جاسکتا ہے لہٰذا اب فرمایا جارہا ہے کہ حج کے کچھ مہینے مقرر ہیں عمرہ کے لیے کوئی وقت مقرر نہیں۔ پچھلی آیت میں تقویٰ و پرہیزگاری کا حکم دیا گیا اب اس کی تفصیل بیان ہورہی ہے کہ حج میں جماع وگناہ اور جھگڑا چھوڑنا، چوری، ڈکیتی بھیک وغیرہ سے بچنے کے لیے توشہ ساتھ لے جانا تقوی ہے۔ گویا کہ یہ آیت پہلی آیت کا تتمہ ہے۔

شانِ نزول:

بعض یمنی لوگ بے سروسامان ہی حج کے لیے چل پڑتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم متوکل ہیں اور سمجھتے تھے کہ ہم تو اللہ کے مہمان ہیں اور اس کے گھر کے حاجی ہیں کیا ہمیں روٹی نہ کھلائے گا اور مکہ مکرمہ پہنچ کر لوگوں سے سوال شروع کر دیتے تھے بلکہ کبھی غربت میں خیانت اور لوٹ مار بھی کر لیتے تھے۔ ان کے حق میں آیت کا آخری حصہ (وَتَزَوَّدُوْا) سے (الباب) تک نازل ہوا جس میں انھیں ہدایت کی گئی کہ توشہ لے کر حج کو چلو تا کہ تمہیں آخرت کا بہترین توشہ یعنی تقوی حاصل ہو۔

تفسیر:

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ: حج سے پہلے وقت پوشیدہ کیوں کہ حج چند کاموں کا نام ہے اس کی خبر (اشھرٌ) یعنی (مہینے) نہیں بن سکتی۔ اشھر شہر کی جمع ہے یعنی مہینا اگر چہ جمع کم از کم تین پر بولتے ہیں مگر یہاں دو ماہ دس دن یعنی شوال، ذیقعد اور دس دن ذوالحج کے مراد ہیں۔ کیوں کہ کبھی ایک سے زیادہ کو بھی جمع سے تعبیر کر دیتے ہیں جیسے (قُلُوْبُكُمَا) اور (اشھرَ) سے عربی مہینے مراد ہیں نہ کہ شمسی کیوں کہ اسلامی کام چاند کے مہینوں کے حساب سے ہوتے ہیں۔

مَّعْلُوْمٰتٌ: سے پہلے جانے پہچانے ہوئے مہینے مراد ہیں کیوں کہ زمانۂ جاہلیت میں بھی حج کے یہی مہینے تھے، شریعت نے وقتِ حج میں تبدیلی نہ کی بلکہ کفار جو مہینوں میں تبدیلی کر دیا کرتے تھے کہ رجب کو شوال کر دیتے اور شوال کو صفر، اسے بند کر دیا یعنی حج کے مہینے وہ ہیں جو پہلے سے جانے پہچانے ہوئے ہیں جو دنیا کی پیدائش کے وقت سے معلوم و مقرر ہیں، تمہارے بنائے ہوئے نہیں۔

نکتہ: حضرت آمنہ خاتون کو استقرارِ حمل بارہویں ذی الحج میں ہوا مگر وہ درحقیقت رجب تھا جسے کفارِ مکہ نے اس سال ذی الحج قرار دے کر حج کیا تھا اسی حساب سے ربیع الاول تک نو ماہ پورے

ہوتے ہیں۔ اگر اصل ذی الحج ہوتا تو ربیع الاول تک چار ماہ ہوتے۔

فَمَنْ فَرَضَ فِيهِنَّ الْحَجَّ : فرض کے لفظی معنی ہیں کاٹنا، کھودنا۔ چوں کہ کاٹنے کا اثر چیز میں لازم ہو جاتا ہے اس لیے لازم اور ضروری کام کو بھی فرض کہہ دیتے ہیں۔ لیکن یہاں فرض بمعنی اوجب ہے یعنی جو کوئی ان مہینوں میں احرام یا تلبیہ یا ھدی تیار کر کے اپنے پر حج فرض کرے خیال رہے کہ حج تو رب نے عمر میں ایک بار فرض کیا مگر جب بھی کوئی حج کا احرام باندھ لے اس پر ضرور فرض ہو جاتا ہے جیسے تکبیر تحریمہ سے نماز فرض ہو جاتی ہے۔

فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ : رفث کے معنی ہیں جماع مگر یہاں جماع اور اس کے اسباب بوسہ وغیرہ عورت کے سامنے اس کا تذکرہ بھی اسی میں شامل ہے۔ فسوق کے معنی ہیں شریعت کے حدود توڑنا اور گناہ کرنا جیسے غیبت گالی گلوچ وغیرہ۔ جدال مفاعلت کا مصدر ہے اس کا مادہ جدل بمعنی فتل (لپٹنا اور لپٹانا) ہے۔ لگام کو جدیل کہا جاتا ہے۔ جھگڑے کو اسی لیے جدال کہتے ہیں کہ اس میں ہر ایک دوسرے کو اپنے جال میں لپیٹتا ہے یہاں یا تو نوکر چاکر ساتھیوں یا کرایہ داروں وغیرہ سے جھگڑنا مراد ہے۔ گناہ ہمیشہ ہی برا ہے مگر جو حج کا احرام باندھ لے اس پر جماع بلکہ جماع کی باتیں گالی گلوچ جھگڑے وغیرہ بہت سخت منع ہے بلکہ مکہ معظمہ پہنچ کر گناہ کرنا تو خدا کی پناہ جیسے وہاں ایک نیکی کا ثواب ایک لاکھ کا ہے ایسے ہی ایک گناہ کا عذاب بھی ایک لاکھ کا اسی لیے تو وہاں گناہ سے بہت ہی ڈرو۔

وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ : جو کچھ تم بھلائی کرو گے صدقہ خیرات، فرضی نفلی نماز، طواف، بارگاہ الٰہی میں خشوع وخضوع وغیرہ (يَعْلَمْهُ اللّٰهُ) (اسے جانتا ہے) تمہیں اس کا اجر دے گا۔ اس جملے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ اے حاجیو! تم حج کے زمانے میں جو بھلائی ہو سکے کر گزرو، یہ موقع پھر میسر ہونا مشکل ہے۔ یا اے انسانو! اپنی زندگی میں جو ہو سکے خیر کما لو، ہر دم کو آخری دم سمجھو، تمہارے اعمال سے نہ تو ہم بے خبر ہیں نہ ہمارے خزانوں میں کمی ہے۔ نہ ہم بخیل

ہیں تمہیں اجر اپنی شان کے لائق دیں گے نہ کہ تمہارے عمل کے لائق۔ اس کے سوا خیال رکھو کہ (تَـزَوَّدُوا) اس کا مادہ زاد بمعنی بڑھانا اور زیادتی کرنا توشہ کو زاد اس لیے کہتے ہیں کہ وہ کسی قدر زیادہ لیا جاتا ہے تا کہ کام آئے۔ مطلب یہ ہے کہ حج کے لیے توشہ ساتھ لے لیا کرو (فَـاِنَّ خَیرَ الزَّادِ التَّقْوٰی) یہاں تقوی سے مراد بھیک لوٹ مار سے بچنا ہے۔ یا پرہیزگاری یعنی حج میں آ کر گناہوں اور بھیک سے بچنا بہتر توشہ ہے یا دنیاوی توشہ اطمینانِ قلب اور تقوی کا ذریعہ ہے پھر یہ تقوی آخرت کا توشہ ہے (وَاتَّقُوْنِ یٰاُولِی الْاَلْبَابِ) کی جمع ہے بمعنی عقل مند اسی لیے عقل مند کو لبیب کہا جاتا ہے یعنی اے عقل والوں! ہمیشہ ہم سے خوف کرتے رہو۔

مسئلہ: حنفیہ کے نزدیک محرم کے لیے جماع تو حرام مگر نکاح حرام نہیں۔ حضور ﷺ نے حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے بحالتِ احرام ہی نکاح فرمایا۔

حج کے دوران روزی کمانا اور مشعرِ حرام کا بیان

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

لَيۡسَ عَلَيۡكُمۡ جُنَاحٌ اَنۡ تَبۡتَغُوۡا فَضۡلًا مِّنۡ رَّبِّكُمۡ فَاِذَاۤ اَفَضۡتُمۡ مِّنۡ عَرَفٰتٍ فَاذۡكُرُوا اللّٰهَ عِنۡدَ الۡمَشۡعَرِ الۡحَرَامِ وَاذۡكُرُوۡهُ كَمَا هَدٰٮكُمۡ وَاِنۡ كُنۡتُمۡ مِّنۡ قَبۡلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيۡنَ ۱۹۸ ثُمَّ اَفِيۡضُوۡا مِنۡ حَيۡثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسۡتَغۡفِرُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ (سورۃ البقرۃ:۱۹۸،۱۹۹)

''تم پر کچھ گناہ نہیں کہ اپنے رب کا فضل تلاش کرو تو جب تم عرفات سے پلٹو تو اللہ کی یاد کرو مشعر حرام کے پاس اور اس کا ذکر کرو جیسے کہ اس نے تمہیں ہدایت فرمائی اور بے شک اس سے پہلے تم بھٹکے ہوئے تھے۔ پھر بات یہ ہے کہ (اے قریشیو) تم بھی وہیں سے پلٹو جہاں سے لوگ پلٹتے ہیں اور اللہ سے معافی مانگو بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے''

تعلق:

(۱) پہلے فرمایا گیا کہ حج وعمرہ اللہ کے لیے پورا کرو جس سے وہم ہوتا تھا کہ اس سفر میں سوا ادائے حج کوئی دنیوی کام جائز نہیں۔ اب فرمایا جا رہا ہے کہ تجارت بھی کر سکتے ہو مگر اصل مقصود ادائے حج ہو۔ (۲) پچھلی آیت میں حکم دیا گیا تھا کہ توشہ لے کر حج کو آؤ۔ اب اس حکم میں وسعت دی گئی کہ اگر کوئی صاحب کمال شخص کماتا کھاتا حج کر آوے تو بھی حرج نہیں حج میں چوری قزاقی بھیک منع ہے۔ بہت سے غریب غرباء جو کچھ ہنر جانتے ہیں حج میں اپنے ہنر سے کمائی بھی کرتے ہیں اور حج بھی جیسے کہ حجام، درزی وغیرہ حجامتیں کرتے، کپڑے سیتے جائیں اور حج کر آئیں۔

شانِ نزول:

عرب میں عکاظ، مجنہ اور ذوالمجاز بڑے بڑے بازار تھے۔ جہاں حج کے موسم میں کاروبار ہوتے تھے۔اس پر ان کی گزراوقات تھی۔جب اسلام دنیا میں تشریف لایا اور لوگوں کے دلوں میں تقویٰ کا جذبہ پیدا ہوا تب انہوں نے حج میں تجارت بھی گناہ سمجھی اور حضور علیہ السلام سے دریافت کیا اس پر یہ آیت کریمہ اُتری۔ (تفسیر رُوح المعانی، مظہری ورواہ البخاری عن ابن عباس)۔

لَيۡسَ عَلَيۡكُمۡ جُنَاحٌ : جناحٌ جنحٌ سے بنا جس کے معنی ہیں میلان (فَاِنۡ جَنَحُوۡا لِلسَّلۡمِ) (پس اگر وہ صلح کے لیے جھک جائیں) گناہ کو جناح اسی لیے کہتے ہیں کہ یہ صحیح راستہ سے ہٹا دیتا ہے۔بعض نے کہا کہ اکثر گناہِ کبیرہ کو معصیت وغیرہ کہتے ہیں اور گناہِ صغیرہ کو جناح۔اس صورت میں آیت کے یہ معنی ہوئے کہ زمانۂ حج میں کمائی کرنا گناہِ کبیرہ تو کیا گناہِ صغیرہ بھی نہیں۔ بغیر کاروبار حج ناممکن ہے اگر مکہ معظمہ، منٰی، عرفات وغیرہ میں دکانیں نہ ہوں تو حجاج اپنی ضروریات کی اشیاء کہاں سے حاصل کریں۔اگر وہاں سواریاں اور خیمے کرایہ پر نہ دیئے جائیں تو حجاج عرفات وغیرہ کیسے پہنچیں۔نیز اکثر اہلِ مکہ کا گزارہ حج پر ہے اس زمانہ میں وہ کماتے ہیں سال بھر کھاتے ہیں۔اگر حج میں سارے کام ممنوع ہوں تو اہلِ مکہ کا گزارہ مشکل ہوجائے۔

اَنۡ تَبۡتَغُوۡا فَضۡلًا مِّنۡ رَّبِّكُمۡ : (تَبۡتَغُوۡا) کا مادہ (بَغۡیٌ) ہے۔جس کے معنی حد سے نکلنا، کوشش کرنا، تلاش کرنا، ڈھونڈنا ہیں یہاں آخری معنی مراد ہیں۔فضل کے معنی زیادتی خواہ کسب سے حاصل ہو یا بغیر کسب چوں کہ تجارتی نفع وغیرہ اصلِ مقصود (حج) سے زیادہ ہیں۔اسی لیے انہیں یہاں فضل فرمایا گیا۔یعنی حاجیوں پر اس میں گناہ نہیں کہ وہ حج کے ساتھ ہی اللہ کا فضل تجارتی نفع وغیرہ تلاش کرلیں۔مگر ضروری ہے کہ یہ تجارت ادائے حج میں نقصان نہ پیدا کرے۔اسی لیے اس کے ساتھ ہی ذکر اللہ اور عرفات سے روانگی وغیرہ کا بیان ہوا۔

فَاِذَآ اَفَضۡتُمۡ مِّنۡ عَرَفٰتٍ : (اَفَضۡتُمۡ) افاضہ سے بنا جس کا مادہ ہے فیض بمعنی زور سے بہنا،

آنسو بہنے کو بھی فیض کہتے ہیں۔ (تفیض من الدفع) کسی جگہ سے لوگوں کے ایک دم نکلنے کو بھی اسی لیے فیض کہہ دیتے ہیں کہ وہ مثل بہت پانی کے بہہ رہے ہیں۔ بلکہ بڑی مہربانی کو فیض اور سپرد کرنے کو بھی تفویض کہا جاتا ہے۔ چوں کہ عرفات سے لوٹتے وقت انسانوں کا بے پناہ ہجوم ہوتا ہے اس لیے یہاں (اَفَضْتُم) فرمایا گیا۔ عرفات عرفۃ کی جمع ہے جس کے معنی جاننا، پہچاننا یا خوشبو یا اعتراف واقرار۔ اصطلاح میں اس میدان کا نام ہے جو مکہ مکرمہ سے نو میل پر مزدلفہ سے آگے واقع ہے۔ نو ۹ ذی الحجہ کو اسی جگہ ٹھہرنے کا نام حج ہے۔ عرفات کی وجہ تسمیہ اور فضائل وغیرہ کا بیان آئندہ آرہا ہے۔ (ان شاء اللہ)

فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ: ذکر اللہ سے مراد تلبیہ، رب کی حمد وثناء، تسبیح ودعا وغیرہ ہیں۔ لفظ عند سے معلوم ہوا کہ مشعرِ حرام کے پاس ٹھہرنا زیادہ بہتر ہے اگرچہ سارے مزدلفہ میں ٹھہرنا جائز ہے۔ سوائے وادیٔ محسر کے۔ مشعر شعور یا شعار سے بنا اس کے معنی نشان یا علامت کے ہیں۔ حرام بمعنی محترم اور عزت والا مشعرِ حرام مزدلفہ کے دو پہاڑوں کے درمیان کی جگہ کا نام ہے اور اس کی حد مازمان سے محسر تک ہے۔ خود مازمان اور محسر مشعر سے نہیں (مظہری)۔ اسی مقام کو قزح اور میقدہ بھی کہتے ہیں۔ زمانہ جاہلیت میں لوگ عرفات سے واپس ہو کر تمام رات اس پر آگ جلاتے تھے۔ اسلام نے حکم دیا کہ یہ بیہودہ بات ہے یہاں آکر اللہ کا ذکر کرو۔

وَاذْكُرُوهُ كَمَا هَدٰكُمْ: (یعنی اس کا ذکر ایسے کرو جیسے کہ اس نے تمہیں بتایا)۔ عاجزی، زاری، ڈر اور امید کے ساتھ۔

وَاِنْ كُنْتُمْ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ: (تم اسلام سے پہلے بھٹکے ہوئے تھے) یعنی حج تو کرتے تھے مگر غلط طریقہ سے کہ عبادات میں تمہاری عادات اور جہالت کی رسمیں شامل ہو چکی تھیں۔

ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ: یہاں ثُمَّ سے مراد ترتیب ذکری کے لیے ہے نہ کہ واقعہ کی ترتیب کے لیے کیوں کہ عرفات سے روانگی کا ذکر تو پہلے ہو چکا۔ (افیضوا) قریش سے

خطاب ہے اور (الناس) سے قریش کے علاوہ دیگر لوگ مراد ہیں۔ بغوی فرماتے ہیں کہ اسلام سے قبل قریش مزدلفہ ہی میں ٹھہر جاتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم اہلِ حرم ہیں حدودِ حرم سے باہر نہ جائیں گے اور دیگر لوگ عرفات تک جاتے تھے اور واپسی کے وقت قریش تو مزدلفہ سے اور دوسرے لوگ عرفات سے پلٹتے تھے۔ اس لیے فرمایا گیا کہ اے قریش تم بھی وہیں سے پلٹو جہاں سے باقی لوگ لوٹیں۔ یہ سنتِ ابراہیم علیہ السلام ہے تم اپنی شیخی کی وجہ سے اس سنتِ ابراہیمی سے محروم نہ رہو۔ (مظہری، ابن جریر نے ابن عباس سے اور ابن منذر نے اسماء بنت ابوبکر سے ایسی ہی روایات نقل کی ہیں)۔

☆ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ: اللہ سے اپنی کوتاہیوں کی معافی مانگو۔

☆ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ: اللہ تعالیٰ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔

(یومِ الترویہ، عرفہ، یومِ النحر اور مزدلفہ کی وجہ تسمیہ اور معانی)

آٹھویں ذوالحجہ کو یوم الترویہ، نویں کو یوم عرفہ، دسویں کو یوم النحر کہتے ہیں۔ یہاں ان الفاظ کی وجہِ تسمیہ اور معانی وغیرہ بیان کیے جاتے ہیں۔

یوم الترویہ:

یہ روی سے بنا جس کے معنی ہیں غور کرنا یا پانی پلانا۔ اس دن کو ترویہ کہنے کی چند وجہیں ہیں۔ صاحبِ تفسیر کبیر فرماتے ہیں کہ جب آدم علیہ السلام کو بیت اللہ بنانے کا حکم دیا گیا تو آٹھویں ذوالحج کو آپ نے غور کیا اور رب سے عرض کیا کہ مجھے اس کی کیا اجرت ملے گی؟ حکم الٰہی آیا کہ اس کے اول طواف میں تمہاری تمام خطائیں معاف ہو جائیں گی۔ عرض کی مولا کچھ زیادہ فرمایئے۔ فرمایا تمہاری اولاد میں بھی جو طواف کرے گا اس کے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔ عرض کیا کچھ زیادہ کیجئے حکم ہوا کہ حاجی طواف کرتے وقت جس کے لیے بھی دعا کر دیں گے اس کی بھی مغفرت کر دی جائے گی۔ عرض کیا بس بس مجھے کافی ہے چوں کہ اس تاریخ کو آدم علیہ السلام نے غور وفکر

کیا اس لیے اس کا نام یوم الترویہ ہوا (صفحہ نمبر ۵/۱۴۳ طبع ثانی تہران) نیز مکہ والے آٹھویں ذوالحج میں اپنے جانوروں کو بھی پانی پلاتے تھے اور عرفات میں اپنے پینے کے لیے بھی جمع کر لیتے تھے اس لیے اسے یوم الترویہ یعنی پانی پلانے کا دن کہا جاتا ہے۔

عرفہ یا عرفات:

عرفہ یا تو معرفت سے بنا یا عرف یا اعتراف سے چوں کہ اس میدان میں حاجیوں کی یک رنگی دیکھ کر خالق کی معرفت اور پہچان ہوتی ہے اور سخت دل والوں پر بھی ہیبت اور گریہ زاری طاری ہو جاتی ہے لہٰذا یہ عرفہ ہے۔ (نعیمی) نیز جنت سے آدم علیہ السلام تو سراندیپ میں اور حضرت حوا جدہ میں اور ابلیس نیساں میں اور سانپ اصفہان میں اتارے گئے۔ تین سو برس کے بعد آدم علیہ السلام نے اس میدانِ عرفات اور نویں ذوالحج کے دن حضرت حوا سے ملاقات کی اور انہیں پہچانا لہٰذا وہ میدان تو عرفات اور یہ تاریخ یوم عرفہ کہی گئی (کبیر صفحہ ۵/۴۷ علاوہ ازیں اور وجوہات بھی صاحبِ تفسیرِ کبیر اور صاحبِ مظہری نے نقل فرمائی ہیں)۔

یوم النحر:

دسویں ذوالحج کا نام ہے۔ نحر کے معنی ہیں قربانی (فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَر) چوں کہ اس دن ہر جگہ عموماً اور منٰی میں خصوصاً قربانیاں ہوتی ہیں۔ اس لیے اس کا نام یوم النحر ہوا۔

مزدلفہ:

یہ زلف سے بنا بمعنی قرب (لیقربون الی اللّٰہ زلفا) یہ باب افتعال کا اسم فاعل یا مفعول ہے چوں کہ فاکلمہ ز تھا اس لیے افتعال کی ت دال بن گئی اس کے معنی بنے قریب کرنے والی جگہ چوں کہ یہاں حاجیوں کو قرب الٰہی حاصل ہوتا ہے نیز آدم علیہ السلام حضرت حوا سے پہلی بار اس مقام پر قریب ہوئے لہٰذا اس جگہ کا نام مزدلفہ ہوا۔

فوائد آیت کریم:

۱۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ انفرادی عبادت سے اجتماعی عبادت افضل ہے۔ اکیلے نماز سے جماعت کی نماز افضل کہ ایک کی قبول تو ان شاء اللہ سب کی قبول۔ قریش کا مزدلفہ سے لوٹ آنا گویا ان کی شخصی (انفرادی) عبادت تھی اور عرفات سے واپس ہونا قومی (اجتماعی) عبادت تھی رب تعالیٰ نے انہیں عرفات سے لوٹنے کا حکم دیا کہ اجتماعی عبادت بنے جس میں امیر، غریب، سردار، ماتحت سب یکساں ہوں۔ دنیا اور دنیا کی چیزیں باعثِ امتیاز ہیں لیکن آخرت اور وہاں کی اشیاء اس امتیاز کو اٹھانے والی ہیں۔ گھر میں امیر، فقیر، اپنے مکان، لباس، غذا وغیرہ میں ممتاز ہوتے ہیں مگر مسجد میں پہنچتے ہی سب یکساں۔ حج میں اس یکسانیت کا وہ نمونہ قائم ہوتا ہے کہ سبحان اللہ کیا کہنا۔

۲۔ ادائے عبادت کے وقت قومی امتیاز اور دنیوی بڑائیاں محرومی کا باعث ہیں۔ دیکھو قریش کو حکم ہوا کہ تم بھی عام لوگوں کے ساتھ عرفات ہی پہنچا کرو اور ان کے ساتھ ہی واپس ہوا کرو۔

بندۂ عشق شدی ترکِ نسب کن جامی

کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

۳۔ ہمیشہ مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ رہنا ضروری ہے جماعت سے علیحدگی ہلاکت ہے۔ حدیث شریف میں ہے (ید اللہ علی الجماعۃ) اور مقام پر فرمایا (من شذ شُذَّ فی النار) (جو علیحدہ ہوا وہ آگ میں علیحدہ کیا گیا)

۴۔ تجارت بہت بہتر چیز ہے کہ حج جیسی عبادت میں بھی اس کی اجازت دی گئی۔ ہمارے نبی ﷺ نے بھی بارہا تجارت فرمائی۔ تجارت مسلمانوں کا خاص فن تھا افسوس وہ اس کو کھو بیٹھے۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

فَاِذَا قَضَيۡتُمۡ مَّنَاسِكَكُمۡ فَاذۡكُرُوا اللّٰهَ كَذِكۡرِكُمۡ اٰبَآءَكُمۡ اَوۡ اَشَدَّ ذِكۡرًا ؕ فَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّقُوۡلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِى الدُّنۡيَا وَمَا لَهٗ فِى الۡاٰخِرَةِ مِنۡ خَلَاقٍ (سورۃ البقرۃ:۲۰۰)

"پس جب اپنے حج کے کام پورے کر چکو تو اللہ کا ذکر کرو جیسے اپنے باپ دادا کا ذکر کرتے تھے بلکہ اس سے زیادہ اور کوئی آدمی یوں کہتا ہے اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں دے اور آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں"

شانِ نزول:

اہلِ عرب حج سے فارغ ہو کر بیت اللہ کے پاس بیٹھ جاتے تھے اور اپنے باپ دادوں کا مفاخرت سے ذکر کیا کرتے تھے۔ ہر ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس بری رسم کو مٹانے کے لیے یہ آیتِ کریمہ اتری جس میں بجائے باپ دادوں کی تعریف کے ذکر الٰہی کرنے کا حکم دیا گیا۔ (مظہری، درمنشور، طبری وغیرہ)

تفسیر:

فَاِذَا قَضَيۡتُمۡ مَّنَاسِكَكُمۡ: یہ فاء تعقیبیہ ہے۔ (قَضَيۡتُمۡ قَضَاءً) سے بنا اگر قضا اپنے کام سے متعلق ہو تو فراغت اور اتمام کے معنی میں آتا ہے جیسے (فَاِذَا قَضَيۡتُمُ الصَّلٰوةَ) اور اگر دوسرے کے فعل یا ذات سے متعلق ہو تو بمعنی اِلزام ہوتا ہے۔ جیسے (وَقَضٰى رَبُّكَ)، (وَقَضَيۡنَآ اِلٰى بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ فِى الۡكِتٰبِ) چوں کہ یہاں خود اپنے فعل سے متعلق ہے اس لیے پورا کرنا اور فارغ ہونا ہی مراد ہے۔ (تفسیر کبیر) مناسکِ حج منسک کی جمع ہے اس کا مادہ ہے نسک

بمعنی عبادت یہاں بمعنی ظرف ہے یا مصدر کے معنی میں ہے چوں کہ حج میں بہت سی جگہ جانا پڑتا ہے اور بہت سی عبادات ہوتی ہیں اس لیے جمع لایا گیا۔ یعنی اے حاجیو! جب مناسکِ حج کو پورا کرلو تو اپنے باپ دادوں کی تعریفیں نہ کرو بلکہ (اللہ کا ذکر کرو)۔ بعض علماء نے فرمایا کہ یہ حکم وجوبی ہے اور ذکر سے مراد نماز کے بعد کی تکبیریں ہیں یعنی تکبیرِ تشریق جن کا پڑھنا واجب ہے۔ بعض نے فرمایا کہ اس سے مراد دعائیں اور ادائے شکر ہے جو کہ قریب قریب واجب ہے۔ بعض نے فرمایا کہ امر استحبابی ہے یعنی ادائے حج کے بعد بجائے شیخی مارنے اور خاندانی فخر بیان کرنے کے اللہ کا ذکر کرو۔ (کَذِکۡرِکُمۡ اٰبَآءَکُمۡ) (مثل اپنے باپ دادا کے ذکر کرنے کے) یعنی جیسے جوش وخروش اور محنت سے تم لوگ اپنے خاندانی فخر بیان کرتے تھے اب بجائے اس کے خلوت وجلوت میں کوشش سے اللہ کا ذکر کرو۔ یہ معنی اس آیت کے شانِ نزول کے مطابق ہے۔ اگرچہ مفسرین نے اس کے کچھ اور بھی مطالب بیان فرمائے ہیں۔

اَوۡ اَشَدَّ ذِکۡرًا: یعنی بلکہ خدا کا ذکر اپنے باپ دادوں کے ذکر سے بھی زیادہ کرو کیوں کہ باپ دادوں کی غلط تعریف، جھوٹ اور سچی تعریف شیخی ہے غرض یہ کہ اس میں جھوٹ بھی خطرناک اور سچ بھی اور رب کی جتنی بھی تعریف کرو سچی ہی ہوگی اور اس پر ثواب بھی ملے گا۔

یہاں تک تو کفارِ عرب کی غلط رسم کو روکا گیا۔ اب ان کی غلط دعاؤں کی اصلاح فرمائی جارہی ہے۔

فَمِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّقُوۡلُ رَبَّنَاۤ اٰتِنَا فِی الدُّنۡیَا: (بعض آدمی کہتے ہیں اے ہمارے پروردگار ہم کو دنیا میں ہی دے دے) ان سے وہ لوگ مراد ہیں جن کی طمع صرف دنیا پر ہی منحصر ہے۔ یعنی وہ مشرک جو حشر ونشر کے منکر ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بعض مشرکین عرفات میں کہتے تھے اے اللہ! ہمیں اونٹ، گائے، بکریاں، غلام، لونڈیاں دے اور اپنے گناہوں سے توبہ واستغفار وغیرہ نہ کرتے تھے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ لوگ حج میں بارش اور دشمنوں پر فتح ہی مانگا کرتے تھے ان سب کے متعلق ارشاد ہورہا ہے۔ (تفسیر کبیر)

وَمَا لَهُ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ: (اور ایسوں کا آخرت میں کچھ حصہ نہیں) خلاق کا مادہ خلق بمعنی لائق ہونا یا خلق بمعنی پیدائش ہے۔ نصیب اور حصہ کو خلاق اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ حصہ دار کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ اور وہ اس کے لائق ہے۔ (روح المعانی) یعنی ایسے لوگوں کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں جنہیں وہاں کی طلب نہ ہو۔

فوائد:

۱۔ عبادات کے بعد دعا اور ذکر کرنا بہت بہتر ہے۔ جیسا کہ اس آیت میں حج کے بعد ذکرِ الٰہی کا حکم دیا گیا لہٰذا نماز عید اور نکاح وغیرہ کے بعد بھی دعا بہتر ہے بعض لوگ بلا وجہ روکتے ہیں۔

۲۔ بلند آواز سے بلکہ جماعت کے ساتھ ذکر اللہ کرنا رب کو پسند ہے کیوں کہ یہاں فرمایا گیا کہ جیسے اپنے باپ دادوں کا ذکر کرتے تھے ویسے بلکہ اس سے بھی بڑھ چڑھ کر رب کا ذکر کرو اور ظاہر ہے کہ وہ لوگ اپنے باپ دادوں کا ذکر مجمع میں بلند آواز سے ہی کیا کرتے تھے۔ حضور ﷺ نماز کے بعد مع صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بلند آواز سے ذکر الٰہی کرتے تھے۔ جن آیات یا روایات میں جہری ذکر سے منع کیا گیا ہے ان میں خاص حالات مراد ہیں۔ جیسے جبکہ جہر میں ریا کا اندیشہ ہو یا دشمن کے ملک میں جہری ذکر سے کوئی جنگی مصلحت فوت ہوتی ہو لہٰذا نہ تو آیات متعارض ہیں اور نہ آیات و روایات متعارض۔

۳۔ رب ایسا کریم ہے کہ زیادہ مانگنا پسند فرماتا ہے۔ جن لوگوں نے اس سے فقط دنیا مانگی ان پر ناراضگی کا اظہار فرمایا اور بتایا کہ دین و دنیا دونوں مانگو۔

۴۔ طالبِ دنیا دین سے محروم رہ جاتا ہے۔ اور دنیا بھی بقدرِ نصیب ملتی ہے۔ یہاں انہیں کے حق میں فرمایا گیا کہ آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں۔ مگر طالبِ دین بفضلہٖ تعالیٰ دین بھی پا لیتا ہے اور دنیا بھی اس کے پیچھے بھاگتی ہے۔

۵۔ نسبی فخر اور باپ دادوں پر پھولنا جہلا کا طریقہ ہے اور رب کو ناپسند اس کی بجائے اللہ کا ذکر کرنا چاہیے۔ (نعیمی)

دعا میں دنیا اور آخرت کی بھلائی چاہنا

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّقُوۡلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِى الدُّنۡيَا حَسَنَةً وَّفِى الۡاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ (سورۃ البقرۃ:۲۰۱)

"اور کوئی یوں کہتا ہے کہ اے رب ہمارے ہمیں دنیا میں بھلائی دے اور ہمیں آخرت میں بھلائی دے اور ہمیں عذابِ دوزخ سے بچا"

وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّقُوۡلُ: اور بعض ان میں وہ ہیں جو حج کی حاضری میں اس کے ذکر کے ساتھ دارین کی بھلائی کا سوال کرتے ہیں۔

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِى الدُّنۡيَا حَسَنَةً: اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں بھلائی عنایت فرما۔ یعنی صحت و وجہِ معاش بقدرِ ضرورت اور بھلائی کی توفیق۔ تفسیر تیسیر میں ہے کہ لفظ الحسنہ جامع ہے ہر ان تمام بھلائیوں کو جو دارین میں نصیب ہوتی ہیں۔

وَّفِى الۡاٰخِرَةِ حَسَنَةً: اور آخرت میں بھلائی۔ اس سے ثواب اور رحمت مراد ہے۔

ف: حضرت ابوالقاسم حکیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حسنۂ دنیا سے سعادت کی زندگی اور شہادت کی موت اور حسنہ آخرت سے قبر سے خوش خبری دیا ہوا اٹھنا اور پل صراط سے آسانی سے گزرنا مراد ہے۔ (وَقِنَا) اور ہمیں بچا (عَذَابَ النَّارِ) دوزخ کے عذاب سے۔

ف: حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ حسنہ سے حسین وجمیل عورت اور حسنۂ آخرت سے مراد ہے اور عذاب النار سے بری عورت مراد ہے۔

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں

چوں مستور باشد زن خوب روی
بدیدار او در بہشت است شوی

(بوستان باب ۷)

ترجمہ: (جس کی عورت حسین اور نیک ہو اسے دنیا میں بہشتی حور ملی)

حضور نبی کریم ﷺ دعا میں اکثر فرمایا کرتے تھے (وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّقُوۡلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِى الدُّنۡيَا حَسَنَةً وَّفِى الۡاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ) (روح البیان)

قیامِ منٰی کا بیان

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَاذۡكُرُوا اللّٰهَ فِىۡٓ اَيَّامٍ مَّعۡدُوۡدٰتٍؕ فَمَنۡ تَعَجَّلَ فِىۡ يَوۡمَيۡنِ فَلَآ اِثۡمَ عَلَيۡهِۚ وَمَنۡ تَاَخَّرَ فَلَاۤ اِثۡمَ عَلَيۡهِۙ لِمَنِ اتَّقٰىؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعۡلَمُوۡٓا اَنَّكُمۡ اِلَيۡهِ تُحۡشَرُوۡنَ

(سورۃ البقرۃ:۲۰۳)

"اور اللہ کی یاد کرو گنے ہوئے دنوں میں تو جو جلدی کر کے دو دن میں چلا جاوے اس پر کچھ گناہ نہیں اور جو رہ جائے تو اس پر گناہ نہیں پرہیز گار کے لیے اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ تمہیں اسی کی طرف اٹھنا ہے"

شانِ نزول:

بعض مفسرین نے فرمایا کہ بعض اہلِ عرب منٰی میں تین دن یعنی تیرھویں تک ٹھہرنا ضروری سمجھتے تھے اور جو کوئی بارھویں ذوالحج کو لوٹ آتا اسے گناہ گار بتاتے اور بعض کا خیال اس کے برعکس تھا کہ بارھویں کو چلے آنا ضروری ہے تیرھویں تک وہاں ٹھہرنا گناہ۔ ان دونوں کی تردید میں یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی جس میں فرمایا گیا کہ دونوں باتیں جائز ہیں۔ (خزائن العرفان)

وَاذۡكُرُوا اللّٰهَ فِىۡٓ اَيَّامٍ مَّعۡدُوۡدٰتٍ : یا تو ذکر اللہ سے مراد فرض نمازوں کے بعد تکبیرِ تشریق کہنا ہے یا قربانی کرتے وقت بسم اللہِ اللہ اکبر کہنا تب تو یہ امر وجوبی ہے کہ یہ دونوں ذکر واجب ہیں۔ یا اس ذکر سے جمروں کی رمی میں ہر کنکر پر اللہ اکبر کہنا مراد ہے تو یہ حکم استحبابی کہ اگرچہ جمروں کی رمی واجب مگر تکبیر سنت (احمدی)۔ ایام سے اشارۃً معلوم ہوا کہ رمی دن میں چاہیے نہ کہ رات میں۔ قربانی بھی دن میں ہی مستحب ہے اور اگر ذکر اللہ سے تکبیرِ تشریق مراد ہو تو ایام بمعنی اوقات ہوگا کہ یہ تکبیریں رات میں بھی ہوتی ہیں۔ معدودات سے بتایا کہ وہ دن بہت تھوڑے

ہیں۔اس سے مراد بقر عید کے بعد آنے والے تین دن گیارھویں، بارھویں اور تیرھویں تاریخ مراد ہیں۔

فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ : (يَوْمَيْن) سے بقر عید کے بعد کے دو دن یعنی گیارھویں بارھویں ذوالحج مراد ہیں اور (لَا اِثْمَ) میں ان لوگوں کی تردید ہے جو تیرھویں کا قیام ضروری جانتے تھے۔اگر چہ اب بھی مستحب یہی ہے کہ تیرھویں کی بھی رمی کرے۔یعنی جو کوئی بقر عید کے بعد صرف گیارھویں اور بارھویں دو دن ہی میں رمی کر کے جلد مکہ معظمہ واپس جانا چاہے یا واپس ہو جائے تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔

وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ : یعنی جو کوئی تیسرے دن تیرھویں ذوالحجہ کو بھی وہاں ٹھہرنا چاہے تو اس پر بھی کوئی گناہ نہیں بلکہ ثواب ہے۔

وَاتَّقُوا اللّٰه : تم ہمیشہ ہر حال میں اللہ سے ڈرتے رہو۔

وَاعْلَمُوْآ اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْن : یہی جانتے رہو کہ تم آخر کار سب جمع ہو کر رب ہی کی بارگاہ میں حاضری دو گے۔لہٰذا حاجی بننا یا حاجی نہ بننا بلکہ ہمیشہ تقویٰ اختیار کرنا۔

فوائد و مسائل:

(۱) نویں ذوالحجہ کی فجر سے تیرھویں کی عصر تک پنج گانہ نماز باجماعت کے بعد بآواز بلند ایک بار تکبیر کہنا واجب ہے اور تین بار مستحب۔(۲) دسویں ذوالحجہ کے بعد دو دن یعنی گیارھویں بارھویں کو منٰی میں قیام کرنا واجب اور تیرھویں کا قیام مستحب۔لیکن جو بارھویں کو لوٹنا چاہے وہ تیرھویں کی صبح صادق سے پہلے ہی وہاں سے چل دے تیرھویں کی صبح صادق تک ٹھہر جانے سے اس دن کی رمی بھی واجب ہو جاتی ہے۔(۳) مسئلہ گیارھویں، بارھویں میں زوال کے بعد رمی کرے۔مگر تیرھویں میں زوال سے پہلے بھی رمی کر کے لوٹ سکتا ہے۔مسئلہ قیام منٰی کی تاریخوں میں راتیں بھی منٰی میں گزارنا ضروری ہیں۔

ہمارا اسلام میں آنا اور اسلام کا ہم میں آنا

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا ادۡخُلُوۡا فِى السِّلۡمِ كَآفَّةً وَلَا تَتَّبِعُوۡا خُطُوٰتِ الشَّيۡطٰنِ اِنَّهٗ لَـكُمۡ عَدُوٌّ مُّبِيۡنٌ ۲۰۸ فَاِنۡ زَلَـلۡتُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡكُمُ الۡبَيِّنٰتُ فَاعۡلَمُوۡٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيۡزٌ حَكِيۡمٌ (سورۃ البقرۃ:۲۰۸)

''اے ایمان والو! اسلام میں پورے داخل ہو جاؤ۔ اور شیطان کے قدموں پر نہ چلو، بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ اگر اس کے بعد بھی پھسلو کہ تمہارے پاس روشن حکم آچکے تو جان لو کہ اللہ زبردست حکمت والا ہے''

شانِ نزول:

حضرت عبداللہ ابن سلام اور ان کے بعض ساتھی اسلام لانے کے بعد بھی شریعت موسوی کے بعض احکام پر قائم رہے۔ یوم السبت (ہفتہ) کی تعظیم کرتے اس دن شکار سے بچتے تھے۔ اونٹ کے دودھ اور گوشت سے پرہیز کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ چیزیں اسلام میں ضروری نہیں، محض جائز ہیں اور تورات میں سخت منع تو ان کے چھوڑ دینے سے اسلام کی مخالفت نہیں اور دین موسوی پر بھی عمل ہو جاتا ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس میں انہیں اس سے روکا گیا۔ (خزائن العرفان، مظہری، کبیر) بعض نے فرمایا کہ یہ آیت منافقین کے حق میں آئی انہیں دورنگی سے منع فرمایا گیا۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا: رب تعالیٰ کی سب سے بڑی نعمت، دنیا میں ایمان اور آخرت میں دیدار الٰہی اس لیے امنوا کہہ کر خطاب فرمایا۔ ممکن ہے کہ اس سے منافقین مراد ہوں اور ایمان سے ان کا زبانی

اسلام مراد ہو۔ حکم فرمایا(**اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً**) (اسلام میں پورے داخل ہو جاؤ) سلم کے معنی راضی ہونا مطمئن ہونا۔ صلح کرنا۔ جنگ چھوڑ دینا اور اطاعت وفرماں برداری کرنا ہیں۔ اسلام اور استسلام اسی سے بنا کیوں کہ مسلمان رب کی قضاء پر راضی اس کی مخالفت سے علیحدہ اور اس کا فرماں بردار ہوتا ہے اور یہاں اسلام ہی مراد ہے(کبیر) **کَآفَّۃً کف** سے بنا بمعنی روکنا اور آڑ آمدنی کو کفاف کہا جاتا ہے کہ وہ فقیری کو روکتی ہے، ہتھیلی کو کف اس لیے کہتے ہیں کہ اس سے مار دغیرہ روکی جاتی ہے نابینا کو مکفوف بھی اسی لیے کہتے ہیں۔ پوری چیز یا پورے اجتماع کو اسی لیے کافۃ کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے سارے افراد کو گھیر کر انہیں نکلنے سے روکتی ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہوا کہ تم سب اسلام میں داخل ہو جاؤ یا پورے اسلام میں آجاؤ اور اس کے سارے عقائد واعمال مان لو یعنی ہر حیثیت سے مسلمان بنو۔

وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ: (شیطان کے قدموں پر نہ چلو) (**تَتَّبِعُوا**) اتباع سے بنا بمعنی پیچھے چلنا خُطُوٰت خُطْوَہ (خ کے پیش سے) کی جمع ہے بمعنی دو قدموں کے درمیان کا فاصلہ یہاں اس سے راستہ مراد ہے چوں کہ شیطانی راستے بہت ہیں اس لیے جمع فرمایا۔

اِنَّہٗ لَکُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ: (بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے) کہ تمہارے والد آدم علیہ السلام کی بھی مخالفت کر چکا اب تمہارے پیچھے پڑا ہوا ہے۔

فَاِنْ زَلَلْتُمْ: یہ لفظ زَلَلٌ سے بنا بمعنی پھسلنا چکنی جگہ کو زِلَہ اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ پھسلن ہے یعنی اگر تم عقائد میں یا فرائض، واجبات اور مستحبات کسی عمل میں بھی سیدھے راستے سے ڈگمگائے۔

مِّنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْکُمُ الْبَیِّنٰتُ: یہ بینۃ کی جمع ہے بمعنی کھلی دلیل یا تو اس سے قرآنی آیتیں مراد ہیں یا حقانیتِ اسلام کے عقلی نقلی دلائل یا حضور علیہ السلام کے معجزات یا خود حضور علیہ السلام کی ذات کریم کیوں کہ ان کی ہر ادا رب کی دلیل اور ان کا ہر کمال مظہرِ شانِ ذوالجلال ہے۔ یعنی اگر تم قرآن کریم یا معجزات یا اسلام کی حقانیت کے دلائل یا خود نبی کریم ﷺ کے آنے کے بعد بھی اسلام سے ڈگمگائے تو۔

فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ: (جان لو کہ اللہ زبردست حکمت والا ہے) یعنی یہ وہم بھی نہ کرنا کہ تم رب کی پکڑ سے باہر ہو وہ تم پر ہر وقت غالب ہے اور تم ہر دم اس کے قبضہ میں اپنی حکمت سے ہی تمہیں کچھ مہلت دے کر تمہاری سخت پکڑ فرمائے گا۔ جس جرم کے بعد غفور رحیم یا ستار وغیرہ آوے تو اس میں اشارۃً فرمایا جاتا ہے کہ یہ گناہ بخش دیا جائے گا۔ اگر بعد میں (عزیزٌ ذو انتقام) یا (عزیزٌ حکیم) وغیرہ آوے تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس جرم کی سزا ضرور ملے گی۔

خلاصہ تفسیر:

اے مسلمانو! دورنگی سے بچو اور پلپلے پن سے دور رہو۔ اسلام میں ظاہراً باطناً پورے طور سے داخل ہو جاؤ مسلمان ہو کر دوسرے مذاہب یا کفار کی رعایت کیسی؟ مضبوط مسلمان بنو اور راہِ حق کو چھوڑ کر شیطانی راستے اختیار نہ کرو اور نہ اس کے قدموں پر چلو۔ کیوں کہ صرف تمہارا ہی کھلا دشمن ہے چوں کہ تمہاری وجہ سے ذلیل ہوا جنت سے نکالا گیا۔ اب وہ تمہیں جنت سے دور رکھنا اور ذلیل کرنا چاہتا ہے۔ دولت ایمان تمہارے پاس ہے جس کی تاک میں وہ ہے۔ تم غفلت سے کام نہ لو۔

فوائد:

۱۔ بدمذہبوں اور بے دینوں کی رعایت کرنا سخت جرم ہے۔ اونٹ کا گوشت کھانا اور ہفتہ کے دن شکار کرنا اسلام میں واجب نہیں۔ بہت سے مسلمان نہیں کرتے مگر چوں کہ عبداللہ بن سلام وغیرھم نے یہودیت کی رعایت کرتے ہوئے اس سے بچنا چاہا، عتابِ الٰہی آ گیا۔ اس رعایت کو شیطانی رعایت کہا گیا۔ مسلمان ہو کر کفر کی رعایت کیسی؟

۲۔ محفلِ میلاد شریف وغیرہ فرض یا واجب نہیں مگر جو کوئی کسی بدمذہب کی رعایت کرتے ہوئے

اس سے بچے اور کہے کہ اہلِ سنت کے نزدیک یہ واجب نہیں اور دیوبندیوں کے نزدیک حرام ہے لٰہذا اس سے بچنا بہتر ہے تو وہ بھی اسی آیت میں داخل ہے۔ آج کل بعض مسلمان اس بلا میں بہت گرفتار ہیں اللہ رحم فرمائے۔

۳۔ اس آیت میں بہت وسعت ہے سارے اسلامی عقیدے اور سارے اعمال اس میں داخل ہیں۔ داڑھی منڈانا، مشرکین کا سا لباس پہننے والا کفار کے سے نام رکھنے والا سب اس میں داخل ہیں۔ عقیدے بھی اسلامی اختیار کرو اور اعمال بھی اور صورت بھی مسلمانوں کی سی بناؤ اور سیرت بھی، نام بھی مسلمانوں کا سا رکھو اور کام بھی۔ زندگی، موت، شادی اور دیگر رسم و رواج سب اسلامی ہوں۔ غرض یہ کہ مسلمان کا مرنا جینا سب عین اسلام کے مطابق ہو۔

۴۔ ہر مسلمان اپنے اہلِ قرابت خصوصاً بال بچوں کو سچا مسلمان بنانے کی کوشش کرے کہ آیت کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ تم صرف اکیلے ہی مسلمان نہ بنو بلکہ سب مل کر مسلمان ہو جاؤ دوسری آیت میں ارشاد ہوا (قُوْا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا)

۵۔ انسان کو چاہیے کہ گناہ کبیرہ سے بھی بچے اور صغیرہ سے بھی۔ صغیرہ کو ہلکا جاننا بے وقوفی ہے کیوں کہ یہاں فرمایا گیا (زَلَلْتُمْ) اگر تم پھسل جاؤ جس میں صغائر بھی شامل ہیں۔

۶۔ بے خبری رب کے ہاں پکڑ نہیں دلائل آنے کے بعد جو پھسلے اس کی پکڑ ہے۔

۷۔ دلائل سے بے خبر رہنا عذر نہیں کیوں کہ یہاں دلائل آنے کا ذکر فرمایا گیا نہ کہ جاننے کا آج حقانیتِ اسلام کے بے شمار دلائل موجود ہیں جو اس سے غافل رہے وہ اس کا قصور ہے۔

۸۔ غیر ممنوع چیز کو منع جاننا بے دینی ہے اگر بدمذہب اس میں داخل ہیں کہ تمام امورِ خیر جنہیں شریعت نے حرام نہ کیا انہیں حرام جانتے ہیں۔ حلال چیز کو حرام کر لینا تقویٰ نہیں بلکہ حرام سے بچنا نیک کام کرنا تقویٰ ہے۔ اس سے وہ لوگ بھی غیرت پکڑیں جو ظاہری فقیر بن کر گوشت، نکاح وغیرہ سے بچتے ہیں مگر جھوٹ غیبت بھنگ وغیرہ سے نہیں بچتے۔ تقویٰ تو حضور سید عالم ﷺ کی پیروی میں ہے۔

فرضیت جہاد

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ وَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسَىٰ أَن تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ (سورۃ البقرۃ:۲۱۶)

"تم پر لڑنا فرض ہوا۔ اور وہ تمہیں ناگوار ہے اور یہ ممکن ہے کہ تم کسی امر کو گراں سمجھو اور وہ تمہارے حق میں بہتر ہو اور یہ ممکن ہے کہ تمہیں کوئی بات پسند آئے اور وہ تمہارے حق میں بُری ہو۔ اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے"

خلاصہ تفسیر:

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ: كُتِبَ بمعنی فُرِضَ ہے اور اس سے جہاد فرض فرمانا مقصود ہے۔ گویا یہ خبر حکم کے معنی میں ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس سے خبریت ہی مقصود ہو یعنی ابتداء سے ہی تمہارے ذمے جہاد لکھا گیا تھا۔ یعنی لوحِ محفوظ میں مرقوم تھا کہ امت مصطفیٰ ﷺ مجاہد جانباز اور سرفروش ہوگی یا تورات و انجیل وغیرہ کتب۔ سابقہ میں تمہارے اوصاف میں لکھا گیا تھا کہ نبی آخر الزماں ﷺ کی امت پر جہاد فرض ہوگا۔ لہٰذا یہ فرضیت جہاد تمہاری حقانیت کی ایسی ہی دلیل ہوگی جیسے تبدیلی قبلہ وغیرہ عَلَيْكُمُ ظاہر یہ ہے کہ اس حُکم کے مخاطب تمام مسلمان ہیں۔ اور کُتِبَ سے مراد فرض کفایہ ہے۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ خاص صحابہ کرام یا ان مسلمانوں سے خطاب ہو جن پر کفار چڑھائی کریں کہ اس صورت میں جہاد فرض عین ہے۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ سب مسلمانوں پر جہاد یا جہاد میں امداد دینا فرض ہو گویا قتال سے شراکت جہاد مراد ہے۔ (نعیمی، بحوالہ کبیر و در منشور)

مگر حق یہی ہے کہ قیامت تک ہر مسلمان پر جہاد فرض عین ہے مگر اس کی فرضیت کے لیے کچھ شرائط ہیں۔ جیسے نماز، روزہ، زکوٰۃ مسلمانوں پر فرض ہیں مگر اس کے ظہور کے لیے کچھ شرائط ہیں کہ فقیر پر فرضیت زکوٰۃ کا ظہور نہیں اور اسی طرح راستہ پُرخطر ہونے کی صورت میں فرضیت حج کا ظہور نہیں الحاصل فرضیت اور ظہور فرضیت میں فرق ہے۔ اور مذہب جمہور یہ ہے کہ جہاد (ابتداء میں) فرض کفایہ ہے (رُوح البیان) جب کچھ لوگ جہاد کے لیے کھڑے ہو جائیں تو اور لوگوں کے ذمہ سے ساقط ہو جاتا ہے جیسا کہ جنازہ کی نماز اور اسی پر اجماع ہو گیا ہے۔ اور سب ائمہ کا اس پر اتفاق ہے کہ تمام شہر والوں پر واجب ہے۔ جو کفار ان کے قریب ہوں ان سے جہاد کریں اگر ان سے نہ ہو سکے یا یہ ہمت ہار دیں تو پھر جو ان کے قریب کے مسلمان ہیں اور پھر ان سے جو قریب کے مسلمان ہیں (ان پر ان کی مدد کرنی واجب ہے) اور اس پر اتفاق ہے کہ جب جہاد کا اعلان عام ہو جائے اور کفار اسلامی شہروں پر چڑھ آئیں تو پھر ہر ایک شخص پر جہاد کرنا فرض ہے۔ اور اس پر بھی اتفاق ہے کہ جو شخص جہاد کے لیے متعین نہ ہو اور اس کے والدین مسلمان ہوں تو بلا ان کی اجازت کے یہ جہاد میں نہ جائے۔ اور جس کے ذمے قرض ہو وہ اپنے قرض خواہ کی اجازت کے بغیر نہ جائے۔ (مظہری) اس طرح مجاہد کی بوقت ضرورت مدد کرنا بھی فرض ہے۔

وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ: واؤ عاطفہ ہے اور جملہ اسمیہ کا عطف فعلیہ پر جائز اور ہو سکتا ہے کہ واؤ حالیہ ہو۔ کُرْہٌ اور کَرْہٌ کے ایک ہی معنی ہیں اور بعض نے فرمایا کُرْہٌ بضم بمعنی مجبوری اور کَرْہٌ بالفتح ناگواری اور بعض نے فرمایا عارضی مشقت کو کَرْہٌ اور دلی مشقت کو کُرْہٌ اور مفردات امام راغب میں ہے کہ کراہت کی دو قسمیں ہیں ایک من حیث الطبع اور ایک من حیث العقل یا الشرع اس لیے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ میں اس کُرْہٌ سے مراد طبعی مشقت اور گرانی ہے نہ کہ بمعنی ناراضگی کیوں کہ مسلمان رب کے حکم سے ناراض نہیں ہوتا۔ گو جہاد طبعاً گراں ہو۔ اور تفسیر کبیر میں یہ بھی فرمایا کہ یہ فرضیت جہاد سے پہلے کا حال بتایا جا رہا ہے۔ اس لیے کہ اس وقت

کثرت اعداء کا خوف تھا۔ یعنی اس سے پہلے تمہیں جہاد ناپسند تھا کہ تمہارے دشمن زیادہ تھے اور تم بظاہر کمزور تھے۔ مگر خیال رکھو کہ

وَعَسٰٓی اَنۡ تَكۡرَهُوۡا شَيۡئًا وَّهُوَ خَيۡرٌ لَّكُمۡ کسی چیز کا قریب ہونا بتاتا ہے شک کے لیے نہیں۔ عسٰی زیدٌ یعنی قَرُبَ زیدٌ قرآن کریم میں ہے کہ (عَسٰی اَنۡ یَّکُوۡنَ رَدِفَ لَکُمۡ) ای قَرُبَ معنی یہ ہے قریب ہے (ممکن ہے) کہ تم کسی چیز کو طبعاً پسند نہ کرو اور وہ در حقیقت تمہارے لیے فائدہ مند ہو اور اسی قسم سے جہاد ہے کیوں کہ اس میں فتح یابی مالِ غنیمت کا حصول دنیا پر قبضہ ہونا حصولِ شہادت اور ثواب ملنا سب ہی بھلائیاں ہیں۔

وَعَسٰٓی اَنۡ تُحِبُّوۡا شَيۡئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمۡ: (اور ممکن ہے کہ ایک چیز تمہیں اچھی معلوم ہو اور وہ تمہارے حق میں بری ہو) جیسے جہاد سے بیٹھ رہنا کیوں کہ اس میں گناہ، ذلت اور ثواب اور مالِ غنیمت سے محروم رہنا ہے۔

وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ وَاَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ: اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے یعنی اللہ تمہاری بھلائی برائی جانتا ہے تم ظاہر پر مائل ہوتے ہو اور حقیقت کا علم رب کو ہے۔ لہٰذا اس کے احکام کی ادائیگی میں جلدی کرو تا کہ تمہیں ایسی چیز نصیب ہو جائے جو کہ دین و دنیا میں تمہارے حق میں بہتر ہو۔

یاد رہے! جنگ وقتال کی چار قسمیں ہیں ۱۔ جنگ شیطانی ۲۔ جنگ نفسانی ۳۔ جنگ روحانی ۴۔ جنگ رحمانی۔ فساق کا حرام چیز پر لڑنا جنگ شیطانی ہے جیسے غیر عورت کے عشاق جوارئیے، شرابی آپس میں ان چیزوں کے حصول کے لیے لڑیں اور دن رات دنیاوی لڑائیاں جو کہ جائیداد زمین مال و متاع کے لیے لڑی جاتی ہیں وہ جنگ نفسانی ہیں اور مسلمانوں کا کفار سے اعلائے کلمۃ اللہ اور فروغ اسلام کے لیے لڑنا جنگ رحمانی ہے اور محض رب تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لیے کفار سے لڑنا جنگ روحانی ہے۔ یہاں آیت میں جنگ رحمانی کا ذکر ہے۔ (نعیمی)

(فضائل جہاد)

حضرت ابن مسعود کہتے ہیں میں نے پوچھا یا رسول ﷺ سب سے افضل عمل کونسا ہے فرمایا وقت پر نماز ادا کرنا۔ میں نے کہا پھر کونسا فرمایا ماں باپ کو آرام دینا۔ میں نے کہا اس کے بعد فرمایا اللہ کی راہ میں جہاد کرنا۔ ابن مسعود (رضی اللہ عنہ) کا قول ہے کہ میں نے بس اتنا ہی پوچھا اور اگر میں اور پوچھتا تو آپ ﷺ اور بھی فرماتے۔ (بخاری)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ سے سوال کیا گیا کہ سب عملوں سے افضل کون سا عمل ہے۔ آپ نے فرمایا اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانا۔ عرض کیا گیا پھر کونسا۔ فرمایا راہ خدا میں جہاد کرنا۔ عرض کیا گیا پھر کونسا آپ ﷺ نے فرمایا حج مقبول (متفق علیہ) اور یہ حدیث اگرچہ پہلی حدیث کے معارض ہے کیوں کہ پہلی حدیث سے معلوم ہوتا تھا کہ نماز جہاد سے افضل ہے۔ اور اس حدیث سے اس کے برعکس معلوم ہوا لیکن ان دونوں کے معنی اس طرح بن سکتے ہیں کہ حضور ﷺ کا ارشاد ہر سائل کے حال کے موافق تھا اور جو جس کے حق میں بہتر ہوا آپ ﷺ نے وہی فرمایا یا یہ کہا جائے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ایمان کے لفظ سے فرض نماز اور فرض زکوۃ مراد ہے اب کوئی تعارض نہیں رہتا یا یوں کہا جائے کہ ایمان کے بعد جہاد کرنا درست ہے اگرچہ جہاد نماز اور زکوۃ کے بعد ہے۔ عمران بن حصین سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ آدمی کا صرف جہاد میں کھڑے ہونا اللہ تعالیٰ کے نزدیک ساٹھ برس کی عبادت سے بہتر ہے۔ یہ حدیث حاکم نے روایت کی اور کہا کہ بخاری کی شرط کے موافق صحیح ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے مرفوعا روایت کرتے ہیں کہ تم سے ایک کا راہ خدا میں (ایک دفعہ) کھڑا ہونا اپنے گھر میں ستر برس نماز پڑھنے سے افضل ہے (ترمذی)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ کسی نے حضور علیہ السلام سے پوچھا یا رسول اللہ جہاد کے برابر بھی کوئی عمل ہے۔ فرمایا تم میں اس کی طاقت نہیں ہے۔ اس نے دو تین مرتبہ

پوچھا حضورﷺ یہی فرماتے رہتے کہ تم میں اس کے کرنے کی طاقت نہیں ہے۔ پھر فرمایا کہ جو شخص خدا کی راہ میں جہاد کرتا ہے اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو (ہر وقت) کھڑا ہوا قرآن شریف پڑھ رہا ہے۔ اپنے نماز روزہ میں ہرگز فرق نہیں آنے دیتا (یہ مثال مجاہد کی ہے) یہاں تک کہ وہ جہاد سے واپس آجائے (متفق علیہ)

حضرت ابوامامۃ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دستہ فوج میں ہم رسول اللہﷺ کے ساتھ چلے۔ دستہ میں ایک صحابی کا ایک ایسے غار پر سے گذر ہوا جہاں پر کچھ سبزہ اور پانی تھا (وہ جگہ ان کو پسند آگئی) انہوں نے سوچا کہ پس تارک الدنیا ہو کر اب یہیں رہا کریں گے پھر نبی کریمﷺ سے اجازت چاہی تو آپ نے فرمایا کہ میں یہودی یا نصرانی بنانے کے لیے نہیں بھیجا گیا۔ بلکہ میں ایک صاف ستھرا دین دے کر بھیجا گیا ہوں اور قسم ہے۔ [1]اس ذات کی جس کے قبضے (قدرت) میں محمدﷺ کی جان ہے کہ صرف صبح یا شام جہاد میں نکلنا ساری دنیا اور مافیھا سے بہتر ہے۔ اور صرف جہاد میں (فقط ایک دفعہ) تمہارا کھڑا ہونا ساٹھ برس کی نماز سے بہتر ہے۔ (یہ حدیث امام احمد نے نقل کی)

میں کہتا ہوں یہ سب احادیث نفلی نماز روزہ سے جہاد کے افضل ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جہاد فرض کفایہ ہے جب ایک نے ادا کر دیا تو اس کی فرضیت ادا ہو گئی اور وہ ہر وقت ادا ہو سکتا ہے اور جہاد شہادت کا ذریعہ بھی ہے جو نبوت کے قریب قریب ہے۔ بخلاف نماز و روزہ کے یہ دونوں غیر وقت میں ادا کرنے سے نفل ہی ہوتے ہیں اور نفل فرض کے برابر نہیں ہو سکتے۔ اگر کوئی کہے کہ حضورﷺ نے فرمایا کہ آدمی کو اللہ کے عذاب سے بچانے والا سوائے ذکر الٰہی کے کوئی عمل نہیں ہے۔ صحابہ نے عرض کیا اور نہ جہاد فرمایا اور نہ جہاد۔ اگرچہ (کفار) پر اس قدر تلوار چلائی جائے کہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں یہ الفاظ آپ نے تین دفعہ فرمائے۔ [1] یہ حدیث امام احمد، طبرانی، ابن ابی شیبہ نے معاذ کی سند سے نقل کی ہے۔ یہ حدیث ان مندرجہ بالا تین حدیثوں (جو حضرات عمران، ابو ہریرہ، ابوامامۃ سے منقول ہو چکی ہیں) معارض ہے تو ان

دونوں کے معنی باہم موافق ہو جانے کی کیا صورت ہے۔ ہم کہتے ہیں۔ اس حدیث میں ذکر سے مراد وہ حضور دائمی ہے جس میں کبھی کمی نہیں ہوتی نہ وہ نماز اور روزہ جو زاہد لوگوں کا حصہ ہیں اور یہی جہاد اکبر سے مراد ہے۔ اس روایت میں ہے کہ حضور سید عالم ﷺ نے ایک غزوہ سے لوٹتے ہوئے فرمایا (رجعنا من الجهاد الاصغر الى الجهاد الاكبر) (یعنی ہم جہاد اصغر سے جہاد اکبر کی طرف لوٹتے ہیں) اگر کوئی کہے کہ جس وقت آپ ﷺ جہاد اصغر میں تھے تو کیا جہاد اکبر میں مشغول نہ تھے۔

ہم کہتے ہیں۔ ہاں اس میں بھی مشغول تھے۔ لیکن زیادہ اہتمام کرنے کی وجہ سے حال مختلف ہو جاتا ہے (اس لیے پہلے گویا جہاد اصغر کا اہتمام زیادہ تھا اور اب جہاد اکبر کا زیادہ اہتمام ہوگا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ مرفوعاً روایت کرتے ہیں کہ سید عالم ﷺ نے فرمایا جنت میں سو درجہ ہیں جو اللہ تعالیٰ نے راہ خدا میں جان دینے والوں کے لیے تیار کیے ہیں اور ہر دو درجوں کا درمیانی فاصلہ اس قدر ہے جیسا آسمان اور زمین کے درمیان میں ہے۔ پس جس وقت اللہ سے سوال کرنا چاہو تو فردوس کا سوال کیا کرو کیوں کہ وہ سب جنتوں کے درمیان اور سب سے اعلیٰ درجہ کی ہے اور اس کے اوپر خدا تعالیٰ کا عرش ہے اور وہیں سے جنت کی نہریں آتی ہیں۔ (بخاری)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ روپے پیسے، روٹی کپڑے کے بندے کا ناس ہو کہ اگر اسے یہ (دنیا) مل گئی راضی ہو گیا اور نہ ملی تو ناراض ہے۔ خوشی اس بندے کے لیے ہے جو جہاد میں اپنے گھوڑے کی باگ تھامے رہا اس کے بال بکھرے ہوئے ہیں پیروں پر ریتا چڑھا ہوا ہے۔ اگر پہرہ داروں میں ہے تو وہیں ہے۔ اگر مقدمۃ الجیش میں ہے تو وہیں ہے۔ اگر کسی کے پاس داخل ہونے کی اجازت چاہتا ہے تو اجازت نہیں ملتی اور اگر کسی کی سفارش کرتا ہے تو کوئی قبول نہیں کرتا (بخاری)

اصل میں جہاد کو تمام حسنات پر اس وجہ سے فضیلت دی گئی اور کوہان اسلام اس کو اس وجہ سے کہا گیا کہ یہ اسلام کی اشاعت اور خلق (اللہ) کی ہدایت کا سبب ہے۔ پس جس شخص کو کسی مجاہد کی کوشش

کے سبب سے یہ ہدایت ملی تو اس کی نیکیاں بھی اس مجاہد کی نیکیوں میں لکھی جائیں گی۔ اور علوم ظاہرہ وباطنہ کی تعلیم دینا اس سے بھی افضل ہے کیوں کہ اس میں اسلام کی حقیقت کی اشاعت ہے (تفسیر مظہری)

(جہاد کے عقلی فوائد)

۱۔ جہاد سے دنیاوی رغبت کم اور عقبیٰ کی طرف میلان زیادہ ہوتا ہے جو کے اطاعت کی اصل ہے۔

۲۔ سپاہیانہ زندگی بقاء کا ذریعہ ہے نہ کہ عیش کی زندگی کم زور مہاجن سپاہی کے بل بوتے پر زندہ رہتا ہے اور سپاہیانہ زندگی جہاد سے حاصل ہوتی ہے۔

۳۔ اگر دشمن کو ہماری بزدلی کا پتہ چل جاوے تو ہم کو پیس دے۔ کیونکہ طاقتور کمزور سے ہر بات منوا سکتا ہے۔ لیکن اگر ہم طاقتور ہونگے تو دشمن یا تو ہماری اطاعت پر مجبور ہو گا یا ہم سے دور ہی رہے گا۔

۴۔ جیسے انسان میں آگ، پانی، ہوا، مٹی چار دشمن جمع ہیں انہی کے اجتماع کا نام مزاج ہے۔ اس نظام کے قیام کے لیے قوت وطاقت کی ضرورت ہے۔ صدہا مقویات یا اسی طاقت کے لیے استعمال کرائی جاتی ہے۔ اگر جسم میں طاقت نہ ہو تو ہر بیماری دبا لیتی ہے۔ نزلہ عضو ضعیف پر گرتا ہے۔ ایسے ہی دنیا میں مختلف انسان جمع ہیں اور ایمان کے بہت دشمن۔ اگر مسلمانوں میں طاقت نہ ہو تو دشمن ہلاک کر ڈالیں۔ ضروری ہے کہ ایمانی مقویات کا استعمال رہے۔ اور وہ جہاد ہے۔

۵۔ آج یورپ والوں کا غلبہ ہے اور حکومت بھی صرف اس لیے کہ ان کے پاس قوت ہے۔ موجودہ مسلمان اسی لیے کمزور ہو گئے کہ ان میں جہاد کی طاقت نہ رہی۔

۶۔ گلے عضو کو کاٹ دینا، کھیت سے خودرو گھاس کو اکھاڑ ڈالنا جسم اور کھیتی کی اصلاح ہے۔ طاقتِ کفر کو زائل کر دینا ایمان کی کھیتی کی حفاظت ہے اور یہ بات جہاد سے ہی حاصل ہوگی۔

۷۔ جہاد سے ہی امن وامان کا قیام ہے اسی سے نسلِ انسانی کی بقاء، چوروں کو سزا دینا ملک کا امن ہے۔

ہر بات میں عقل کو دخل نہ دینا چاہیے۔ بہت سی باتیں بظاہر خلافِ عقل ہوتی ہیں مگر مفید۔ اس آیت سے نئے تعلیم یافتہ عبرت پکڑیں۔ شریعت کے اسرار معلوم کرنا اچھا ہے مگر عقل محض کی اطاعت بُری۔ اطاعت اللہ ورسول ہی کی کرو خواہ عقل میں آئے یا نہ آئے۔

ع عقل قربان کن بہ پیشِ مصطفیٰ علیہ السلام

عقلِ انسانی برائی بھلائی کے پہچاننے میں کافی نہیں۔ اس کے لیے معیار شرعی کی ضرورت ہے۔ اسی لیے انبیائے کرام علیہم السلام کو بھیجا گیا دیکھو اس آیت کریمہ میں سارے عاقلوں سے خطاب ہے۔ ہوسکتا ہے کہ تم کسی چیز کو اچھا سمجھو اور وہ بُری ہو اس لیے عقل پر ان چیزوں کا بھی مدار نہیں۔

حرمت والے مہینے چار ہیں

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

یَسۡئَلُوۡنَکَ عَنِ الشَّھۡرِ الۡحَرَامِ قِتَالٍ فِیۡہِ قُلۡ قِتَالٌ فِیۡہِ کَبِیۡرٌ وَصَدٌّ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَکُفۡرٌ بِہٖ وَالۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ وَاِخۡرَاجُ اَھۡلِہٖ مِنۡہُ اَکۡبَرُ عِنۡدَ اللّٰہِ وَالۡفِتۡنَۃُ اَکۡبَرُ مِنَ الۡقَتۡلِ وَلَا یَزَالُوۡنَ یُقَاتِلُوۡنَکُمۡ حَتّٰی یَرُدُّوۡکُمۡ عَنۡ دِیۡنِکُمۡ اِنِ اسۡتَطَاعُوۡا وَمَنۡ یَّرۡتَدِدۡ مِنۡکُمۡ عَنۡ دِیۡنِہٖ فَیَمُتۡ وَھُوَ کَافِرٌ فَاُولٰٓئِکَ حَبِطَتۡ اَعۡمَالُھُمۡ فِی الدُّنۡیَا وَالۡاٰخِرَۃِ وَاُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ھُمۡ فِیۡھَا خٰلِدُوۡنَ (سورۃ البقرۃ:۲۱۷)

تم سے پوچھتے ہیں ماہ حرام میں لڑنے کا حکم۔ تم فرما دو اس میں لڑنا بڑا گناہ ہے۔ اور اللہ کی راہ سے روکنا اور اس پر ایمان نہ لانا اور مسجد حرام سے روکنا اور اس کے بسنے والوں کو نکال دینا اللہ کے نزدیک یہ گناہ اس سے بھی بڑے ہیں اور ان کا فساد قتل سے سخت تر ہے۔ اور ہمیشہ تم سے لڑتے رہیں گے یہاں تک کہ تمہیں تمہارے دین سے پھیر دیں اگر بن پڑے''

شانِ نزول:

ہجرت کے دوسرے سال جنگِ بدر سے دو مہینہ پہلے حضور ﷺ اپنے پھوپھی زاد عبداللہ ابن جحش رضی اللہ عنہ کو چند صحابہ کے ہمراہ کفار کی خبر لینے بھیجا۔ یہ جمادی الاخری کی آخری تاریخ تھیں۔ قریش کا ایک قافلہ تجارتی سامان لیے ان کے سامنے سے گزرا۔ تو ان حضرات نے مشورہ کیا کہ آج جمادی الاخری کی آخری تاریخ ہے اور آج شام کو رجب کا چاند ہو جائے گا جس سے جنگ حرام ہو جائے گی۔ چناں چہ انہوں نے قافلہ پر حملہ کر کے عمرو بن حضرمی کو قتل کر دیا لیکن

دن رجب کی پہلی تھی چاند انتیس کا ہو چکا تھا مگر ان حضرات کو پتہ نہ چل سکا۔ اس پر کفارِ عرب نے شور مچا دیا کہ مسلمانوں نے ماہ حرام کی بھی عظمت نہ کی شدہ شدہ یہ خبر حضور علیہ السلام کو بھی ملی آپ نے حضرت عبداللہ بن جحش سے فرمایا کہ میں نے تم کو کفار کی خبر لینے بھیجا تھا تم نے جنگ کیوں کی؟ تو انہوں نے عرض کی جو کچھ ہوا غلطی سے ہوا۔ اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ (درمنشور، رُوح البیان)

تفسیر:

(یَسْئَلُوْنَکَ) (آپ سے پوچھتے ہیں) یعنی اے محبوب یہ عبداللہ اور ان کے ساتھی مجاہدین یا کفار عرب آپ سے پوچھتے ہیں (عن الشھر الحرام) (حرمت والے مہینوں کے بارے میں) حرام سے محترم مہینہ مراد ہے، جس میں جنگ و جدال ناجائز ہے وہ چار مہینے ہیں۔ رجب، ذی قعد، ذی الحجہ اور محرم یعنی یہ لوگ محترم مہینے کے متعلق پوچھتے ہیں۔ (قِتَالٍ فِیْہِ) یہ شہر حرام کا بدل کا اشتمال ہے۔ یعنی ماہ حرام میں لڑنا کیسا ہے۔ (قُلْ قِتَالٌ فِیْہِ کَبِیْرٌ) جواب تو رب نے دیا مگر حضور سے کہلوایا۔ کیوں کہ سوال بھی آپ ہی سے تھا۔ کبیر کے معنی ہیں بڑا مگر بڑی برائی پر یہ لفظ خصوصیت سے بولا جاتا ہے۔ جیسے a ﴿کَبُرَتْ کلمۃ﴾ اسی لیے بڑے گناہ کو کبیرہ کہتے ہیں۔ یعنی آپ فرما دو کہ اس ماہ حرام میں (عمداً) جنگ بُری ہے۔ لہٰذا اس میں حضرت عبداللہ کی بے قصوری بیان ہوئی۔ اب معترضین کی طرف اشارہ کر کے ان کے چار عیب بیان فرمائے جا رہے ہیں۔ ایک یہ کہ (وَصَدٌّ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ) صد کے معنی پھرنا، رک جانا اور دوسرے کو پھیرنا اور روک دینا۔ سبیل اللہ سے مراد اسلام ہے یعنی اسلام سے باز رہنا یا اوروں کو روکنا خیال رہے یہ کہ کسی کو اسلامی عقائد یا اعمال سے قولاً یا فعلاً روکنا طریقہ کفار ہے اور بہت بُرا۔ اس میں بڑی وسعت ہے۔ کسی کو نماز کے وقت باتوں میں لگا کر مسجد نہ جانے دینا۔ اولاد کو اسلامی راستے سے روک کر انہیں صرف کالج سینما کی طرف بھیج دینا۔ اپنے گھر والوں کو اچھے کام کی رغبت نہ دینا یہ

سب اسی میں داخل ہیں۔

دوسرے (وَكُفْرٌ بِهٖ) یہ صد پر معطوف ہے۔ بہ کا مرجع لفظ اللہ ہے۔ یعنی اللہ کا انکار کرنا اگرچہ کفار عرب رب کے منکر نہیں تھے مگر ابنیائے کرام اور آسمانی کتابوں کا انکار گویا رب ہی کا انکار ہے۔

تیسرے (وَالْمَسْجِدَ الْحَرَامِ) یہ سبیل اللہ پر معطوف ہے اور مسجد حرام سے مراد کعبہ معظمہ یا شہر مکہ مکرمہ یعنی مسجد حرام سے نبی ﷺ اور مسلمانوں کو روکنا اور انہیں وہاں نماز ادا کرنے اور عمرہ سے محروم کر دینا۔

چوتھے (وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ) ان دونوں ضمیروں کا مرجع مسجد حرام ہے۔ اور اہل سے نبی کریم ﷺ اور مہاجرین مراد ہیں۔ یعنی مسجد حرام والوں کو وہاں سے نکالنا (اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ) یعنی اللہ کے نزدیک یہ چار گناہ ماہ حرام میں جنگ کرنے سے بدتر ہیں کیوں کہ کفر وغیرہ بے دینی ہے اور یہ جنگ فقط گناہ۔ نیز ان مسلمانوں نے غلطی سے جنگ کی تم یہ گناہ جان بوجھ کر کرتے ہو نیز تمہاری حرکتیں دین حق میں فتنہ ہیں اور وہ جنگ دین کی خدمت (وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ) الفتنة میں الف لام مضاف الیہ کے عوض اور القتل میں عہدی یعنی اے کفار تمہارے یہ فتنے ایسے قتلوں سے بڑھ کر گناہ ہیں۔ یہاں فتنہ سے مراد کفر ہے یا کفار کو مسلمانوں کا ایذا دینا یا انہیں وہاں سے نکالنا یا ملک میں ناحق فساد پھیلانا وغیرہ۔

وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ :یزالون زوال سے بنا جس کے معنی ہیں ہٹنا اور مٹنا اس پر لا داخل ہو کر ہمیشگی کے معنی پیدا ہو گئے۔ یعنی یہ کفار تمہارے ساتھ جنگ کرنے سے باز نہ آئیں گے بلکہ ہمیشہ کرتے رہیں گے خواہ گرم جنگ لڑیں شمشیر سے یا سرد جنگ لڑیں تدبیر سے بہر حال تمہارے دین کے پیچھے پڑے رہیں گے۔ دیکھو آج سے دوسو (۲۰۰) برس پہلے مسلمانوں کی ایمانی قوت کیسی تھی اور آج یہود و ہنود اور دیگر یورپین اقوام کی سازشوں سے ہم کیا ہو گئے، صورتیں، سیرتیں سب ہی بگڑ گئیں یہ ان کی سرد جنگ ہے۔

حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا : یہاں حتٰی یا تو بمعنی کَی ہے (روح البیان) یا انتہا کے لیے ہے۔ (یَرُدُّوا) رَدٌّ سے بنا جس کے معنی ہیں کسی چیز کو ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف پھیرنا (استطاعوا) طوعٌ سے بنا بمعنی فرماں برداری طاقت کو استطاعت اسی لیے کہتے ہیں کہ طاقتور کی فرماں برداری کی جاتی ہے۔ یعنی یہ کفار تمہیں تمہارے دِین سے پھیرنے کے لیے تم سے لڑتے ہی رہیں گے اگر یہ طاقت رکھیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ کفار تمہاری جان مال عزت کے ہی دشمن نہیں بلکہ وہ تمہارے ایمان کے دشمن ہیں۔ جس طرح ہو سکے گا تمہیں اسلام سے ہٹائیں گے تو جیسے تم جان وایمان کی حفاظت کے لیے مضبوط عمارتیں بناتے ہو حکومتیں تمہاری حفاظت کے لیے پولیس وغیرہ رکھتی ہے ایسے ہی تم ایمان کی حفاظت کے لیے مضبوط قلعوں میں رہو۔ اولیاء علماء تمہاری حفاظتی پولیس ہیں ان کے سایہ میں رہو۔ (نعیمی)

فوائد:

۱۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنھم بارگاہِ الٰہی میں ایسے مقبول ومحبوب ہیں کہ ان کے فعل پر اعتراض ہو تو رب تعالیٰ ان کی صفائی بیان فرماتا ہے کہ وہ گناہ گار نہیں تم غلطی پر ہو۔

۲۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کے اعمال اور ان کی نیتوں پر اعتراض کرنا طریقہ کفار ہے۔ اور ان کی صفائی بیان کرنا سنتِ الٰہیہ الحمدللہ اہلِ سنت والجماعت سنتِ الٰہیہ پر عامل ہیں۔

۳۔ اللہ تعالیٰ دشمنانِ صحابہ کے عیب کھول دیتا ہے۔ جیسے ولید ابن مغیرہ کے دس عیب کھولے، (عتل بعد ذالک زنیم) ایسے یہاں ان معترضین کے چار عیب بیان فرمائے۔

۴۔ کافر مسلمان سے کبھی بھی محبت نہیں کرسکتا۔ وہ تو مسلمانوں کے ایمان کا دشمن ہے ان کو راضی کرنے کی کوشش بے کار ہے۔ سب کو راضی نہ کرو، رب کو راضی کرو۔

مسئلہ: اکثر علماء کے نزدیک اب اشہرِ حرم میں کفار سے ممانعتِ جنگ کا حکم منسوخ ہو چکا ہے (رُوح المعانی، مدارک، شرح سیر کبیر، جصاص، خازن وغیرہ) اور معروف مفسر عطاء سے مروی ہے کہ حرم اور اشہرِ حرم میں اب بھی جنگ کی ابتداء منع ہے۔ ہاں مدافعانہ جنگ ہو سکتی ہے۔ ابن ہمام صاحب فتح القدیر نے اس حرمت کے منسوخ ہونے پر چند عمومات سے استدلال کیا ہے۔ مثلاً (اُقْتُلُوا المشر کین کافۃ) اور آنحضرت ﷺ کا یہ فرمانا (امرت ان اقاتل الناس حتّٰی یقولوا لا الٰہ الا اللّٰہ) ح / صاحب مظہری نے بحمایتِ عطا اس کا یہ جواب دیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ استدلال ٹھیک نہیں ہے۔ کیوں کہ ان آیتوں کا عام ہونا مکلفین اور ان کے احوال کے بارے میں ہے نہ کہ زمانوں کی بابت کہ اس میں اشہرِ حرم داخل ہو جائیں اور ان پر منسوخ ہونے کا حکم لگ جائے۔ بلکہ اگر زمانوں کا عموم ثابت ہو گا تو اقتضاء النص سے ہو گا اور اقتضاء النص یہاں ہے نہیں۔ لہٰذا اس میں تخصیص اور نسخ جاری نہیں ہو سکتا اور اشہرِ حرم میں قتل و قتال کی حرمت منسوخ ہونے کا کوئی کس طرح دعویٰ کر سکتا ہے حالاں کہ خود اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ (اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ مِنْهَا اربعۃ حرم ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ) (یعنی بے شک مہینوں کا شمار اللہ کے نزدیک اللہ کی کتاب میں بارہ (۱۲) مہینے ہیں۔ جس دن کہ اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ان میں چار (مہینے) حرمت والے ہیں۔ یہ مضبوط دین ہے پس ان مہینوں میں (قتل و قتال کر کے) اپنی جانوں پر ظلم نہ کرو) (وَقَاتِلُوا المشر کینَ کافۃ یقاتلونکم کافۃ واعلمو ان اللّٰہ مع المتقین انما النسئی زیادۃ فی الکفر یضل بہ الذین کفروا یحلونہ عاماً ویحرمونہٗ عاماً لیوا طئو عدۃ ما حرم اللّٰہُ فیحلوا ما حرم اللّٰہ زین لھم سوء اعمالھم واللّٰہ لایھدی

القوم الکفرین) (یعنی اور تمام مشرکوں سے لڑو جس طرح وہ تم سب سے لڑتے ہیں اور جان لو کہ اللہ پرہیزگاروں کے ساتھ ہے۔ سوا اس کے نہیں کہ (مہینے) کا آگے پیچھے کر لینا کفر میں زیادتی ہے، جو لوگ کافر ہیں اس کے ذریعہ سے گمراہ کیے جاتے ہیں۔ ایک سال (تو) وہ اس (مہینہ) کو حلال کر لیتے ہیں اور دوسرے سال اسے حرام کر لیتے ہیں تاکہ ان مہینوں کا شمار پورا کر لیں جن کو اللہ نے حرام کیا ہے۔ اور جو اللہ نے حرام کیا ہے اسے (اس تدبیر سے) حلال کر لیں ان کے لیے ان کے برے کام زینت دیئے گئے ہیں۔ اور اللہ کافروں کو ہدایت نہیں کرتا) یہ آیت قتال کی آیتوں میں سب سے آخر میں نازل ہوئی اور یہی آیت سیف ہے جو ۹ ہجری کے آخر میں نازل ہوئی اور اس میں ان مہینوں کے حرام ہونے کا ذکر ہے لہٰذا اس سے یہ خصوصیت ثابت ہوئی کہ ان مہینوں کے سوا ہی میں قتل و قتال کرنا واجب ہے (ان میں جائز نہیں) واللہ اعلم۔ اس کے علاوہ حضور ﷺ کی وفات سے دو مہینے پہلے حجۃ الوداع میں بقرعید کے روز کا خطبہ جو حضور ﷺ نے پڑھا تھا ان اشہرِ حرم میں قتل و قتال کرنے کی حرمت پر دلالت کرتا ہے۔ کیوں کہ اس میں آپ (ﷺ) نے فرمایا تھا۔ (یاد رکھو! زمانہ پھر اسی حالت پر آ گیا ہے کہ جس حالت پر آسمان و زمین پیدا ہونے کے دن تھا۔ سال کے بارہ مہینے ہوتے ہیں ان میں سے چار مہینے حرام ہیں تین پے در پے ذی قعدہ، ذی الحجہ، محرم اور ایک (ان سے علیحدہ) یعنی رجب اسی حدیث کے آخر میں فرمایا کہ تمہارے خون تمہارے مال تمہارے اسباب ایک کے دوسرے پر ایسے حرام ہیں جیسے تمہارے اس شہر اور اس مہینے میں آج کے دن کی حرمت ہے) یہ حدیث حضرت ابوبکر کی سند سے متفق علیہ ہے۔

ابن ہمام کہتے ہیں کہ ماہ ذوالحجہ کی بیسویں (۲۰) تاریخ کو حضور ﷺ نے طائف کا محاصرہ کیا تھا۔ اور یہ محاصرہ محرم کے آخر تک رہا۔ غرض یہ ہے کہ اس آیت کا منسوخ ثابت ہوتا ہے اور یہ

قول ٹھیک نہیں کیوں کہ طائف کا محاصرہ ماہ شوال ۸ ہجری میں ہوا تھا۔ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ فتح مکہ کے سال ماہِ رمضان شریف کی دوسری تاریخ کو ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مدینے سے چلے تھے۔ یہ روایت امام احمد نے صحیح سند کے ساتھ نقل کی ہے۔ بیہقی نے زہری سے صحیح سند کے ساتھ روایت کی ہے کہ رمضان شریف کی تیرھویں تاریخ کو حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے مکہ پر فتح پائی تھی...... خلاصہ یہ ہے کہ اشہر حرم کی حرمت کا منسوخ ہونا ثابت نہیں ہوا۔ واللہ اعلم

ہاں! یہ آیت اس آیت سے منسوخ ہے جو پہلے گزر چکی ہے کہ (الشهر الحرام بالشهر الحرام والحرمات قصاص فمن اعتدیٰ علیکم فاعتدوا علیه بمثل مااعتدی علیکم) کیوں کہ یہ آیت اشہرِ حرم میں قتل وقتال کے مباح ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ ایسی حالت میں کہ جنگ کی ابتداء کفار کی طرف سے ہو کیوں کہ یہ آیت جنگِ بدر سے پہلے نازل ہوئی اور وہ آیت عمرہ قضاء ۷ ہجری میں نازل ہوئی۔ پس! اشہر حرم میں (مسلمانوں کو) جنگ شروع کرنی حرام ہی رہی۔ (واللہ اعلم) (تفسیر مظہری)۔ یہ صاحب مظہری کی اپنی رائے ہے جسے ہم نے کل علم کے لیے من وعن درج کر دیا تاہم ہمارے نزدیک قولِ محقق اور مفتی بہ وہی مروی ہے جسے صاحب شرح سیرِ کبیر عنایہ فتح القدیر نے بیان فرمایا کہ یہ حکم منسوخ ہے۔ اور زادالمعاد میں ابن قیم جوزی سے لکھا کہ ائمہ اربعہ کے نزدیک شہر حرام میں جنگ کی ممانعت منسوخ ہے۔ (ماجدی بحوالہ زادلمعاد)۔ بدائع صنائع جلد ۷ صفحہ ۱۰۰ میں ہے (ولهم ان يقاتلوهم وان لم يبدؤ بالدعوة بقول الله تعالىٰ اقتلوا المشركين حيث وجدتموهم سواء كان فى الاشهر الحرم اوفى غيرها لان حرمة القتال صارت منسوخة باية السيف وغيرها من آيات القتال) اور اسی طرح مبسوط امام سرخی میں اشہر حرم میں حرمت قتال کے نسخ پر دلائل قائم کیے ہیں۔ (صفحہ ۲۶/ج ۹)

مرتد کی تعریف اور مرتد کا شرعی حکم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (سورۃ البقرۃ:۲۱۷)

''اور تم میں جو کوئی اپنے دین سے پھرے پھر کافر ہو کر مرے تو ان لوگوں کا کیا اکارت گیا۔ دنیا اور آخرت میں وہ دوزخ والے ہیں انہیں اس میں ہمیشہ رہنا ہے۔''

تعلق:

اس جملہ سے پہلے جملہ میں فرمایا گیا تھا کہ کفار تمہیں اسلام سے پھیرنے کی کوشش کریں گے۔ اب اسلام سے پھرنے کی سزا کا ذکر فرمایا جا رہا ہے۔ (۲) پہلے جز میں کفار کے مسلمانوں کو دین سے پھیرنے کا ذکر تھا۔ اب بتایا جا رہا ہے کہ جو کوئی ان کے بہکانے میں آ جائے پھر بھی موت سے پہلے اسلام میں آ سکتا ہے مرنے سے پہلے اس کے لیے دروازہ رحمت کھلا ہے۔

تفسیر:

وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ: یہ لفظ ارتداد سے بنا جس کے معنی ہیں اس راستہ پر لوٹ جانا۔ جس سے آیا تھا (فَارْتَدَّا عَلٰٓى اٰثَارِهِمَا قَصَصًا) مگر شریعت میں اسلام چھوڑ کر کفر کی طرف لوٹ جانے کو ارتداد کہا جاتا ہے اور وہ تو خاص اس معنی کے لیے ہے۔ (مِنْكُمْ) میں ہر عاقل بالغ مسلمان سے خطاب ہے کیوں کہ بچے اور دیوانے کا اسلام تو معتبر ہے مگر ان کا ارتداد معتبر نہیں۔ (عَنْ دِيْنِهٖ) اصول عقائد کو دین اور فروعات کو مذہب کہتے ہیں۔ کسی مسئلہ شرعی سے رجوع کرنا یا فروعی

عقیدہ کا انکار ارتداد نہیں کہلائے گا۔ یعنی تم مسلمانوں میں سے جو کوئی بھی اپنے دین یعنی اسلام سے پھر جائے (فَیَمُتْ وَھُوَ کَافِرٌ) (یعنی وہ پھر مرتے وقت اسلام میں نہ لوٹا بلکہ حالت کفر میں ہی مر گیا)۔ (فَاُولٰٓئِکَ حَبِطَتْ اَعْمَالُھُمْ) (پس ایسوں کے عمل ضائع ہو گئے) (حَبِطَتْ حبطًا یا حبوطًا سے بنا حبط کے معنی ہیں جانور کا اتنا چارہ کھالینا کہ اس سے پیٹ پھول جائے یا مضر گھاس چر کر بیمار ہو جانا۔ اور نہایہ میں ہے احبط اللّٰہ تعالیٰ عملہ بطلہ یقال حبط عملہ واحبط واحبطہ غیرہ) جس کا حاصل یہ ہے کہ اس کے عمل باطل ہو گئے ضائع ہو گئے اکارت گئے۔ اعمال سے مراد وہ نیکیاں ہیں جو اس نے بحالت اسلام کیں کیوں کہ ارتداد سے صرف نیکیاں برباد ہوتی ہیں نہ کہ گناہ جیسے اسلام لانے سے زمانہ کفر کے گناہ مٹ جاتے ہیں نہ کہ نیکیاں۔ (فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ) دنیا میں اور آخرت میں۔ دنیا سے مراد موت سے پہلے کی حالت اور آخرت سے برزخ اور محشر مراد یعنی ان مرتدین کی نیکیاں دنیا میں بھی برباد ان کا خون، مال محفوظ نہ رہے گا بلکہ نہ اس کا نکاح قائم رہے گا اور نہ وہ اپنے قرابت دار کی میراث پائے گا۔ مرتد مرد کو زندہ رہنے کا بھی حق نہیں بلکہ اس کو قتل کر دیا جائے گا۔ رفع شکوک کے لیے تین دن تک مہلت دینی واجب نہ ہو گی ہاں مستحب ہے اور آخرت میں بھی اس کے اعمال برباد کہ اس کی نیکیاں نہ قبر میں کام آئیں نہ حشر میں۔ ان پر کوئی ثواب ملے نہ ان کی نماز جنازہ نہ اسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے بلکہ (واُولٰئِکَ اصحاب النار ھم فیھا خلدون) یہ دوزخ والے ہیں اور انہیں ہمیشہ اس میں رہنا ہے} یعنی مرتد بھی دوسرے کفار کی طرح جہنم میں ہی ہمیشہ رہیں گے بلکہ ان کے احکام زیادہ سخت ہیں۔

فوائد:

ا۔ مرتد وہ ہے جو اسلام سے نکل جاوے۔ یا تو اس طرح کہ کھلم کھلا عیسائی یا ہندو وغیرہ ہو جائے۔ یا اس طرح کہ وہ تو اپنے آپ کو مسلمان ہی کہتا رہے مگر کسی اسلامی قطعی عقیدے کے انکار کی وجہ سے شریعت اسے کافر بتائے۔ جیسے قادیانی خارجی، تبرائی رافضی، توہینِ

پیغمبر کرنے والے دیوبندی وغیرہ کیوں کہ سارے عقائدِ اسلامیہ کے ماننے کا نام اسلام ہے۔ان میں سے ایک کا انکار بھی کفر ہے۔یا اس طرح کہ مسلمان سے عمداً کوئی کفر سرزد ہو جائے۔یہ بھی ارتداد ہے۔دیکھو منکرینِ زکوٰۃ اور مسیلمہ کذاب کو نبی مان لینے والوں نے سارے اسلامی عقائد کا انکار نہ کیا تھا۔صرف زکوٰۃ کی فرضیت کا اور دوسروں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ختم نبوت کا انکار کیا تو حضرت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان پر حکم ارتداد دے کر ان سے جنگ کی ٹھان لی۔یوں ہی شیطان نے سارے عقائد اسلامی کا انکار نہ کیا صرف نبی کی اہانت کی مرتد ہوا۔رب تعالیٰ منافقین سے فرماتا۔(لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ)اور فرماتا ہے(اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ) غرض یہ کہ ارتداد کے لیے یہ ضروری نہیں کہ بالکل اسلامی عقائد کا انکار کرے بلکہ اس کی مذکورہ بالا تین صورتیں ہیں اور وہ تینوں اس آیت میں داخل ہیں۔

۲۔ بچے اور دیوانے کا ارتداد صحیح نہیں کیوں کہ یہاں ارتداد کی سزا ضبطی اعمال فرمائی گئی ان دونوں کے اعمال ہی معتبر نہیں۔

۳۔ مرتد کا ذبیحہ، نماز، روزہ سب غیر مقبول۔یعنی اگر وہ حالتِ ارتداد میں کوئی جانور ذبح کرے تو مردار، نماز روزہ ادا کرے تو بے کار کیوں کہ یہ بھی اعمال ہیں۔

مرتد کے مسائل

دنیاوی احکام میں مرتد کے اعمال صرف ارتداد سے ہی باطل ہو جاتے ہیں۔لہٰذا اگر کوئی حاجی مرتد ہو کر دوبارہ اسلام لائے تو اس پر دوبارہ حج کرنا فرض ہے۔اسی طرح اگر کوئی نماز پڑھ کر مرتد ہوا اور وقتِ نماز باقی تھا کہ اسلام لے آیا تو اس نماز کی قضا کرے ہاں گزشتہ نمازوں کی قضاء واجب نہیں(رُوح البیان)مگر ان پر ثواب کی بھی امید نہیں۔دوبارہ اسلام لانے سے یہ گناہ اٹھ جائے گا ثواب واپس نہ ہوگا۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے (فَیَمُتْ وھو کافرٌ) الخ سے استدلال کیا کہ جو شخص مرتد ہو جائے تو جب تک حالتِ کفر پر نہ مرے اس کے عمل ضائع نہیں ہوتے۔ ان کا یہ استدلال صفت کے مفہوم کے ساتھ ہے۔ لیکن سیدنا امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ معتبر نہیں۔ احناف کی دلیل یہ آیت ہے۔ (ومن یکفر بالایمان فقد حبط عمله) (یعنی جو کوئی ایمان سے پھر گیا اس کے عمل ضائع ہو گئے) (ولو اشرکو لحبط عنهم ما کانوا یعملون) پ ۷ اور یہ آیت مطلق ہے اور مطلق کو مقید پر حمل کرنا ہمارے نزدیک جائز نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب (مظہری)۔

مسئلہ: مرتد کی زمانہ کفر میں نیکیاں بے کار مگر کافر کی نیکیاں ایمان پر موقوف رہتی ہیں۔ یعنی اگر کافر زمانہ کفر میں صدقہ خیرات کرے اور بعد میں اسلام لے آئے تو اس کا ثواب پائے گا لیکن مرتد اس ثواب کا مستحق نہیں۔

مسئلہ: زمانۂ اسلام کی چھوٹی ہوئی نمازیں ارتدار کے بعد قضاہ کرنی پڑیں گی۔ (شامی/ عالمگیری وغیرہ)

مسئلہ: ارتداد کے اخروی احکام موت پر موقوف نہیں۔ یعنی اگر مرتد اسلام لاکر مرا تو اس کے سارے گناہ معاف ہیں ورنہ سب کی پکڑ۔

مسئلہ: مرتد مرد کو بادشاہِ اسلام قتل کرے گا اور مرتدہ عورت کو قیدِ دوام۔

مسئلہ: کافر اصلی سے جزیہ لیا جا سکتا ہے مرتد سے نہیں اس کے لیے دو ہی صورتیں ہیں اسلام یا قتل جیسا کہ احادیث سے ثابت ہے۔

اعتراض: اس سے معلوم ہوا کہ مرتد وہ ہے جو اسلام میں آکر کافر بنے تو چاہیے کہ پیدائشی رافضی، قادیانی وغیرہ مرتد نہ ہوں کیوں کہ یہ اسلام میں کبھی آئے ہی نہیں۔ حالاں کہ فقہاء فرماتے ہیں کہ یہ سب لوگ مرتدین ہیں۔

جواب: بچے کا اسلام معتبر ہے کفر معتبر نہیں لہٰذا ان لوگوں کا سمجھ دار بچہ کلمہ پڑھ کر مسلمان تو ہو جاتا ہے اور کفریات بول کر کافر نہیں ہوتا۔ پھر جب بالغ ہو کر کفر بکتا ہے تو اب اس بچپن کے اسلام سے نکل جاتا ہے لہٰذا وہ مرتد ہے۔

اعتراض: تمہاری تفسیر سے معلوم ہوا کہ جو کوئی کسی عقیدہ اسلامی کا انکار کر دے وہ کافر ہے۔ حالاں کہ حدیث شریف میں ہے کہ جس نے (لا الہ الا اللّٰہ) پڑھ لیا وہ جنتی ہے۔ نیز امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اہلِ قبلہ کو کافر نہ کہو نیز فقہاء فرماتے ہیں کہ جس شخص میں ۹۹ باتیں کفر کی ہوں اور ایک بات بھی ایمان کی ہو اسے کافر مت کہو۔ تمہاری تفسیر حدیث وفقہ کے خلاف ہے۔

جواب: تمہاری بیان کردہ حدیث مشرکین کے متعلق ہے جو توحید کے منکر تھے۔ ان کا کلمہ پڑھنا ہی اسلام کی علامت تھی مگر جو اہلِ توحید ہوں اور وہ کسی قسم کا کفر کریں ان کا یہ حکم نہیں ان کے لیے وہ حدیث ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا (ایک قوم پیدا ہوگی جو بہت نمازی اور قرآن خواں ہوں گے مگر دین سے ایسے نکل جائیں گے جیسے تیر نشانہ سے) (بخاری مسلم وغیرہ اور مشکوۃ باب قتل مرتدین) نیز فرمایا کہ (میری امت کے تہتر (۷۳) فرقے ہوں گے صرف ایک جنتی باقی سب دوزخی)۔ یا یہ تمہاری پیش کردہ حدیث اس وقت کی ہے جب اسلام میں کوئی احکام نہ آئے تھے صرف کلمۂ توحید پڑھنا کافی تھا جیسے قبل ہجرت فرضیت نماز سے پہلے کا زمانہ پھر جب کچھ شرعی احکام بھی آگئے تو تب ارشاد ہوا۔ (من صلی صلوتنا واکل ذبیحتنا) الخ.

بعد ہجرت جب نمازی مسلمانوں کی شکل میں منافق بھی ہو گئے تو یہ حکم آیا (واللّٰہ یشھد انھم لکاذبون) پھر آئندہ کے متعلق جب مسلمانوں کے صدہا فرقے ہونگے اس کے متعلق ارشاد ہوا کہ (میری امت کے ۷۳ فرقے ہونگے ایک جنتی باقی دوزخی) غرضیکہ یہ مختلف احادیث

مختلف زمانوں کے اعتبار سے ہیں اگر فقط توحید ماننا ہی اسلام کے لیے کافی ہوتا تو چاہیے کہ آریہ مسلمان ہوں فقہاء کے نزدیک اہلِ قبلہ وہی ہیں جو سارے عقائدِ اسلامیہ کا ماننے والا ہو صرف کعبہ کی طرف نماز پڑھنے والے کو اہل قبلہ نہیں کہتے (شرح فقہ اکبر ملا علی قاری) منافقین بھی کعبہ کی طرف نماز پڑھتے تھے کیا وہ مسلمان تھے؟

یہ کہنا غلط ہے کہ جس میں ایک بات بھی ایمان کی ہو۔ یہ کسی عالم نے نہ کہا ہاں فقہاء یہ فرماتے ہیں کہ جس مسلمان کے کلام میں ۹۹ معنی کفر کے نکلتے ہوں اور ایک معنی اسلام کے تو نیک گمانی کرتے ہوئے اس سے اسلام ہی کے معنی مراد لو بشرطیکہ جب یہ معلوم نہ ہو کہ اس نے کوئی پہلوئے کفر مراد لیا۔ مسئلہ تو یہ تھا جاہلوں نے کیا سے کیا کر لیا اس کی مزید وضاحت تمہیدِ ایمان با آیات قرآن مؤلفہ مولانا شاہ احمد رضا فاضل بریلویؒ میں دیکھیے۔

اعتراض: مرتد کو قتل کرنا اور مرتدہ کو قید کرنا ظلم ہے مذہب میں آزادی چاہیے نیز یہ مسئلہ قرآن کریم سے ثابت نہیں مولویوں کی ایجاد ہے رب تعالیٰ تو فرماتا ہے (لا اکراہ فی الدین) (دین میں جبر نہیں) پھر مرتد کو اسلام پر مجبور کیوں کیا جاتا ہے؟

جواب: اسلام نے مذہبی آزادی دی ہے کہ جو چاہے مسلمان ہو جو چاہے نہ ہو لیکن مسلمان ہونے کے بعد اس پر قائم رہنے کا حکم دیا۔ اسلام چھوڑنے کی اجازت دینا مذہبی آزادی نہیں بلکہ فساد کی اجازت دینا ہے۔ مرتد حکومتِ الٰہیہ کا باغی ہے جس کی سزا تو بہ ہے یا قتل۔ نیز قرآن کریم نے ڈاکوؤں کے قتل کا حکم دیا، ڈاکو مسافروں کا مال لوٹتا ہے اور مرتد لوگوں کا ایمان۔ جب ایمان مال سے افضل ہے تو اس کی سزا بھی قتل چاہیے۔ حدیث شریف میں ہے کہ جو دین اسلام چھوڑ دے اسے قتل کر دو (بخاری) صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) نے اس پر عمل کیا اس مسئلہ کو مولویوں کی ایجاد کہنا بے دینی اور حماقت یا جہالت ہے۔ مشکوۃ شریف میں اس کا باب باندھا (بـاب قـتـل اهـل الرّدة) (باب

مرتدوں کے قتل کے بارے میں:

آیت لا اکراہ فی الدین کے یہ معنی ہیں کے کسی کو اسلام لانے پر مجبور نہ کرو نہ یہ کہ کسی کو مسلمان رہنے پر بھی مجبور نہ کرو یا یہ معنی ہیں کہ (لا یتصور الاکراہ فی الدین) یعنی دین میں اکراہ متصور نہیں۔ کہ دین کا تعلق قلبی اعتقاد و انقیاد سے ہے، اور قلب، دل، پر اکراہ کا تصور ہی نہیں ہو سکتا ہے۔

ہدایت:

ہر مسلمان کو چاہیے کہ سوتے وقت چھٹا کلمہ اور سورہ کافرون پڑھ لیا کرے ان شاء اللہ اسلام پر قائم رہے گا نیز اکثر ذکر الٰہی میں مشغول رہے اور بد مذہبوں کی صحبت سے بچے۔ اچھی صحبت اختیار کرے اللہ تعالیٰ انجام بخیر فرمائے۔ عارف رومی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ (ذکر حق کن بانگ غولاں را بسوز = چشم نرگس را ازیں کرگس بدوز) سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تورات پڑھنے سے منع کر دیا گیا۔ حالاں کہ ان سے شیطان بھاگتا ہے۔ کیا ہمارا ایمان فاروق اعظم سے قوی ہے؟ ہم کو بھی چاہیے کہ نہ تو ہر صحبت میں بیٹھیں اور نہ ہر رسالہ کتاب کا مطالعہ کریں بلکہ بے دینوں اور بد مذہبوں کی صحبت اور ان کی تصنیفات کے مطالعہ سے بچیں۔ ہاں کامل اہل علم ان کے رد کے لیے ان کی کتابیں پڑھ سکتے ہیں۔

تم سے جہاں تک ہو سکے اللہ کی راہ میں سخاوت کرو

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَیَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ کَذٰلِکَ

یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّکُمْ تَتَفَکَّرُوْنَ (سورۃ البقرۃ:۲۱۹)

''تم سے پوچھتے ہیں کیا خرچ کریں؟ تم فرمادو جو فاضل بچے۔ اس طرح اللہ تم سے آیتیں بیان فرماتا ہے کہ کہیں تم دنیا اور آخرت کے کام سوچ کر کرو''

شان نزول:

نبی کریم ﷺ نے مسلمانوں کو صدقہ دینے کی رغبت دی تب آپ علیہ الصلوۃ والسلام سے دریافت کیا گیا کہ اس کی مقدار ارشاد فرمائیے کہ کتنا مال راہ خدا میں خرچ کریں تب یہ آیت نازل ہوئی (خزائن عرفان)

دوسری روایت یہ ہے کہ معاذ بن جبل اور ثعلبہ حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگے کہ یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمارے پاس غلام بھی ہیں اور بال بچے بھی ہم ان پر کتنا خرچ کریں تب یہ آیت نازل ہوئی (درمنثور)

تفسیر:

وَیَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ: (تم سے پوچھتے ہیں کیا خرچ کریں)

قُلِ الْعَفْوَ: (فرمادو جو فاضل بچے) عفو کے معنی ہیں آسان ونرم جهد کا مقابل۔ اسی لیے نرم زمین کو عفو کہتے ہیں یا فاضل اور بچا ہوا جیسے (خُذِ الْعَفْوَ) یا مٹادینا (عفا اللہ عنک) یہاں

سارے معنی بن سکتے ہیں۔ یعنی فرمادو کہ ضرورت سے بچا ہوا مال راہ خدا میں خرچ کر دو یا جس کا خرچ کرنا آسان ہو وہ دو یا جس کے خرچ کرنے کا دل پر اثر نہ رہے وہ دو۔ تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ بعض نے اس کے معنی افضل اور طیب مال بھی کیے ہیں۔ یعنی راہ خدا میں پاک مال خرچ کرو۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ شروع اسلام میں بقدر ضرورت مال رکھ کر باقی سب خیرات کرنا واجب تھا۔ صحابہ کرام سارا بچا ہوا مال راہ خدا میں صرف کر دیتے تھے اس صورت میں یہ آیت زکوۃ کی آیت سے منسوخ ہے۔ لیکن صاحب تفسیر مظہری وغیرہ فرماتے ہیں کہ یہ کہنا ٹھیک نہیں کیوں کہ زکوۃ کا حکم سورۃ بقرہ کے شروع میں نازل کیا گیا ہے اور اس کا نزول ا ہجری یا ۲ ہجری میں ہے پس زکوۃ کی آیت اس آیت سے پہلے نازل ہوئی۔ اور یہی قول صحیح معلوم ہوتا ہے۔ لہٰذا بقول بعض مفسرین کہا جائے گا کہ صحابہ کا یہ سوال نفلی صدقہ کی بابت تھا۔ اور عفو سے مراد ضرورت سے بچا ہوا مال یعنی ضروری مال خیرات کر کے خود محتاج نہ بن جاؤ اور اپنے بال بچوں کو محتاج نہ بنا دو بلکہ بچا ہوا مال خرچ کیا کرو۔ عمرو بن دینار فرماتے ہیں کہ عفو کے معنی اوسط درجہ کے ہیں یعنی نہ اسراف ہو اور نہ بخل۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے (وَالَّذِيْنَ اِذَا اَنْفَقُوْا لم يُسْرِفوا وَلَمْ يقتروا) الآية (اور وہ لوگ کہ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف کرتے ہیں اور نہ بخل کرتے ہیں) طاؤس فرماتے ہیں عفو سے مراد ہے جو جیسے آسان ہو اور یہی مطلب اللہ تعالیٰ کے اس قول کا ہے کہ (خُذِ الْعَفْوَ) (یعنی جو لوگوں کو عادۃً دینا آسان ہو تم وہی لے لو) پس آدمی راہ خدا میں وہی خرچ کرے جو جسے آسان ہو اور جس کے خرچ کرنے سے تکلیف نہ اٹھانی پڑے۔

حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے مروی ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا سب سے بہتر صدقہ وہی ہے جو تونگری کے ساتھ ہو اور اپنے متعلقین سے دینا شروع کرے یعنی سب سے مقدم انہیں رکھے (بخاری۔ ابوداؤد وغیرہ)

حکیم بن حزام سے بھی اسی طرح مروی ہے اور وہ متفق علیہ ہے۔ بغوی نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اسی طرح نقل کی اور اتنا زیادہ کیا کہ اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح ان لفظوں سے مروی ہے کہ بہتر صدقہ وہی ہے جس میں تونگری باقی رہے۔

حضرت جابر (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ ایک آدمی سونے کی خود لے کر جو کسی غنیمت میں اس کے ہاتھ لگی تھی حضور ﷺ کی خدمت میں آیا اور کہنے لگا کہ یہ میری طرف سے صدقہ میں لے لیجئے۔ آپ نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ اس نے کئی مرتبہ اسی طرح کیا آپ (ﷺ) نے غصہ ہو کر فرمایا کہ لاؤ اور لے کر اس زور سے پھینکا کہ اگر اس کے سر میں لگ جاتی تو سر پھٹ جاتا پھر فرمایا کہ تم لوگ اپنا سارا مال صدقہ کرنے کے لیے آ جاتے ہو اور پھر بیٹھ کر لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہو یاد رکھو! صدقے وہی (مقبول ہوتے) ہیں جو تونگری کے ساتھ ہوں۔ (بزار۔ ابوداؤد ابن حبان حاکم)

حضرت اسماء رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے (مجھ سے) فرمایا کہ خرچ کرو اور روک کر نہ رکھو ورنہ اللہ تمہیں دینے سے روک لے گا اور بند کر کے نہ رکھا کرو ورنہ اللہ تمہیں دینا بند کر دے گا تم سے جہاں تک ہو سخاوت کرو (متفق علیہ)

مذکورہ بالا تمام احادیث کے پیش نظر خلاصہ کلام یہ ہوا کہ اقوال اور اشخاص کے مختلف ہونے سے حکم بھی مختلف ہو جاتا ہے۔ جو شخص ایسا ہو کہ اپنا سارا مال خیرات کر دینے کے بعد لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلاتا پھرے اور فقر و فاقہ پر صبر نہ کر سکے تو اس کے لیے جائز نہیں کہ اپنا سارا مال خیرات کر دے۔

جو شخص صبر کر سکے اور لوگوں کے حقوق بھی اس کے ذمہ نہ ہوں تو اس کے حق میں راہ خدا میں خرچ کرنا ہی افضل ہے۔ لیکن لوگوں کے حقوق یعنی قرض اور متعلقین کا خرچ اجنبی پر خرچ کرنے سے یقیناً مقدم ہے۔ کیوں کہ وہ فرض ہے اور یہ صدقہ نفل۔ اور جس نے زاہد بن کر نبی کریم ﷺ کی طرح زندگی گزارنا اپنے اوپر لازم کر لیا ہو جیسے اہل صفہ اور صوفیاء میں بعض اہل خانقاہ تو ایسوں کو حاجت سے زیادہ چیز اپنے لیے رکھنا مکروہ ہے۔

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ فِی الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ : (اسی طرح اللہ تم سے آیتیں بیان فرماتا ہے کہ کہیں تم دنیا اور آخرت کے کام سوچ کر کرو) کذالک

سے مذکورہ احکام کی طرف اشارہ ہے یُبَیِّن تبیین سے بنا جس کے معنی ہیں آہستہ آہستہ یا خوب بیان کرنا۔ آیات سے مراد یا تو احکام کی آیات ہیں یا ساری آیتیں کیوں کہ ہر آیت ہدایت ہے۔ یعنی جس طرح ہم نے یہ احکام تم پر واضح کر دیے اسی طرح اور آیتیں بھی بیان فرماتے ہیں۔ تاکہ تم ان چیزوں میں غور و فکر کرو جن کو دنیا اور آخرت سے تعلق ہے پس تم اسی کو اختیار کرو جو تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہو۔ اپنے اموال سے بقدر ضرورت رکھ کر باقی راہ خدا میں خرچ کر دیا کرو تاکہ تمھیں اس سے آخرت میں فائدہ ہو۔

زیرِ کفالت یتیم کے ساتھ طرزِ معاشرت

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (سورۃ البقرۃ:۲۲۰)

''اور تم سے یتیموں کا مسئلہ پوچھتے ہیں تم فرماؤ ان کا بھلا کرنا بہتر ہے اور اگر اپنا ان کا خرچ ملا لو تو وہ تمہارے بھائی ہیں اور خدا خوب جانتا ہے بگاڑنے والے کو سنوارنے والے سے اور اللہ چاہتا تو تمہیں مشقت میں ڈالتا۔ بے شک اللہ زبردست حکمت والا ہے''

شانِ نزول:

زمانۂ جاہلیت میں لوگ یتیموں کا مال کھا جانے میں احتیاط نہ کرتے تھے۔ تو ابتداءً آیت (انما یاکلون اموال الیتمی ظلماً) الخ ۔ جو لوگ یتیموں کا مال کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں انگارے بھرتے ہیں} جسے سن کر مسلمان ڈر گئے اور بہت احتیاط کرنے لگے حتی کہ یتامٰی کا کھانا الگ پکاتے، ان کا پانی الگ رکھتے اور ان کا بچا ہوا کھانا استعمال نہیں کرتے۔ کبھی وہ گل سڑ جاتا تو پھینک دیتے۔ اتنی احتیاط مسلمانوں پر گراں تھی۔ جس کی شکایت انہوں نے بارگاہ نبوت (ﷺ) میں کی تب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ (کبیر، اسباب النزول، ابوالحسن علی بن احمد الواحدی انیسا پوری)

تفسیر:

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى: یتمٰی یتیم کی جمع ہے۔انسانوں میں یتیم وہ نابالغ بچہ ہے جس کا باپ مرجائے حرامی اولاد کا وہ باپ جس نے اس کی ماں سے زنا کیا اس سے یہ بچہ پیدا ہوا اس زانی کے مرجانے سے یہ حرامی بچہ یتیم نہ ہوگا کہ شریعت نے اس شخص کو اس بچہ کا باپ مانا ہی نہیں اسی لیے ان میں ایک دوسرے کو میراث نہیں ملتی نہ نان ونفقہ واجب۔ جانوروں میں یتیم وہ بچہ ہے جس کی ماں فوت ہوجائے۔در یتیم وہ موتی جو سیپ میں اکیلا ہو اگر چہ عَنِ الْيَتٰمٰى بغیر قید کے ہے، مگر جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ سوال یتیموں کے مال کے متعلق تھا یعنی اے نبی علیہ السلام لوگ آپ سے ان یتیموں کے مال کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ جو کسی کی پرورش میں ہو کہ ان کے مال کیسے خرچ کیے جائیں۔(قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ) (تم فرماؤ ان کا بھلا بہتر ہے) اس مختصر سے جملہ میں بے شمار احکام بیان ہوگئے۔اصلاح صلح سے بنا ہے یعنی دوستی فساد کا مقابل، اصلاح سے مراد جانی، مالی، نفسانی، روحانی ساری دوستیاں مراد ہیں۔یتیموں کو علم و ادب سکھانا انہیں نمازی پرہیز گار بنانا، ان کا مال احتیاط سے خرچ کرنا بلکہ ان کے مال کو نفع بخش تجارت میں لگانا سب ہی اس میں داخل ہے۔یعنی فرمادو اے محبوب ﷺ! کہ یتیموں کی اصلاح کرنا تمہارے لیے بھی بہتر ہے اور ان کے لیے بھی کہ تم ثواب پاؤ گے اور ان کی جسمانی روحانی درستگی ہوجائے گی۔ (وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ) (اور اگر اپنا ان کا خرچ ملالو تو وہ تمہارے بھائی ہیں) تُخَالِطُوْا خلط سے بنا جس کے معنی ہیں چند چیزوں کے اجزاء آپس میں ملا دینا۔اسی لیے دوست شریک اور پڑوسی کو خلیط کہتے ہیں، لہٰذا مخالطت سے مراد شرکت یا آپس میں مل جل کر رہنا ہے۔ بعض نے فرمایا اس سے مال ملانا مراد ہے اور بعض نے کہا کہ نکاح مراد ہے (کبیر) اخوان جمع اخ کی ہے بمعنی بھائی جو ماں باپ دونوں یا ایک میں شریک ہو، مگر مجازاً ہم قبیلہ، ہم پیشہ، ہم مذہب اور اپنے پیاروں کو اخ کہا جاتا ہے۔یہاں یا تو ہم مذہب مراد ہے یا ہم قبیلہ۔یعنی اگر تم ان یتیموں کو اپنے ساتھ ملالو یا ان سے رشتۂ نکاح قائم کرلو یا ان کا مال اپنے مال سے بقدر خرچ ملالو تو جائز ہے، کیوں کہ وہ تمہارے دینی اور قبیلہ کے بھائی ہیں۔

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ : یعنی اگرچہ رب تعالیٰ نے تمہیں تجارت اور کھانے پینے میں ان کا مال ملا لینے کی اجازت دے دی، مگر وہ خوب جانتا ہے کہ فسادی کون ہے اور مصلح کون۔

وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَأَعْنَتَكُمْ : اَعْنَتَ اعنات سے بنا جس کا مادہ عنت ہے۔ اس کا معنی ہیں نا قابلِ برداشت مشقت رب تعالیٰ نے فرمایا (عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ) (یعنی اگر رب تعالیٰ چاہتا تو تمہیں یتیموں کے متعلق سخت مشقت میں ڈال دیتا) کہ ان کا ہر مال علیحدہ رکھنے کا ہی حکم دیتا جس میں تم کو سخت دشواری ہوتی، مگر اپنے کرم سے خلط کی اجازت دی (اِنَّ اللّٰهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ) عزیز عزت بمعنی غلبہ سے بنا اور حکیم حکمت سے یعنی اللہ تعالیٰ سب پر غالب ہے اور کوئی اس کے احکام روک نہیں سکتا اور حکمت والا ہے۔

فوائد:

(۱) یتیم کی اصلاح لازم ہے، بگاڑنا حرام ہے۔ (۲) یتیم بچے کی صرف پرورش ہی نہ کی جاوے بلکہ ان کی تربیت بھی کی جاوے اور تربیت کے لیے بقدرِ ضرورت مار پیٹ اور ان پر سختی کر سکتے ہیں پرورش میں کھانا، کپڑا، گرمی سردی سے بچانا وغیرہ سب داخل ہے اور تربیت میں انہیں بری صحبت سے بچانا، تعلیم، اخلاق، کسی ہنر میں لگا دینا جس سے وہ اپنی روزی کما سکے، دین دار بنانا جس سے وہ بندہ مومن بن سکے سب داخل ہیں۔ یہ تمام چیزیں اصلاح سے معلوم ہوئی ہیں یعنی یتیموں کی اصلاح ضروری ہے نہ محض پرورش (نعیمی) (۳) یتیم کے مال کو تجارت میں لگا دینا اسے مضاربت پر دینا جائز کہ یہ بھی اصلاح ہی ہے۔ (۴) چند ساتھیوں کا آپس میں روٹی وغیرہ ملا کر کھانا جائز ہے کہ جب یہ کام یتیم کے ساتھ جائز ہوا تو یہاں بھی جائز ہوگا۔ (۵) اجتہاد جائز ہے اور اجتہادی غلطی معاف کیوں کہ یتیم کی اصلاح ولی کی رائے سے ہی ہوگی۔ اگر اس رائے میں غلطی بھی ہوگی تو بھی معاف ہے (روح المعانی) (نعیمی بالاختصار)

مسائل

مسئلہ: گلنے سڑنے والی چیزیں یتیم کا مال اپنے مال سے ملانا جائز ہے، مگر اس کے خرچ کا اندازہ کر کے دیگر خرچوں میں اس کا حساب الگ رکھنا ضروری ہے۔

مسئلہ: ہاں اگر چہ مسلمان یتیم کا حکم بیان ہوا، مگر کفار یتیموں کا بھی حکم یہی ہے کہ ان کے مال کی بھی اصلاح کی جائے دوسری جگہ مطلق فرمایا (لا تقربوا مال الیتیم الا بالتی ھی احسن)

مسئلہ: کافر یتیم کو اسلام کی خوبیاں دکھا کر اسلام کی طرف مائل کرنا بہتر ہے کہ یہ بھی اس کی اصلاح ہے، مگر اسے جبراً مسلمان نہیں کر سکتے کہ دین میں جبر نہیں۔

مسئلہ: یتیموں کی پرورش بڑے ثواب کا کام ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اپنی دو انگلیوں کو ملا کر فرمایا کہ جنت میں مَیں اور یتیموں کا پالنے والا اس طرح رہیں گے۔ دوسری روایت میں ہے کہ جو کوئی محبت سے یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرے تو اسے ہر بال کے عوض نیکی ملتی ہے۔ (روح البیان)

مسئلہ: یتیم کا پالنے والا اگر غریب ہو تو اس کے مال سے حق پرورش لے سکتا ہے۔ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سرکاری خزانے کے مال کو یتیم اور اپنے کو ولیٔ یتیم سمجھتا ہوں کہ اگر ضرورت پڑتی ہے تو اس میں سے کھاتا ہو ورنہ نہیں۔ (نعیمی)

مسئلہ: چند مسلمانوں کا مل کر کھانا باعثِ برکت ہے اکیلے کھانے میں بے برکتی چاہیے کہ گھر کے بال بچے یا دوست واحباب مل کر کھانا کھایا کریں۔

ضروری مسئلہ:

ہمارے ہاں عام رواج ہے کہ میت کے قل، چہلم، فاتحہ وغیرہ اس کے سارے مال سے کرتے ہیں حالاں کہ اس کے یتیم بچے بھی ہوتے ہیں۔ اسی مال سے عام برادری کی روٹی وغیرہ بھی کرتے ہیں، یہ حرام ہے۔ چاہیے کہ پہلے مال تقسیم ہو بعد میں بالغ وارث اپنے حصے سے یہ سب خرچ کریں یا بوقت تقسیم وارث اپنے حصے سے وضع کریں۔

مسئلہ: یتیم کے مال سے زکوٰۃ نہیں دے سکتے۔ اس کا مال کسی کو ہبہ نہیں کیا جاسکتا۔

مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کے ساتھ مسلمانوں کا نکاح جائز نہیں ہے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ (سورۃ البقرۃ:۲۲۱)

”مشرکہ عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک کہ مسلمان نہ ہو جائیں اور بے شک مسلمان لونڈی مشرکہ سے اچھی ہے، اگر چہ وہ تمہیں بھاتی ہو اور مشرکوں کے نکاح میں نہ دو جب تک وہ ایمان نہ لے آویں اور بے شک مسلمان غلام مشرک سے اچھا اگر چہ وہ تمہیں بھاتا ہو وہ دوزخ کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ جنت اور بخشش کی طرف بلاتا ہے اپنے حکم سے اور اپنی آیتیں لوگوں کے لیے بیان کرتا ہے کہ کہیں وہ نصیحت مانیں“

شانِ نزول:

ابو مرثد غنوی (رضی اللہ عنہ) کو حضور ﷺ نے مکہ بھیجا کہ وہاں سے کسی تدبیر کیساتھ ان ضعیف مسلمانوں کو نکال لائیں جو ہجرت نہ کر سکے۔ وہاں عناق نامی ایک مشرکہ عورت تھی جسے زمانۂ جاہلیت میں ان کے ساتھ محبت تھی۔ وہ نہایت حسین اور مال دار تھی۔ جب اسے ان کے مکہ آنے کی خبر ملی تو وہ ان کے پاس آئی اور بدکاری کی طرف بلایا تو آپ (رضی اللہ عنہ) نے فرمایا: اے عناق میں مسلمان ہو چکا ہوں اور اسلام ایسی بدکاری اور بے حیائی سے منع کرتا ہے۔ تب اس نے آپ سے نکاح کی درخواست کی لیکن آپ (رضی اللہ عنہ) نے فرمایا کہ میں حضور علیہ السلام کی

اجازت کے بغیر تیرے سے نکاح بھی نہیں کرسکتا۔ جب بارگاہ نبوی میں حاضر ہوئے تو سارا واقعہ عرض کیا تو تب یہ آیت کا پہلا جملہ (وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ) الخ نازل ہوا۔ (مظہری نعیمی، روح البیان وغیرہ)

علامہ واحدی نے اسباب النزول میں بروایت ابن عباس نقل کیا ہے کہ حضرت عبداللہ ابن رواحہ (رضی اللہ عنہ) کی ایک بدصوررت لونڈی تھی۔ ایک دن آپ نے خفا ہو کر اسے طمانچہ مار دیا لیکن پھر پشیماں ہو کر حضور علیہ السلام کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور یہ قصہ عرض کیا۔ آپ نے فرمایا: عبداللہ اس کی حالت کیسی ہے؟ عرض کی وہ توحید و رسالت کی قائل ہے، نماز پڑھتی ہے، روزہ رکھتی ہے، تو آپ (ﷺ) نے فرمایا پھر تو وہ مومنہ ہے۔ تو عبداللہ ابن رواحہ نے عرض کی حضور (ﷺ)! قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق دے کر بھیجا، میں اسے آزاد کر کے اس سے نکاح کرلوں گا- چناں چہ ایسا ہی کیا بعض لوگوں نے ان کو طعنہ دیا کہ فلاں مشرکہ عورت جو کہ حسین اور مال دار تھی تم سے نکاح کرنے کے لیے تیار تھی تم نے اسے چھوڑ کر اس بدصورت لونڈی سے کیوں نکاح کرلیا۔ اس پر اللہ تعالٰی نے یہ آیت کریمہ کا دوسرا حصہ {وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ} نازل فرمایا۔

تفسیر:

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ : تَنْكِحُوا نَكْحٌ سے بنا جس کے لغوی معنی ہیں جمع ہونا اور ملنا، داخل ہونا۔ اہل عرب بولتے ہیں (نكح المطر الارض) (بارش زمین سے مل گئی) (نكح النعاس عينه) یعنی {نیند آنکھ میں آگئی} اصطلاح میں جماع کو بھی نکاح کہتے ہیں اور عقد نکاح کو بھی۔ بعض علماء نے فرمایا کہ اہلِ عرب (نكح فلانٌ فلانتاً) اور (نكح امراته او زوجة میں فرق کرتے ہیں یعنی جہاں نکاح کا مفعول اجنبی عورتیں ہیں وہاں عقدِ نکاح مراد ہوتا ہے اور جہاں اس کا مفعول بیوی، (زوجہ) ہو تو وہاں جماع مراد ہوتا ہے۔ لہٰذا یہاں اس آیت میں

عقد نکاح مراد ہے اور (حتّٰی تنکح زوجاً غیرہ) میں جماع مراد ہے (کبیر) مشرک شرعاً ہر منکر توحید کو کہتے ہیں اور کبھی مطلقاً کفر کو بھی شرک کہہ دیا جاتا ہے جیسے (انّ اللّٰـہ لایغفِرُ انْ یشرک بہٖ) میں شرک بمعنی کفر ہے یہاں پر مشرکہ سے یا تو توحید کی منکرہ مراد ہے یا ہر کافرہ اس صورت میں اس آیت کی سورہ مائدہ والی آیت سے تخصیص ہو گی۔

والمحصنت من الذین اوتوا الکتاب : لھٰذا سوائے اہل کتاب تمام کافرہ عورتوں سے نکاح حرام ہے۔ یہود وعیسائی بھی بایں معنی مشرک ہیں کہ وہ عزیر، عیسٰی اور مریم علیہم السلام کو خدا یا خدا کا بیٹا یا بیوی بتاتے ہیں۔ مگر اصطلاح شرع میں انہیں اہل کتاب کہا جاتا ہے اور قرآن کریم میں ان کا ذکر مشرکوں سے الگ کیا گیا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا (ان الذین امنوا والذین ھادو والنصاری والصابئین والمجوس والذین اشرکوا) نیز فرمایا (مایود الذین کفروا من اھل الکتاب ولاالمشرکین) نیز فرمایا (لم یکن الذین کفروا من اھل الکتاب والمشرکین) ان آیات میں دونوں قسموں کو الگ الگ بیان کیا ہے اور ایک کو دوسرے پر عطف کیا ہے۔ اگرچہ عطفِ تفسیری بھی جائز ہوتا ہے مگر اصل عطف میں یہی ہے کہ معطوف اور معطوف علیہ میں مغائرت ہو۔ جمہور کے نزدیک اہلِ کتاب کی عورتوں سے نکاح جائز ہے۔ مگر یہ ملحوظ رہے کہ کتابیہ سے نکاح کی کچھ شرائط ہیں۔ ایک یہ کہ مسلمان مرد میں اتنی پختگی ہو کہ اسلام پر قائم رہ سکے۔ عورت کو اسلام کی طرف مائل کر سکے نہ کہ خود اسی کی طرف مائل ہو جائے۔ دوسرے یہ کہ اس عورت پر اتنا فریفتہ نہ ہو جاوے کہ اس کے اخلاق حاصل کر لے اور اسے اپنا راز دار بنا لے اور اس سے دلی محبت کرنے لگے۔ تیسرے کہ اپنی اولاد پر پورا کنٹرول رکھ سکے کہ انہیں پختہ مسلمان بنا سکے۔ بچے اس ماں کا دین اختیار نہ کر لیں۔ اگر اتنی شرطیں موجود ہوں تو ان سے نکاح جائز ہے، ورنہ حرام۔ ابن عمر اور محمد ابن حنفیہ اور صاوی زیدی کے نزدیک کتابیہ سے نکاح مطلقاً حرام ہے (کبیر وغیرہ) اور ان شرائط کے ہوتے ہوئے بھی ان سے نکاح بہتر نہیں مکروہ ہے۔ اسی لیے حضور ﷺ اور خلفاء راشدین وقریباً سارے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم ان کے

نکاح سے بچے کسی نے نکاح نہ کیا۔ بہتر یہ ہے کہ اپنی اولاد کے لیے بہترین بیویاں تجویز کرو صحبتِ بد سے بچو۔ (حتّٰی یُؤْمِنّ) یہ نہی کی انتہا ہے۔ ایمان سے یا تو مسلمان ہو جانا مراد ہے یا اہلِ کتاب بن جانا کہ مشرک اگر مسلمان ہو جائے تو بھی اس سے نکاح حلال اور اگر عیسائیہ یا یہودیہ تب بھی جائز، حلال۔ یعنی مشرکہ عورتوں سے اس وقت تک نکاح نہ کرو جب تک کہ وہ کسی نبی اور آسمانی کتاب کا اقرار نہ کرلیں (احمدی، کبیر)

وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ : اَمَةٌ اصل میں امؤ تھا اؤ گرا کر اس کے عوض میں تا لگا دی گئی اس لیے اس کی جمع اماءٔ آتی ہے۔ اَمَةٌ بمعنی مملوکہ عورت یعنی لونڈی مؤمنۃ سے مسلمان لونڈی مراد ہے۔

خَیْرٌ مِّنْ مُّشْرِکَةٍ : خیر سے مراد زیادہ، اچھی اور مشرکہ سے مراد آزاد کافرہ عورت یعنی مسلمہ اگر چہ لونڈی ہو وہ ہزار درجہ آزاد کافرہ عورت سے افضل ہے (وَلَوْ اَعْجَبَتْکُمْ) واؤ وصلیہ ہے اور لَوْ شرطیہ۔ روح البیان نے فرمایا کہ جہاں لَوْ کا جواب اس سے پہلے آجائے اور لَوْ کے بعد فعلِ ماضی ہو تو وہاں واؤ وصلیہ ہوتا ہے۔ اور (لو بمعنی اِنْ اَعْجَبَتْ) اعجاب سے بنا بمعنی تعجب میں ڈالنا یا پسند آنا یعنی مشرکہ اگر چہ اپنے مال، جمال، حسب، نسب کی وجہ سے تمہیں پسند آئے۔

وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا : تُنْكِحُوْا بضم التاء انکاحٌ سے بنا بمعنی نکاح کرانا۔ اس میں سارے مسلمانوں سے خطاب ہے خواہ عورت کے ولی ہوں یا دوسرے مسلمان اس کا مفعول پوشیدہ ہے اور مشرکین سے تمام کفار مراد ہیں۔ خواہ بت پرست ہوں یا اہل کتاب (روح البیان)

یعنی اے مسلمانو! کسی مسلمان عورت کا نکاح کفار سے نہ کراؤ یا نہ ہونے دو۔ خواہ عورت لونڈی ہو یا آزاد جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں۔ بعض مفسرین ابن الشیخ وغیرہ نے فرمایا کہ یہاں نابالغ بچیوں کے اولیآء سے خطاب ہے یعنی اے اولیآء اپنی نابالغ بچیوں کا نکاح کفار سے نہ کرو۔ (روح البیان)

وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَیْرٌ مِّنْ مُّشْرِکٍ: عبد عبودیت سے بنا بمعنی عاجزی اختیار کرنا لہٰذا عبد

بمعنی عاجز، ذلیل اس کا استعمال چار معنوں میں ہے۔ (۱) مملوک یعنی غلام (من عبادکم) (۲) مخلوق (۳) عبادت گزار (۴) خدمت گزار تابع فرمان حدیث میں ہے۔

تَعِسَ عبدالدینار : یہاں پہلے معنی میں ہے (غلام) یعنی مسلمان غلام اگرچہ بظاہر حقیر ہے لیکن آزاد اور مال دار کافر سے افضل ہے کہ اس کے پاس دولتِ ایمان ہے۔ (وَلَوْ اَعْجَبَكُمْ) یعنی اگرچہ وہ کافر اپنے مال، عزت اور جاہ وجلال کی وجہ سے تمہیں اچھا معلوم ہو۔

اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ : اب اس جملہ میں کفار سے نکاح حرام کی وجہ بیان فرمائی جا رہی ہے۔ اُولٰٓئِكَ سے سارے کفار کی طرف اشارہ ہے اور یدعون رغبت دینا اور نار سے سبب جہنم یعنی کفر مراد ہے۔ یعنی یہ کفار تم سے مل جل کر کفر کی طرف رغبت دیں گے۔ لہٰذا ان سے دوری ضروری ہے۔ خصوصاً وہ کفار جو اپنے آپ کو مسلمان کہیں اور ہوں کافر جیسے مرزائی، غالی، تبرائی، روافض یا کوئی گستاخ رسول وہابی دیوبندی کہ ان کا نقصان کھلے کفار سے زیادہ ہے۔ اس آیتِ کریمہ سے ان لوگوں کو عبرت پکڑنا چاہیے جو بلا دھڑک ان مرتدین سے رشتے ناطے کرتے ہیں۔ پھر خود بھی بے دین ہوتے ہیں اور اولاد بھی بے دین ہوتی ہے۔ اس لیے سب کا وبال ان لوگوں پر ہی پڑتا ہے۔

وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ : يَدْعُوْٓا سے یا تو بلانا مراد ہے یا رغبتِ دنیا۔ جنت اور مغفرت سے اس کے اسباب مراد ہیں (ایمان پر استقامت اور نیک اعمال) یعنی اللہ کے پیارے مسلمان بندے ایمان اور نیک اعمال کی رغبت دیتے ہیں۔ لہٰذا انہیں سے بیاہ (شادی) کرو کہ ان سے میل جول رحمت ہے یا اللہ جنت اور بخشش کی طرف بلا رہا ہے اس لیے اس نے نکاح کفار سے تمہیں روک دیا جو جہنم کا ذریعہ ہیں۔ (بِاِذْنِهٖ) یعنی اللہ تعالیٰ اپنے ارادۂ کرم سے یا مسلمان رب کی توفیق سے جنت کی رغبت پاتے ہیں۔ (وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ) یعنی اللہ تعالیٰ ہدایت دینے والی اپنی آیات لوگوں کے لیے خوب صاف صاف بیان فرماتا ہے۔ (لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ) یہ لفظ تذکر سے بنا اس کا مادہ ذکر ہے بمعنی نصیحت قبول کرنا۔ یعنی تا کہ لوگ ان احکام میں غور کر کے نصیحت قبول کریں۔

فوائد و مسائل

۱۔ اس آیت میں دو حکم بیان ہوئے۔ ایک یہ کہ مسلمان مرد کافرہ عورت سے نکاح نہ کرے۔ دوسرے یہ کہ مسلمان عورت کافر مرد کے نکاح میں نہ دی جائے۔ دوسرا مسئلہ تو اپنے عموم پر ہے یعنی مسلمہ کا نکاح کسی بھی کافر سے جائز نہیں۔ خواہ وہ کتابی ہو یا مشرک یا مرتد۔ پہلے حکم میں ایک تخصیص ہے۔ وہ یہ کہ مسلمان کا نکاح اہلِ کتاب یعنی یہودیہ اور عیسائیہ سے ہو سکتا ہے جیسا کہ سورۂ مائدہ کی آیت میں فرمایا گیا۔

مسئلہ: جیسے اختلاف دین کے ہوتے ہوئے نکاح ہو ہی نہیں سکتا۔ اسی طرح اگر زوجین میں اختلاف دین پیدا ہو جائے تو پہلا نکاح باقی نہیں رہ سکتا۔ اگر مرد مرتد ہو جائے تو اس کی عورت اس کے نکاح سے فوراً نکل جائیگی اور بعد مدت دوسرے سے نکاح کر سکے گی اور اگر کافر عورت مسلمان ہو جائے تو وہ اپنے کافر شوہر کے نکاح سے نکل جائے گی۔ لیکن اس میں اتنی تفصیل ہے کہ اگر وہ جگہ دار الحرب ہے تو عورت کے اسلام لاتے ہی دار الاسلام میں آتے ہی نکاح ٹوٹ جائے گا، خاوند سے پوچھنے کی ضرورت نہ پڑے گی اور اگر وہ جگہ دار الاسلام ہے تو مرد پر بھی اسلام پیش کیا جائے گا۔ اگر وہ مسلمان ہو جائے تو نکاح قائم رہے گا ورنہ ٹوٹ جائے گا۔ زیادہ تفصیل کتب فقہ میں دیکھی جائے۔

مسئلہ: صحیح یہ ہے کہ عورت کے مرتد ہونے سے نکاح نہیں ٹوٹتا ہاں اس سے جماع حرام ہو جاتا ہے اور عورت کو اسلام لانے اور تجدید نکاح پر مجبور کیا جائے گا۔

مسئلہ: موجودہ زمانہ میں عموماً انگریز عورتیں جو دہریہ ہو کر خدا کی ذات، انجیل اور عیسیٰ علیہ السلام کی منکر ہو چکی ہیں۔ ان سے نکاح جائز نہیں کیوں کہ یہ عیسائیہ نہیں بلکہ دہریہ ہیں۔ وہ مسلمان سخت غلطی کرتے ہیں جو بے تحقیق ولایت سے انگریز عورتیں بیاہ لاتے ہیں۔

مسئلہ: جناب تھانوی صاحب نے اپنی تفسیر بیان القرآن میں اسی جگہ لکھا کہ جو مرد ظاہری حالت میں مسلمان سمجھا جاوے لیکن عقائد اس کے کفر تک پہنچے ہوئے ہوں تو اس سے مسلمان عورت کا نکاح درست نہیں اور اگر نکاح ہونے کے بعد ایسے عقائد ہو جاویں تو نکاح ٹوٹ جاتا ہے۔ لڑکی والوں پر واجب ہے کہ پیغام آنے کے وقت اول عقائد کی تحقیق کر لیا کریں جب اس سے اطمینان ہو جائے تب زبان دیں اور عورتوں کو چاہیے کہ اگر بعد نکاح شوہر کے ایسے عقائد ظاہر ہوں تو ان سے کنارہ کریں اور جس طرح بن پڑے اسے اپنے سے صحبت نہ کرنے دیں اور سر پرستوں کو بھی اس میں عورت کی امداد واجب ہے۔

ہم اس مسئلہ میں مولوی صاحب سے متفق ہیں اور مسلمانوں کو اس پر عمل کرنے کی پُر زور رغبت دیتے ہیں۔ اگر شوہر نیچری، قادیانی، رافضی، توہینِ رسول ﷺ کرنے والا دیوبندی، وہابی، چکڑالوی وغیرہ ہو تو اس سے مسلمان لڑکی کا نکاح ہرگز جائز نہیں اور اگر بعد میں خاوند ایسا ہو جائے تو نکاح ٹوٹ جائے گا۔ عورت اس سے بالکل الگ ہو جائے اور اگر وہ الگ نہ ہو تو اس کے وارث اس کو جبراً اپنے گھر لے آئیں۔

مسئلہ: جس کی بیوی عیسائی یا یہودی ہو تو وہ اپنے بچوں کی پرورش اس ماں سے نہ کرائے بلکہ ان کے ہوش سنبھالتے ہی ماں سے الگ کر دے ورنہ بچوں کے اسلام سے خارج ہونے کا اندیشہ ہے۔

مسئلہ: اگرچہ کتابیہ عورت سے مسلمان کا نکاح جائز ہے مگر اچھا نہیں۔ حدیث شریف میں ہے کہ عورت سے نکاح چار وجہوں سے ہوتا ہے۔ مال، جمال، حسب و نسب، دین لیکن فرمایا کہ (فاظفر بذات الدین) کہ تم دین دار بیوی اختیار کرو۔ صاحب تفسیر کبیر نے نقل فرمایا کہ حضرت حذیفہ (رضی اللہ عنہ) نے ایک کتابیہ عورت سے نکاح کر لیا تو حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے لکھا کہ فوراً طلاق دیدو آپ (رضی اللہ عنہ) نے پوچھا کیا یہ حرام ہے؟ فرمایا حرام تو نہیں لیکن سخت خطرناک ہے۔

امام اہلِ سنّت مولانا الشاہ احمد رضا فاضل بریلوی (رحمۃ اللہ علیہ) سے منقول ہے کہ عمران ابن حطان رقاشی اکابر علماء محدثین سے تھا۔ اس کی ایک چچازاد بہن خارجیہ تھی اس سے نکاح کرلیا علماء کرام نے طعنہ زنی کی تو اس نے کہا کہ میں نے اسلیے نکاح کیا ہے کہ اس کو اپنے مذہب پر لے آؤں گا لیکن ایک سال نہ گزرا تھا کہ خود خارجی ہو گیا۔

شد غلام کہ آب جو آرد
آب جو آمد و غلام ببرد

(ملفوظات حصہ دوئم صفحہ ۱۰۸)

لہٰذا مسلمانوں کو چاہیے کہ یہودی، عیسائی اور دیگر بے دین، بدمذہب عورتوں کو اپنے نکاح میں لانے سے بچیں ورنہ بعض اوقات سخت قومی اور دینی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔

(ضروری ہدایت)

اپنی بچیوں کے لیے خوش اخلاق، دین دار خاوند تلاش کرو۔ محض مال و دولت پر لڑکی نہ دو ورنہ بعض اوقات بعد میں سخت پریشانی اٹھانی پڑتی ہے۔ بچے کا پہلا مکتب ماں باپ کی گود ہے آوارہ بداخلاق ماں باپ کی اولاد بھی اکثر آوارہ اور گستاخ ہی ہوتی ہے۔

معدنِ زر معدنِ فولاد بن سکتی نہیں
بے ادب ماں با ادب اولاد جن سکتی نہیں

حضرت سیّدتنا فاطمہ خاتونِ جنت (رضی اللہ عنہا) جیسی ماں ہو تو حضرت حسین (رضی اللہ عنہ) جیسے فرزند پیدا ہوتے ہیں۔ شاعرِ مشرق علامہ اقبال نے آج کل کی آزاد منش عورتوں کو مخاطب کرتے ہوئے کیا خوب فرمایا۔

اگر پندے ز درویشے پزیری — جہاں میرد و لیکن تو نہ میری
بتولے باش پنہاں شو ازیں عصر — کہ در آغوش شبیرے بگیری

حضور سید عالم ﷺ نے اپنی لختِ جگر سیدہ فاطمۃ الزاہرہ (رضی اللہ عنہا) کے لیے حضرت علی (رضی اللہ عنہ) جیسے مردِ فقیر کو منتخب فرمایا جن کے پاس بجائے مال و دولت کے اللہ رسول ﷺ کا نام ہی تھا لیکن ان کا سینہ دولتِ ایمانی سے مالا مال تھا۔ نیز ایسی بہوویں گھر میں لاؤ جو قرآن ،مصلا، تسبیح ساتھ لائیں نہ کہ ریڈیو، ٹی وی بلکہ چاہیے کہ ان کے آنے سے گھر اللہ کے ذکر سے بھر جاوے۔

۲۔ بدمذہبوں کو اپنا دوست اور رازداری بنانا یا انہیں اپنے گھر کے اختیارات دینا ناجائز ہے۔ نکاح کفار سے اسی لیے منع فرمایا گیا ہے کہ اس طرح کفار کو مسلمانوں کے رازداری اور ان سے خلط ملط کا موقع ملے گا قرآن کریم میں ہے (لَاتَتَّخِذُوا بِطَانَةً مِنْ دُوْنِكُمْ) یعنی (کفار کو اپنا رازدار نہ بناؤ) کیوں کہ (لَا يَأْلُوْنَكُمْ خَبَالًا) کہ وہ تمہاری ہلاکت میں کوتاہی نہیں کریں گے-زمانہ فاروقی میں حضرت امیر معاویہ (رضی اللہ عنہ) نے اپنے خط وکتابت کے لیے ایک غیر مسلم کو اپنا کاتب (سیکریٹری) مقرر کیا، فاروق اعظم (رضی اللہ عنہ) نے پوچھا کہ یہ کیا کیا؟ عرض کی کہ شہر میں کوئی ایسا پڑھا لکھا قابل مسلمان نہ ملا لہٰذا مجبوراً رکھ لیا گیا۔ آپ نے فرمایا اگر یہ مرجائے تو کیا کرو گے عرض کیا پھر کوئی اور بندوبست کرلوں گا۔ فرمایا وہ بندوبست اب ہی کرلو۔ (نعیمی)

۳۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ آزاد عورت سے نکاح کرنے پر قدرت ہوتے ہوئے بھی لونڈی سے نکاح جائز ہے کیوں کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ جس میں آزاد مشرکہ سے نکاح کرنے کی طاقت ہو تو وہ اس سے نکاح نہ کرے بلکہ بجائے اس کے مسلمان لونڈی سے کرلے۔اور ظاہر ہے کہ جس میں آزاد مشرکہ سے نکاح کی طاقت ہوگی اس میں آزاد مومنہ سے بھی نکاح کی طاقت ہوگی کیوں کہ ان میں ایمان اور کفر کا فرق ہے نہ کے مال کا۔اس سے مذہب حنفیہ کی پوری تائید ہوتی ہے-امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی شافعی ہونے کے باوجود تردید نہیں کی بلکہ فرمایا (وھذا الاستدلال لطیف فی ھذہ المسئلہ)

حیض کا لغوی و شرعی معنیٰ اور اس کے احکام

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ قُلْ هُوَ اَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ وَ لَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ (سورة البقرة:۲۲۲)

"اور تم سے پوچھتے ہیں حیض کا حکم۔ تم فرمادو وہ ناپاکی ہے تو عورتوں سے الگ رہو حیض کے دنوں میں اور ان سے نزدیکی نہ کرو جب تک پاک نہ ہو جائیں پھر جب پاک ہو جائیں تو ان کے پاس جاؤ جہاں سے اللہ نے تمہیں حکم دیا ہے بے شک اللہ پسند رکھتا ہے بہت توبہ کرنے والوں کو اور پسند رکھتا ہے ستھروں کو"

تعلق:

پہلی آیت میں نجس عورت یعنی کافرہ سے نکاح کی ممانعت تھی اور یہاں گندی عورت یعنی حائضہ سے جماع کی ممانعت ہے گویا عقیدہ کی گندگی کے احکام بتا کر جسمانی گندگی یعنی حیض کے احکام ارشاد ہو رہے ہیں (نعیمی)

شان نزول:

عرب کے یہودی اور مجوس حائضہ عورتوں سے بہت نفرت کرتے تھے۔ ان کے ساتھ کھانا پینا ایک مکان میں رہنا گوارہ نہ کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کی طرف دیکھنا اور ان سے کلام بھی حرام جانتے تھے مگر وہاں کے عیسائی حائضہ عورتوں سے صحبت بھی کرتے تھے۔ مشرکین عرب

یہودیوں کی چال چلتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت ثابت ابن واحد اور دیگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے حضور ﷺ سے حیض کے احکام پوچھے تب یہ آیت کریمہ اتری جس میں مسلمانوں کو یہودیوں کی افراط اور عیسائیوں کی تفریط سے منع کر کے درمیانی راستہ بتایا گیا کہ تم حیض کے زمانے میں جماع نہ کرو اس کے علاوہ سارے برتاوے برتو۔ (نعیمی، درمنشور، روح المعانی وغیرہ)

تفسیر:

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ : محیض کا مادہ حیض ہے بمعنی بہنا اس لیے حوض کو حوض کہتے ہیں کہ اس میں پانی بہہ کر آتا ہے اہلِ عرب ی کو واؤ اور واؤ کو ی سے بدل دیا کرتے تھے۔ شریعت میں حیض عورتوں کے ماہواری خون کا نام ہے جو رحم سے بذریعہ شرم گاہ جاری ہوتا ہے۔ اس کی مدت کم از کم تین دن اور زیادہ سے زیادہ دس دن ہے۔ اگرچہ سوال میں اجمال ہے مگر جواب سے ظاہر ہے کہ سوال احکام کے متعلق تھا کہ حائضہ کے احکام کیا ہیں؟ یعنی اے نبی ﷺ لوگ آپ سے حیض کے احکام پوچھتے ہیں۔ (قُلْ هُوَ اَذًى ھو کا مرجع محیض مصدر ہے اذیٰ کے معنی ہے گندی یا ناپسندیدہ یا تکلیف دہ چیز۔ سخت تکلیف کو ضرر اور معمولی کو اذیٰ کہا جاتا ہے۔ چوں کہ حیض کا خون گندا بھی اور اس سے نفرت بھی آتی ہے نیز اس حالت میں جماع کرنے سے عورت کو تکلیف مرد کو آتشک اور اس کی اولاد کے کوڑھی اور بے غیرت اور بے حیا ہونے کا سخت اندیشہ ہے۔ اس لیے اسے اذیٰ کہا گیا۔ عربی میں نجاست، خباثت، اذیٰ قریب المعنی ہیں۔ مگر اکثر نجاست ظاہری گندگی کو کہا جاتا ہے۔ خباثت اندرونی گندگی کو اور اذیٰ دونوں قسم کی گندگیوں کے مجموعہ کو۔ بلکہ اس کو جو علاوہ گندے ہونے کے مضر و ایذا رساں بھی ہو۔ استحاضہ کا خون اور پیشاب وغیرہ نجس ہے۔ اذیٰ نہیں مگر حیض اذیٰ ہے۔ اسی لیے ہی حیض صحبت کو حرام کر دیتا ہے۔ بحالتِ حیض عورت کی شرم گاہ نجس حقیقی ہے۔ باقی سارا بدن نجس حکمی ہے۔ یعنی فرما دو کہ یہ حیض گندگی یا پلیدی یا تکلیف دہ چیز ہے۔ لہٰذا (فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ) ۔ فاعتزلوا عزل بمعنی کسی سے الگ

ہو جانا۔ یہاں عورتوں سے جماع نہ کرنا مراد ہے۔ یہاں محیض اسم ظرف ہے خواہ زماں ہو یا مکاں یعنی زمانہ حیض میں عورتوں کے پاس نہ جاؤ یا مقام حیض یعنی شرم گاہ میں عورتوں کے پاس نہ جاؤ۔ خیال رہے کہ حائضہ عورتوں سے صرف جماع کرنا حرام ہے نہ کہ انہیں چھونا یا بات چیت کرنا۔ اس سے پہلے ھواذیٰ کہہ کر یہ بتایا کہ وہ حیض پلید ہے نہ کہ عورتوں کا سارا جسم۔ حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک روز حضور علیہ السلام نے مجھ سے فرمایا کہ مسجد سے چٹائی اٹھا دو میں نے عرض کی کہ میں حائضہ ہوں تو آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ حیض (کی ناپاکی) تیرے ہاتھ میں نہیں ہے (رواہ مسلم) یعنی خود باہر کھڑی ہو کر ہاتھ بڑھا کر مصلی اٹھا کر دے دو۔

بخاری و مسلم نے بروایت انس رضی اللہ عنہ نقل کیا کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ علیہ السلام نے فرمایا کہ سوائے صحبت کے سب کچھ کر لیا کرو (مظہری) ابن جریر نے بروایت مسروق بن اجدع حضرت ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اسی طرح نقل کیا۔ (تفسیر آیات الاحکام)

وَ لَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ : یقرب (ر کے پیش سے) کے معنی قرب مکانی کے ہوتے ہیں اور یقرب (راء کے زبر سے) کے معنی قرب استعمال ہوتے ہیں۔ (وَ لَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ) میں بھی تقربوا کی راء پر زبر ہے لہذا مطلقاً مال یتیم کے پاس جانے سے ممانعت نہیں بلکہ اس کے غلط استعمال سے روکا گیا ہے۔ یہاں بھی چوں کہ راء پر زبر ہے لہذا اس سے جماع مراد ہے نہ کہ قریب ہونا۔ متقی شخص جو اپنے نفس پر قابو رکھتا ہو وہ بوس و کنار کر سکتا ہے اور وہ نوجوان جو اپنے نفس پر کنٹرول نہ کر سکے اس کو حالت حیض میں بوس و کنار وغیرہ اسباب جماع سے بھی بچنا چاہیے۔ یَطْهُرْنَ کی دو قراءتیں ہیں ایک طاء اور ھاء کی تشدید سے یعنی خوب پاک ہو جائیں حیض کے بعد غسل بھی کریں۔ دوسری طاء کے جزم اور ھاء کے پیش سے یعنی پاک ہو جائیں کہ حیض بند ہو جائے۔ دونوں قراءتوں کے معنی امام مالک، شافعی، احمد رحمۃ اللہ علیہم کے نزدیک ایک ہی ہیں یعنی جب تک وہ نہا نہ لیں پس خون بند ہو جانے کے بعد غسل کرنے سے پہلے مردوں کو ان کے

قریب جانا جائز نہیں۔ لیکن سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اگر عورت دس دن سے کم میں پاک ہو تو جب تک غسل نہ کرلے یا وقت نماز نہ گزر جائے اس سے جماع جائز نہیں اور اگر دس دن کے بعد پاک ہو تو خون بند ہوتے ہی بغیر غسل اس سے جماع جائز ہے۔ اس طرح دونوں مختلف قرأتوں پر عمل ہو گیا۔

فَإِذَا تَطَهَّرْنَ: یہاں تطہرن یا تو طہرن کے معنی میں ہے یا اس سے ایک حالت مراد ہے یعنی دس دن سے کم دن میں بند ہونا۔ صاحب روح المعانی نے فرمایا کہ جب عورت کی طرف طہر منسوب ہو تو اس سے غسل مراد نہیں ہوتا بلکہ فقط خون کا بند ہونا۔ یہ ہی عبداللہ ابن عباس اور مجاہد رضی اللہ عنہم کا قول ہے۔

فَأْتُوهُنَّ: یہ امر اباحت کے لیے ہے کیوں کہ ممانعت کے بعد امر اسی لیے آتا ہے جیسے (وإِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوا) یعنی جب عورتیں پاک ہوں تو تم ان سے جماع کر سکتے ہو لیکن

مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ اللّٰهُ: حیث کے معنی جگہ کے ہیں۔ عبداللہ ابن عباس، مجاہد اور قتادہ وغیرہم (رضی اللہ عنہم) فرماتے ہیں اس کے معنی ہیں جہتیں (روح المعانی) یعنی اس جگہ میں جماع کرو جہاں سے خدا کی اجازت ہے یعنی فرج میں نہ کہ دُبر میں۔ یا بقول عبداللہ ابن عباس اور دیگر مفسرین جائز جہتوں سے جماع کرو کہ اگر عورتیں روزہ دار یا احرام یا اعتکاف میں ہوں تو ہرگز جماع نہ کرو۔ (نعیمی، روح المعانی)

إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ: توّاب کے معنی ہیں بکثرت یا اچھی طرح توبہ کرنے والا یعنی اللہ تعالیٰ بہت توبہ کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ: اور بہت پاک ہونے والوں کو پسند فرماتا ہے جو کہ حیض اور شرک دونوں گندگیوں سے بچیں۔

فوائد ومسائل

عورتوں کو تین قسم کے خون آتے ہیں۔ایک ماہواری اسے حیض کہتے ہیں۔ یہ بالغہ عورت کے رحم سے بغیر کسی بیماری کے آتا ہے۔اس کی مدت کم از کم تین دن اور زیادہ سے زیادہ دس دن ہے اس حالت میں عورت سے جماع کرنا حرام ہے۔اس خون کا رنگ کبھی سرخ کبھی پیلا کبھی کالا کبھی مٹیلا ہوتا ہے اس میں سخت بدبو ہوتی ہے حائضہ سے صحبت کا حرام ہونا قرآن سے ثابت ہے۔

دوسرے وہ خون جو عورتوں کو بچہ پیدا ہونے کے بعد آتا ہے نفاس کہلاتا ہے اس کی زیادہ سے زیادہ مدت چالیس دن ہے اور کم کی کوئی حد نہیں چوں کہ یہ خون بھی رحم سے ہی آتا ہے اسلیے اس کے احکام بھی حیض کے سے ہیں۔بعض عورتیں بچہ پیدا ہونے کے بعد چالیس دن نماز نہیں پڑھتی خواہ خون آئے یا نہ آئے وہ سخت غلطی کرتی ہیں۔

تیسرے وہ خون جو ایک بیماری ہے۔جس سے کوئی رگ کھل جاتی ہے اور عورت کو شرم گاہ سے خون آنے لگتا ہے یہ خون چوں کہ رحم کا نہیں ہوتا اسلیے اس کے احکام حیض ونفاس کے سے نہیں ہیں۔اسے شرعاً استحاضہ کہتے ہیں اور اس حالت میں عورت پر نماز بھی فرض ہوتی ہے اور اس سے صحبت بھی جائز ہوتی ہے۔

مسئلہ: حیض عورت پر نماز کے وجوب اور جواز دونوں کو روک دیتا ہے اور روزہ کے صرف جواز کو روکتا ہے اس کے وجوب کو نہیں روکتا۔یعنی حالت حیض میں عورت کو روزہ رکھنا جائز نہیں۔لیکن اس کے ذمہ واجب ہو جاتا ہے۔اسلیے حائضہ پر نماز کی قضا نہیں اور روزوں کی قضا ضروری ہے کہ بعد میں رکھنے پڑیں گے۔

مسئلہ: مستحاضہ سے صحبت جائز اور اس پر نماز وغیرہ بھی فرض۔

مسئلہ: حیض ونفاس میں آٹھ چیزیں عورت پر حرام ہیں۔(۱) نماز (۲) روزہ (۳) تلاوت

قرآنِ کریم (۴) قرآنِ کریم چھونا (۵) مسجد میں آنا (۶) طواف (۷) صحبت۔ ان کے علاوہ باقی نیک اعمال کرسکتی ہے کلمہ طیبہ دیگر دعائیں، درود شریف، بقیہ ارکان حج سب کچھ کرسکتی ہے۔ تلاوتِ قرآن میں بھی یہ آسانی ہے کہ قرآن مجید کی ہجہ بچوں کو کراسکتی ہے۔ الفاظِ قرآن بہ نیت دعا پڑھ سکتی ہے۔

مسئلہ: اگر ماہواری خون تین دن سے کم آئے تو استحاضہ ایسے ہی اگر دس دن سے بڑھ جائے تو زیادتی استحاضہ ہے۔

مسئلہ: کچا بچہ گرنے کی صورت میں اگر بچہ کے ہاتھ پاؤں بن گئے ہیں تو وہ خون نفاس ہے ورنہ استحاض: (ردالمختار)

مسئلہ: صاحب تفسیر درمنشور نے بروایت عبدالرزاق نقل کیا کہ حیض بنی اسرائیل کی عورتوں سے شروع ہوا لیکن صاحب تفسیر نعیمی حکم الامت مفتی احمد یار خاں رحمۃ اللہ علیہ نے نقل فرمایا کہ یہ حیض حضرت حوا علیہا السلام سے ہی شروع ہو چکا تھا کہ یہ ان کے گندم کھانے کا اثر تھا۔ اور یہی صحیح ہے۔ (واللہ اعلم)

مسئلہ: حالتِ حیض میں عورت کے ناف سے گھٹنے تک بدن سے بچے۔ باقی کو چھونا اور چپٹانا جائز ہے۔

مسئلہ: اگر حیض پورے دس دن پر ختم ہوا تو بند ہوتے ہی اس سے صحبت کرسکتا ہے۔ غسل کا انتظار ضروری نہیں اور اگر دس دن سے پہلے مگر عورت کی عادت کے موافق بند ہو تو صحبت جب حلال ہوگی جبکہ عورت یا تو غسل کرے یا اس پر نماز کا وقت گزر جائے۔

مسئلہ: اگر غلبہ شہوت سے حالتِ حیض میں صحبت کر بیٹھا تو خوب توبہ کرنا واجب ہے اور بہتر ہے کہ کچھ خیرات بھی کردے۔

مسئلہ: بحالت حیض عورت حرام نہیں بلکہ اس سے جماع کرنا حرام ہے یعنی حیضی بچہ حلالی ہوگا اگر عورت حرام ہوتی تو حرامی ہوتا۔

خبردار دوسری غیر عورتوں پر نظر نہ اُٹھانا، تمہاری کھیتیاں تمہاری اپنی بیویاں اور لونڈیاں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ (سورۃ البقرۃ:۲۲۳)

''تمہاری عورتیں تمہارے لیے کھیتیاں ہیں۔ تو آؤ اپنی کھیتی میں جس طرح چاہو اور اپنے لیے آگے بھیجو (اعمال صالحہ) اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ تمہیں اس سے ملنا ہے اور محبوب بشارت دو ایمان والوں کو''

تعلق:

گزشتہ آیت میں اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق عورتوں سے صحبت کرنا اور اس کے اوقات کا ذکر تھا۔ اور اب اس کی تفصیل اور کیفیات کا تذکرہ ہے۔

شانِ نزول:

یہود کہتے تھے کہ جو کوئی اپنی بیوی کے ساتھ پیچھے سے فرج میں جماع کرے تو بچہ احول (بھینگا) پیدا ہوگا۔ ایک بار ایک (جلیل القدر) صحابی رضی اللہ عنہ بارگاہ رسالت میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگے کہ یارسول اللہ ﷺ میں تو ہلاک ہوگیا کہ میں اس طرح صحبت کر بیٹھا تب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی جس میں اس کی بلکہ ہر طرح صحبت کرنے کی اجازت دی گئی بشرطیکہ فرج میں ہی ہو۔ (تفسیر کبیر، احمدی، نعیمی وغیرہ)

تفسیر:

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ : (تمہاری عورتیں تمہارے لیے کھیتیاں ہیں) نسآء سے مراد اپنی

بیویاں اور لونڈیاں ہیں۔ نِساؤکم فرما کر یہ بتایا گیا کہ خبردار دوسری غیر عورتوں پر نظر نہ اٹھانا تمہاری کھیتیاں صرف تمہاری اپنی بیویاں اور لونڈیاں ہیں اسی ایک لفظ میں ہی تقوی کا سبق دے دیا گیا۔ لہٰذا زانی کے نطفے سے جو بچہ پیدا ہوگا وہ اس کا بچہ شرعاً نہ مانا جائے گا۔ نہ اس کو اس کی پرورش نکاح وغیرہ کا حق، نہ میراث کا استحقاق کیوں کہ یہ بچہ اس کے کھیت کی پیداوار نہیں۔ حرث مصدر بمعنی حراثت (کھیتی بونا) حرث اور زرع میں یہ فرق ہے کہ حرث زمین تیار کرنے اور بیج ڈالنے کو کہتے ہیں اور زرع بیج کی حفاظت اور اگانے کو، اس لیے قرآن مجید میں حرث بندوں کی طرف اور زرع رب تعالیٰ کی طرف منسوب ہے۔ ارشاد فرمایا (اَفَرَءَیْتُمْ مَا تحرثون ءَ اَنْتُمْ تزرعونہٗ ام نحن الزارعون) پس عورت گویا کھیت ہے اور نطفہ بیج اور اولاد پیداوار۔ کسان کو اپنی زمین میں تخم ریزی کا حق ہوتا ہے نہ کہ دوسرے کی زمین میں نیز بعض زمینیں بہت ذرخیز ہوتی ہیں بعض کم اور بعض بالکل بنجر اسی طرح بعض عورتیں زیادہ صاحبِ اولاد ہوتی ہیں بعض کم اور بعض بالکل بانجھ۔ بعض عورتیں خبیث بچے جنتی ہیں، بعض طیب صالح۔ ان وجوہ کی بناء پر عورتوں کو کھیت فرمایا گیا۔ خیال رہے کہ مالک کھیت کو ملک سے نکال سکتا ہے مگر کھیت خود مالک کی ملک سے نہیں نکل سکتا۔ اسی طرح مرد عورت کو طلاق دے سکتا ہے عورت خود خاوند کے نکاح سے نہیں نکل سکتی غرض یہ کہ عورتوں کو کھیت کہنے میں بہت سی حکمتیں ہیں۔ (نعیمی)

فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ: چوں کہ پہلے حرث سے مجازاً عورت (بیوی) مراد تھی اس لیے یہاں ضمیر نہ لائے یعنی جب عورتیں تمہاری کھیتیاں ہوئیں تو اپنی کھیتی یعنی شرم گاہ کو جس طرح چاہو استعمال کرو۔

اَنّٰى شِئْتُمْ: صاحب روح المعانی نے فرمایا کہ انّی بمعنی اَیْنَ بھی آتا ہے اور کیف بھی اور متٰی بھی یعنی جہاں کہیں، یا جس طرح، یا جب کہیں، مگر این کے معنی میں ہو تو اس کے پہلے من ضرور ہوتا ہے خواہ ظاہر یا پوشیدہ جیسے (انی لک ھذا) (اے مریم تمہارے پاس یہ رزق کہاں سے آیا)

یہاں انّٰی کے تینوں معنی بن سکتے ہیں جب کبھی چاہو دن میں یا رات یا جیسے چاہو کھڑے ہو کر بیٹھ کر یا لیٹ کر۔ آگے سے پیچھے سے یا چت بشرطیکہ صحبت فرج میں ہو یا جس جگہ سے چاہو آگے سے یا پیچھے سے۔ خلاصہ یہ کہ اگر کیف یا متٰی کے معنی میں ہو تو بالکل ظاہر ہے اور اگر این کے معنی میں ہو تو معنی یہ ہوں گے کہ جدھر سے چاہو فرج میں جماع کرو آگے سے یا پیچھے سے نہ یہ کہ جہاں چاہو فرج یا دبر میں یہ ہی قول قتادہ اور ربیع کا ہے اور یہ ہی شان نزول کے مطابق ہے اس پر اعتراض کرنے والے اس نکتہ سے ناواقف ہیں۔ (نعیمی)

وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ : (اور اپنے لیے (اعمال صالحہ) آگے بھیجو) یعنی صحبت کرنے سے فقط اس وقت کی لذت ہی مقصود نہ رکھو بلکہ ان فائدوں کا قصد کرو جو دین کی طرف راجع ہوتے ہیں۔ مثلاً حرام کاری سے بچنا، نیک اولاد ہونا کہ تمہارے لیے دعا اور استغفار کرے اور مر جائے تو قیامت میں پیش خیمہ ہو کیوں کہ (فان الامور المباحة باقتران النیه الصحیحة الصالحة تصیر عبادة) (مباح امور اگر خالص صحیح نیت کے زیر اثر ہوں تو عبادت بن جاتے ہیں) حضور ﷺ نے فرمایا کہ تمہارے صحبت کرنے میں بھی ثواب ہے صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کیا ہم اپنی شہوت پوری کریں تو جب بھی ہمیں اجر ملتا ہے؟ فرمایا: تم ہی بتاؤ اگر کوئی حرام کاری کرے تو کیا اس کا اس کے ذمے گناہ نہیں ہوگا۔ پس اسی طرح اگر کوئی حلال جگہ کرے گا تو اسے اجر بھی ملے گا۔ (رواہ مسلم) (مظہری)

وَاتَّقُوا اللّٰهَ : ہر کام میں اللہ سے ڈرتے رہو۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ : دھیان رکھو تمہیں رب سے ملنا ہے دور دراز سفر درپیش ہے۔ توشہ کا انتظام کرو ان معاملات میں مشغول ہو کر اپنا رستہ نہ کھوٹا کرو۔

وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ : یہ حضور ﷺ سے خطاب ہے کہ اے نبی ﷺ ان متقی مسلمانوں کو جو ہر وقت رب سے ڈرتے ہیں خوش خبری دے دو کہ ان کا ہر کام سونا، جاگنا، کھانا، پینا بلکہ صحبت کرنا بھی عبادت اور باعث ثواب جیسا کہ ابھی حدیث شریف میں گزرا۔

فوائد و مسائل

آیت کریمہ سے چند فائدے حاصل ہوئے۔

۱۔ قرآن کریم نازک مضامین کو اس تہذیب سے بیان فرماتا ہے کہ سبحان اللہ۔ عورت مرد کے تعلقات بہت نازک ہیں۔ ان کو نہایت تہذیب کے ساتھ چند الفاظ میں بیان فرمادیا۔ عرب کے شاعر فحش گوئی میں مشہور تھے۔ گندے مضامین لکھ کر ان پر فخر کرتے اور مجمعوں میں فخریہ پڑھتے تھے۔ دیوان متنبی اور امراء القیس کے فحش اشعار لوگ بڑے ذوق وشوق سے پڑھتے تھے۔ ایسے ملک میں اس تہذیب کا نمونہ پیش کرنا قرآنی معجزہ ہے۔

۲۔ واعظ کو چاہیے کہ دنیوی باتیں بتاتے وقت آخرت کا بھی ذکر کرے تاکہ لوگ اس سے غافل نہ ہوجائیں دیکھئے اس آیت میں خاوند کو جماع کی عام اجازت دے کر نیک اعمال اور تقوے کا حکم دیا اور بتایا کہ تمھیں رب سے ملنا ہے اس کی فکر کرو

۳۔ انسان کو چاہیے کہ صرف شہوت پوری کرنے کے لیے مجامعت نہ کرے بلکہ نیک اولاد حاصل کرنے یا سکونِ قلب کے لیے تاکہ عبادت بافراغت ہو۔ اس نیت سے ان شاء اللہ ثواب بھی ہوگا۔

۴۔ جس چیز پر شریعت نے پابندی نہ لگائی ہو اس میں پابندی لگا کر بعض کو حرام اور بعض کو حلال کہنا سخت جرم ہے۔ یہود پیچھے سے مجامعت کرنے کو ناجائز سمجھتے تھے جس کی یہاں تردید کردی گئی اور فرمادیا کہ جماع سے مقصود اولاد حاصل کرنا ہے۔ وہ ہر طرح ہوگی پھر پابندیاں کیوں لگاتے ہو لہٰذا دیوبندیوں اور وہابیوں کا بعض امور خیر میں بلاوجہ پابندیاں لگانا کہ یوں کرو تو جائز اور اس طرح کرو تو ناجائز سخت منع ہے جب شریعت نے آزادی دی تو دوسرا پابندی لگانے والا کون؟

۵۔ بیوی کے ساتھ صرف فرج میں صحبت جائز ہے دبر میں حرام چند دلائل کے ساتھ۔ (۱) یہاں فرمایا گیا کہ اپنی کھیتیوں میں آؤ اور فرج ہی کھیتی ہے نہ کہ دبر۔ دوسرے یہ کہ یہ مسئلہ مسئلہِ حیض کے بعد بیان کیا گیا وہاں فرمایا گیا تھا کہ چوں کہ حیض پلیدی ہے لہٰذا اس میں عورتوں سے بچو ظاہر ہے کہ وہ دبر حیض سے بڑھ کر پلید ہے لہٰذا وہاں مجامعت کیوں کر حلال ہوگی۔ دونوں جگہ جب علت ایک ہے تو حکم بھی ایک ہی ہونا چاہیے۔ یہ اس آیت کا شان نزول بھی بتا رہا ہے کہ یہاں فرج میں مجامعت کرنا مراد ہے کیوں کہ سوال اسی کے متعلق تھا۔

٦۔ مجامعت سے پہلے بسم اللہ پڑھنی سنت ہے مگر خیال رہے کہ ستر کھلنے سے پہلے پڑھی جائے یہی حکم پاخانے کا ہے کہ جائے پاخانہ میں داخل ہونے سے پیشتر اعوذ پڑھی جائے (شامی)

مسئلہ: حرام پر بسم اللہ پڑھنا کفر ہے (خطبہ شامی) کیوں کہ بسم اللہ برکت کے لیے اور برکت حلال میں ہے حرام میں نہیں۔

۷۔ اسلام بہت اعلیٰ دین ہے۔ اور حضور ﷺ بہترین معلم اور قرآن کریم مکمل ہدایت اور کامل دستور العمل ہے کہ اسلام نے ہم کو صرف عبادات ہی نہ سکھائیں بلکہ معمولی سے معمولی معاملات کی بھی تعلیم دی تاکہ مسلمان کسی قوم کی شاگردی نہ کریں اور زندگی انسان کا کوئی پہلو تشنہ نہ رہنے پائے۔ دیکھئے یہاں بیویوں سے صحبت کرنے کے طریقے بھی سکھا دیئے۔ حضور ﷺ نے ہم کو پیشاب پاخانہ کرنے کے طریقے بھی سکھائے۔ غرض یہ کہ دین اسلام مکمل ضابطہ حیات ہے ہمیں اسلام سے باہر کسی اور نظام کی ضرورت نہیں۔

اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ عورتوں کے ساتھ دبر (جائے پاخانہ) میں جماع جائز ہے کیوں کہ یہاں فرمایا گیا اَنّٰی شِئْتُم جہاں چاہو (بعض شیعہ)

جواب: اس کا تفصیلی جواب آیت کی تفسیر میں گزرا کہ انّی کے معنی یا تو ہیں جب کبھی یا جیسے اور اگر این کے معنی میں ہو تو بھی وہاں مِنْ پوشیدہ ہوگا یعنی جہاں کہیں سے چاہو آگے کی

طرف سے یا پیچھے کی طرف سے فرج میں جماع کرو۔ اسی لیے یہاں فرمایا گیا کہ اپنی کھیتوں کے پاس آؤ سورہ ال عمران میں ہے (انّٰی لک ھذا) (اے مریم تمہارے پاس یہ پھل کہاں سے آئے) یہ ہی معنی یہاں ہیں کہ جہاں سے چاہو نہ یہ کہ جہاں چاہو۔

اعتراض: تفسیرِ روح المعانی میں اس آیت کے تحت ہے کہ عبداللہ ابن عمر اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بیویوں سے دبر میں صحبت جائز ہے۔

جواب: یہ ان دونوں حضرات پر محض بہتان ہے۔ اسی لیے روح المعانی نے اسی جگہ فرمادیا کہ امام مالک کے ساتھی اس روایت کا انکار کرتے ہیں۔ عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق صاحبِ تفسیرِ کبیر نے اسی جگہ فرمایا کہ حضرت نافع رضی اللہ عنہ نے ان سے یہ روایت کی۔ مگر یہ روایت غلط ہے اور سب لوگوں نے نافع کی اس روایت کا انکار کردیا خود حضرت نافع رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کہ یہ روایت میں نے نہیں کہی لوگوں نے مجھ پر بہتان باندھ دیا (در منثور) اور خود عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایات بکثرت موجود ہیں جن میں وہ اس سے سخت منع فرماتے ہیں۔ مزید تحقیق کے لیے تفسیر درِ منثور دیکھیے۔

قرآنِ کریم سے ثابت ہے کہ قومِ لوط پر اسی وجہ سے عذاب آیا۔ یہ فعل خواہ لڑکے سے ہو یا عورت سے یکساں باعثِ عذاب ہے کوئی امام اس کا قائل نہیں اس قسم کی تمام روایتیں محض غلط اور بے بنیاد ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَلَا تَجۡعَلُوۡا اللّٰهَ عُرۡضَةً لِّاَیۡمَانِكُمۡ اَنۡ تَبَرُّوۡا وَتَتَّقُوۡا

وَتُصۡلِحُوۡا بَیۡنَ النَّاسِ وَاللّٰهُ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ (سورۃ البقرۃ:۲۲۴)

"اور اللہ کو اپنی قسموں کا نشانہ نہ بناؤ کہ احسان اور پرہیز گاری اور لوگوں میں صلح کرنے کی قسم کرلو اور اللہ سنتا جانتا ہے"

شان نزول:

(۱) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے خالہ زاد بھائی مسطح غریب آدمی تھے جن کا سارا خرچہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہی اٹھاتے تھے لیکن مسطح نے حضرت ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگانے والوں کی کچھ حمایت کی۔اس پر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ناراض ہوئے اور قسم کھالی کہ آئندہ انہیں خرچ نہ دوں گا کیوں کہ انہوں نے میری عزت کو اپنی عزت نہ سمجھا یہ میرے عزیز نہیں کہ میری اولاد کے بھی ہمدرد نہیں اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

(۲) بشیر ابن نعمان رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی تو ان کے بھائی عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے قسم کھالی کہ میں اپنے بہنوئی ابن نعمان کے گھر کبھی نہ جاؤں گا اور نہ کبھی ان سے کلام کروں گا اور نہ دونوں میاں بیوی میں صلح کراؤں گا۔تب یہ آیت نازل ہوئی (روح المعانی)

تفسیر:

وَلَا تَجۡعَلُوۡا اللّٰهَ عُرۡضَةً لِّاَیۡمَانِكُمۡ : اللہ کو اپنی قسموں کی آڑ نہ بناؤ عرضۃ عرض سے بنا ہے جس کے معنی ہیں آڑ، حائل، مانع اور پیش آنی والی چیز۔اسی لیے پیش کرنے کو عرض اور سوال کو اعتراض، چوڑائی کو عرض اور مقابلہ کو معارضہ کہا جاتا ہے کیوں کہ اگر کوئی چیز راستہ کے بیچ میں رکھ

دی جائے تو گزرنے سے روکتی ہے اعتراض اور مقابلہ بھی روکنے ہی کے لیے ہوتا ہے ڈھال کو بھی اسی معنی میں عرضہ کہا جاتا ہے۔ نشانے کو بھی اسی لیے عرضہ کہتے ہیں اسے سامنے رکھ کر مارا جاتا ہے یہاں تو بمعنی آڑیا بمعنی نشانہ ہے۔ ایمان جمع یمین کی ہے بمعنی دایاں ہاتھ چوں کہ دایاں ہاتھ بائیں سے قوی ہوتا ہے اور قسم میں بھی ایک جہت قوی ہوتی ہے اس لیے اسے یمین کہا جاتا ہے یعنی اللہ کے نام کو نیک کاموں کے لیے آڑ نہ بنالو کہ نیکی سے قسم کھا کر بعد میں کہہ دیا کہ ہم یہ نیکی کیسے کریں ہم تو قسم کھا چکے ہیں یا اللہ کے نام کو اپنی قسموں کا نشانہ نہ بنالو کہ بار بار اسی کی قسمیں کھائے جاؤ (نعیمی)

اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَیْنَ النَّاسِ : (کہ سلوک کرو اور پرہیز گاری کرو اور لوگوں میں صلح کراؤ) تَبَرُّوْا بِرّ سے بنا ہے جس کے معنی بھلائی، نیکی اور احسان کے ہیں اور یہ ساری نیکیوں کو شامل ہے اس کے بعد تقوی اور اصلاح کا ذکر گویا عام کے بعد خاص کا ذکر ہے۔ یہ عبارت یا تو بمعہ اپنے معطوفوں کے ایمانکم کا عطفِ بیان ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ لایمانکم میں لام علت کا ہو اور ان فعل لاتجعلوا یا عرضۃ کے متعلق ہو یعنی (وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِاَیْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا) یعنی (تعالیٰ کی قسم کو لوگوں کیساتھ سلوک کرنے سے تم آڑ نہ بنالو) کہ تم قسم کھالو فلاں شخص کیساتھ سلوک نہ کریں گے یا قسم کھا کر نیکیاں چھوڑ بیٹھو۔ قاموس میں ہے العرضۃ الاعتراض فی الخیر والشر اس صورت میں یہ معنی ہونگے (کہ ہر وقت خدا کی قسم نہ کھایا کرو) اَنْ تَبَرُّوْ یا تو نہی کی علت ہوگی یعنی تمہیں قسم سے منع کیا جاتا ہے تا کہ تم متقی ہو جاؤ۔ یا منہی کی علت ہوگی اس صورت میں لا مقدر مانا جائے گا یعنی زیادہ قسمیں نہ کھایا کرو (کہ زیادہ قسمیں کھانے سے) تم پرہیز گار نہ ہو گے اور لوگوں میں تمہارا اعتبار نہ رہے گا تو لوگوں میں صلح کرانا جو اہم کام ہے اس کو انجام نہ دے سکو گے۔

فوائد و مسائل

۱۔ زیادہ قسمیں کھانا اچھا نہیں کہ اس سے رب کے نام کی ہیبت دل سے جاتی رہتی ہے۔ نیز جو کوئی سچی قسمیں کھانے کا عادی ہو جائے وہ جھوٹی قسموں سے بھی نہ ڈرے گا (کبیر) نیز کثرت سے سچی قسمیں کھانے سے بھی رزق گھٹتا ہے اور فقیری غالب آتی ہے (احمدی)

۲۔ نیکی سے باز رہنے پر قسم نہ کھاؤ۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا جو شخص کسی بات پر قسم کھالے اور اس کے سوا میں بھلائی دیکھے تو چاہیے کہ اپنی قسم توڑ کر نیک کام کرے اور قسم کا کفارہ دے۔ (مسلم، ترمذی و نسائی)

۳۔ بہت قسمیں کھانے والے کی بات زیادہ قابل قبول نہیں رب فرماتا ہے ﴿ولا تطع کل حلاف مھین﴾

۴۔ قسم پوری کرنا اچھی بات ہے مگر گناہ پر کھائی ہوئی قسم توڑنا ضروری۔

مسئلہ: کفارہ قسم توڑنے سے پہلے جائز نہیں۔ پہلے قسم توڑے پھر کفارہ دے۔ کفارہ کا ذکر سورہ مائدہ میں آئے گا (ان شاء اللہ)

مسئلہ: مال فروخت کرتے وقت قسمیں کھانا یا درود شریف پڑھنا سخت منع ہے۔

مسئلہ: سات جگہ درود شریف پڑھنا منع ہے۔ عورت سے صحبت کرتے وقت، استنجا کے وقت، مال بیچنے کے وقت، پھسلنے، تعجب، ذبح اور چھینک پر۔ (شامی کتاب الصلواۃ)

مسئلہ: غیر اختیاری کام پر قسم نہ کھائیں مثلاً یہ کہ خدا کی قسم کل بارش ہوگی یا پرسوں زید آئے گا۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغۡوِ فِيۡۤ اَيۡمَانِكُمۡ وَلٰكِنۡ يُّؤَاخِذُكُمۡ بِمَا كَسَبَتۡ قُلُوۡبُكُمۡ وَاللّٰهُ غَفُوۡرٌ حَلِيۡمٌ (سورۃ البقرۃ:۲۲۵)

"تمہیں نہیں پکڑتا ان قسموں میں جو بے ارداہ زبان سے نکل جائیں۔ ہاں اس پر گرفت فرماتا ہے جو کام تمہارے دلوں نے کیے اور اللہ بخشنے والا حلم والا ہے"

تعلق:

پچھلی آیت میں مسلمانوں کو زیادہ قسمیں کھانے سے منع فرمایا گیا تھا اب قسم کے احکام بیان فرمائے جارہے ہیں۔ آیت کریمہ کی تفسیر سے پہلے چند ضروری اصطلاحیں ذکر کی جاتی ہیں۔

قسم کی اقسام:

قسم کی تین قسمیں ہیں۔(۱) غموس (۲) لغو (۳) منعقدہ

۱۔ غموس:

غموس یہ ہے کہ کسی گزرے ہوئے کام پر جان بوجھ کر جھوٹی قسم کھائے اس میں گناہ گار ہوگا کفارہ نہیں۔

مثلاً: کسی کو خبر ہے کہ زید نہیں آیا اور پھر قسم کھاتا ہے کہ آگیا۔ یہ اگر چہ واقعہ میں سچی ہو تب بھی ارادہ جھوٹ کی وجہ سے اس پر گناہ ہوگا کیوں کہ اس نے جھوٹ کے ارداے سے ہی قسم کھائی تھی (نعیمی)

۲۔ لغو:

لغو یہ ہے کہ کسی گزرے ہوئے معاملہ پر اپنے خیال میں صحیح جان کر قسم کھائے مگر واقعہ اس کے خلاف ہو یہ معاف ہے نہ اس پر کفارہ نہ گناہ۔

۳۔ منعقدہ:

منعقدہ یہ ہے کہ کسی آئندہ چیز پر قسم کھائے مثلاً خدا کی قسم یہ کام کروں گا یا نہ کروں گا۔ اگر اس قسم کو توڑے تو اکثر گناہ گار بھی ہے کفارہ بھی یقیناً لازم۔

جب کہ قسم کی اقسام بمعہ احکام کہ جان لیں تو اب آیت کی تفسیر پڑھیے۔

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ : یواخذ مواخذہ سے بنا جس کا مادہ اخذ بمعنی پکڑنا۔ یہاں باب مفاعلہ شرکت کے لیے نہیں۔ نیز اس جگہ پکڑ سے دنیوی اور اخروی دونوں پکڑیں مراد ہیں یعنی اللہ نہ تو تم پر دنیا میں کفارہ واجب کرتا ہے اور نہ آخرت میں گناہ۔

بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ :لغو کے معنی ہیں باطل اور بے اعتباری کلام یا کام اسی لیے بیہودہ باتیں اور شور شغب کو لغو کہا جاتا ہے۔

لَا يَسْمَعُوْنَ فِيهَا لَغْوًا : ایمان جمع یمین کی ہے بمعنی دایاں ہاتھ چوں کہ اہل عرب قسم کے وقت مصافحہ کرتے تھے اس لیے اسے یمین کہا گیا یعنی اللہ تعالیٰ تمہاری لغو قسموں پر جو تم گزشتہ بات پر اپنے کو سچا سمجھ کر کھالو کوئی پکڑ نہیں فرماتا نہ دنیا میں نہ آخرت میں اور نہ اس پر کفارہ نہ گناہ۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک لغو قسم وہ ہے جو بطور عادت بلا ارادہ زبان سے نکل جائے جیسے بعض لوگوں کا تکیہ کلام ہوتا ہے **لا واللّٰہ بلیٰ واللّٰہ** نہیں خدا کی قسم اور ہاں خدا کی قسم اور قسم کا انہیں احساس تک نہیں ہوتا مگر قسم لغو کی تعریف جو احناف نے کی ہے وہ قوی ہے اس کی وجہ آئندہ آرہی ہے۔

وَلٰكِنْ يُؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ : یہاں مواخذہ سے مراد پکڑ یا سزا ہے اور اس میں دنیاوی سزا یعنی کفارہ اور اُخروی سزا یعنی گناہ دونوں شامل ہیں۔ کسبت قلوبکم سے ارادۂ جھوٹ مراد ہے۔ یعنی جس قسم میں تم جھوٹ کا دلی ارادہ کرلو گے اس پر تمہاری پکڑ فرمائے گا۔ آئندہ کی قسم پر دنیاوی سزا یعنی کفارہ لازم اور گزشتہ کی قسم پر اخروی سزا یعنی گناہ خلاصہ کلام یہ ہے کہ جو قسمیں تم دیدہ دانستہ جھوٹی کھاؤ گے اس پر رب گرفت فرمائے گا۔

وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ :غفور غفر سے بنا بمعنی (چھپانا) اور حلیم سے بنا حلم بمعنی (بردباری) یعنی اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا اور بہت حلم فرمانے والا کہ اس نے لغو قسم پر عام معافی کا اعلان فرمادیا۔

فوائد و مسائل

ا۔ ہر قسم پر پکڑ نہیں بلکہ بعض پر اور جن پر ہے ان میں سے بعض پر دنیوی پکڑ یعنی کفارہ اور بعض پر اخروی یعنی صرف گناہ جیسے کہ پہلے بالتفصیل گزر چکا ہے۔

مسئلہ: کسی چیز کے ہونے کے ارادہ پر کچھ لازم کرلینا نذر ہے۔ جیسے اے اللہ اگر میرا بچہ تندرست ہو جائے تو میں سو روپیہ خیرات کروں گا۔ کام ہو جانے پر جو عبادت کی جاوے گی وہ شکرانہ ہوگی نہ کہ سزا اور کسی کام کے نہ ہونے کے ارادہ پر اپنے ذمہ کچھ لازم کرلینا یا لازم ہو جانے کا نام یمین یا قسم ہے۔ قسم دو طرح کی ہے۔ لغوی اور شرعی قسم لغوی وہ ہے جو اپنی جان، مال، اولاد وغیرہ کی قسم کھائی جائے۔ جس پر شرعی احکام مرتب نہ ہوں صرف کلام کی توثیق کی جاوے قسم شرعی وہ ہے جو رب کی ذات یا خصوصی صفات کی کھائی جاوے جس پر کفارہ وغیرہ شرعی احکام مرتب ہوں۔ قسم کی تین نوعتیں ہیں حلال کو حرام کرلینا یہ بھی قسم ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کی قسم کھانا یہ بھی قسم ہے۔ کسی کام پر عورت کی طلاق یا غلام کی آزادی یا مال کی خیرات کو معلق کردینا مثلاً اگر میں تجھ سے بولوں تو میری بیوی کو طلاق یا میرا غلام آزاد یا میرا مال صدقہ یہ بھی قسم ہے

۔مگر پہلی دو قسموں میں تو شرعی کفارہ واجب ہوگا۔مگر آخری تیسری قسم میں وہ سزا ہی بھگتنا پڑے گی جو اپنے اوپر لازم کی اگر طلاق معلق کی تھی تو طلاق ہی پڑ جاوے گی۔

(نعیمی) قسم کی تین قسمیں ہیں جو کہ پہلے بیان ہو چکی ہیں۔

مسئلہ: غیر خدا کی قسم نہ کھانی چاہیے جیسے کعبہ، پیغمبر اپنے سر یا مال اولاد وغیرہ کی۔

مسئلہ: قسم یا تو اللہ تعالیٰ کے نام کی کھائی جائے یا اس کی صفت مشہورہ کی جس پر قسم کھانے کا رواج ہو۔ ہمارے ہاں قرآن کی قسم صحیح ہے کیوں کہ قرآن کلام اللہ ہے جو کہ خدا کی صفت ہے اور یہاں اس قسم کا رواج ہے۔

مسئلہ: جب بعض روایات میں آیا کہ غیر خدا کی قسم کھانا شرک ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کو معبود جان کر ان کے نام کی شرعی قسم کھانا شرک ہے۔یا یوں کہا جائے گا کہ شرک کے درجات ہیں (شرکٌ دون شرکٍ)۔حلف بغیر اللہ جب کہ بلا تعظیم مقسم بہ ہو۔ اس کو گناہ صغیرہ کہا گیا ہے۔(واللہ اعلم)

مسئلہ: اپنے پر حلال کو حرام کر لینا بھی قسم ہے قرآن پاک میں ہے (لم تحرم ما احل اللّٰہ لک) مثلاً کوئی کہے کہ اگر میں تجھ سے بولوں تو مجھ پر روٹی حرام اس میں کفارہ واجب ہوگا قرآن کریم میں ہے (فرض اللّٰہ لکم تحیۃ ایمانکم)

مسئلہ: کفر کی قسم کھانا سخت برا ہے۔مثلاً یہ کہنا کہ اگر میں ایسا کروں تو کافر ہو جاؤں اس میں بھی کفارہ واجب ہوگا کفر لازم نہ آئے گا۔ہاں کفر کو ہلکا جان کر کہے تو واقعی کافر ہو جائے گا۔

مسئلہ: قسم میں نیابت نہیں یعنی ایک شخص دوسرے کی جگہ قسم نہیں کھا سکتا۔مگر یوں کہہ سکتا ہے کہ واللہ میری تحقیق کے مطابق یہ مجرم نہیں۔جب کہ اس کے علم میں اس کا مجرم ہونا ثابت نہ ہو۔قسم کی تفصیلی احکام کے لیے بہار شریعت حصہ نہم کا مطالعہ کیجئے۔

مسئلہ: قسم کا کفارہ کیا ہے آئندہ ان شاء اللہ آئے گا۔

ایلاء کا بیان

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

لِلَّذِیْنَ یُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِھِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَۃِ اَشْھُرٍ فَاِنْ فَآءُ وْ

فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۲۲۶ وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰہَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ

(سورۃ البقرۃ:۲۲۶)

''وہ جو قسم کھا بیٹھتے ہیں اپنی عورتوں کے پاس جانے کی انہیں چار مہینہ کی مہلت ہے۔ پس اگر اس مدت میں پھر آئیں تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ اور پس اگر چھوڑ دینے کا ارادہ پکا کر لیا تو اللہ سنتا جانتا ہے''

تعلق:

پچھلی آیتوں میں اشارۃً قسم کی تین قسمیں بیان ہوئیں اب ایک چوتھی قسم بیان ہو رہی ہے جو ان تینوں سے زیادہ خطرناک ہے کیوں کہ ان تین قسموں میں لغو قسم ہیں دو طرفہ آزادی تھی اور منعقدہ میں قسم توڑنے میں کفارہ اور پورا کرنے میں کوئی نقصان نہیں۔ مگر اس قسم کی دونوں طرفیں خطرناک کہ اگر قسم توڑ دو تو کفارہ دو اور اگر پوری کرو تو بیوی نکاح سے جاتی ہے۔ گویا فرمایا جا رہا ہے کہ ہر قسم میں ایسی آزادی نہ سمجھ لینا ایک قسم خطرناک بھی ہے جسے ایلاء کہتے ہیں۔

شانِ نزول:

سعید بن میسب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایلاء اہلِ جاہلیت کا ستانا تھا جب کسی کو اپنی بیوی سے محبت نہ ہوتی اور نہ وہ یہ چاہتا تھا کہ دوسرا نکاح کرے تو قسم کھا لیتا تھا کہ میں کبھی اس کے نزدیک نہ جاؤں گا اس کو اس طرح چھوڑے رکھتا تھا کہ وہ نہ بیوہ ہوتی تھی نہ خاوند والی رہتی تھی۔

ابتداءً اسلام میں بھی لوگ اسی طرح کرتے تھے بعد میں اسلام نے اس کی مدت معین فرمادی۔ (گویا کہ خاوندوں کو بھی پابند کردیا) (مظہری، اسباب النزول للواحدی وغیرہ) اسلام سے پہلے صرف عرب ہی نہیں بلکہ ساری دنیا میں عورتوں، بچوں، جانوروں پر جو ظلم و ستم ہو رہے تھے وہ بیان میں نہیں آسکتے۔ ہندوستان میں عورت خاوند کے مرنے کے بعد نکاح ثانی نہیں کرسکتی تھی بلکہ اسے خاوند کے ساتھ زندہ جل جانا ہوتا تھا جسے اہل ہند ستی ہونا کہتے تھے۔ لڑکیوں کو باپ کی میراث قطعاً نہ ملتی تھی۔ جانوروں کو ایک ایک دو ماہ میں کھاتے تھے۔ یعنی ایک عضو آج کاٹ کر کھالیا بیس روز بعد دوسرا عضو۔ بچیاں زندہ دفن کردی جاتی تھیں۔ غریب لوگ تنگدستی کے خوف سے سارے بچے ہلاک کرڈالتے تھے۔ غرض یہ کہ دنیا میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ محسنِ انسانیت ﷺ نے ان ظلموں کو مٹایا۔ عورتوں، بچوں، جانوروں کو زندگی بخشی۔ ان ظلموں میں سے ایک ظلم ایلاء بھی تھا۔ خاوند عورت کے پاس نہ جانے کی قسم کھالیتا تھا۔ برسوں تک اس سے علیحدہ رہتا اور اس زمانہ میں نان و نفقہ بھی نہ دیتا تھا جس کے باعث عورت ماں باپ پر بوجھ بن جاتی تھی یا مزدوری کرتی بھیک مانگتی تھی اس آیت میں اس ظلم کو دفع کیا گیا۔ (تفسیر نعیمی)

لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ : لِلَّذِيْنَ کا متعلق پوشیدہ ہے اور یہ تربص کی خبر مقدم ہے۔ يُؤْلُوْنَ الىٰ یا الوٰ سے بنا بمعنی کوتاہی کرنا۔ قرآن حکیم میں ہے (لایالونکم خبالاً) ایلاء کسی کے حق مارنے کی قسم کو کہتے ہیں۔ شریعت میں ایلاء یہ ہے کہ خاوند اپنی بیوی کے پاس چار ماہ تک نہ جانے کی قسم کھالے (عامہ کتب) چوں کہ اس میں بھی عورت کے حق سے کوتاہی کی جاتی ہے۔ اس لیے ایلاء کہلاتا ہے۔ نیز اس کا تعدیہ علی سے ہوتا ہے لیکن جب دوری کے معنی کو متضمن ہو تو اس کا تعدیہ من سے کردیا جاتا ہے۔

تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ : (انہیں چار مہینے انتظار کرنا لازم ہے) تربص کے معنی انتظار کرنا اور توقف کرنا یعنی ٹھہرنا کے ہیں۔ اہل عرب بولتے ہیں (مالی ربصةٌ) (مجھے ٹھہرنے کی گنجائش نہیں) (اربعة اشهر) اس کا ظرف ہے اور اس کی طرف نسبت مجازی ہے۔ مطلب یہ ہے ایلاء

کرنے والے کو اس معاملہ میں سوچنے اور غور کرنے کے لیے چار ماہ کا حق حاصل ہے۔ (فَاِنْ فَآءُ وْ) (پس اگر رجوع کرلیں) یہ لفظ فیئ سے بنا بمعنی اصل کی طرف لوٹنا۔ اسی لیے شام کے سایہ کو فی اور صبح کے سایہ کو ظل کہتے ہیں۔ کیوں کہ شام کا سایہ دھوپ کے بعد لوٹ کر آتا ہے جنت کے سایہ کو بھی ظل ہی کہا جاتا ہے نہ کہ فیئ کیوں کہ وہاں دھوپ نہیں۔ قال اللہ تعالیٰ (و ظلّ ممدودٌ) (کبیر) مال غنیمت بھی فئی کہلاتی ہے یعنی سایہ کے ساتھ تشبیہ دے کر فئی کہتے ہیں۔ اس امر پر تنبیہ ہے کہ دنیا کا بہترین سامان بھی بمنزلہ ڈھلتی چھاؤں ہے (مفردات) پس اگر ایلاء کرنے والے شوہر اپنی قسم سے رجوع کر جائیں اور قسم توڑ دیں کہ اپنی عورت سے مدت ایلاء میں محبت کرلیں۔

فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ: (بخشنے والا مہربان ہے) کہ صرف کفارہ کا یہی حکم دیا اور اس ایلاء کی وجہ سے جو عورت کو تکلیف پہنچی اس کی معافی فرما دی۔ اس مقام پر احناف اور شوافع کے درمیان اس بات میں اختلاف ہے کہ ایلاء کرنے والا چار ماہ کے بعد رجوع کرے یا دورانِ مدت۔ احناف کے نزدیک چار ماہ گزرنے سے پہلے رجوع کرنا ضروری ہے۔ ورنہ طلاق واقع ہو جائے گی مگر شوافع کے نزدیک چار ماہ کے بعد بھی رجوع کیا تو ثابت ہوگا اور طلاق نہ پڑے گی۔ دلائل کے لیے تفسیرِ مظہری اور فتح القدیر کا مطالعہ کیجئے۔

وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ : عزم اور عزیمت کے معنی ہیں کوئی سخت کام کر گزرنے پر دل مضبوط کر لینا اسی لیے قسم کو بھی عزم کہہ دیا جاتا ہے۔

طلاق: طلقٌ سے بنا جس کے معنی ہیں کھلنا اور چھوٹنا۔ اسی لیے چلنے کو انطلاق، بے قید چیزوں کو مطلق اور تیز زبانی کو طلاقتِ لسان اور ہنس مکھ کو طلق الوجہ کہتے ہیں۔ شریعت میں نکاح کی بندش آزاد کرنے کو طلاق کہا جاتا ہے یعنی اگر ایلاء والے طلاق کا ہی ارادہ کرلیں کہ اپنی قسم نہ توڑیں اور نہ اس مدت میں اپنی عورت کے پاس جائیں تو

فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ : اللہ تعالیٰ شوہر کی بات کو سنتا ہے اور اس کی نیت کو جانتا ہے۔

فوائد و مسائل

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔

۱۔ اسلام میں افراط و تفریط نہیں۔ اہل عرب کے ہاں طلاق میں بہت بے قاعدگی تھی۔ جب چاہتے تو طلاق دے دیتے اور جب چاہتے واپس لے لیتے۔ یہودی بھی طلاق میں کسی قدر آزاد تھے اور اس کے مقابل میں ہندوؤں کے ہاں طلاق کی کوئی صورت ہی نہ تھی کہ کیا ہوا نکاح کبھی ختم ہو سکتا ہی نہیں۔ عیسائیوں کے ہاں بھی مسئلہ طلاق میں بہت پابندی ہے۔ انجیل متی باب ۵ آیت ۳۱-۳۲ میں ہے۔

۲۔ (وقیل من طلّقَ اِمْرأته فلْیحطها) کتاب طلاق، ۳۲ (واما انا فاقول لکم اِنَّ من طلق امرائة الا لعلّةِ الزنی تجعلها تزنی ومن تزوج مطلقة فانه یزنی) (ترجمہ) (جو کوئی اپنی بیوی کو زنا کے سوا کسی اور سبب سے چھوڑ دے وہ اس سے زنا کراتا ہے۔ اور جو کوئی اس چھوڑی ہوئی سے بیاہ کرے وہ زنا کرتا ہے۔ مگر عیسیٰ علیہ السلام کو خدا یا خدا کا بیٹا کہنے والے عیسائیوں نے یہ دونوں قانون بالائے طاق رکھ دیے اور ان کے ان الفاظ کو چھوڑ دیا۔ اور ان کی پارلیمنٹ میں طلاق کی بے حد آزادی دے دی گئی۔ کیونکہ یہ قانون اس دور میں ناقابلِ عمل تھا۔ اسلام نے نہ ہندوؤں کی سی قید رکھی اور نہ اہلِ عرب کی سی آزادی ضرورتاً طلاق جائز کی۔ مگر بانیِ اسلام ﷺ نے اعلان فرمادیا کہ حلال چیزوں میں سب سے بڑھ کر ناپسند چیز طلاق ہے۔

۳۔ اسلام میں طلاق کا مسئلہ بہت اہم ہے کہ رب تعالیٰ نے دوسرے مسائل اجمالاً بیان فرمائے مگر اس مسئلہ کی بہت شرح کی جو کہ طلاق اور اس کے اقسام رجعی، بائنہ، غلیظہ، ایلاء اور خلع وغیرہ اسی طرح عورت اور اس کے احکام اس کی قسمیں مثلاً حائضہ، آیسہ، حاملہ چھوٹی بچی کی عدت اور عدت وفات وغیرہ پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔ نیز اس کا بیان سورۂ بقرہ میں بھی

اچھی طرح کیا گیا اور پھر آخر قرآن میں طلاق کی ایک پوری سورۃ یعنی سورۃ طلاق نازل فرما ئی۔ لہٰذا مسلمانوں کو چاہیے کہ طلاق میں بہت احتیاط سے کام لیں۔ آج کل اکثر جاہل لوگ یک لخت تین طلاق دے دیتے ہیں اور پھر بغیر تحلیلِ شرع کے عورتوں کو گھر رکھنے کے لیے دوڑتے پھرتے ہیں۔

۴۔ احناف کے ہاں ایلاء میں طلاق دنیا ضروری نہیں بلکہ مدت ایلاء گزرنے پر خود بخود طلاق واقع ہو جائے گی نہ طلاق بولنے کی ضرورت نہ حاکم کے فیصلہ کی حاجت کیوں کہ یہاں فرمایا گیا (وَاِنْ عَـزَمُـوا الـطَّـلاق) یعنی بصورت ایلاء چار ماہ گزر جانا اور رجوع نہ کرنا گویا کہ ارادہ طلاق ہے۔

۵۔ طلاق کا اختیار مرد کو ہے نہ کہ عورت کو کیوں کہ عورتیں عقل و دین میں ناقص ہونے کی وجہ سے جلد غصہ میں آ کر کچھ کا کچھ کر بیٹھتی ہیں۔ ان کو طلاق کا اختیار دینا گویا دیوانے کے ہاتھ میں تلوار دینا ہے۔ جس سے دن رات گھر بگڑا کریں گے۔ یہاں ارشاد ہوا (وَاِنْ عَزَمُو الطَّلاق) اگر وہ طلاق کا ارداہ کریں اور دوسری جگہ ارشاد فرمایا (وَبِیَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ) کہ نکاح کی گرہ مرد کے ہاتھ میں ہے۔

۶۔ ایلاء میں طلاق سے رجوع بہتر ہے کیوں کہ رب تعالیٰ نے رجوع کیساتھ اپنی مغفرت اور رحمت کا ذکر فرمایا۔

مسئلہ: ایلاء یہ ہے کہ کوئی شخص قسم کھالے کے میں اپنی بیوی کے پاس نہیں جاؤں گا۔ اس کی چار صورتیں ہیں ایک یہ کہ کوئی مدت معین نہ کرے، دوئم یہ کہ چار ماہ کی قید لگا دے، سوئم یہ کہ چار ماہ سے زیادہ مدت کی قید لگا دے، چہارم چار ماہ سے کم مدت کا نام لے۔ پس پہلی تین صورتوں کو شریعت میں ایلاء کہتے ہیں اور اس کا حکم یہ ہے کہ اگر چار ماہ کے اندر قسم توڑ ڈالے اور اپنی بیوی کے ساتھ جماع کرے تو قسم کا کفارہ دے اور نکاح باقی ہے اور اگر چار ماہ گزر گئے اور قسم نہ توڑی اس عورت پر طلاق واقع ہو جائے گی یعنی بلا نکاح رجوع کرنا درست نہ ہوگا ہاں اگر دونوں رضا مندی سے پھر نکاح کر لیں تو

درست ہے اور حلالہ کی ضرورت نہیں ہوگی اور چوتھی صورت کا حکم یہ ہے کہ اگر قسم توڑے تو کفارہ لازم ہوگا اور اگر قسم پوری کرلی جب بھی نکاح باقی ہے (ھٰذہٖ خلاصۃ مافی الکتب الفقھیہ)

مسئلہ: کسی نے اپنی بیوی سے کہا کہ اگر میں چار ماہ تک تیرے پاس آؤں تو مجھ پر حج یا خیرات یا روزہ واجب ہے، یا تجھے طلاق ہے، یا میرا غلام آزاد غرضیکہ اپنے پر چار ماہ تک دور رہنا لازم کرے قسم سے یا کسی التزام سے یہ سب ایلاء ہے۔

مسئلہ: ایلاء کے لیے شرط ہے کہ شوہر اہل طلاق ہو یعنی وہ طلاق دے سکتا ہو لہٰذا مجنون ونابالغ کا ایلاء صحیح نہیں کیوں کہ یہ اہلِ طلاق نہیں۔ (درمختار)

مسئلہ: ہر قابل وطی شوہر کا ایلاء صحیح ہے جس کا تصرف معتبر ہو۔ خواہ کافر ہو یا مسلمان لہٰذا نامرد کا ایلاء صحیح نہیں ہے اور جس کا ذکر کٹا ہوا ہو اس کا ایلاء صحیح نہیں۔ (کبیر بحوالہ نعیمی)

مسئلہ: ایلاء کے لیے ضروری ہے کہ قسم اور بیانِ مدت ایک ہی مجلس میں ہو اور قسم بھی شرعی ہو اللہ کی یا اس کی صفات کی۔

مسئلہ: ایلاء میں اگر مرد صحبت پر قادر ہو تو رجوع صحبت سے ہی ہوگا اور اگر کسی وجہ سے صحبت پر قدرت نہ رکھتا ہو تو وعدۂ صحبت سے بھی رجوع ہو جائے گا لیکن اگر مدتِ ایلاء میں صحبت پر قدرت ہوگی تو صحبت ہی کرنا پڑے گی۔ (ملخصاً درمختار جوہرہ وغیرہ)

مسئلہ: مدتِ ایلاء کا خرچ مکان وغیرہ عورت کو اس کا خاوند ہی دے گا کیوں کہ نکاح اس مدت میں قائم رہتا ہے اور قصور مرد کا ہوتا ہے۔ اگر مرد قسم توڑ دے تو کفارہ بھی مرد پر ہی ہوگا اور اگر نہ توڑے اور چار ماہ کے بعد طلاق واقع ہو جاوے تو عدت کا خرچہ بھی مرد کے ذمہ ہوگا اور اگر عورت حاملہ ہو بچے کے ساتھ سال کا خرچہ بھی مرد کے ذمہ ہوگا۔ بچہ رہے گا ماں کے پاس اور خرچہ باپ دے گا۔ (نعیمی)

مطلقہ عورتوں کی عدت کا بیان

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَالۡمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصۡنَ بِاَنۡفُسِہِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوۡٓءٍ وَلَا یَحِلُّ لَہُنَّ اَنۡ یَّکۡتُمۡنَ مَا خَلَقَ اللّٰہُ فِیۡۤ اَرۡحَامِہِنَّ اِنۡ کُنَّ یُؤۡمِنَّ بِاللّٰہِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَبُعُوۡلَتُہُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّہِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ اِنۡ اَرَادُوۡۤا اِصۡلَاحًا وَلَہُنَّ مِثۡلُ الَّذِیۡ عَلَیۡہِنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَیۡہِنَّ دَرَجَةٌ وَاللّٰہُ عَزِیۡزٌ حَکِیۡمٌ (سورۃ البقرۃ:۲۲۸)

"طلاق والیاں اپنی جانوں کو روکے رکھیں تین حیض تک اور انہیں حلال نہیں کہ چھپائیں وہ جو اللہ نے ان کے رحموں میں پیدا کیا اگر اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کے شوہروں کو اس مدت کے اندر ان کے پھیر لینے کا حق پہنچتا ہے۔ اگر ملاپ چاہیں۔ اور عورتوں کا حق ایسا ہی ہے جیسا ان پر شرع کے موافق اور مردوں کو ان پر فضیلت ہے اور اللہ غالب حکمت والا ہے"

تعلق:

گزشتہ آیت میں ایلاء کا ذکر ہوا جس کا نتیجہ کبھی طلاق ہوتا ہے۔ اور اب طلاق کی عدت کا ذکر فرمایا جا رہا ہے۔

شانِ نزول:

حضرت اسماء بنت یزید انصاریہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور سید عالم ﷺ کے زمانۂ اقدس میں مجھے میرے خاوند نے طلاق دے دی۔ اس وقت تک اسلام میں عدت کے احکام نہ

آئے تھے (زمانۂ جاہلیت میں طلاق کی عدت مقرر نہ تھی) اس موقع پر یہ آیت کریمہ اتری اور سب سے پہلے انہوں نے ہی عدت طلاق (شرع) کے مطابق گزاری۔ (اخرج ابوداؤد وابن ابی حاتم و البیھقی فی سننہ عن اسماء بنت یزید بحوالہ درمنشور، نعیمی)

وَالْمُطَلَّقٰتُ : یہ لفظ طلاق سے بنا جس کے معنی پہلے بیان ہو چکے ہیں۔ شریعت میں نکاح کی بندش آزاد کرنے کو طلاق کہا جاتا ہے۔ چوں کہ بندش نکاح سے آزاد ہونے کی کئی صورتیں ہیں۔ خواہ طلاق سے یا مرد کے مرتد ہو جانے یا عورت اپنے سسر کا بوسہ لے لے۔ یا اس طرح کہ شوہر اپنی ساس سے زنا کرے (العیاذ باللہ) غرض یہ کہ خاوند کی زندگی میں جس طرح بھی نکاح کے بعد جدائی ہو تو وہ سب اس میں داخل ہیں اس لیے یہاں مطلقات جمع فرمایا گیا یعنی ہر قسم کی نکاح سے نکلنے والی عورتیں۔ خیال رہے کہ خاوند کی زندگی میں نکاح ختم ہو جانے کی نو صورتیں ہیں ۔طلاق، ایلاء، لعان، ارتداد، زوج، خیار بلوغ، خیار عتق، مرد کا اپنی ساس سے زنا یا دواعی زنا ۔عورت کا اپنے سسر یا بیٹے وغیرہ سے زنا یا دواعی زنا۔ خلع علاوہ ازیں مرد کے عنین (نامرد) یا خصی وغیرہ ہونے کی وجہ سے نکاح فسخ کیا گیا۔ ان سب صورتوں میں یہی عدت واجب ہوگی جس کا اس آیت میں بیان آرہا ہے بشرطیکہ یہ تمام واقعات خلوت صحیحہ کے بعد رونما ہوئے ہوں۔

☆ **يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ** : یہ لفظ تربص سے بنا جس کے معنی ہیں انتظار کرنا مگر یہاں اگلی باء کی وجہ سے اس کے معنی روکنا ہے۔ نیز یہاں خبر بمعنی امر ہے تاکہ اس پر ضرور عمل ہوا۔ نفس نفس کی جمع ہے بمعنی جان، ذات یعنی ہر قسم کی طلاق والی عورتیں اپنے آپ کو نکاح ثانی سے روکے رکھیں۔ خیال رہے کہ عدت ہمیشہ عورت پر ہوتی ہے مرد پر نہیں۔ کیوں کہ عورت کے حاملہ ہونے کا احتمال ہوتا ہے نہ کہ مرد کا۔ ہاں چند صورتوں میں مرد کا مطلقہ عورت کی عدت کا انتظار کرنا پڑتا ہے کہ اس دوران دوسری عورت سے نکاح نہیں کرسکتا۔ اگر مرد مطلقہ کی بہن یا خالہ یا پھوپھی یا بھانجی بھتیجی وغیرہ ان عورتوں سے نکاح کرنا چاہتا ہے جن کا اجتماع نکاح میں درست نہیں تو مرد اپنی مطلقہ بیوی کی انقضائے عدت تک ان سے نکاح نہیں کرسکتا۔ اسی طرح کسی کی چار بیویاں تھیں ایک کو

طلاق دیدی وہ ابھی عدت میں ہے تو کسی اور عورت سے نکاح نہیں کرسکتا کیوں کہ عدت بھی حکما نکاح ہے۔ اگر اسی حالت میں نکاح کرے گا تو پانچ بیویاں نکاح میں جمع ہو جائیں گی یا دو بہنیں یہ دونوں کام حرام ہیں۔

ثَلٰثَةَ قُرُوْءٍ : قُرُوْءٌ قَرْءٌ کی جمع ہے جس کے معنی جمع ہونا۔ وقت اور ایک حال سے نکل کر دوسری حالت میں داخل ہونا (کبیر، نعیمی) اصطلاح میں اس کے معنی حیض بھی اور طہر بھی۔ احناف کے نزدیک یہاں بمعنی حیض ہے اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بمعنی طہر ہے لیکن حنفیوں کا مذہب مندرجہ ذیل وجوہات کی بناء پر قوی ہے۔ (۱) لفظ قرء کے اگرچہ حیض اور طہر دونوں معنی آتے ہیں۔ مگر شریعت میں اس کا اکثر استعمال حیض کے لیے ہے۔ حدیث شریف میں ہے (دعی الصلوة ایام اقرائک) (یعنی زمانہ حیض میں نماز چھوڑ دو) (کبیر) (۲) اس آیت میں تین قروء انتظار کرنے کا حکم ہے۔ اگر اس سے طہر مراد ہو تو تین جو کہ عددِ خاص ہے وہ کبھی پورا نہیں ہوسکتا۔ کیوں کہ جس طہر میں طلاق ہوئی وہ پورا عدت میں نہ آئے گا۔ ہاں اس طہر کے بعد حیض پورے تین آئیں گے۔ مسنون طلاق طہر میں ہوتی ہے نہ کہ حیض میں (۳) حیض نہ آنے کی صورت میں عدت تین ماہ ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ (وَالّٰیٓ ءِ یَئِسْنَ مِنَ الْمَحِیْضِ مِن نِسآئِکُمْ اِنْ ار تبتم فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ) معلوم ہوا کہ تین مہینہ تین حیض کے قائم مقام ہیں۔ نہ کہ تین طہر کے لہٰذا عدت حیض سے ہے (۴) حدیث شریف میں ہے (طلاق الامة تطلیقان وعدتها حیضان) (لونڈی کی طلاقیں دو ہیں اور اس کی عدت بھی دو حیض) (کبیر) معلوم ہوا کہ لونڈی کی عدت حیض سے ہے تو حرہ کی بھی یہی عدت چاہیے (۵) عدت سے مقصود رحم کی صفائی معلوم کرنا ہے کہ عورت حاملہ ہے یا نہیں، اور حمل کا پتہ حیض سے ہی چلتا ہے نہ کہ طہر سے (۶) قیدی کافرہ عورتوں کی عدت فقط ایک حیض ہے کہ اس سے اس کا حاملہ ہونا یا نہ ہونا معلوم ہوتا ہے۔ تو چاہیے کہ طلاق والی کی عدت بھی حیض سے ہی ہو۔ قرء کے لفظی معنی جمع ہونا اور ظاہر ہے کہ خون ہی رحم میں جمع ہوتا ہے اور وہی نکلتا ہے پس حیض ہی کو لغوی معنی سے زیادہ قرب ہے (نعیمی)

علاوہ ازیں ہمارا مذہب خلفاء راشدین عبداللہ ابن عبداللہ ابن مسعود، عبداللہ ابن عباس، عبداللہ ابن عمر، ابی بن کعب، معاذ بن جبل، ابی داؤد، عبادہ بن صامت، زید بن ثابت اور ابو موسیٰ اشعری (رضی اللہ عنہم اجمعین) سے مروی ہے۔ ابوداؤد اور نسائی نے معبد جہنی کو بھی انہی میں شمار کیا ہے۔ اور تابعین میں سے سعید بن مسیب ابن جبیر، عطا طاؤس مجاہد، قتادہ، عکرمہ، ضحاک، حسن بصری، مقاتل، شریک القاضی، ثوری، اوزاعی ابن شیرمہ، ربیعہ، سدی ابوعبیدہ اسحاق (رضی اللہ عنہم اجمعین) سے بھی یہی مروی ہے اور اسی کی طرف امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے بھی رجوع کیا۔ امام محمد بن حسن مؤطا میں فرماتے ہیں کہ ہم سے عیسیٰ بن ابی عیسیٰ خیاط نے انھوں نے شعبی سے شعبی نے نبی ﷺ کے تیرہ صحابہ (رضی اللہ عنہم اجمعین) سے روایت کی ہے کہ وہ سب کے سب یہ فرماتے ہیں کہ مرد اپنی بیوی کا سب سے زیادہ حق دار ہے، یہاں تک کہ وہ تیسرے حیض سے (پاک ہوکر) غسل کرلے (واللہ اعلم) (مظہری) اس مسئلہ کے بارے میں شوافع حضرات نے بھی اپنے مذہب پر عمدہ دلائل بیان کیے تفصیل کے لیے التفسیر الکبیر لامام الفخر الرازی دیکھیے۔ چوں کہ ہمارے ملک میں اکثریت احناف کی ہے اس لیے ہم نے حیض کے حنفی مسلک کے دلائل تفصیل سے ذکر کیے ہیں۔ وضاحتِ بالا کے بعد آیتِ کریمہ کا مطلب یہ ہوا کہ طلاق والی عورتیں تین حیض کی مدت اپنے کو دوسرے نکاح سے روکیں اور دوسروں کا پیغام نکاح قبول کرنے سے اپنے آپ کو روکیں۔ نیز زمانہ عدت میں بناؤ سنگار کرنے اور خاوند کے گھر سے نکلنے سے رکیں عدت میں یہ تمام کام حرام ہیں۔

وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ: یَحِلُّ حلال سے بنا بمعنی مباح اور یکتمن کتم سے بمعنی چھپانا اور پردہ ڈالنا۔ یعنی طلاق والی عورتوں کو یہ جائز نہیں کہ چھپالیں۔

مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ: ما سے مراد حمل اور حیض دونوں ہی ہیں۔ (مظہری) ارحام جمع رحم بمعنی رحمت وکرم۔ عورت کی بچہ دانی کو اس لیے رحم کہتے ہیں کہ وہ ذریعہ محبت ورحمت ہے اس سے رشتہ داریاں قائم ہیں (نعیمی) یعنی عورتیں عدت پوری ہونے کی جلدی کرنے میں یا طلاق رجعی میں شوہر کا حقِ رجوع باطل کرنے کے لیے حمل اور حیض کو مت چھپائیں کیوں کہ عدت میں

عورت کا قول اکثر معتبر ہے۔ اس پر گواہی وغیرہ لازم نہیں۔ خیال رہے کہ چند مسائل ایسے ہیں جن میں ایک عورت کا قول معتبر ہے رمضان کا چاند، عدت، حلالہ وغیرہ۔

چوں کہ نکاح سے حلال و حرام صحبت کا فرق ہے۔ اگر عورت عدت میں غلط بیانی سے کام لے کر نکاح غلط پڑھوائے تو صحبتیں بھی حرام اور آئندہ نسل بھی خراب۔ اس لیے ارشاد ہوا
اِنۡ كُنَّ يُؤۡمِنَّ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ : یعنی اگر وہ اللہ پر ایمان رکھتی ہے تو نہ چھپائے کیوں کہ مومن کی شان یہی ہے کہ حرام فعل کا مرتکب نہ ہو اس سے غرض تاکید اور توبیخ ہے۔ (واللہ اعلم) (مظہری)

وَبُعُوۡلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ : (اور ان کے خاوند ان کو (اپنی زوجیت میں) واپس لینے کے حق دار ہیں) بعولۃ بعل کی جمع ہے جیسا کہ فحل کی جمع فحولۃ تاء زاہد ہے اس کے معنی سردار، مالک وغیرہ بعض نے کہا یہ لفظ بعال سے بنا جس کے معنی کنایۃً جماع کے آتے ہیں (مفردات) کیوں کہ شوہر عورت کا سردار بھی ہے اور اس کا مالک بھی اور اس سے جماع کرنے والا بھی لہٰذا اسے بعل کہا گیا اَحَقُّ اس اسم تفضیل میں تفصیل بمعنی اسم فاعل ہے کیوں کہ طلاق رجعی میں رجوع کرنے کا اختیار صرف خاوند کو ہی ہوتا ہے (روح المعانی، مظہری) یعنی طلاق رجعی میں خواہ عورت رضا مند ہو یا نہ عدت کے اندر رجوع کر لیں اور طلاق بائن میں دوران عدت عورت سے دوبارہ نکاح کرنے کا صرف اسی خاوند کو حق ہے کہ یہ عدت کے اندر بھی نکاح کر سکتا ہے دوسرے شخص سے عدت کے بعد ہی نکاح ہو سکے گا مگر یہ رجوع کرنے والا اور دوبارہ نکاح کرنے والا کب نکاح کرے جب کہ

اِنۡ اَرَادُوۡۤا اِصۡلَاحًا : ارادوا کا فاعل بعل یعنی شوہر ہے۔ اصلاح سے مراد احسان اور دوستی وغیرہ ہے اور یہ گناہ گار نہ ہونے کی شرط ہے نہ کہ رجوع جائز ہونے کی۔ یعنی شوہر رجوع جب کرے جب کہ ان کی نیت عورت کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے کی ہو نہ ستانے اور پریشان کرنے کی۔ جیسا کہ زمانۂ جاہلیت میں لوگ کرتے تھے کہ ایک شخص اپنی عورت کو طلاق دے دیتا تھا پھر

جب عدت پوری ہونے کو ہوتی تو رجوع کر لیتا تھا اس کے بعد پھر طلاق دے دیتا تھا تا کہ عدت دوبارہ شروع ہو اور عورت پریشان رہے اگر اس نیت سے اب بھی کوئی ایسا کرے تو سخت گناہ گار ہوگا۔

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ: لام نفع کا ہے اور علی الزام کا اور لھن سے عورتوں کے حقوق مراد ہیں جو کہ خاوندوں کے ذمہ ہیں اور عَلَيْهِنَّ سے وہ حقوق مراد ہیں جو کہ شوہروں کے ان کے ذمہ ہے اور مثل سے نہ برابری مراد ہے اور نہ کیفیتِ حقوق میں تشبیہ یعنی یہ مطلب نہیں کہ زوجین کے ایک دوسرے پر برابر کے حقوق ہیں کہ ایک مہینہ خاوند بیوی کو کما کر کھلائے اور اس کی خدمت کرے اور دوسرے ماہ بیوی خاوند کو بلکہ فقط واجب ہونے میں تشبیہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کچھ حقوق مرد کے عورت پر لازم ہیں۔ ایسے ہی کچھ عورتوں کے بھی مردوں پر لازم ہیں لہٰذا چاہیے کہ دونوں ایک دوسرے کے حقوق کا لحاظ رکھیں۔ اسی کو واضح کرنے کے لیے ارشاد ہوا۔

وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ: (اور مردوں کو ان پر فضیلت ہے) رجال رجل کی جمع ہے یہ رجل بسکون جیم یا رجلۃ سے بنا بمعنی قوت اس لیے پاؤں کو رجل کہتے ہیں اس میں چلنے کی قوت ہے۔ قوی بات کو کلامٌ مرتجل اور جب دن کی روشنی تیز ہو جائے تو ترجل النھار کہا جاتا ہے (کبیر، مفروضات وغیرہ) چوں کہ مرد بمقابلہ عورت دینی اور دنیاوی لحاظ سے زیادہ قوی ہے اس لیے اسے رجل کہا جاتا ہے۔ درجہ کا مادہ درج ہے بمعنی لپیٹنا یا سیڑھی لپٹے ہوئے کو مدرج کہا جاتا ہے اصطلاح میں بلندی کو درجہ اور پستی کو درکہ کہتے ہیں۔ کیوں کہ پستی جلدی حاصل ہو جاتی ہے۔ مگر بلندی راستہ طے کر کے اور ترقی کے زینے پر چڑھ کر اسی لیے آہستگی کو تدریج اور مہلت دینے کو استدراج کہتے ہیں (نعیمی) یعنی شوہروں کو عورتوں پر فوقیت ہے۔

وَاللّٰهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ: اللہ غالب حکمت والا ہے جو چاہے احکام جاری فرمائے اور جن کو چاہے اعلیٰ اور افضل کرے اس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں۔

فوائد و مسائل

شوہر و بیوی کے حقوق

اسلام سے پہلے عرب بلکہ ہندوستان میں بھی عورت مثل مال کے مویشی سمجھی جاتی تھی کہ شوہر فقط اپنی خدمت کے لیے کھانا، کپڑا دے کر ان سے غلاموں کا سا برتاؤ کرتے تھے۔ بلکہ انہیں جائیداد کی طرح استعمال کرتے تھے۔ اسلام نے عورت کو اس پستی سے نکالا۔ اس کے حقوق بھی قائم کیے مگر چوں کہ بالکل برابری کرنے میں گھر کا انتظام قائم نہیں رہ سکتا جیسے ملکی اور خانگی انتظام کے لیے کوئی افسر ضرور چاہیے۔ اگر ملک میں کوئی بادشاہ نہ ہو سب برابر ہوں تو اس کی بربادی یقینی ہے ایسے ہی اگر گھر میں کوئی حاکم نہ ہو سب یکساں ہوں تو گھر کی تباہی لازمی ہے۔ اس لیے مردوں کو عورتوں کا حاکم بنایا کیوں کہ مرد قوت، شجاعت، عقل وغیرہ میں زیادہ ہوتے ہیں۔ نیز ان کے ذمہ بیوی کا سارا خرچہ ہے بعض حقوق تو مشترک ہیں اور بعض خاص۔ حقوق مشترکہ دو قسم کے ہیں۔ ایک حقوق شرعی جن کا دعویٰ کیا جاسکتا ہے اور ان کے ادا کرنے پر حاکم مجبور کرسکتا ہے دوسرا حقوق اخلاقی جن کا ادا کرنا ضروری مگر ان کا عدالت میں دعویٰ نہیں ہوسکتا۔ عورت کے حقوق شرعی مرد پر چار قسم کے ہیں (۱) کھانا جیسا خود کھائے اسے بھی کھلائے (۲) کپڑا جیسا کہ خود پہنے اسے بھی پہنائے اور حسب حیثیت اسے آرام میں رکھے (۳) مکان حسب حیثیت اسے رہنے کے لیے دے (۴) مجامعت عمر میں ایک بار صحبت (صحبت) کرنا ضروری ہے کہ اگر نہ کرے تو عورت کو طلاق لینے کا حق حاصل ہے۔ اسی لیے نامرد کی بیوی حاکم کے ذریعہ طلاق حاصل کرسکتی ہے (اس مسئلہ کو ہم پہلے (فالئٰن باشروھن) کے تحت بیان کر آئے ہیں)۔ اور اگر کوئی مانع نہ ہو تو ہر چار مہینہ میں کم از کم ایک دفعہ مجامعت کرنا بھی ضروری ہے۔ ہاں ہر ہفتے میں ایک بار صحبت مستحب ہے۔ جمعہ کی شب میں زیادہ افضل ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ جمعہ کی شب جماع کرنے

والے کو دو ثواب ملتے ہیں اپنے غسل کا اور عورت کے غسل کا بھی (در منشور) ایسے ہی مرد کے بھی عورت پر کچھ شرعی حقوق ہیں جنہیں نہ ادا کرنے پر مرد عورت کا خرچہ بند کر سکتا ہے۔(۱) عورت کو ضروری ہے کہ مرد کو اپنے پر قابو دے بشرطیکہ کوئی شرعی مانع حیض وغیرہ نہ ہو۔(۲) عورت کو لازم ہے کہ شوہر کی بے اجازت اس کے گھر سے نہ جائے (۳) عورت کو لازم ہے کہ شوہر کے گھر میں اسے نہ آنے دے جس کے آنے سے شوہر ناراض ہے۔یہ حقوق شرعی ہیں۔رہے اخلاقی حقوق تو وہ بے شمار ہیں۔عورت مرد کے لیے کھانا تیار کرے۔بوقت ضرورت اس کے کپڑے سیئے اور دھوئے بلکہ ہر طرح اسے راضی کرنے کی کوشش کرے۔ حدیث شریف میں ہے کہ اگر غیر خدا کو سجدہ کرنا جائز ہوتا تو میں عورتوں کو حکم دیتا کہ اپنے شوہروں کو سجدہ کریں}۔اس کے گھر کو آراستہ رکھے۔اس کی رضا کے لیے بناؤ سنگار کرے۔اس کی بغیر اجازت نفلی روزے اور نفلی نماز میں مشغول نہ ہو غرض یہ کہ اس کی ہو کر رہے۔مرد کے لیے ضروری ہے کہ بیماری میں اس کا علاج کرائے کبھی کبھی اس کو میکے والوں سے ملاتا رہے۔سیدنا عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں اپنی بیوی کو راضی کرنے کے لیے اچھا لباس پہنتا ہوں کہ جب میلے کپڑے میں وہ مجھے بری معلوم ہوتی ہے تو میں اسے کب اچھا معلوم ہوں گا اور آپ نے یہی آیت پڑھی (نعیمی بلفظہ)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا (ان اکمل المومنین ایماناً احسنھم خلقاً وخیارکم خیارکم لنسائھم) (مسلمانوں میں سے پورا ایمان دار وہ ہے جو سب سے زیادہ خوش خلق ہو اور اچھے لوگ تم میں سے وہی ہیں جو اپنی بیویوں سے اچھی طرح رہیں) (ترمذی)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: (کہ عورتوں کے ساتھ بھلائی کرنے میں تم میری وصیت یاد رکھنا۔کیونکہ عورتیں پسلی سے پیدا کی گئی ہے۔اور پسلی میں ٹیڑھا پن اوپر کی طرف ہوتا ہے۔پس اگر تم اسے سیدھا کرنا چاہو گے تو توڑ بیٹھو گے اور اگر چھوڑ دو گے تو ہمیشہ ٹیڑھی رہے گی لہٰذا ان کے بارے میں میری وصیت یاد رکھنا} (متفق علیہ)

حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا: تم میں سے اچھا وہ جو اپنے اہل (بیوی) کیساتھ اچھی طرح رہے اور میں تم سب سے اپنی اہل سے اچھی طرح رہتا ہوں۔ (ترمذی، دارمی، ابن ماجہ عن ابن عباس)

مرد کو چاہیے کہ اپنی بیوی کو خوش رکھنے کے لیے اس کی سہیلیوں سے بھی حسنِ سلوک کا مظاہرہ کرے۔ حضور سرور عالم ﷺ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد ان کی طرف سے قربانی کرتے اور گوشت حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی سہیلیوں میں تقسیم فرماتے تھے لہٰذا مرد کو چاہیے کہ بیوی کے انتقال کے بعد تیجہ، دسواں، چالیسواں وغیرہ کر کے اس کو ایصال ثواب کرے اور بہتر یہ ہے کہ فاتحہ کا کھانا ان عورتوں کو بھیجے جن کے ساتھ زندگی میں اس کی بیوی کا میل و محبت تھا۔ بعد موت اچھائی سے یاد کرے۔ اس کے لیے دعائے مغفرت کرے اس کے ماں باپ اہل قرابت سے حسن سلوک اور احترام سے پیش آئے۔

مرد کی فضیلت

(۱) مرد عورت سے چند وجوہات کی بناء پر افضل ہے۔ مرد ہمیشہ نماز روزہ ادا کر سکتا ہے عورت زمانہ حیض و نفاس میں ان سے مجبور۔ (۲) دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر ہے بعض مقامات میں عورتوں کی گواہی بالکل قبول نہیں جیسے شرعی سزاؤں رجم وغیرہ کا مقدمہ (۳) مرد اکیلا سفرِ حج کر سکتا ہے، عورت بغیر محرم کے نہیں کر سکتی (۴) نبوت امامت سلطنت، گھوڑے کی سواری مرد کے لیے ہی خاص ہے (لعن اللہ الفروج علی السروج) یعنی محض مردوں کے ساتھ تشبیہ کرنے کے لیے گھوڑے کی سواری عورت کے لیے منع ورنہ سفر وغیرہ کی ضرورت کے لیے جائز ہے (۵) مرد کے ذمہ عورت کا سارا خرچہ ہے (۶) مرد کی اجازت کے بغیر عورت اپنے گھر سے باہر نہیں جا سکتی۔ مرد پر یہ پابندی نہیں (۷) مرد عقل، دین میں کامل، عورت ناقص اس لیے عورتوں کو ناقصات فی العقل والدین کہا گیا (۸) مرد پر مہر لازم، عورت پر نہیں (۹) مرد کو طلاق دینے کا حق

ہے نہ کہ عورت کو(۱۰) مرد میراث میں عورت سے دُگنے کا حق دار ہے (۱۱) مرد چار بیویاں رکھ سکتا ہے۔ وغیرہ

فوائد و مسائل

(۱) عدت میں نکاح کسی قدر قائم رہتا ہے۔ بشرطیکہ طلاق مغلظہ نہ ہو اس لیے طلاق دینے والے کو بعولہ یعنی عورت کا شوہر کیا گیا (۲) طلاق کی عدت حیض سے ہے نہ کہ طہر سے جیسا کہ پہلے بالتفصیل بیان ہوا (۳) حمل، حیض اور عدت کے متعلق عورت کی بات مانی جائے گی۔

مسئلہ: مطلقہ عورتیں چند قسم کی ہیں اور ان کی عدتیں بھی علیحدہ علیحدہ۔ (۱) جس کو خلوت سے پہلے طلاق ہو جائے۔ اس پر عدت واجب نہیں۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے (ثم طلقتمو من قبل ان تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَها) (۲) حاملہ مطلقہ کی عدت بچہ کی پیدائش ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے (وَاولاتُ الاَحْمَالِ اَجلُهُنَّ ان يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ) حاملہ عورتوں کی عدت یہ ہے کہ وہ اپنے حمل جنم دیں۔ (۳) چھوٹی بچی یا بوڑھی عورت جسے حیض نہ آتا ہو اس کی عدت تین مہینے ہے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے (وَالّٰىءِ يَئِسْنَ مِنَ الْمَحِيضِ مِن نسَآئِكُمْ اِنْ ار تبتُمْ و فَعِدَّتُهُنَّ ثَلاثَةُ اَشْهُرٍ والائى يحضن) (۴) لونڈی منکوحہ کی عدت دو حیض۔ آزاد بیوی جو قابلِ حیض ہو حاملہ بھی نہ ہو اور اسے طلاق بھی خلوت صحیحہ کے بعد دی گئی اس کی عدت تین حیض اسی کا ذکر اس آیت میں آیا ہے اس آیت کے الفاظ اگرچہ عام ہیں۔ مگر دوسری آیت سے اس میں تخصیص مانی گئی ہے اس بحث کی تفصیل احکام القرآن میں علامہ جصاص رازی نے بیان کی ہے۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمۡسَاکٌۢ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ تَسۡرِیۡحٌۢ بِاِحۡسَانٍ ؕ وَلَا یَحِلُّ لَکُمۡ اَنۡ تَاۡخُذُوۡا مِمَّاۤ اٰتَیۡتُمُوۡهُنَّ شَیۡئًا اِلَّاۤ اَنۡ یَّخَافَاۤ اَلَّا یُقِیۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰهِ ؕ فَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا یُقِیۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَیۡهِمَا فِیۡمَا افۡتَدَتۡ بِهٖ ؕ تِلۡکَ حُدُوۡدُ اللّٰهِ فَلَا تَعۡتَدُوۡهَا ۚ وَمَنۡ یَّتَعَدَّ حُدُوۡدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ (سورۃ البقرۃ:۲۲۹)

''یہ طلاق دو بار تک ہے پھر بھلائی کے ساتھ روک لینا یا نکوئی کیساتھ چھوڑ دینا ہے۔اور تمہیں روا نہیں کہ جو کچھ عورتوں کو دیا اس میں سے کچھ واپس کرلو مگر جب دونوں کو اندیشہ ہو کہ اللہ کی حدیں قائم نہ کریں گے۔پھر اگر تمہیں خوف ہو کہ وہ دونوں ٹھیک اپنی حدوں پر نہ رہیں گے تو ان پر کچھ گناہ نہیں۔اس میں جو بدلہ دے کر عورت چھٹی لے۔یہ اللہ کی حدیں ہیں۔ان سے آگے نہ بڑھو اور جو اللہ کی حدوں سے آگے بڑھے تو وہی ظالم لوگ ہیں۔''

تعلق:

پچھلی آیت میں فرمایا گیا کہ طلاق رجعی میں شوہروں کو رجوع کرنے کا حق ہے اب طلاق رجعی کی حد بیان ہو رہی ہے (۲) گزشتہ آیت میں طلاق والی عورتوں کے احکام بیان ہوئے اب طلاق دینے کا طریقہ اور مرد کو کچھ ہدایات فرمائی جارہی ہیں۔

شان نزول:

علامہ بغوی فرماتے ہیں عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ شروع اسلام میں لوگوں کی یہ حالت تھی کہ بے حد و بے حساب طلاقیں دے دیتے تھے۔کوئی یہ کرتا تھا کہ بیوی کو

طلاق دے دی اور جب اس کی عدت ختم ہونے پر آئی تو اس سے رجعت کرلی۔ پھر اسی طرح طلاق دے دی، اسے ستانے کے ارداہ سے پھر رجعت کرلی۔ اس پر یہ حکم نازل ہوا کہ (الطلاق مرتان) طلاق دو بار تک ہے اور جب کسی نے تیسری بار بھی طلاق دے دی تو اب کسی اور سے نکاح کیے بغیر یہ عورت اس کے لیے حلال نہیں ہوگی (مظہری)

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ : الطلاق میں الف لام عہدی ہے اور اس سے یا تو طلاقِ رجعی کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر اس سے پہلی آیت (احق بردھن) میں اشارۃ ہو چکا ہے یعنی وہ طلاق جس کے بعد رجعت ہو سکتی ہے وہ دو ہیں۔ تیسری کے بعد طلاقِ مغلظہ ہو جاتی ہے اور شوہر کو رجوع کرنے کا حق حاصل نہیں رہتا۔

یہ بھی احتمال ہے کہ اس لام سے طلاقِ شرعی کی طرف اشارہ ہو اور طلاق سے طلاق دینا مراد ہو جو مرد کا کام ہے۔ اس صورت میں مرتٰن سے مراد بار بار ہوگا جیسے (فَارْجِعِ البصر کرَّتَیْن) یعنی طلاقِ شرعی علیحدہ علیحدہ دینا ہے نہ کہ ایک دم تین۔ یہ بھی خبر بمعنی امر ہے تفاسیرِ عامہ۔ نیز اللہ تعالیٰ کے مرتان فرمانے اور اثنتان نہ فرمانے میں بھی اس امر کی دلیل ہے کہ ایک دفعہ ہی دو طلاقیں دے دینا مکروہ ہے کیوں کہ مرتان کا لفظ عبارۃً تو تفریق پر دلالت کرتا ہے اور اشارۃً عدد پر بھی (مظہری)

فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ : امساک مسک سے بنا بمعنی روکنا طلاق کا مقابل۔ اسی لیے بخیل کو بھی کنایۃً ممسک کہہ دیتے ہیں کہ وہ مال کو روکتا ہے۔ یا بمعنی حفاظت کرنا اسی لیے عقل وقوت کو مسکہ اور بہادر کو ذو مسکہ یا مسیک کہا جاتا ہے کہ عقل برائیوں سے اور قوت ذلت سے روکتی ہے۔ (نعیمی)

معروف سے اچھے تعلقات اور نیک سلوک مراد ہے۔ یعنی دو طلاقوں کے بعد تک یا تو بغرضِ اصلاح نہ کہ بنیتِ نقصان ان کو روکنا جائز ہے۔ جب کہ دونوں میاں بیوی آزاد ہوں اور اگر دونوں غلام ہوں تو پھر دو طلاقوں کے بعد بالاتفاق رجعت نہیں ہو سکتی۔

اَوْ تَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ : تسریح سرح سے بنا بمعنی آزاد چھوڑنا۔ اسی لیے بالوں میں کنگی کرنے کو تسریح الشعر اور جانور کو چرنے کے لیے چھوڑنے کو تشریح کہا جاتا ہے۔ (حِيْنَ تَسْرَحُوْنَ) (مفردات، نعیمی، کبیر وغیرہ)

احسان سے عورت کا مہر اور حقوقِ عدت ادا کرنا اور اس کی غیبت نہ کرنا مراد ہے۔ (روح البیان) یعنی دو طلاقوں تک مردوں کو حق حاصل نہیں ہے۔ بمقصدِ اصلاح انہیں روک لینا اور طلاق سے رجوع کر لینا یا بھلائی کیساتھ چھوڑ دینا۔

خیال رہے کہ یہاں چھوڑنے سے یا تیسری طلاق دینا مراد ہے۔ اس صورت میں (فَاِنْ طَلَّقَهَا) اس کا بیان ہے جیسا کہ حدیث شریف میں ہے۔ یا چھوڑنے سے رجوع نہ کرنا مراد ہے یہاں تک کہ عدت گزر جائے۔ اس صورت میں (فان طلقها) الآیۃ میں صراحۃً تیسری طلاق کا بیان ہے۔ (واللہ اعلم) پوری تفصیل کے لیے اسی آیت کے ماتحت مظہری ملاحظہ کی جائے۔

یہاں تک تو طلاق بلا عوض کا ذکر ہوا اب طلاق بعوض مال کا ذکر ہے فرمایا گیا (وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ) الآیۃ جمیلہ بنت عبداللہ ابن ابی حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور اپنے شوہر ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کی شکایت کی اور ان سے سخت نفرت کا اظہار کیا اور کسی طرح بھی ان کے پاس جانے پر راضی نہ ہوئیں تو تب حضور علیہ السلام نے ثابت رضی اللہ عنہ کو بلا کر سب واقعہ بیان فرمایا تو انہوں نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! اگر یہ میرے پاس رہنا نہیں چاہتی تو میں نے اس کو حقِ مہر میں ایک باغ دیا ہے وہ مجھے واپس کر دے تو میں اس کو آزاد کر دیتا ہوں۔ جمیلہ نے کہا مجھے منظور ہے بلکہ کچھ اور زیادہ بھی دوں گی۔ تب یہ (وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ) الآیۃ آیت نازل ہوئی آپ ﷺ نے فرمایا: صرف باغ واپس کر دو، زیادتی کی ضرورت نہیں۔ اسلام میں یہ پہلا خلع ہوا (روح البیان، کبیر وغیرہ) ابوداؤد شریف کتاب الطلاق باب الخلع میں بی بی صاحبہ کے نام حبیبہ بنت سہیل بتایا ان کے خاوند نے ان کو اس قدر مارا کہ ان کی ہڈی ٹوٹ گئی تب وہ حضور علیہ السلام کی بارگاہ میں حاضر ہو کر طلاق کی طالبہ ہوئیں (نعیمی)

وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ : اس میں یا تو خاوندوں سے خطاب ہے کیوں کہ آگے مال دینے کا ذکر ہے اور

مال شوہر ہی لیتا ہے۔ یا حکام سے خطاب ہے اور لینا دینا انہی کی طرف منسوب کیا گیا کیوں کہ میاں بیوی میں جھگڑا ہو جانے کے وقت آخری فیصلہ وہی کرتے ہیں۔ (روح البیان، کبیر)

اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْئًا: (تمہارے لیے روا نہیں جو کچھ عورتوں کو دیا اس سے کچھ واپس لو) اٰتَيْتُمْ میں یا تو مہر مراد ہے یا مہر میں دی ہوئی چیز۔

اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ: یہاں شوہر اور بیوی دونوں مراد ہیں (روح البیان) اور صیغہ غائب لانے میں التفات ہے۔ (یخافا) بطریقہ منع خلو دونوں (میاں بیوی) داخل ہیں۔ (حدود اللہ) سے مراد وہ شرعی حقوق ہیں جو شوہر کے بیوی پر اور بیوی کے شوہر پر ہیں اور حدود قائم کرنے سے مراد حقوق ادا کرنا ہے یعنی اس صورت میں مہر وغیرہ کی واپسی جائز ہے جب کہ میاں بیوی دونوں یا صرف بیوی کو یا شوہر کو یہ اندیشہ ہو کہ یہ دونوں یا ان میں سے کوئی شرعی حقوق ادا نہ کریں گے۔ بہتر یہ ہے کہ خاوند بیوی کے جھگڑے میں حتی الامکان صلح کرانے کی کوشش کی جائے یہ بہت ہی ثواب کا کام ہے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے (فابعثوا حکما من اھلہ وحکما من اھلھا) لیکن جب صلح کی کوئی صورت نہ ہو تو (فان خفتم الا یقیما حدود اللہ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ) تو اگر (اے حاکموں) تمہیں ڈر ہو کے خدائی قانون پر وہ دونوں قائم نہ رہ سکیں گے۔ تو عورت مرد کو کچھ دے کر پیچھا چھڑا لے تو اس میں ان دونوں پر کچھ گناہ نہیں۔ افتدت فدیہ سے بنا بمعنی جانی معاوضہ یعنی جو کچھ مال بطور فدیہ عورت شوہر کو دے کر اپنی جان چھڑا لے تو اس پر زوجین میں سے کسی پر کچھ گناہ نہیں (تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ) حدود جمع حد کی ہے بمعنی روکنے والی چیز۔ کنارے کو بھی اسی لیے حد کہتے ہیں وہ آگے بڑھنے سے روکتا ہے۔ تلوار کی دھار اور شرعی سزاؤں کو بھی اس لیے حد کہا جاتا ہے کہ وہ سرکشی سے روکتی ہے یعنی یہ قوانین اللہ کی مقرر کی ہوئی حدیں ہیں۔ (فَلَا تَعْتَدُوْهَا) یعنی ان حدوں سے آگے نہ بڑھو (وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ) اور جو کوئی بھی اللہ کی حدوں سے آگے بڑھے گا خواہ خاوند ہو یا بیوی یا حاکم یا عامۃ المسلمین پس وہی ظالم ہیں۔

فوائد و مسائل

ا۔ انسان کو چاہیے کہ اپنی مطلقہ بیوی کی غیبت نہ کرے اور نہ ہی اس کے ظاہری یا پوشیدہ عیب ظاہر کرے بعض لوگ طلاق نامہ پر لکھ دیتے ہیں کہ یہ عورت سخت زبان دراز، نافرمان ہے یا بدچلن ہے یا مجھے اس عورت سے جان کا خطرہ ہے شاید مجھے زہر دے کر مار دے یا کسی اور سے مروا دے وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب ناجائز ہیں ایسے الفاظ لکھنے کی کوئی ضرورت نہیں صرف طلاق کے الفاظ لکھو۔ ذرا سوچو کہ تم نے تو اس کے عیوب گنا دیئے اس نے تمہارے عیب کس کاغذ پر لکھے۔ یہ سب کچھ تسریح باحسان سے حاصل ہوا۔

۲۔ لڑنے میں بھی شرعی حدود کا لحاظ چاہیے دیکھو یہاں چھوڑنے پر بھی احسان کی پابندی لگادی۔

۳۔ سخت ضروری ہے کہ طلاقیں علیحدہ علیحدہ دیں ایک دم دو یا تین طلاقیں دے دینا حرام ہے یہاں فرمایا (اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ) جس سے معلوم ہوا کہ طلاقِ رجعی الگ الگ ہوں تیسری کے بارے میں آگے ارشاد ہوا ہے (فَاِنْ طَلَّقَھَا)

مسئلہ: طلاق کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ جب آدمی اپنی بیوی کو طلاق دینے پر مجبور ہو ہی جائے تو ایک طلاق دے دیں پھر اگر رجوع کرنے کا ارادہ نہ ہو تو اسے ایسے ہی رہنے دیں یہاں تک کہ اس کی عدت پوری ہو جائے اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مباح (جائز) چیزوں میں سے طلاق دینی سب سے زیادہ بری ہے اور ضرورت ایک ہی دینے سے پوری ہو جاتی ہے آج کل لوگ یک دم تین طلاقیں دے دیتے ہیں یا بعض جاہل عرائض نویس ایک دم ہی تین طلاق لکھ دیتے ہیں ایک ہی جملہ میں یا تین مرتبہ ایک مجلس میں طلاق دینا بدعت اور معاصیت ہے اگرچہ جمہور اہل اسلام کے نزدیک ایک مجلس میں یا ایک دم

تین طلاق دینے سے تین ہی واقع ہو جاتی ہیں آئندہ ہم اس کو مدلل بیان کریں گے ان شاء اللہ مگر اس سے قبل طلاق اور اس کی اقسام کا ذکر کیا جاتا ہے۔ نکاح سے عورت شوہر کی پابند ہو جاتی ہے۔ اس پابندی کے اٹھانے کو طلاق کہتے ہیں اور اس کے لیے کچھ الفاظ مقرر ہیں ۔اس کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ اسی وقت نکاح سے باہر ہو جائے اسے بائن کہتے ہیں ۔ دوئم یہ کہ عدت گزرنے پر باہر ہوگی اسے رجعی کہتے ہیں۔

مسئلہ: اصل طلاق میں منع ہے اور بضرورت مباح بلکہ بعض صورتوں میں مستحب مثلاً عورت اس کو یا اوروں کو ایذا دیتی یا نماز نہیں پڑھتی ہے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بے نمازی عورت کو طلاق دے دو، اور اس کا مہر میرے ذمہ واقع ہو اس حالت میں دربار خدا میں میری پیشی ہو تو یہ اس سے بہتر ہے کہ اس کیساتھ زندگی بسر کروں اور بعض صورتوں میں طلاق دینا واجب ہے۔ مثلاً شوہر نہ مرد یا ہیجڑا ہے۔ یا اس پر کسی نے جادو یا عمل کر دیا ہے کہ جماع کرنے پر قادر نہیں اور اس کے ازالہ کی بھی کوئی صورت نظر نہیں آتی کہ ان صورتوں میں طلاق نہ دینا سخت تکلیف پہنچانا ہے۔ (درمختار وغیرہ)

مسئلہ: طلاق کی تین قسمیں ہیں (۱) حسن (۲) احسن (۳) بدعی۔

حسن: طہر میں وطی نہ کی ہو اس میں ایک طلاقِ رجعی دے اور چھوڑ دے یہاں تک کہ عدت گزر جائے یہ احسن ہے۔

مسئلہ: اور غیر موطوۃ کو طلاق دی اگرچہ حیض کے دنوں میں دی ہو۔ موطوۃ کو تین طہر میں تین طلاقیں دیں بشرطیکہ نہ طہروں میں وطی کی ہو نہ حیض میں یا تین مہینہ میں تین طلاقیں اس عورت کو دیں جسے حیض نہیں آتا مثلاً نابالغہ یا حمل والی ہے یا اس عمر کو پہنچ گئی تو یہ سب صورتیں طلاقِ حسن کی ہیں۔

حمل والی یا سن ایاس والی کو وطی کے بعد طلاق دینے میں کراہت نہیں۔ یوں ہی اگر اس کی عمر نو سال سے کم کی ہو تو بھی کراہت نہیں اور نو برس یا زیادہ کی عمر ہے ابھی حیض نہیں آیا ہے تو افضل یہ ہے کہ وطی اور طلاق میں ایک مہینہ کا فاصلہ ہو۔

بدعی: یہ ہے کہ ایک طہر میں دو یا تین طلاقیں دے دے۔ تین دفعہ میں یا دو دفعہ میں یا ایک ہی دفعہ میں خواہ تین بار لفظ کہے یا یوں کہہ دیا کہ تجھے تین طلاقیں یا ایک ہی طلاق دی مگر اس سے طہر میں وطی کر چکا ہے یا موطوءۃ کو حیض میں طلاق دی یا یہ سب باتیں نہیں مگر طہر میں طلاق بائن دی۔ یہ سب طلاق بدعی کی صورتیں ہیں۔ (درمختار وغیرہ)

مسئلہ: حیض میں طلاق دی تو رجعت واجب ہے کہ اس حال میں طلاق دینا گناہ تھا۔ اگر طلاق دینا ہی ہے تو اس حیض کے بعد طہر گزر جائے پھر حیض آ کر پاک ہو اب دے سکتا ہے۔ یہ اس وقت ہے کہ جماع سے رجعت کی ہو اور اگر قول یا بوسہ لینے یا چھونے سے رجعت کی ہو تو اس حیض کے بعد جو طہر ہے اس میں بھی طلاق دے سکتا ہے۔ اس کے بعد دوسرے طہر کے انتظار کی حاجت نہیں۔ (جوہرہ وغیرہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حالت حیض اور نفاس اور موطوءۃ فی الطہر کی طلاق کا حکم

اس مسئلہ میں جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا ہے حنفیہ کے ہاں طلاق واقع ہو جاتی ہے۔ اگرچہ اس طرح طلاق دینا خلاف سنت ہے اور ابن قیم جوزی اور اس کے اتباع نے اس مسئلہ میں شدت سے مخالفت کی ہے۔ جیسا کہ تین طلاقوں کے ایک دفعہ ایقاع میں انہوں نے مخالفت کی۔ مذکورہ صورت میں وقوع طلاق کے ثبوت میں اہلِ سنت کی طرف سے مندرجہ ذیل دلائل پیش کیے گئے ہیں۔

(ا) فی الصحیحین ان ابن عمرؓ طلق امرأته وھی حائضة علی عھد رسول اللہ ﷺ فسال عمر بن الخطابؓ عن ذالک رسول اللہ ﷺ فقال مرہ فلیراجعھا ثم لیمسکھا حتی تطھر ثم تحیض ثم تطھر ثم ان شاء امسکھا بعد ذالک وان شاء طلقھا قبل ان یمس فتلک العدۃ التی امر اللہ ان تطلق لھا النسآء ولمسلم مرہ فلیراجعھا ثم لیطلقھا اذا طھرت او ھی حامل وفی لفظ ان شاء طلقھا طاھراً قبل ان یمس فذالک الطلاق للعدۃ کما امرہ اللہ تعالیٰ فی لفظ للبخاری مرہ فلیراجعھا ثم لیطلقھا فی قبل عدتھا صحیحین میں ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے عہد میں اپنی بیوی کو حالتِ حیض میں طلاق دے دی تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے اس بارے میں سوال کیا تو آپ نے فرمایا کہ ابن عمر کو حکم دو کہ وہ اپنی بیوی سے مراجعت کرے پھر اس کو روکے یہاں تک کہ وہ پاک ہو جائے۔ پھر اسے حیض آئے پھر پاک ہو جائے پھر چاہے تو اس کے بعد اس عورت کو روکے اور اگر چاہے تو اسے (حالتِ طہر) میں قبل از مس طلاق دے دے۔ پس یہ وہ عدت ہے کہ اللہ تعالیٰ

نے عورتوں کو اس میں طلاق دینے کا حکم دیا ہے۔ اور مسلم شریف کی روایت میں ہے۔ کہ اس کو حکم دے کہ وہ بیوی سے رجوع کرے اور اس کو طلاق دے جب وہ پاک ہو جائے یا حالت حمل میں طلاق دے۔ اور ایک لفظ میں ہے اگر چاہے تو اس کو قبل از جماع طہر میں طلاق دے پس یہ طلاق للعدۃ ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم دیا ہے۔ اور بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ اس کو رجوع کا حکم دو پھر وہ اس کو اس کی عدت سے پہلے طلاق دے (زاد المعاد ۴۳/۴)

اس حدیث کو آئمہ ستہ نے ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ امام بخاری نے اس کو طلاق، تفسیر اور احکام میں لائے ہیں۔ اور مسلم میں باب تحریم طلاق الحائض جلد اول میں ہے۔ اور باقی آئمہ نے طلاق میں اس کا ذکر کیا ہے۔ اس حدیث میں نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد کہ (فليـــراجـعهـا) اس امر کی دلیل ہے کہ طلاق حالتِ حیض میں ہوگئی تھی اور حضور علیہ السلام نے اس سے رجوع کا حکم فرمایا تا کہ دوبارہ ابن عمر رضی اللہ عنہ طلاق دینا چاہیں تو بطریقہِ سنت طلاق دیں۔ ابنِ قیم اور اس کے اتباع حالتِ حیض کی طلاق کو کالعدم قرار دیتے ہیں اور ان کا استدلال اس روایت سے ہے کہ (عن ابـن عـمـر قال طلق عبدالله عمر امراته وهي حائض فردها عليه رسول الله ﷺ ولم يرها شياً وقال اذا طهرت فليطلق او ليمسک) الحدیث رواہ احمد ابوداؤد نسائی (ترجمہ) عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی کو حالتِ حیض میں طلاق دی تو وہ عورت رسول اللہ ﷺ نے ابن عمر کو لوٹا دی اور اس طلاق کو شمار نہیں کیا اور فرمایا جب عورت پاک ہو جائے تو ابنِ عمر اس کو طلاق دے یا روکے۔ اس حدیث کو حدیثِ ابوزبیر کہتے ہیں۔ ابوداؤد نے اس کے ماتحت لکھا ہے کہ ابوزبیر کی یہ روایت دوسری مثبت روایات کے خلاف ہے چناں چہ ابوداؤد کی عبارت یہ ہے (قـال ابـو داؤد روى هذا الحديث عن ابي عمر يونس بن جبير و انس بن سليم وسعيد ابن جبير و زيد بن اسلم و ابو زبير منصور عن ابي وائل معناهم كلهم ان النبي ﷺ امره ان يراجعها حتى تطهر ثم ان شاء طلق وان شاء امسک و كـذالک رواه مـحـمـد بن عبدالرحمن عن سالم عن ابن عمر وما

روایة زهری عن نافع عن ابن عمر ان النبی ﷺ امره ان یراجعها حتی تطهر ثم تحیض ثم تطهر ثم ان شاء طلق او امسک وروی عن عطاء الخراسانی عن الحسن عن ابن عمر نحو روایت نافع والزهری والاحادیث کلها علی خلاف ماقال ابو زبیر) ابوداؤد کے اس کلام میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حدیث ابوزبیر میں لم یرھاشیأ کے جو الفاظ ہیں وہ قصہ ابن عمر رضی اللہ عنہ میں وارد تمام حدیثوں کے مخالف ہے۔ لہٰذا جو کچھ ابوزبیر نے کہا ہے وہ شاذ ہے اس کے علاوہ نسائی اور صحیح مسلم میں جو حجاج بن محمد کے طریق سے مروی ہے لم یرھاشیأ کے الفاظ مذکور نہیں ہیں اور یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ ابوزبیر ثقہ ہیں اور زیادت ثقہ مقبول ہوتی ہے۔ اس لیے کہ زیادت ثقہ اس وقت مقبول ہوتی ہے جب کہ وہ کسی ثقہ کی روایت کے منافی نہ ہو جس نے اس زیادت کا ذکر نہ کیا ہو اور یہاں ابوزبیر رضی اللہ عنہ نے دوسرے بہت سے ثقات کے خلاف روایت کی ہے لہٰذا ان کے مقابلے میں یہ روایت مرجوح ہوگی۔ علاوہ ازیں اس روایت کو تسلیم بھی کرلیا جائے جیسا کہ ابن قیم نے زادالمعاد میں اس پر زور دیا ہے تو اس کی یہ تاویل ممکن ہے کہ یوں کیا جائے (لم یرھا شیأ مشروعاً) اور (لم یرھا شیأ مانعاً من الرجعة) یعنی حضورﷺ نے اس طلاق کو مشروع نہ جانا یا اس کو رجعت سے مانع نہ سمجھا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ھا ضمیر کا مرجع رجعت ہو (ای لم یر الرجعة شیأ ممنوعاً) یعنی رجعت کو شئی ممنوع نہ جانا۔ علامہ ابن قدامہ حنبلی نے مغنی میں فرمایا (فان طلق للبدعة وهو ان یطلقها حائضاً) اور (فی طهر اصابها فیه اثم و وقع طلاقهٔ فی قول عامه اهل العلم. قال ابن المنذر وابن عبدالبر لم یخالف فی ذالک الا اهل البدع والضلال) پس اگر طلاقِ بدعت دی اور وہ اس طرح کہ حالتِ حیض میں طلاق دے یا اس طہر میں جس میں اس عورت سے وطی کی گناہ گار ہوگا اور عامہ اہلِ علم کے قول کے مطابق یہ طلاق واقع ہو جائے گی اور ابن منذر اور ابن عبدالبر نے کہا ہے کہ اس مسئلہ میں مخالفت کرنے والے صرف بدعتی اور گمراہ لوگ ہیں۔ رہا یہ مسئلہ کہ نہی منہی عنہ کے فساد کی مقتضی ہے اس کا جواب آئندہ طلاقِ ثلاثہ کی بحث میں دیں گے

(ان شاء اللہ) اور ابن قیم نے (مره فليراجعها) میں مراجعت کی جو تائید کی ہے وہ احادیث کے ظاہر الفاظ اور جملہ شارحینِ حدیث کے بالکل خلاف ہے۔ اگر ابنِ قیم کے نزدیک ابوداؤد کی تقلید جائز نہیں تو جمہور اہلِ اسلام اور عامہ اہلِ علم کے خلاف ابن قیم اور اس کے اتباع شرذمہ قلیلہ کا قولِ شاذ کیسے قابلِ تسلیم ہو سکتا ہے۔ اسی لیے معتبر آئمہ اسلام نے اسی قول کے قائلین کو اہلِ بدعت و ضلال میں شمار کیا ہے۔ کما عن المغنی (۷/۹۹)

طلاق ثلاثہ کا بیان

(کلمہ واحدۃ سے تین طلاق کے وقوع کے بارے میں اختلاف کا بیان)

اس مسئلہ میں ابن قیم نے چار مذہب نقل کیے ہیں۔

۱۔ اگر کوئی شخص اپنی زوجہ کو بیک وقت ایک کلمہ سے تین طلاق دے یا متفرق کلمات سے ایک مجلس میں تین مرتبہ طلاق۔ طلاق۔ طلاق کہے تو اسی وقت تین طلاق بائنہ مغلظہ واقع ہو جائیں گی۔ اور وہ شخص اپنی زوجہ سے رجوع نہیں کر سکے گا۔ مگر یہ کہ وہ عورت دوسرے مرد سے نکاح کرے اور اس سے طلاق مل جائے اور یہ زوجِ ثانی سے وطی کرے پھر یہ نکاح فسخ ہو جائے یا وہ مر جائے ایسی صورت میں عدت ختم ہونے پر فریقین باہمی رضامندی اس سے نکاح جدید کر سکتے ہیں۔ ابن قیم نے لکھا ہے کہ یہ مذہب آئمہ اربعہ اور جمہور تابعین اور کثیر صحابہ کا ہے ہم آگے چل کر ان شاء اللہ بیان کریں گے کہ یہ مذہب صرف کثیر صحابہ کا نہیں بلکہ تمام صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کا ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فیصلہ پر جملہ صحابہ کا اجماع سکوتی ثابت ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم کے بعد کسی نے بھی مخالفت نہیں کی۔

۲۔ کوئی طلاق واقع نہیں ہوتی۔ (یہ مذہب شیعہ ہے)۔

۳۔ ایک طلاق رجعی واقع ہوتی ہے اور یہ عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ ابوداؤد نے ان سے اس کا ذکر کیا ہے۔ اور ابن تیمیہ اور اسکے اتباع کا یہی مختار ہے۔

۴۔ مدخولہ اور غیر مدخولہ میں فرق ہے۔ مدخولہ کو اس صورت میں تین طلاق واقع ہو جاتی ہے اور غیر مدخولہ کو ایک طلاق واقع ہوتی ہے۔ اور ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کے اصحاب میں سے ایک جماعت کا قول ہے۔ اور اسحاق بن راھویہ کا مذہب ہے محمد بن نصر مروزی نے اختلاف العلماء میں اس کو حکایت کیا ہے۔ مسئلہ اول کے دلائل صفحہ ۱۴۳ پر مذکور ہیں۔

پہلے مسلک کے دلائل

عن الحسن قال حد ثنا ابن عمر انه طلق امرأته تطليقةً وهى حائض ثم اراد ان يتبعها تطليقيتين آخر تين عندالقرئين فبلغ ذالک رسول الله ﷺ فقال يا ابن عمر ماهکذا امرک الله تعالیٰ انک قد اخطأت السنة والسنة ان تسقبل الطهر فتطلق لکل قرء وقال فامرنی رسول الله ﷺ فراجعتها ثم قال اذا هی طهرت فطلق عند ذالک او امسک فقلت يارسول الله ارايت لو طلقتها ثلاثاً اکان يحل لی ان راجعها قال لا کانت تبين منک وتکون معصيةً (رواه الدارقطنی) (نيل الاوطار علی المنتقی صفحه ۶/۲۴۱) مرقات ۶/۲۹۴ مفريا الی مصنف ابن ابی شيبه والدار تطنی ۳۱ (بيهقی صفحه ۳۳۰/۷ ايضا ۳۳۴) /

"حسن سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ ہم سے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے حدیث بیان کی کہ انہوں نے اپنی بیوی کو حالتِ حیض میں طلاق دے دی۔ پھر ارادہ

کیا کہ اس کے بعد دو اور طلاقیں دو حیضوں میں دے دوں۔ پس رسول اللہ ﷺ کو خبر پہنچی تو آپ نے فرمایا: اے ابن عمر تجھ کو اللہ تعالیٰ نے اس طرح حکم نہیں فرمایا۔ بے شک تو نے سنت کی خلاف ورزی کی۔ سنت یہ ہے کہ تو آئندہ طہر کا انتظار کرتا اور ہر طہر میں طلاق دیتا اور ابن عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: پس رسول اللہ ﷺ نے مجھے حکم دیا تو میں نے اس عورت سے رجوع کیا۔ پھر فرمایا جب وہ پاک ہو جائے اس وقت طلاق دے یا روک لے۔ پس میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ خبر دیجئے اگر میں اس کو تین طلاق دے دیتا تو اس صورت میں میرے لیے اس سے مراجعت حلال تھی؟ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: نہیں وہ عورت تجھ سے بائن ہو جاتی اور یہ فعل معصیت ہوتا۔" (روایت کیا اس کو دار قطنی نے صفحہ ۴/۱۳۱)

حدیثِ مذکورہ حنفیہ کے مدعا میں بالکل صریح ہے کہ یک لخت تین طلاق دینا معصیت ہے لیکن با این ہمہ وہ تین طلاق ہی ہوں گی ان کو ایک نہیں سمجھا جائے گا۔

صفحہ ا: اس روایت مذکورہ کی سند میں عطا خراسانی آتے ہیں۔ جن کے متعلق شوکانی کہتا ہے کہ وہ مختلف فیہ ہے اس لیے اس سے احتجاج جائز نہیں ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ عطا کا مختلف فیہ ہونا اس روایت صحیحہ سے احتجاج میں قادح نہیں ہے اس لیے کہ امام ترمذی نے عطا کی توثیق کی ہے اور نسائی اور ابو حاتم نے اس کے متعلق لاباس بہ کہا۔ کما اقر بہ الشوکانی فی النیل۔ علاوہ ازیں عطا خراسانی رجال موطا امام مالک سے ہیں امام سیوطی ان کے متعلق فرماتے ہیں۔ (احد الاعلام نزل الشام وروى عن الزهرى وسعيد ابن المسيب و خلق وروى عنه ابو حنيفه و مالک و شعبة والثورى و حماد بن سلمة وعدة وثقهٔ ابن معين و ابو حاتم والدار قطنى ...... مات خمس ثلاثين ومائة) (اسعاف المبطا برجال الموطا صفحه ٢٠) اور علامہ ذہبی فرماتے ہیں (قال احمد يحيىٰ وغيرهم ثقة وقال يعقوب ابن شيبه ثقة معروف بالفتوى والجهاد وقال ابو حاتم لاباس به ...... قال

ابو حاتم ثقة مبحٌ به ...... ثم قال الترمذی ثقةٌ روی عنه مثل قتل مالک و معمر لم اسمع ان احداًمن المتقدمین تکلم فیه ......) (میزان الاعتدال صفحہ ۷۴. ۷۵ / ۳ ، ایضاً تہذیب التہذیب صفحہ ۶۱۳ / ۷ میں منقول ہے (قال ابن معین ثقةٌ وقال ابن ابی حاتم عن ابیه ثقةٌ صدوق قلت یحتج به قال نعم) (ایضاً کتاب الجرح والتعدیل صفحہ ۳۳۵ / ۲ قسم اول) ابن ابی حاتم فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے باپ سے پوچھا (عطاء الخراسانی فقال لاباس به صدوق) میں نے کہا اس کی حدیث قابل احتجاج ہے یا نہیں قال نعم یعنی قابل احتجاج ہے پس شوکانی کا بطل الاحتجاج بہ کہنا باطل ہو گیا۔ رہا حدیث مذکور میں زیادت فی محل الحاجة سے تفرد عطا اس میں کوئی حرج نہیں اس لیے کہ زیادة الثقة مقبولة معروف عندالمحدثین ہے خصوصاً جب کہ اس کا متابعہ موجود ہے قال ابن الهمام تعلیل البیهقی مردودٌ حیث تابعه شعیب بن رزیق سنداً و متابع متناً رواه الطبرانی (فتح القدیر صفحہ ۲۴ / ۳)

اس روایت میں ایک راوی شعیب بن رزیق ہے جس کو شوکانی نے ضعیف کہا ہے لیکن شعیب بن رزیق کو تقریب میں صدوق یخطی کہا ہے اور تہذیب صفحہ ۴/۳۵۳ میں فرمایا قال الدار قطنی ثقة و ذکره ابن حبان فی الثقات.

۲۔ ابن عمر رضی اللہ عنہ کی مذکورہ حدیث کی تائید بخاری اور مسلم شریف میں بھی ہے۔ حضرت نافع رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے جب حائضہ کی طلاق کے بارے میں سوال کیا جاتا۔ (قال لا حدھم اما انت طلّقت امرأتک مرةً اومرتین فان رسول الله ﷺ امرنی بهذا وان کنت طلّقتها ثلاثاً فقد حَرُمت علیک حتی تنکح زوجاً غیرکَ وعصیت الله فیما امرک من طلاق امرأتک) (رواه مسلم جلد اول صفحہ ۴۷۶ ، بخاری صفحہ ۷۹۲ / ۲ ، فی تعلیقاته والدارقطنی صفحہ ۲۸ / ۴ ، بیهقی ۷/۳۳۵ ، واللفظ عام)

ترجمہ: ابن عمر رضی اللہ عنہ نے سوال کرنے والے سے فرمایا کہ تو نے تو اپنی عورت کو ایک یا دو دفعہ طلاق دی ہے۔ اس بارے میں رسول اللہ ﷺ نے مجھے ایسا حکم فرمایا ہے اور اگر تو اپنی عورت کو تین طلاقیں دے دیتا تو وہ تجھ پر حرام ہو جاتی یہاں تک کہ تیرے سوا کسی دوسرے خاوند سے نکاح کرلے اور تو نے (اس صورت میں) اپنی بیوی کو طلاق دینے کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی۔

۳۔ نیز اس کی تائید عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد سے ہوتی ہے (عن نافع ان رجلاً طلق امرأته وهي حائض ثلاثاً فسأل ابن عمر فقال عصيت ربك بانت منك لاتحل لك حتى تنكح زوجا غيرك) نافع رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک آدمی نے اپنی بیوی کو حالتِ حیض میں تین طلاقیں دیں تو اس نے ابن عمر رضی اللہ عنہ سے سوال کیا۔ تو آپ نے فرمایا: تو نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور وہ عورت تجھ سے بائن ہو گئی جب تک وہ تیرے سوا کسی دوسرے خاوند سے نکاح نہ کرے تیرے لیے حلال نہیں ہوگی (مصنف عبدالرزاق ۶/۳۱۱) حدیث نمبر ۱۰۹۶۴

۴۔ حدیث علاعنہ میں ہے کہ عویمر عجلانی نے اپنی بیوی کو لعان کے بعد حضرت رسول اللہ ﷺ کے سامنے بیک وقت تین طلاقیں دیں پس حدیث لعان کو ذکر کیا (قال سهل فلما فرغ من تلاعنهما قال كذبت عليها يارسول الله ﷺ ان امسكتها فطلق ها ثلاثاً قبل ان يامره النبي ﷺ) (بیہقی ۷/۳۲۸) اس کے علاوہ یہ حدیث مختلف اسناد وروایات، سنن ابی داؤد باب اللعان اور بخاری اور مسلم میں کتاب الطلاق باب اللعان کے تحت بیان کی گئی ہے۔

سہل بن سعد ساعدی نے فرمایا کہ جب عویمر اور اس کی بیوی ایک دوسرے پر لعان سے فارغ ہوئے تو عویمر نے کہا۔ اگر میں اس عورت کو اپنے پاس رکھوں تو میں نے اس پر جھوٹ باندھا پس رسول اللہ ﷺ کے فیصلہ کرنے سے پہلے عویمر نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں اس صحیح حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ تین طلاق بیک وقت دینے سے تین طلاق واقع ہو جاتی ہیں کیوں کہ

نبی کریم ﷺ نے عویمر پر انکار نہیں فرمایا۔ رہا شوافع کا اس سے یہ استدلال کہ معلوم ہوا تین طلاق بیک وقت دینا ممنوع نہیں احناف کے خلاف حجت نہیں اس لیے کہ شافعی حضرت لعان کو فسخ مانتے ہیں۔

۵۔ عائشہ خثعمیہ حسن بن علی رضی اللہ عنہ کے نکاح میں تھیں۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ شہید کر دیئے گئے تو عائشہ رضی اللہ عنہ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے کہا آپ کو خلافت مبارک ہو تو حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے کہا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت پر خوشی کا اظہار کرتی ہے (اذھبی فانت طالق یعنی ثلاثاً) (چلی جاؤ تجھے تین طلاق ہیں) راوی نے کہا کہ اس نے اپنے کپڑے سمیٹے اور بیٹھ گئی یہاں تک کہ اس کی عدت گزر گئی تو حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے اس کی طرف باقی حق مہر اور دس ہزار بطور صدقہ بھیجے۔ جب قاصد اس کے پاس پہنچا تو اس عورت نے کہا (متاعٌ قلیل من حبیب مفارقٍ) (جدا ہونے والے حبیب کے مقابلہ میں یہ سامان تھوڑا ہے) (یعنی اس کی کوئی وقعت نہیں) جب اس کی خبر حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو پہنچی تو آپ روئے پھر فرمایا (لولا انی سمعت جدی او حدثنی ابی انہ سمع جدی یقول ایما رجل طلق امرأتہ ثلاثاً عندالاقراء او ثلاثاً مبھمۃ لم تحل لہ حتی تنکح زوجا غیرہ لراجعتھا) (بیہقی صفحہ ۳۳۶/ ۷، طبرانی صفحہ ۲/۲۷۹) اگر میں نے اپنے نانا سے نہ سنا ہوتا یا مجھ سے میرے باپ نے بیان کیا اور انہوں نے میرے نانا ﷺ سے سنا کہ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ جو کوئی اپنی عورت کو تین طلاق تین حیض میں یا تین اکھٹی دے دے تو وہ عورت اس کے لیے حلال نہیں ہوگی یہاں تک کہ وہ دوسرے شوہر سے نکاح نہ کرے تو میں ضرور اس سے رجوع کر لیتا۔ اس روایت سے صراحۃً معلوم ہوا کہ تین طلاق اکھٹی دینے سے تین واقع ہو جاتی ہیں۔ اس کی تائید حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے (سمعت رسول اللہ ﷺ یقول ایما رجل طلق امرأتہ ثلاثۃ عند کل طھر تطلیقۃ او عند رأس کل شھر تطلیقۃ طلقھا ثلاثاً جمیعاً لم تحل لہ حتی تنکح زوجاً غیرہ) (دار قطنی صفحہ ۴/۳۱)

اس کا معنی اور مفہوم سابقہ روایت کی طرح ظاہر ہے (فائدہ) اصابہ میں علامہ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما کا نبی کریم ﷺ سے سماع ثابت کیا ہے اور بعض وہ روایات بھی ذکر کیں ہیں جو حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے حضور علیہ السلام سے روایت کی تھیں اور سنن اربعہ میں موجود ہے۔

۶. قال اخبرنا مخرمة عن ابیه قال سمعت محمود بن لبید قال اُخبر رسول اللّٰه ﷺ عن رجل طلق امرأته ثلٰث تطلیقاتٍ جمیعاً فقام غضباناً ثم قال ایلعب بکتاب اللّٰه وانا بین اظهر کم حتی قام رجل وقال یارسول اللّٰه الا اقتله (رواہ النسائی ۹۹/ ۲۷) مخرمہ نے اپنے باپ سے روایت کی کہ اس کے باپ نے کہا کہ میں نے محمود بن لبید سے سنا انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کو ایک آدمی کے متعلق خبر دی گئی کہ اس نے اپنی بیوی کو تین طلاق اکٹھی دے دی ہیں۔ تو حضور علیہ الصلوۃ والسلام ناراض ہو کر کھڑے ہو گئے۔ پھر فرمایا کہ کیا میری موجودگی میں اللہ کی کتاب سے کھیلا جاتا ہے؟ یہاں تک کہ ایک آدمی کھڑا ہوا اور عرض کی یارسول اللہ ﷺ کیا میں اس کو قتل نہ کردوں؟ قال ابن کثیر اسناده جید وقال الحافظ فی بلوغ المرام روایة موثقون (نیل) / والتعلیق والمغنی حدیث مذکور سے اکٹھی تین طلاق کا گناہ ہونا تو ظاہر ہے اور تین کا واقع ہو جانا بایں طور پر ہے کہ اس شخص کے اس طرح تین طلاق دینے پر حضور علیہ السلام ناراض تو ہوئے مگر یہ نہیں فرمایا کہ یہ طلاق واقع نہیں۔ قال ابن العربی فیه التصریح بان الرجل طلّق ثلاثاً مجموعة ولم یرده النبی ﷺ۔ ابن العربی نے فرمایا اس میں تصریح ہے کہ اس آدمی نے اکٹھی تین طلاق دے دیں اور نبی کریم ﷺ نے اس کو رد نہیں کیا۔ بل امضاه واللّٰه اعلم (فتح الباری صفحہ ۲۷۹/ ۱۱) عدم رد دلیل امضاء ہے لان السکوت فی معرض البیان بیان اور (حدیث ابن عمر عصیت ربک وبانت منک امرأتک) اور اسی طرح ابن عباس رضی اللہ عنہ کا فتویٰ جس میں انہوں نے فرمایا: ان اللّٰه تعالیٰ قال ومن یتق اللّٰه یجعل له مخرجاً وانک لم تتق اللّٰه فلا اجد

لک مخرجاً عصیت ربک بانت منک امرأتک یہ حدیث ابن لبید کی مؤید ہے واخرج ابوداؤد لہ متابعات عن ابن عباس بنحوہٖ (فتح الباری صفحہ ۲۷۷/۱۱)

۸۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فیصلہ کہ یک وقت دی ہوئی تین طلاق تین ہی ہوتی ہے۔ اور کسی صحابی کا اس پر انکار نہ فرمانا اور ائمہ اربعہ اہل سنت کا اس پر اجماع بالکل ظاہر و عیاں ہے۔ جس کا ذکر آگے حدیث طاؤس میں بالتفصیل آرہا ہے۔ (ان شاء اللہ) فتاویٰ صحابہ (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین)۔

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کا فتویٰ

(۹) عن مجاھد کنت عند ابن عباس فجاءہ رجلٌ فقال انه طلق امرأته ثلثاً فسکت حتی ظننت انه رادھا الیه ثم قال ینطلق احدکم فیرکب الحموقة ثم یقول یا ابن عباس یا ابن عباس وان اللّٰه قال ومن یتق اللّٰه یجعل له مخرجاً وانک لم تتق اللّٰه فلم اجد لک مخرجاً عصیت ربک وبانت منک امرأتک وان اللّٰه قال یا ایھا النبی اذا طلقتم النساء فطلقوھن فی قبل عدتھن (رواہ ابوداؤد نیل الاوطار صفحہ ۲۴۳/۶) مجاہد سے مروی ہے کہ میں ابن عباس رضی اللہ عنہ کے پاس تھا پس آپ کے پاس ایک آدمی آیا۔ اس نے کہا کہ اس نے اپنی عورت کو طلاق دے دی ہے۔ پس ابن عباس رضی اللہ عنہ خاموش رہے یہاں تک کہ میں نے گمان کیا کہ وہ اس کی عورت کو اس کی طرف لوٹانے والے ہیں۔ پھر فرمایا کہ ایک شخص تم میں سے بیوقوفی پر سوار ہوتا ہے۔ پھر کہتا ہے اے ابن عباس اے ابن عباس اور بے شک اللہ تعالیٰ نے فرمایا جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے لیے نکلنے کا کوئی راستہ بنا دیتا ہے۔ بیشک تو اللہ سے نہیں ڈرتا۔ پس تیرے پاس تیرے لیے کوئی راستہ نہیں۔ تو نے اپنے رب کی نافرمانی کی سو تیری عورت تجھ سے بائن (جدا) ہوگئی۔ اور تحقیق اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے نبی ﷺ جب تم عورتوں کو طلاق دو تو ان کو ان کی عدت کے مقابلہ میں طلاق دو

(طہر میں) روایت کیا اس کو ابوداؤد نے پس یہ گمان بھی نہیں کیا جاسکتا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے پاس کوئی حضور علیہ السلام کا صریح حکم ہوتا اور وہ اسکے خلاف فتویٰ دیتے۔ الا لمرجح ظهر له وراوی الخبر اخبر بما رواه۔

۱۰۔ وعن مجاهد عن ابن عباس انه سئل عن رجل طلق امرأته مائة قال عصيت ربک وفارَقَتْ امرأتک لم تتق الله فيجعل لک مخرجاً نیل الاوطار مجاہد ابن عباس رضی اللہ عنہ سے راوی ہے کہ ان سے ایسے آدمی کہ بارے میں سوال کیا گیا جس نے اپنی عورت کو سوطلاق دیں تو ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تو نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور تیری عورت تجھ سے جدا ہوگئی تو اللہ تعالیٰ سے نہیں ڈرا اور وہ تیرے لیے کوئی سبیل بنا دیتا۔ (نیل الاوطار ۲۴۳/ ۴۲)

۱۱۔ عن سعيد ابن جبير عن ابن عباس ان رجلا طلق امرأته الفا قال يكفيك من ذالک ثلاث وتدع تسع مائة وسبعا وتسعين (نیل صفحہ ۶/۲۴۳) ایضاً عن عطاء سعد ابن جبیر ابن عباس رضی اللہ عنہ سے راوی ہیں کہ ایک آدمی نے اپنی بیوی کو ہزار طلاقیں دے دیں تو ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا تیرے لیے اس سے تین کافی ہیں اور نو سو ستانوے چھوڑ دے۔

۱۲۔ وعن سعيد ابن جبير عن ابن عباس انه سئل عن رجل طلق امرأته عدد النجوم فقال اخطأ السنة وحرمت عليه امرأته (نیل الدوطار بحوالہ دار قطنی صفحہ ۲۴۳/ ۶) سعید ابن جبیر ابن عباس رضی اللہ عنہما سے راوی ہیں کہ وہ ایک ایسے آدمی کے بارے میں سوال کیے گئے جس نے اپنی عورت کو ستاروں کے برابر طلاق دی تو فرمایا: اس نے سنت کی خلاف ورزی کی اور اس کی بیوی اس پر حرام ہوگئی۔ ان روایات کو دار قطنی نے روایت کیا اور منتقی الاخبار میں ان کی نقل کے بعد ابن تیمیہ نے کہا (وهذا كله يدل على اجماعهم على صحته ووقوع الثلاث بالكلمة الواحدة) یہ تمام روایات اس بات پر دال ہیں کہ کلمہ واحدہ سے وقوع طلاق

ثلاثہ پر اجماع ہے۔ یہ صاحب منتقی عبدالسلام بن عبداللہ المعروف ابن تیمیہ ہے جس کو شوکانی الشیخ الامام علامہ عصرہ المجتہد المطلق لکھا ہے (نیل الاوطار صفحہ ۱/۱۳) اور یہ ابن تیمیہ تقی الدین احمد بن عبدالحلیم کا دادا ہے۔

۱۴۔ عن عطاء ان رجلاً قال لابن عباس طلقت امرأتی مائة قال تاخذ ثلاثاً وتدع سبعاً و تسعین. عطاء سے مروی ہے کہ ایک شخص نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے کہا کہ میں نے اپنی عورت کو سو طلاقیں دیدی ہیں تو آپ نے فرمایا کہ تین شمار کر لے اور ستانوے چھوڑ دے (بیہقی صفحہ ۳۳۷)۔

۱۵۔ بیہقی نے ابن عباس سے مروی تمام روائیں بیان کرنے کے بعد فرمایا فهذه روایة سعید بن جبیر، عطاء ابن رباح و مجاهد و عکرمة و عمر بن دینار و مالک بن حارث و محمد بن اباس بن البکیر ورویناه عن معاویه بن ابی عیاش الانصاری کلهم عن ابن عباس انه اجاز الطلاق الثلاث وامضاهن. پس یہ سعید بن جبیر، عطاء ابن رباح اور مجاہد، عکرمہ، عمر بن دینار، مالک بن حارث، محمد بن ایاس بن بکیر اور معاویہ بن ابی عیاش انصاری سے بھی روایت کیا یہ تمام افراد ابن عباس رضی اللہ عنہ سے راوی ہیں کہ انہوں نے تین طلاق کو جائز رکھا اور ان کو نافذ فرمایا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا فتویٰ

(۱۵) واسند عبدالرزاق عن علقمه قال جاء رجل الی ابن مسعود فقال انی طلقت امرأتی تسعاً وتسعین فقال له ابن مسعود ثلاث تبینها وسائرهن عدوان (مرقات صفحہ ۲۹۴) عبدالرزاق نے اپنی سند سے علقمہ سے روایت کی کہ ایک آدمی ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس آیا۔ پس اس نے کہا: بے شک میں نے اپنی عورت کو ننانوے طلاقیں دے دیں تو ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تین طلاقوں سے وہ جدا ہو گئی اور باقی طلاقیں زیادتی ہے۔

(۱۶) وعن مالک بلغه انی رجلا قال بعبدالله ابن عباس انی طلقت امرأتی مائة تطليقة فماذا تسرمی تلی فقال ابن عباس طلقت منک بثلاث وسبع وتسعون اتخذت بها آیات الله هزواً (رواہ فی الموطا مرقاب صفحہ ۲۹۳) امام مالک خود فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نے عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے کہا کہ میں نے اپنی عورت کو سو (۱۰۰) طلاقیں دے دی ہیں۔ پس میرے بارے میں آپکی کیا رائے ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ وہ عورت تجھ سے تین طلاق کے ساتھ مطلقہ ہوگئی اور باقی ستانوے سے تو نے اللہ کی آیتوں سے استھزاء کیا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا فتویٰ

(۱۷) روی وکیع عن الاعمش عن حبیب بن ابی ثابت قال جاء رجل الی علی بن ابی طالب فقال انی طلقت امرأتی الفاً فقال له علیؓ بانت منک بثلاث واقسم سائرهن علی نسائک (مرقات صفحہ ۲۹۵ ایضا فتح القدیر صفحہ ۳/۲۶) وکیع نے اعمش سے انہوں نے حبیب بن ابی ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ ایک آدمی علی بن ابی طالب کے پاس آیا۔ پس عرض کی کہ میں نے اپنی عورت کو ایک ہزار طلاق دی ہیں پس آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ وہ تجھ سے تین طلاق سے بائن ہوگئی اور باقی طلاقیں اپنی باقی عورتوں پر تقسیم کرلے۔

(۱۸) بیہقی نے اپنی سند سے اعمش سے روایت کیا کہ کوفہ میں ایک شیخ یہ کہتا تھا کہ میں نے علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو سنا ہے وہ فرماتے تھے کہ جب آدمی ایک مجلس میں تین طلاقیں دے دے تو وہ ایک طلاق کی طرف لوٹائی جاتی ہے تو میں اس شیخ کے پاس آیا اور اس سے دریافت کیا کہ تو نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کیسے سنا؟ تو اس نے ویسا ہی جواب دیا (ترجمہ ملخصا) تو میں نے اس سے کہا کہ تو نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہاں سنا؟ تو اس نے کہا کہ میں تیرے لیے ایک تحریر

نکالتا ہوں۔ سو اس نے ایک تحریر نکالی جس میں لکھا ہوا تھا (بسم اللہ الرحمن الرحیم. هذا ماسمعت علی بن ابی طالب یقول اذا طلق الرجل امرأته ثلاثاً فی مجلس واحدٍ فقد بانت منه ولاتحل له حتی تنکح زوجا غیره قال قلت ویحک هذا غیر الذی تقول قال الصحیح هوهذا ولکن هؤلارا دونی علی وفی ذالک) (سنن کبری صفحہ ۳۴۰/ ۷) یہ ہے کہ جو میں نے علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے سنا وہ فرماتے تھے جب کوئی شخص اپنی عورت کو ایک مجلس میں تین طلاق دے دے پس تحقیق وہ عورت اس سے جدا ہو جاتی ہے اور اس کے لیے وہ حلال نہیں ہوتی یہاں تک کہ اس کے سوا کسی دوسرے آدمی سے نکاح کرے۔ میں نے اس بوڑھے سے کہا تجھ پر افسوس ہے یہ تحریر تو جو تو کہہ رہا ہے اس کا اُلٹ ہے۔ تو اس بڈھے نے کہا جو صحیح بات ہے وہ تو یہی ہے لیکن ان لوگوں نے مجھے اس کی مخالفت پر لوٹا لیا۔ یوں ہی امام بیہقی نے آخری باب میں دو روایات امام جعفر صادق سے بھی بیان کی ہیں کہ (من طلق ثلاثاً فهو کما قال) اور (من طلق امرأته ثلاثاً بجهالة او علم فقد بانت منه)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا فتویٰ

(۱۹) روی وکیع ایضا عن معاویة ابن ابی یحی قال جاء رجل الی عثمان ابن عفان فقال طلقت امرأتی الفاً فقال بانت منک بثلاث (فتح القدیر صفحہ ۳/۲۶)

ایک آدمی حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی میں نے اپنی عورت کو ہزار طلاق دے دی ہیں آپ نے فرمایا کہ وہ عورت تجھ سے تین طلاق سے بائن ہو گئی۔

حضرت ابن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کا فیصلہ

(۲۰) عن انس لاتحل له حتی تنکح زوجاً غیره قال وکان عمر ابن الخطاب اذا اتی برجل طلق امرأته ثلاثاً اوجع ظهره (طحاوی صفحہ ۲/۳۰) حضرت انس رضی اللہ عنہ

فرماتے ہیں کہ (مطلقہ ثلثہ دفعۃً) اپنے شوہر اول کے لیے حلال نہیں ہے تاوقت یہ کہ دوسرے آدمی سے نکاح نہ کرے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اکٹھی تین طلاق دینے والے کو سزا دیا کرتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما

(۲۱) عن عبداللہ بن عمرو الواحدۃ تبینھا و الثلاث تحرمھا (طحاوی صفحہ ۲/۳۰) عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے (باکرہ کو تین طلاق دینے کے حکم کے بارے میں) کہ وہ ایک طلاق سے بائن ہو جاتی ہے اور تین طلاق اس کو حرام کر دیتی ہیں۔

(۲۲) وعن مالک بلغہٗ ان رجلا قال لعبد اللہ ابن عباس انی طلقت امرأتی مائۃ تطلیقۃً.

دوسرا مسلک:

شیعوں کی معتبر کتابوں میں مذکور ہے طلاقِ ثلاثہ جس میں رجعت کا حق باقی نہ رہے۔ اسی طرح طلاق حالت حیض اور حالت طہر میں طلاق جس میں زوجہ سے صحبت کی ہو باطل ہے اور ایسی طلاق واقع نہیں ہوتی۔ (شرائع الاسلام از نجم الدین جعفر مطبوعہ ایران قسم ثالث فقہ جعفری کی مشہور کتاب)۔ اس کے علاوہ ابن قدامہ مقدسی حنبلی نے اپنی مشہور کتاب المغنی میں لکھا ہے اور اس کو ابو نصر نے بھی حکایت کیا ہے۔ ابن علیہ اور ہشام بن حکم اور شیعہ حضرات اس بات کے قائل ہیں کہ ایسی طلاق واقع نہیں ہوتی شیعوں نے اپنے مسلک کی تائید میں جو دلائل پیش کیے ہیں ان کا رد شمس الائمہ امام سرخسی (متوفی ۴۸۲ ہجری) نے اپنی مشہور کتاب (المبسوط باب الرد علی من قال اذا طلق بغیر سنۃ لایقع) کے تحت لکھا ہے۔ اسی طرح امام کاشانی نے اپنی مشہور تصنیف (بدائع صنائع) (جلد ثالث) میں اور ابن قدامہ نے حنبلی فقہ پر اپنی معروف کتاب

(المغنی) میں اور ابن حزم ظاہری (المتوفی ۴۵۶ ہجری) نے اپنی مشہور کتاب (المحلی) (جلد نمبر ۱۰) میں جمہور امت کے مذہب و مسلک کی تائید کی ہے اور شیعہ کے اس قول کا مدلل رد کیا ہے۔ چوں کہ شیعہ امامیہ فرقہ کے علاوہ تمام اہلِ سنت دیو بندی اور غیر مقلدین اس قول کو مردود اور نا مقبول سمجھتے ہیں اور اس پر کبھی کسی نے عمل نہیں کیا ہے۔اس لیے ہم نے اس مسلک کی تردید کی ضرورت نہیں سمجھی۔اہل علم حضرات عند الضرورۃ کتب مذکورہ بالا کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔

تیسرا مسلک:

جو لوگ بیک وقت تین طلاق دینے کی صورت میں ایک طلاق رجعی ہونے کے قائل ہیں۔ ابن تیمیہ، ابن قیم اور ان کے مقلدین بظاہر اپنے آپ کو غیر مقلد کہتے ہیں۔اپنے دعوے کے ثبوت میں وہ درج ذیل آیات و احادیث سے استدلال کرتے ہیں۔

آیات قرآنی سے استدلال

ان کی پہلی دلیل یہ ہے کہ تین طلاق بیک وقت دینا قرآن کے خلاف ہے۔اس لیے ایسی طلاقوں کو سنت طریقہ کی طرف لوٹایا جائے گا یعنی صرف ایک طلاق کے واقعہ ہونے کا حکم دیا جائے گا۔یہ لوگ اپنے دعوے کے ثبوت میں (**الطلاق مرّتٰن فامساک بمعروف او تسریح باحسان**) (بقرۃ آیت ۲۲۹) اور (**واذا طلقتم النسآء فبلغن اجلھن فامسکوھن بمعروف او سرحوھن بمعروف**) (بقرۃ ۲۳۱) سے استدلال کرتے ہیں۔ان کا طریقہ استدلال یہ ہے کہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے ایسے طریقہ پر طلاق دینے کا حکم فرمایا ہے کہ عدت گزرنے سے پہلے رجوع کا حق باقی رہے اس پر صرف ایک طلاق رجعی ہونے کا حکم دیا جائے گا اور تین طلاق بیک وقت واقع کرنا کتاب اللہ کے خلاف ہے۔قرآن پاک کی مذکورہ آیات سے اس دعویٰ پر استدلال صحیح نہیں چنانچہ اہل ظاہر کے امام ابن حزم نے اس کا کافی جواب دیا ہے جس

کا ماحصل یہ ہے کہ قرآن پاک کی ان آیات میں طلاق کے احسن طریقہ کو بیان فرمایا گیا ہے۔ یہ قرآن پاک کی کسی آیت میں نہیں ہے کہ قرآن تین طلاقوں کے ایک ساتھ دیئے جانے کو غیر نافذ قرار دیتا ہے یا یہ کہ قرآن پاک اگر ایک فعل سے منع کرتا ہے اور وہ فعل کرلیا جائے تو وہ باطل کیوں کر قرار پاسکتا ہے؟ اور اس کا وجود عدم برابر کیسے ہوسکتا ہے قرآن حکیم نے زنا اور چوری سے منع کیا ہے لیکن اگر کوئی شخص ان افعال کا ارتکاب کرے تو کیا یہ کہا جائے گا کہ اس کا یہ فعل بایں معنی باطل ہے کہ اس کا وجود وعدم برابر ہے۔ یا یہ کہ وہ فعل وقوع پذیر ہی نہیں ہوا؟ اسی طرح اذان جمعہ کے وقت خرید وفروخت یا مغصوبہ زمین پر نماز پڑھنے کی صورت ہے۔ یعنی ممنوعہ وقت میں بیع وشراء ممنوع ہے مگر اس فعل مکروہ سے ممنوعہ ہونے کے باوجود نفس بیع منعقد ہوجائے گی۔ اسی طرح غصب کردہ زمین پر نماز پڑھنا منع ہے مگر فرضیت ادا ہوجائے گی۔ ایسے ہی بیک وقت دو طلاق یا تین طلاق یا حیض میں طلاق باوجود ممنوع ہونے کے واقع ہوجائے گی اور محض قرآن پاک میں ان صورتوں کے مذکور نہ ہونے کی بناء پر طلاق کے عدم وقوع یا صرف ایک طلاق واقع ہونے کا قطعی حکم نہیں لگایا جاسکتا۔ چناں چہ امام ابوحنیفہ، علامہ ابن حزم نے (محلی) (جلد عاشر) میں اس مسئلہ پر تقریباً سو بڑھے صفحات پر طویل بحث کی ہے اور بالاخر مذہب شافعی کے مطابق تین طلاق بیک وقت کو ثابت کیا ہے اور غیر مقلدینِ زمانہ جو ابن حزم کے نہایت مداح ہیں اور انہیں ابن تیمیہ اور ابن قیم کے مقابلہ میں ابن حزم کے دلائل اور مسلک کی طرف بھی رجوع کرنا چاہئے۔

(۲) احادیث سے استدلال

بیک وقت تین طلاق کو ایک قرار دینے کے بارے میں مندرجہ ذیل روایات سے استدلال کیا جاتا ہے۔

(ا) حدیث رکانہ عن ابن عباس قال طلق عبدیزید ابو رکانہ و اخوتہ امّ رکانہ! ونکح امراۃ من مزینۃ فجات النبی ﷺ فقالت مایغنی عنی الا کما یغنی عنی

ھذا الشعرہ نشعرہ اخذتھا من لاسھا ففرق بینی وبینہ فاخذت النبی ﷺ حمیۃ فدعا برکانہ واخوتہ ثم قال لجلسائہ اترون فلاناً یشبہ منہ کذاو کذا قالوانعم قال النبی ﷺ لعبد یزید طلقھا ففعل قال راجع امرأتک ام رکانۃ واخوتہ فقال انی طلقتھا ثلاثاً یارسول اللہ قال قد علمت راجعھا وتلا یاایھاالنبی اذا طلقتم النسآء فطلقوھن لعدتھن) قال ابو داؤد وحدیث نافع ابن عجیر و عبداللہ بن علی بن یزید بن رکانہ عن ابیہ عن جدہ ان رکانۃ طلق امرأتہ فردھا الیہ النبی ﷺ اصح لانھم ولدالرجل واھلہ اعلم بہ ان رکانۃ انما طلق امرأتہ بتۃ فجعل النبی ﷺ واحدۃ. ابوداؤداپنی سند کے ساتھ ابن عباس سے روایت کرتے ہیں۔ ابن عباس نے فرمایا عبد یزید نے جورکانہ اوراس کے بہن بھائیوں کا باپ ہے ام رکانہ کوطلاق دی اور قبیلہ مزینہ کی ایک عورت سے نکاح کیا۔تو وہ عورت نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ اوراپنے شوہر کے عنین ہونے کی شکایت کی (یہ عورت کے الفاظ کامفہوم ہے) میرے اورمیرے شوہر میں تفریق کردیں حضور علیہ السلام کواس کی بات سن کر غیرت آئی تو آپ نے رکانہ اوراس کے بھائیوں کو بلایا پھر حاضرین سے فرمایا کیاتم دیکھتے ہو کہ اس کے یہ بیٹے عبد یزید شکل وصورت میں ملتے جلتے ہیں یانہیں تو حاضرین نے عرض کیاہاں!تو نبی ﷺ نے عبد یزید سے فرمایا کہ اس عورت کوطلاق دے دے انہوں نے طلاق دے دی تو حضور ﷺ نے فرمایااپنی پہلی بیوی رکانہ اور اس کے بھائیوں کی ماں سے رجوع کرلوتو اس نے کہا کہ میں اس کوتین طلاق دے چکا ہوں۔تو حضور ﷺ نے فرمایامیں جانتاہوں (یعنی تو نے لفظ بتہ سے طلاق دی ہےاور لفظ بتہ میں ایک اور تین کی نیت ہوسکتی ہے تو نے ایک کی نیت کی ہے جیسا کہ دوسری روایات میں صراحت ہے)اور حضور ﷺ نے آیت پڑھی (اے نبی ﷺ جب تم عورتوں کوطلاق دوتوان کی عدت کے وقت میں طلاق دو) یہ حدیث تین طلاقوں کوایک قراردینے والوں کی بزعم خویش بہت بڑی سند ہے۔اس کا جواب ابوداؤد نے یہ دیا (کہ اس روایت میں ابن جریج نے بعض بنی ابی رافع سے روایت کی ہے

جو کہ مجہول ہیں)۔اور حدیث نافع بن عجیر اور حدیث عبداللہ بن علی بن یزید بن رکانہ عن ابی عن جدہ میں صرف اتنا ہے کہ رکانہ نے اسی عورت کو طلاق دی اور بعض نسخوں میں لفظ بتہ بھی اس کے ساتھ وارد ہے تو نبی کریم ﷺ نے اس عورت کو واپس لوٹا دیا۔ یہ روایت زیادہ صحیح ہے اس لیے کہ آدمی کی اولاد اور اس کے گھر والے اس بات کو زیادہ جانتے ہیں کہ رکانہ نے اپنی عورت کو طلاق بتہ دی تھی (جس میں ایک کی نیت بھی ہو سکتی ہے) تو نبی ﷺ نے اس کو ایک بنا دیا۔ ماحصل یہ ہے کہ حدیث ابن جریج میں طلاق دینے والا عبد یزید والد رکانہ ہے اور نافع بن عجیر اور عبداللہ بن علی کی حدیث یہ واقعہ رکانہ بن عبد یزید کا ہے تو ابوداؤد نے حدیث نافع اور عبداللہ (رضی اللہ عنہما) کو حدیث ابن جریج پر ترجیح دی۔ اس لیے کہ گھر والے دوسروں کی نسبت اپنے گھر کے حالات بہتر جانتے ہیں۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ طلاق دینے والے نے لفظ بتہ سے ایک طلاق دی ہو اور راوی اس کو تین سمجھا ہو چنانچہ بہت سی صحیح روایات میں صرف لفظ بتہ ہی مروی ہے۔ ایضاً چنانچہ نووی شرح مسلم جلد اول میں ہے۔ (ان رکانة طلق ثلاثاً فجعل الرسول ﷺ واحدة) (رواية ضعيفة عن قوم مجهولين) وہ روایت جس میں یہ وارد ہے کہ رکانہ نے تین طلاق دیں تو حضور ﷺ نے اس کو ایک بنا دیا وہ روایت ضعیف ہے اور اس کے بعض راوی مجہول ہیں۔ جیسا کہ ابوداؤد کی روایت میں صراحت ہے کہ (حدثنا ابن جريج اخبرني بعض بني ابي رافع) (یہ بعض مجہول ہیں) اس کے بعد امام نووی نے لکھا ہے صحیح یہی ہے جو ہم نے بیان کیا کہ انہوں نے لفظ بتہ کے ساتھ طلاق دی اور یہ لفظ ایک اور تین کا محتمل ہے۔ اور ہو سکتا ہے کہ اس روایتِ ضعیفہ کے راوی نے بتہ کو ثلاثہ کے معنی میں سمجھ کر اس کو بالمعنی روایت کر دیا ہو اور اس میں وہ غلطی کھا گیا ہو۔ (مسلم مع نووی ۴۷۸) ابن قیم نے حضرت رکانہ کی اس حدیث کو جس کو نافع بن عجیر نے روایت کیا ہے اپنی تنقید کا نشانہ بنایا ہے کہ نافع بن عجیر جیسے مجہول اور غیر معروف راوی کو ابن جریج وغیرہ پر ترجیح دی جا رہی ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ نافع بن عجیر کو مجہول و غیر معروف کہنا خود قائل کی جہالت کی دلیل ہے جبکہ وہ ابوداؤد کے راویوں میں سے ہے اور اس روایت میں منفرد بھی

نہیں اور ابو داؤد نے اس کی روایت کو ابن جریج کی روایت پر ترجیح بھی دی ہے۔ جبکہ اس کے مقابلہ میں بنی ابی رافع صراحۃ مجہول ہیں معلوم نہیں وہ کون ہیں۔ حدیث رکانہ عن نافع بن عجیر کی متعدد طریقوں سے روایت ہے۔ دارقطنی نے امام شافعی کی تین سندوں سے اس کو روایت کیا ہے۔ اس روایت میں بھی البتہ کے الفاظ ہیں۔ اس کے بعد چار سندوں سے عبداللہ بن علی بن یزید بن رکانہ سے روایت کیا ہے ان میں بھی بتہ کے الفاظ ہیں۔ نیز دارقطنی (۳۳/۴) نے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی سند سے روایت شدہ حدیث کو صحیح کیا ہے۔ اور امام قرطبی نے (جامع الاحکام القرآن) میں امام شافعی کی روایت کو واجب القبول قرار دیتے ہوئے لکھا ہے۔ (والشافعی وعمہ وجدہ اھل بیت رکانۃ من بنی عبدالمطلب بن عبدالمناف وھم اعلم بالقصۃ التی عرضت لھم) (احکام القرآن جلد ۳ صفحہ ۱۲۸ تا ۱۳۰) امام شافعی آپکے چچا اور دادا سب مطلبی ہیں اور رکانہ کے اہل بیت سے ہیں اور وہ اپنے گھر میں پیش آنے والے قصہ کو زیادہ جانتے ہیں۔

۲۔ ایضاً مسند امام احمد میں یہ روایت اس طرح ہے انبأنا عن سعد ابن ابراھیم قال انبأنا ابی عن محمد ابن اسحاق قال حدثنی داؤد بن حصین عن عکرمۃ عن ابن عباس انہ قال طلق رکانۃ زوجتہ ثلاثا فی مجلس واحدٍ فحزن علیھا حزناً شدیداً فسال النبی ﷺ کیف طلقتھا ؟ قال طلقتھا ثلاثاً فی مجلس واحد قال انما تلک واحدۃ فراجعھا ان شئت امام احمد سعد بن ابراہیم سے وہ اپنے باپ سے وہ محمد بن اسحٰق سے روایت کرتے ہیں انہوں نے کہا مجھ سے داؤد بن حصین نے حدیث بیان کی انہوں نے عکرمۃ سے انہوں نے ابن عباس (رضی اللہ عنہ) سے روایت کی کہ ابن عباس (رضی اللہ عنہ) نے فرمایا کہ رکانہ نے اپنی بیوی کو تین طلاق ایک مجلس میں دے دیں۔ پھر اس پر سخت غمگین ہوئے تو نبی کریم ﷺ نے اس سے پوچھا کہ تو نے اپنی بیوی کو کیسے طلاق دی ہے؟ تو انہوں نے عرض کیا کہ میں نے ایک مجلس میں تین طلاقیں دی ہیں۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا یہ ایک ہی طلاق ہے چاہتا

ہے تو اس سے رجوع کرلے۔

جواب: اس حدیث کے راویوں پر جرح مفسر ہے۔ اور جرح مفسر تعدیل پر مقدم ہوتی ہے۔

(۱) محمد بن اسحٰق صاحب مغازی کو امام مالک سلیمان تیمی، یحییٰ قطان اور ہشام بن عروہ نے کذاب کہا ہے کہ ان کے یہ اقوال کتب اسماء رجال میں تفصیلاً موجود ہے۔ اگرچہ ذھبی نے سب قیل و قال کے بعد اس کو حسن الحدیث صالح الحال صدوق قرار دیا ہے۔ لیکن با ایں ہمہ متکلم فیہ تھے اور ضعفا سے اس کی تدلیس معروف ہے۔ اور ابن قیم کا یہ کہنا کہ (قد زالت علة تدليس محمد بن اسحاق بقوله حدثنى داؤد بن حصين. مافی یسر ابن اسحاق کا اخبرنی اور حدثنی کہنا امام احمد کے نزدیک اس کی ثقاہت کی دلیل نہیں چناں چہ میزان میں ہے فقال احمد هو كثير التدليس جداً قيل له فاذا قال اخبرنى وحدثنى فهو ثقة؟ قال هو يقول اخبرنى ويخالف فقيل له ارواه عنه يحيىٰ بن سعيد؟ قال لا ...... وقال ابو داؤد الطيالسى حدثنى بعض اصحابنا قال سمعت ابن اسحق يقول حدثنى ثقه فقيل له من؟ قال يعقوب اليهودى)[۱] (میزان ترجمہ محمد بن اسحٰق)

علاوہ ازیں میزان الاعتدال میں سند امام احمد کی روایت میں (عن ابن اسحق حدثنى داؤد بن حصين) نہیں ہے بلکہ عن ابن اسحٰق عن داؤد بن حصین عن عکرمہ عن ابن عباس (فقد اتى بعنعنة معنعنة المدلس مردودة بالاتفاق) نیز اگر کسی نسخہ پر حدثنی داؤد بھی ہو تو اس سے علت تدلیس رفع نہیں ہوتی ہے۔ کیوں کہ داؤد بن الحصین کے بعد پھر بھی عن عکرمۃ ہے اور مدلس کبھی فوق از شیخ کو نیز ساقط کرتا ہے تو معنعن مدلس کا مظنہ مرتفع نہ ہوا۔

(قال السيد السند فى رسالته ربما لم يسقط بعد لمدلس ولكن يسقط من بعده رجلاً ضعيفاً او صغيرا انتهى) اسی طرح تقریب نووی میں ہے۔ وربما لم يسقط شيخه او اسقط غيرهٔ ضعيفاً اور صغيرا تحسيناً للحديث (تقريب مع التدريب صفحہ ۱۴۴)

داؤد بن حصین کے بارے میں سفیان بن عینیہ نے کہا ہے (کنا نتقی حدیثہ) (ہم اس کی حدیث سے بچتے ہیں) اور علی بن مدنی نے کہا ہے (ما رواہ عن عکرمۃ فمنکرۃ) ابو داؤد نے کہا ہے (احادیث عن عکرمۃ مناکیر) اور یہ روایت اس نے عکرمہ ہی سے بیان کی ہے۔ مع ھذا ہم کہتے ہیں امام بیہقی نے فرمایا کہ رکانہ کے لفظ ثلاثہ سے طلاق دینے کے متعلق یہ سندیں اس قابل نہیں ہیں کہ ان سے استدلال کیا جائے کیوں کہ ان کے مقابلہ میں آٹھ راوی ایسے ہیں جنہوں نے ابن عباس سے ان کی روایت کے خلاف ان کا تین طلاق واقع ہونے کا فتویٰ اور مسلک بیان کیا ہے۔ (بیہقی سنن کبریٰ ۷/۳۳۹)

فائدہ:

اکثر محدثین مثل یحییٰ بن معین اور یحییٰ بن سعید قطان اور امام احمد بن حنبل اور ابن المدینی کا مسلک ہے کہ جب راوی حدیث صحابی کا مذہب اس روایت کے خلاف ہو تو وہ حدیث ضعیف ہوتی ہے۔ پس یہ حدیث کس طرح صحیح ہوگی جب کہ یہ صرف مذہب ابن عباس اور ان کے فتوی ہی کے خلاف نہیں بلکہ عامہ صحابہ اور تابعین کے مذہب کے بھی مخالف ہے۔ بلکہ اس بات میں رسول اللہ ﷺ سے جو احادیث صحیح مروی ہیں ان کے بھی خلاف ہے۔ اور یہی جواب روایات طاؤس عن ابن عباس کا ہے۔ ابن قیم جوزی نے (اعلام الموقعین) میں حدیث طاؤس سے دفاع کرتے ہوئے اجلہ محدثین اور ائمہ مجتہدین پر جس سوئے ظن کا اظہار کیا ہے ان حضرات کا مقام اس سے نہایت بلند ہے۔ سوئے ظن تو عام مسلمانوں کے خلاف بھی ممنوع ہے۔

ایضاً:

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ حضرت ابن عباسؓ جیسے فقیہ اور مجتہد ایک ہی واقعہ کو بیان کرنے میں ایک دوسرے کے منافی اور متضاد عبارات کیسے اختیار کر سکتے ہیں بلکہ حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے۔ یہ عبارت عکرمہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت میں عکرمہ کی اپنی ہے جس کو انہوں نے

اپنے نظریہ کے مطابق مختلف انداز میں بیان کیا ہے۔ چناں چہ ابوداؤد جلد اول میں اسماعیل بن ابراہیم عن ایوب کے واسطے سے اس کا قولِ عکرمہ ہونا نقل کیا ہے۔ (رواہ اسمعیل بن ابراھیم عن ایوب عن عکرمہ ھذا قولہ لم یذکر ابن عباس وجعلہٗ قول عکرمہ) (عن بذل المجھود جز عاشر) امام جصاص رازی نے حدیث داؤد بن الحصین عن عکرمۃ اور اسی طرح حدیث طاؤس کو جو آگے آرہی ہے منکر قرار دیا ہے۔ (صفحہ ۴۵۹، جلد۱) اور ہم اس لیے ذکر کر چکے ہیں زادالمعاد میں ابن قیم نے خود اس روایات کو بوجہ اضطراب ضعیف مانا ہے اور ترمذی اور بخاری کا سہارا لیا ہے۔

۳۔ ایضاً:

عن الذبیر قال سالت ابن عمر عن رجل طلق امراتہٗ ثلاثاً وھی حائض فقال لی اتعرف ابن عمرؓ قلت نعم قال طلقت امراتی ثلاثاً علی عھد رسول اللہ ﷺ (وھی حائض) فردھا رسول اللہ ﷺ الی السنۃ (سنن الدار قطنی) زبیر سے مروی ہے انہوں نے کہا میں نے ابن عمر رضی اللہ عنہ سے اس شخص کے متعلق سوال کیا جو اپنی زوجہ کو حیض کی حالت میں تین طلاقیں دے دے ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم ابن عمر کو جانتے ہو؟ میں نے کہا ہاں! فرمایا: میں نے اپنی زوجہ کو رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں تین طلاقیں دے دیں اس وقت وہ حائضہ تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے اس تین طلاق کو سنت طریقہ کی طرف لوٹا دیا تھا۔ مندرجہ بالا حدیث کے متعلق علامہ قرطبی نے اپنی مشہور تفسیر الجامع الاحکام القرآن میں لکھا کہ اس روایت کے متعلق خود دار قطنی نے فرمایا ہے کہ اس روایت کی سند کہ تمام راوی شیعہ ہیں۔ در حقیقت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی محفوظ روایت وہی ہے جس میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کا اپنی زوجہ کو حیض کی حالت میں ایک طلاقِ رجعی دینا مذکور ہے۔ جس پر اکثر آئمہ اور محدثین کا اتفاق ہے۔

۴۔ حدیث طاؤس جو کہ اپنی تین سندوں سے صحیح مسلم میں مذکور ہے عن ابن طاؤس عن ابیہ

عن ابن عباس قال کان الطلاق علی عهد رسول اللہ ﷺ وابی بکر و ثنیتن من خلافت عمر طلاق الثلاث واحدۃً فقال عمر ابن الخطاب ان الناس قد استعجلو فی امرٍ کانت لھم فیہ اناۃٌ فلو امضیناء علیھم فامضاہ علیم (ترجمہ) ابن طاؤس اپنے باپ سے اور وہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کہ عہد مبارک اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت کے دو سال تک تین طلاقیں ایک تھیں (تین کو ایک سمجھا جاتا تھا یا تین کا کام ایک سے لیا جاتا تھا) تو حضرت عمر ابن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ لوگوں نے ایسے کام میں جلدی کی جس میں ان کے لیے مہلت تھی۔ پس اگر ہم اس کو ان پر نافذ کردیں (تو کوئی حرج نہیں) پس آپ نے اس کو ان پر نافذ کردیا (رواہ مسلم، احمد بحوالہ نیل الاوطار)

۵۔ ابن طاؤس عن ابیہ ان ابا صھباء قال ابن عباس اتعلم انما کانت الثلاث تجعل واحدۃً علی عهد النبی ﷺ وابی بکر و ثلاثہ من امارۃ عمر قال ابن عباس نعم اس روایت میں طاؤس نے ابوصہبا سے روایت کی اور انہوں نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اور اس روایت میں امارۃ عمر دو کی بجائے تین سال مذکور ہیں۔

۶۔ عن طاؤس ان ابا صھبا قال لابن عباس ھات من ھناتک الم یکن الطلاق علی عهد رسول اللہ ﷺ و ابی بکر واحدۃً فقال قد کان ذالک فلما کان فی عهد عمر تتابع الناس فی الطلاق فاجازہ علیھم (ترجمہ) طاؤس سے مروی ہے کہ ابو صہبا نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے کہا اپنی عجیب وغریب باتیں بیان کرو کیا رسول اللہ ﷺ اور ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد میں تین طلاق ایک نہیں تھیں؟ تو ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا ایسا ہی تھا۔ پس جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا زمانہ آیا تو لوگوں نے پے در پے طلاقیں دینی شروع کردیں۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو ان پر نافذ کردیا۔

بعض الفاظ مشکلہ کی شرح:

(اناۃ بفتح الھمزہ الی مھلۃ = تتایع الناس فی الطلاق جمہور کی روایت یہی ہے اور بعض نے اس لفظ کو باء کے ساتھ تتابع ضبط کیا ہے۔ اور وہ دونوں ایک معنی میں ہیں۔ یعنی اکثر منہ واسرعوا الیہ اس کا ترجمہ ہم نے پے درپے سے کیا ہے۔ ہاں! یاء کے ساتھ ہو تو یہ لفظ شر میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اور باء کیساتھ ہو تو خیر و شر میں اور اس جگہ یاء سے زیادہ موزوں ہے۔ واللہ اعلم

ھات من ھناتک : ھات اسمائے افعال سے ہے۔ الایہ۔ اور ھناۃ سے مراد اخبار اور امور مستغربہ ہیں کذا قال (مہ النووی فی شرح ھذا الحدیث واللہ اعلم)

ان روایات کے عینی، مظہری، فتح الباری، نووی اور احکام القرآن وغیرہ میں متعدد جوابات دیئے گئے ہیں۔ جن میں سے بعض کا ہم بقدر کفایت ذکر کرتے ہیں۔

ا۔ ابو صہبا کی حدیث سے مطلق طور پر یہ بات کا ظاہر ہوتی ہے۔ کہ حضور پُر نور سید عالم ﷺ کے عہد مبارک اور حضرت صدیق اکبر کے دور خلافت اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ابتدائی دور میں لوگ تین طلاق دیا کرتے تھے۔ اور یہ طلاقیں ایک طلاق کے حکم میں شمار ہوتی تھیں۔ الفاظ حدیث سے یہ بات واضح نہیں ہوئی کہ تین طلاق کو ایک طلاق قرار دینے کا حکم مدخولہ کے بارے میں تھا یا غیر مدخولہ کے بارے میں جہاں تک غیر مدخول بھا کا تعلق ہے بلا شک ایک طلاق اس کے لیے کافی ہے اگر انت طالق طالق طالق } کے ساتھ طلاق دی گئی ہو۔ کیوں کہ پہلی طلاق سے ہی وہ بائن ہوگئی۔ اور محل طلاق نہ رہی۔ کیونکہ اس پر عدت واجب نہیں ہے۔ اور دوسری صورت میں اگر کسی نے اپنی مدخول بھا کو اس طرح کہا کی (انتِ طالق انتِ طالق انتِ طالق) تو حضور علیہ السلام کے زمانے میں اس صورت میں پہلی طلاق سے طلاق اور دوسری اور تیسری طلاقوں سے تاکید مقصود تھی نئے سرے سے طلاق دینا مقصود نہیں تھا۔ اس لیے اس کو طلاق کے حکم میں داخل کیا جاتا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں اس طرح تین طلاقیں بنیت استیناف

دی جانے لگیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان تینوں کے نفاذ کا حکم دے دیا۔ اور فرمایا کہ لوگوں کے لیے طلاق دینے میں مہلت تھی مگر انہوں نے جلدی کی اور پے در پے طلاقیں دینی شروع کر دیں۔ اسلیے ہم نے ان کو نافذ کر دیا۔ اس صورت میں اس مسئلے کا اختلاف لوگوں کی عادت کے بدل جانے کی وجہ سے ہوا۔ اس مسئلے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی اسی لیے امام قرطبی رضی اللہ عنہ وغیرہ نے فرمایا فحدیث ابن عباس اذا اخبارٌ عن اختلاف عادةِ الناس لا عن تغیر الحکم فی المسئلہ (صفحہ ۲۸ تا ۳۰ / ۳) اور اسی کے قریب نووی شرح مسلم میں ہے۔

۲۔ اس روایت میں تُجعَلُ الثلاث واحدۃ جس کے بظاہر یہ معنی ہیں کہ تین طلاقیں ایک کردی جاتی تھیں۔ جس سے مفہوم نکال لیا گیا کہ تین طلاقیں ایک دم تین نہ ہوں گی بلکہ ایک ہو گی۔ یہ مفہوم مخالف ہے کہ اس میں تاکید وغیر تاکید کا احتمال ہے۔ مگر چوں کہ سید عالم ﷺ اور دورِ صدیقی اور اوائل خلافت فاروقی رضی اللہ عنہ میں تاکید زیادہ رائج تھی اسلیے اس پر عمل کیا گیا ہے۔ اور حضرت فاروق اعظم کے ابتدائی دَور کے بعد تاکید کا رواج ختم ہو گیا اور لوگوں کا عرف بدل گیا یعنی لوگ اس طرح تین طلاق دینے کو تاکید نہیں سمجھتے تھے بلکہ تاسیس یعنی معنی جدید سمجھتے تھے۔ یعنی تین طلاقوں کو تین ہی سمجھنے لگے لہٰذا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس جدید معنی میں تین کو تین ہی سمجھا اور کسی صحابی رضی اللہ عنہ نے اس پر انکار نہیں کیا۔ اور یہ بھی صرف وہ صورت ہے جس میں تین طلاق الگ الگ دی جائیں اور اگر ایک ہی جملہ سے تین طلاق دی جائیں مثلاً کوئی یوں کہے کہ میری عورت کو تین طلاق ہے تو اس میں تاکید کا کوئی احتمال ہی نہیں اور مدخولہ یا غیر مدخولہ ہر دو کو اس صورت میں تین طلاق واقع ہو جائیں گی۔

۳۔ تیسرا جواب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ (تجعل الثلاث واحدۃ) کے معنی یہ ہیں۔ کہ پہلے زمانے میں تین کی بجائے ایک طلاق ہوتی تھی یعنی لوگ اس زمانے میں صرف ایک ہی طلاق دیا کرتے تھے۔ اس معنی کی تاکید حدیث کے ان الفاظ سے ہوتی ہے۔ فقال عمر ابن الخطابؓ ان الناس قد استعجلوا فی امرٍ قد کانت لھم فیہ اناۃ کیوں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ

فرمانا کہ لوگ اس امر میں عجلت کرنے لگے جس میں ان کے لیے مہلت اور تاخیر تھی یہ اس امر پر دال ہوا کہ پہلے لوگ طلاق میں تاخیر سے کام لیتے تھے۔ یعنی یک لخت تین طلاقیں نہیں دیتے تھے اور بعد میں لوگوں نے جلدی کی اور تین طلاقیں دینے لگے اسی معنی کی تائید دوسری روایت کے ان لفظوں سے بھی ہوتی ہے (فلما کان فی عهد عمر تتابع الناس فی الطلاق) اور بعض نسخوں میں تتایع ہے۔ یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں لوگ پے در پے (یعنی ایک ہی مجلس میں) یکے بعد دیگرے (دینے لگے) لہٰذا چوں کہ عرف بدل گیا اسلیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تین طلاقیں نافذ کر دیں۔ حدیث کے اس معنی کی تائید میں قرآن پاک کی ایک آیت کا یہ حصہ پیش کیا جا سکتا ہے (اجعل الالهة الهاً واحداً) (یعنی کیا اس نے تمام خداؤں کی بجائے ایک خدا کر دیا) اس آیت کا مفہوم یہی لیا جائیگا کہ سب خداؤں کی بجائے ایک خدا کو ماننے کا حکم دیا نہ کہ سب خداؤں کو ملا کر ایک خدا کر دیا گیا۔ اسی طرح حدیث میں (تجعل الثلاث واحدۃ)} کے قریب ترین معنی یہ لیے جائیں گے کہ تین طلاق کے بجائے ایک طلاق دی جاتی تھی نہ کہ تین طلاقیں ملا کر دی جاتی تھیں اور وہ ایک کر دی جاتی تھیں۔ حاصل کلام یہ ہوا کہ حضور سید عالم ﷺ کے دورِ مبارک میں لوگ بالعموم ایک طلاق دیا کرتے تھے اسی طرح حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دور میں بھی پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ابتدائی دورِ خلافت کے بعد لوگوں میں بالعموم پے در پے تین طلاق دینے کا رواج ہو گیا جنہیں حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے نافذ کر دیا۔

۴۔ امام جصاص رازی نے اس روایت کے بارے میں فرمایا کہ یہ منکر ہے۔ اسی طرح ابن عبد البر نے روایت طاؤس کو وہم اور غلط سے تعبیر کیا (ضوابط المصلحت بحوالہ قرطبی) نیز جناب طاؤس کے بارے میں امام جصاص رازی نے فرمایا فکان کثیر الخطاء مع جلد لته و فضله و صلاحه یروی اشیاء منکرةً منها انه روی عن ابن عباس انه قال من طلق ثلاثاً کانت واحدةً وقد روی من غیر وجه عن ابن عباس ان من طلق امرأته عدد النجوم بانت منه بثلاث (ترجمہ) (اور طاؤس اپنی بزرگی اور فضل و صلاح کے باوجود بہت

غلطیاں کرنے والے تھے اور کئی منکر چیزیں انہوں نے روایت کی ہیں۔ان میں سے روایت ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جو شخص اپنی عورت کو تین طلاق دے وہ ایک ہی ہوگی حالاں کہ ابن عباس سے کئی طریقوں سے مروی ہے کہ جو شخص اپنی عورت کو ستاروں کی تعداد کے مطابق طلاق دیدے وہ اس سے تین طلاق سے بائن ہو جائے گی)اس طرح ایوب طاؤس کی کثرت خطاء پر تعجب کرتے تھے اور ابن ابی نجیح نے طاؤس کے بارے میں ذکر کیا کہ اس نے کہا خلع طلاق نہیں ہے۔تو اہل مکہ نے اس پر انکار کیا تو اس نے کچھ لوگوں کو جمع کیا اور ان سے معذرت کی اور کہا کہ میں نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایسا سنا ہے۔(احکام القرآن ۱/۴۶۸)

تین طلاق بیک وقت دیئے جانے کی صورت میں صرف ایک طلاق رجعی واقعی ہونے کے ثبوت میں دیئے گئے دلائل کا تفصیلی جواب۔

۱۔ تین طلاق کو حرام اور معصیت کہنا خود اس امر کا ثبوت ہے کہ مجموعی طور تین طلاقیں واقع نہیں ہونی چاہیے۔

جواب: یہ ایک قیاسی دلیل ہے۔جس کی بناء اس بات پر ہے کہ تین طلاق جمع کرنا حرام اور بدعت ہے۔اور بدعت مردود ہے کیوں کہ یہ رسول اللہ ﷺ کے حکم کے خلاف ہے اس لیے مجموعی طور پر تین طلاق واقع نہیں ہونی چاہیے۔ابن قیم اور اتباع کی یہ دلیل خود ان کے اپنے مسلک کے خلاف ہے اس لیے کہ اگر تین طلاق بیک وقت دینا بوجہ بدعت ہونے کے مردود ہے تو چاہیے کہ اس صورت میں ایک طلاق بھی واقع نہ ہو حالاں کہ یہ لوگ ایک طلاق کے وقوع کے قائل ہیں دراصل ایقاع طلاق اور وقوع طلاق میں فرق ہے۔ایقاع ممنوع ہے اور وقوع ہو جائے گا اس کی مثالیں پہلے گزر چکی ہیں۔

۲۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ کا فتوی روایت کے مقابلے میں رد کیا جائے گا کیوں کہ صحابی غیر معصوم ہوتا ہے یہ بات محدثین کہ نزدیک مسلمہ ہے کہ جب صحابی کا کوئی قول ایسا ہو کہ

شارع علیہ السلام کے سوا کوئی دوسرا ان کو نہیں کہہ سکتا خواہ صحابی اس کو حضور علیہ السلام کی طرف منسوب نہ کرے مگر وہ رسول اللہ ﷺ کا قول تصور کیا جائیگا اصول حدیث کا مشہور قاعدہ ہے (**قول الصحابی فیما لا یعقل فی حکم المرفوع**) یہ مسئلہ شوہر پر بیوی کے حرام یا حلال قرار دینے کی صورت ہے جس کا حق رسول اللہ ﷺ کے سوا کسی شخص کو نہیں پہنچتا۔

جواب: اس اصول کا طلاق بعض ان صورتوں میں تو ہوسکتا ہے جہاں راوی روایت کرنے کے بعد روایت کے خلاف رائے یا عمل میں منفرد ہو یا معدودے چند افراد نے اس کا ساتھ دیا ہو لیکن جب تمام فقہا صحابہ اس کے ساتھ ہوں تو ایسی صورت میں روایت متروک قرار دی جائے گی کیوں کہ جمہور صحابہ کا روایت کے خلاف عمل کرنا اس بات کی دلیل ہوگا کہ وہ روایت ان کی نظر میں ضعیف یا نا قابل احتجاج قرار پا گئی ہے۔ اور اس کے مقابلہ میں ان کے پاس کوئی دوسری روایت یا اس روایت کی حقیقت اس طرح واضح ہوگی۔ جس طرح ہم نے رکانہ اور طاؤس کی روایات پر پہلے مکمل تبصرہ کیا ہے۔ اور یہ بھی ہم لکھ چکے ہیں کہ یہ روایت نہ صرف ابن عباس رضی اللہ عنہ کے فتوے کے خلاف ہے بلکہ فقہائے صحابہ اور خود احادیث رسول اللہ ﷺ کے بھی خلاف ہے۔ اصول فقہ میں یہ بات طے شدہ ہے چناں چہ حسامی میں ہے۔ **یسقط العمل بالحدیث اذا ظھر مخالفة قولاً او عملاً من الراوی بعد الروایة او من غیرہ من ائمة الصحابة والحدیث ظاھر لا یتحمل ارخفاء علیھم ویحمل علی الانتساخ نحوہ فی نور الانوار.**

۳۔ ابن قیم نے اپنے دعوے کے ثبوت میں قرآن پاک کی آیت (**الطلاق مرّتٰن**) کو بطور دلیل پیش کرتے ہوئے ایک ہی کلمے سے تین دفعہ دی ہوئی طلاق کے ایک ساتھ واقع نہ ہونے کے ثبوت میں شہادت لعان زنا اور تسامت والے واقعہ سے استدلال کیا ہے۔

جواب: (الطلاق مرتٰن) کی صحیح تفسیر ہم پہلے لکھ چکے ہیں اور شہادت لعان وغیرہ سے استدلال کا جواب یہ ہے کہ فاعل کبھی ایک شی کو متعدد اوقات میں یکے بعد دیگرے عدم سے وجود میں لاتا ہے۔ اور کبھی ایک ہی وقت میں چند اشیاء کو وجود میں لے آتا ہے۔ مثلاً ایک صورت یہ کہ ایک شخص دوسرے آدمی کو ایک روپیہ دیتے ہوئے کہے میں تمہیں ایک روپیہ دیتا ہوں دوسرے وقت دوسرا روپیہ دیتے ہوئے بھی یہی الفاظ ادا کرے کہ میں تمہیں ایک روپیہ دیتا ہوں۔ اور تیسرے وقت تیسرا روپیہ بھی دیتے ہوئے بھی یہی الفاظ ادا کرے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ایک ہی وقت میں یہ تین روپے جمع کرتے ہوئے کہے کہ میں تمہیں تین روپے دیتا ہوں پہلی صورت میں فعل اور مفعول متعدد ہے۔ اور دوسری صورت میں فعل تو ایک ہے لیکن اس فعل سے جو اشیاء وجود میں آئی ہیں وہ متعدد ہیں۔ فعل کے ایک ہونے سے اشیاء یعنی روپے کا بھی ایک ہونا لازم نہیں ہوتا شوہر شریعت کی جانب سے تین طلاق کا مالک ہے وہ اپنے فعل سے ان طلاقوں کو علیحدہ علیحدہ متفرق اوقات میں عدم سے وجود میں لاسکتا ہے۔ اور اسی طرح بھی کرسکتا ہے کہ ایک وقت میں دو یا تین کو جمع کر کے وجود میں لے آئے جیسا کہ ایک شخص کو جو تین روپے کا مالک ہے اس کو حق ہے کہ وہ کسی دوسرے شخص کو متفرق اوقات میں ایک ایک کر کے دے یا ایک ہی وقت میں تین مجموعی طور پر دے دے فرق صرف اس قدر ہوگا کہ پہلی صورت میں روپے کی تعداد میں کہ دینے کی تعداد بھی تھی جب کہ دوسری صورت میں اگر چہ دینے کا فعل ایک ہوگا لیکن اس فعل سے صادر ہونے والی اشیاء تین ہونگی یہ کیونکر ممکن ہے کہ محض ایک مرتبہ دینے کے فعل سے روپے کی تعداد میں کمی ہو جائے یا وہ تین سے گھٹ کر ایک رہ جائے بلکہ اس کی تعداد وہی رہے گی جس تعداد میں وہ شیئے دی جارہی ہے چناں چہ اگر کوئی شخص کہے تجھے طلاق تو اس سے ایک طلاق واقع ہوگی اور اگر کوئی کہے تجھے دو طلاق تو دو طلاقیں واقع ہونگی اور

اگر کہے تین طلاق تو تین طلاقیں ہی واقع ہونگی۔ دوسری مثال: ایک شخص دوسرے کو تین روپے کا مالک بنا کر کہے کہ تین روپے آپ کسی مسکین کو دے سکتے ہیں لیکن بہتر یہ ہوگا کہ آپ ان تینوں روپوں کو تین متفرق اوقات میں ایک ایک کر کے دیں لیکن دوسرا شخص تین روپوں (کی بناء پر بیک وقت ایک ساتھ ہی (ایک وقت میں) کسی مسکین کو دے دیتا ہے تو کیا یہ کہا جائیگا کہ اس نے ایک روپیہ دیا؟ ظاہر ہے کہ اس نے تین روپے دیئے البتہ اس نے پہلے شخص کے کہنے کے مستحن طریقہ کے خلاف عمل کیا لیکن اس خلاف عمل سے روپے دینے کہ اثر فعل میں روپے کی تعداد کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں آیگا۔ اس مثال کو ذہن میں رکھتے ہوئے اگر (الطلاق مرتٰن) والی آیت پر آخر تک غور کیا جائے تو اس آیت سے جو بات واضح ہوگی وہ یہی ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے اس ارشاد میں مرد کو تین طلاق کا مالک قرار دیتے ہوئے نہائش کی ہے۔ کہ ان تین طلاق کے حق کو استعمال کرنے کا یہ احسن طریقہ ہے۔ (جیسا کہ آیت کی تفسیر میں پہلے بیان ہو چکا) اس سے یہ سمجھنا کہ اس احسن طریقہ کے خلاف اس شخص کو اپنی ملکیت تعداد طلاق میں تصرف کرنا طلاق کو عدم سے وجود میں نہ لائے گا (کما قالۃ الرافضۃ) یا صرف ایک ہی طلاق وجود میں آئیگی (جیسا کہ غیر مقلدین کا قول) صحیح نہ ہوگا اگرچہ تین طلاق کا ایک ساتھ واقع کرنا ممنوع ہے (عند الحنفیہ) لیکن یہ ممانعت اس طلاق کے معتبر یا نافذ ہونے سے منع نہیں کرتی (مجموعہ قوانین اسلام) اور حکیم الامت مفتی احمد یار خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ طلاق کو لعان کی گواہیوں اور رمی کے پتھروں اور درود شریف پر قیاس کرنا بالکل غلط ہے۔ کیوں کہ وہاں فعل مقصود نہ کہ فعل کا اثر لعان کی ہر قسم ایک گواہ کے قائم مقائم ہے جب زنا میں گواہیاں چار چاہیے تو اس کا قائم مقائم یعنی قسمیں بھی چار ہی ہوں۔ ایسے جمروں کے پتھر میں سنت کی پیروی ہے چوں کہ حضور علیہ السلام نے ایک ایک کر کے سات بار مارے ہیں تو چاہیے کہ ہم بھی

ایسے ہی ماریں اور درود شریف میں ثواب بقدر محنت ملتا ہے ہزار بار درود پڑھنے میں زیادہ محنت ہے اور ایک دفعہ (اللهم صلى على سيدنا محمد الف مرة)} کہہ دینے میں اتنی محنت نہیں لہٰذا ان کا اثر بھی مختلف اور طلاق میں فعل مقصود نہیں اور نہ اس پر کوئی ثواب ہے۔ پھر اسے ان مسئلوں پر قیاس کیوں کرتے ہو؟ (نعیمی)

۴۔ ابن قیم اور اس کے اتباع کا یہ پرزور مطالبہ ہے کہ روایت طاؤس کا جس روایت سے منسوخ ہونا بیان کیا جاتا ہے وہ روایت کہاں ہے؟

جواب: ہم کہتے ہیں اگرچہ ہمارے علم میں صراحۃً کوئی ایسی روایت نہیں جو بالخصوص حدیث طاؤس کو منسوخ کرتی ہو لیکن اس کے مقابلے میں حضرت عویمر اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ والی احادیث مع فیصلہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ ورفقہائے صحابہ پیش کی جاسکتی ہیں۔ عین ممکن ہے کہ رکانہ والی حدیث حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے ثلاثہ کے حرف سے یوں ہی ہو اور بعد ازاں آپ کو یہ علم ہوا یہ کہ رکانہ نے بتہ کے لفظ سے طلاق دی تھی اس لیے رکانہ والی حدیث جس کو عکرمہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا تھا خود حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اس موقع پر اپنی موجودگی یا حضور سے سماعت کا ذکر نہیں کیا۔ یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی عمر شریف حضور علیہ الصلوۃ والسلام کے وصال کے وقت صرف تیرہ سال بیان کی جاتی ہے۔

۵۔ ابن قیم اور اتباع کی یہ دلیل کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد میں اس مسئلہ پر اجماع ہو چکا تھا لہٰذا اس اجماع کی خلاف ورزی صحیح نہیں۔

جواب: ہم کہتے ہیں کہ اولاً تو یہ اجماع ثابت ہی نہیں اگر بالفرض تصور کر لیا جائے تو کیا یہ کہنا صحیح نہ ہوگا؟ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جو اجماع منعقد ہوا تھا اس نے پہلے اجماع کو منسوخ کر دیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد سے جو اجماع ثابت

ہے۔وہ آج بھی اسی طرح قائم ہے جس طرح آپ کے زمانے میں تھا بناء بریں امت مسلمہ کے لیے آج بھی واجب الاتباع ہے۔کہ تین طلاقیں ایک ساتھ دینے سے ایک نہیں بلکہ تین ہی واقع ہوتی ہیں۔

۵۔ جب تین طلاق کو ایک قرار دیا جانا حدیث مرفوع سے ثابت ہے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ یا دوسرے صحابہ کے قول یا اجماع کو قول مصطفیٰ ﷺ پر کیسے ترجیح دی جاسکتی ہے!

جواب: ہم کہتے ہیں کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے فیصلے پر صحابہ کا اجماع اس بات پر دلیل ہے کہ صحابہ کے پاس یقیناً کوئی ناسخ ہوگا ہم اجماع کو ناسخ نہیں مان رہے ہیں ۔بلکہ یوں کہتے ہیں کہ اجماع دال علی النسخ ہے یا ان روایات میں وہ توجیہات کی جائیں گی جو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔شوکانی کا نیل الاوطار میں یہ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ کہنا (این یقع المسکین من رسول اللہ ﷺ ثم ای مسلم من المسلمین یستحسن عقلہ وعلمہ ترجیح قول صحابی علی قول المصطفی ﷺ) عمر اور اور صحابہ رضی اللہ عنہ پر خواہ مخواہ ناپاک حملہ ہے کیا کوئی مسلمان یہ گمان کرسکتا ہے کہ صحابہ رسول ﷺ کے کسی صریح غیر منسوخ قول کے خلاف اجماع کرسکتے ہیں؟ دراصل اس مسئلہ طلاق ثلاثہ کی صورت بالکل مسئلہ متع کی طرح ہے جیسا کہ حدیث جابر رضی اللہ عنہ میں متع کے بارے میں یہ حدیث مروی ہے (عن جابر قال کنا نستمتع بالقبضة من الدقيق والتمر الايام على عهد رسول الله ﷺ و ابى بكر صدراً من خلافة عمر حتىٰ نهانا عنه عمر) (مسلم) (نیل الاوطار صفحہ ۱۴۸ / ۶ السادس) یہ روایت بالکل اسی طرح مرفوع حکمی ہے جیسے روایت طاؤس اور اس کا جواب نووی وغیرہ بلکہ خود شوکانی نے یہ دیا ہے قد اجيب عن حديث جابر هذا بانهم فعلوا ذالك فى زمن رسول الله ﷺ ثم لم يبلغ النسخ

حتی نهٰی عنها عمر جیسا متعہ کے بارے میں حضور ﷺ کے زمانے میں اور ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے اوائل میں یہ کام ہوتا رہا پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو منع کر دیا اور تمام صحابہ نے اس پر اتفاق کر لیا گویا کہ ان کو پہلے اس کا ناسخ نہیں پہنچا تھا۔ متعہ کے بارے میں اس حدیث جابر رضی اللہ عنہ کا جو جواب شوکانی اور ابن قیم وغیرہ دیتے ہیں وہی جواب طلاق ثلاثہ کے نفاذ کے بارے میں ہم دے سکتے ہیں۔ اور یہ نہیں کہا جائیگا کہ معاذ اللہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ایک غلط کام پر اجماع رہا بلکہ حقیقت الامر یہ ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کا دور مختصر تھا اور اہم جنگی مہمات میں مصروفیات کی وجہ سے ان مسائل پر تحقیقی توجہ دینے کا موقع نہ ملا اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ابتدائی دور میں پھر جب کچھ سکون ہوا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تحقیق و تفتیش کے بعد یہ فیصلے کیے اور کسی صحابی نے اس پر انکار نہ فرمایا۔

ما حصل یہ ہوا کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ناسخ معلوم نہیں ہوا تھا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ناسخ پہنچ گیا ورنہ وہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ جن کی رائے کے مطابق بعض مرتبہ وحی بھی نازل ہوئی قول مصطفیٰ ﷺ کی مخالفت نہیں کر سکتے تھے۔

۶۔ بعض روایات میں یہ آیا ہے کہ بیک وقت تین طلاق دینے والوں کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سزا دیتے تھے۔ جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ فیصلہ تعزیری اور سیاسی نقطہ نگاہ سے تھا۔

جواب: ہم کہتے ہیں اس میں ہماری تائید ہے کہ بیک وقت تین طلاق دینا چوں کہ بدعت اور ممنوع ہے اس لیے اس طرح تین طلاق دینے والے پر تعزیر قائم کی جائے گی کیوں کہ ایسا کرنے والا خلاف سنت فعل کا مرتکب ہے اس لیے گناہ گار ہے لہٰذا جبراً اسے قابل تعزیر قرار دیا جائے گا۔ مگر تین طلاق اس صورت میں واقع ہو جائیں گی جیسا کہ

حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت سے تمام اکابر صحابہ، تابعین، آئمہ اربعہ اور دیگر مجتھدین اور مجتہدین کا اس مسئلہ میں تین طلاق واقع ہونے کا مذہب ہے ۔ہم اس بات کے قائل اور پابند ہیں کہ جب امت میں کسی مسئلہ میں اختلاف ہو جائے تو کتاب وسنت کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ چناں چہ ہم نے کتاب وسنت کی روشنی میں اس مسئلے کے تمام پہلوؤں پر تفصیلی گفتگو کر دی اور یہ بات طے شدہ ہے کہ آئمہ اربعہ کے اجماع کے بعد امتِ مسلمہ کے نزدیک راجح معنیٰ بہ اور واجب العمل یہی مذہب ہے کہ دفعۃً تین طلاق دیئے جانے کی صورت میں تین طلاقیں ہی واقع ہونگیں ۔اور آئمہ اربعہ کے علاوہ اہل ظاہر وہابیہ کے امام ابن حزم کا بھی یہی قول ہے۔ البتہ آٹھویں صدی ہجری میں ابن تیمیہ متوفی ۷۲۸ ہجری اور اس کے شاگرد ابن قیم ۷۵۱ ہجری نے اس موضوع پر تفصیلی گفتگو کی اور اس کے بعد شوکانی اور بعد کے غیر مقلدین نے اس کو اپنایا چوں کہ ہمارے ملک پاکستان میں احناف کی واضح اکثریت ہے اس لیے حکومت اور عوام کو امت کے اجماعی فیصلے پر ہی عملدرآمد کرنا چاہیے ہاں شیعہ اور غیر مقلدین اس مسئلے میں اپنے مسلک پر عمل کریں تو ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے (وآخر دعونا ان الحمد للہ رب العالمین)

ملک کا پبلک لاء (عام قانون) فقہ حنفی کے مطابق ہونا چاہیے اور شخصی طور پر اقلیتوں کو اپنے قوانین پر عملدرآمد کی محدود اجازت ہونی چاہیے۔

(خلع کا بیان)

بفضلہٖ تعالیٰ طلاق ثلاثہ کا مسئلہ تفصیلاً بیان ہونے کے بعد آیت مذکورہ کے دوسرے جز (وَلَا یَحِلُّ لَکُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا) آلایۃ میں خلع کا مسئلہ ہے اب ہم بقدر کفایت اس کا ذکر کرتے ہیں۔

جیسا کہ ابتدائی آیت کے شان نزول میں بیان ہوا کہ شوہر اور زوجہ میں نا اتفاقی رہتی ہو اور یہ اندیشہ ہو کہ احکام شریعہ کی پابندی نہیں کر سکیں گے۔ تو مال کے بدلہ نکاح زائل کرنے کو خلع کہتے ہیں۔

مسئلہ: خلع یہ ہے کہ عورت کچھ مال دے کر یا اپنے حقوق زوجیت کے عوض شوہر سے طلاق حاصل کرے مگر اس میں خلع کا لفظ ہونا ضروری ہے۔ مثلاً عورت کہے کہ تو مجھ سے ہزار روپے کے عوض خلع کر لے اگر مال کا ذکر تو ہوا اور خلع کا ذکر نہ آیا تو وہ طلاق بالمال کہلائے گی نہ کہ خلع (احمدی)

مسئلہ: زوجین جب خلع کر لیں تو طلاق بائن واقع ہو جائے گی جو مال ٹھہرا ہے عورت پر اس کا دینا لازم ہے۔ (ہدایہ) امام محمد رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی کتاب موطا میں لکھا ہے کہ خلع ایک طلاق بائنہ کے حکم میں ہے الا یہ کہ اس کی نیت تین طلاق دینا ہو یا تین طلاق کا نام لے (موطا امام محمد باب الخلع)

مسئلہ: اگر ظلم و زیادتی مرد کی طرف سے ہو تو اسے خلع کے عوض پیسہ لینا سخت منع اور مکروہ تحریمی ہے (ہدایہ) ہاں اگر زیادتی عورت کی طرف سے ہو تو جتنا مہر میں دیا اس سے زیادہ لینا مکروہ پھر بھی اگر زیادہ لے لے گا تو قضاءً جائز ہے۔ (عالمگیری) یعنی اگرچہ زیادہ لینا گناہ تھا تاہم اس گناہ کے باوجود خلع ہو جائے گا (**کما مرّ فی مسئلہ الطلاق**) چاہیے کہ مہر سے زیادہ پر خلع نہ کیا جائے جیسا کہ ہم ثابت بن حسین کی زوجہ کا واقعہ نقل کر چکے ہیں۔ کہ انہوں نے اپنے خاوند کو باغ کے علاوہ اور مال بھی دینا چاہا مگر حضور علیہ السلام نے صرف باغ ہی دلوایا اس آیت میں بھی (**مما اٰتیتموھن**) فرما کر اس کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔

مسئلہ: جو چیز مہر ہو سکتی ہے وہ بدل خلع بھی ہو سکتی ہے اور جو چیز مہر نہیں ہو سکتی وہ بھی بدل خلع ہو سکتی ہے۔ مثلاً دس درہم سے کم کو بدل خلع کر سکتے ہیں مگر مہر نہیں کر سکتے (درمختار)

خیال رہے کہ دس درہم دو تولے سات ماشے چار رتی چاندی کے وزن کے برابر ہے۔ جس

کی قیمت بازار میں کم وبیش ہوتی رہتی ہے۔ رائج الوقت قیمت کا خیال رکھنا چاہیے۔

مسئلہ: چوں کہ شوہر کی جانب سے خلع طلاق ہے لہٰذا شوہر کا عاقل بالغ ہونا شرط ہے۔ نابالغ یا مجنون خلع نہیں کرسکتا۔ کیوں کہ وہ اہل طلاق ہی نہیں۔ اور یہ بھی شرط ہے کہ عورت محل طلاق ہو لہٰذا عورت کو طلاق بائن دیدی تو اگرچہ عدت میں ہو اس سے خلع نہیں ہوسکتا یونہی اگر نکاح ہوگیا یا عورت مرتدہ ہوگئی جب بھی خلع نہیں ہوسکتا کہ نکاح ہی نہیں ہے خلع کس چیز کا ہوگا اور رجعی کی عدت میں ہے تو خلع ہوسکتا ہے۔ (درمختار وردالمختار)

مسئلہ: نکاح کی وجہ سے جتنے حقوق زوجین کے ایک دوسرے پر تھے وہ خلع سے ساقط ہوجاتے ہیں۔

مسئلہ: خلع طلاق ہے یا کہ فسخ نکاح؟ اس بارے میں فقہاء میں اختلاف ہے لیکن احناف کے نزدیک خلع طلاق ہے۔ نہ فسخ نکاح کیوں کہ اس آیت میں رب تعالیٰ نے دو رجعی طلاقوں کیساتھ خلع کا ذکر فرمایا پھر آگے ارشاد فرمایا فان طلقها الخ } جس میں فاء سے معلوم ہوا کہ وہ تیسری طلاق طلاق رجعی یا خلع کے بعد ہی ہے۔ اگر خلع فسخ نکاح ہوتا تو اس کے بعد طلاق واقع نہیں ہوسکتی آیت کا مطلب یہ ہوا کہ طلاق رجعی دو طلاقیں ہیں اور بصورت خوف خلع بھی جائز ہے۔ پھر اگر ان دو طلاقوں یا خلع کے بعد شوہر تیسری طلاق بھی دے دے تو بغیر حلالہ اس کے لیے حلال نہیں ہوگی خیال رہے! کہ فسخ نکاح کے اصل سے ہی اٹھ جانے کا نام ہے جس کے بعد طلاق نہیں ہوسکتی اور طلاق نکاح کے ٹوٹ جانے کا نام ہے جس کے بعد عدت کے اندر اور طلاق بھی واقع ہوسکتی ہے جب کہ طلاق رجعی ہو۔

فائدہ: یوں تو ہبہ یعنی کسی کو کچھ دیکر لوٹا لینا ہمیشہ ہی منع ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ جو کوئی کسی کو کچھ دیکر واپس لے وہ اس کتے کی طرح ہیں جو قے کر کے چاٹ لے (بخاری ومشکوٰۃ) مگر شوہر بیوی میں سے جو کوئی دوسرے کو کچھ دیدے وہ ہرگز واپس نہیں کرسکتا جیسا کہ اس آیت سے معلوم ہوا۔ کہ معلوم ہوا کہ شوہر بیوی کو دیکر کچھ نہ لے سوائے خلع کے۔

مسئلہ: چند چیزیں ہبہ کی واپسی ناجائز کر دیتی ہے۔(۱) زیادتی (۲) موت (۳) عوض (۴) ملک سے نکل جانا (۵) زوجیت (۶) قرابت داری جس کو دمع خزقۃ میں جمع کر دیا گیا۔زوجیں آپس میں کا ہبہ واپس نہیں کر سکتے اس مسئلے کا ماخذ یہی آیت ہے کہ یہاں فرمایا گیا (لا یحل لکم ان تاخذوا مما اٰتیتمو ھن)

مسئلہ: کسی کو کچھ دینے کی چند صورتیں ہیں مال کے عوض مال دینا یہ تجارت ہے۔کام کے عوض مال دینا یہ اجارہ ہے۔بلا معاوضہ کچھ دینا محض رضاء الٰہی کے لیے یہ صدقہ ہے۔ بلا عوض دینا اسے راضی کرنے کے لیے یہ ہبہ ہے۔پہلے تین قسم میں واپس لینا جائز نہیں یعنی تجارت، اجارہ، صدقہ واپس نہیں لے سکتا مگر چوتھی صورت یعنی ہبہ کی واپسی جائز ہے۔الا ان یمنع مانع پھر ہبہ کی تین قسمیں ہیں نذرانہ، عطیہ، ہدیہ چھوٹے کا بڑے کو کچھ دینا نذرانہ ہے جیسے مرید کا پیر کو، شاگرد کا استاد کو، اولاد کا ماں باپ کو کچھ دینا اور بڑے کا چھوٹے کو دینا عطیہ ہے۔جیسے پیر کا مرید کو، استاد کا شاگرد کو، ماں باپ کا اولاد کو کچھ دینا، برابر والے کا اپنے برابر والے کو کچھ دینا ہدیہ ہے۔جیسا بھائی کا بھائی کو کچھ دینا (عینی شرح کنز بحوالہ نعیمی)

مسئلہ: دفعہ ظالم کے لیے رشوت دینا جائز (شامی، مرقات وغیرہ) دیکھو مظلومہ عورت شوہر کے ظلم سے بچنے کے لیے خلع کر سکتی ہے۔جو کہ گویا رشوت ہے، ہم رشوت لینے دینے کے متعلق زیر آیت ولا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل بالتفصیل بحث کر آئے ہیں۔روایات صحیحہ کی رو سے خلع کی اجازت اور جواز صرف شدت ضرورت کے وقت ہے ورنہ بغیر کسی سبب کے خاوند سے طلاق مانگنے والی عورت کے لیے وعید شدید وارد ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (سورة البقرة:۲۳۰)

''پھر اگر تیسری طلاق دیدی تو اب وہ عورت اسے حلال نہیں ہوگی جب تک دوسرے خاوند کے پاس نہ رہے پھر وہ دوسرا اگر طلاق دیدے تو ان دونوں پر گناہ نہیں کہ پھر آپس میں مل جائیں اگر سمجھتے ہوں کہ اللہ کی حدیں نباہیں گے اور یہ اللہ کی حدیں ہیں جنہیں بیان کرتا ہے دانش مندوں کے لیے''

پچھلی آیت میں فرمایا گیا تھا کہ صرف دو طلاقوں تک شوہر کو رجوع کا حق ہے اب ارشاد ہو رہا ہے کہ تیسری طلاق کے بعد عورت نکاح سے بالکل ہی علیحدہ ہو جائے گی زمانہ جاہلیت کی طرح مرد طلاق میں آزاد نہ ہونگے کہ جتنی چاہیں دیتے رہیں اور رجوع کرتے رہیں۔

شانِ نزول:

عائشہ بنت عبدالرحمان رفاعہ ابن رہب کے نکاح میں تھیں انہوں نے اس کو تین طلاقیں دیں انہوں نے عدت گزار کر عبدالرحمان ابن زبیر قرظی سے نکاح کرلیا وہ کچھ دنوں کے بعد حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے دوسرے شوہر کی شکایت کرنے لگی کہ یہ نامرد ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ کیا رفاعہ کی طرف لوٹنا چاہتی ہو؟ اس نے عرض کی ہاں تب یہ آیت اتری اور حضور علیہ السلام نے فیصلہ فرمایا کہ جب تک دوسرا شوہر صحبت نہ کرے تب تک تم پہلے شوہر کے پاس نہیں جاسکتیں اور چوں کہ بقول تمہارے یہ نامرد ہے لہٰذا تم ابھی رفاعہ کے لیے حلال نہیں

(در منثور، روح المعانی، واللفظ للنعیمی)

تفسیر:

فَاِنْ طَلَّقَهَا : فاء تعقیبیہ ہے اور اس کا تعلق رجعی اور خلع کی دو طلاقوں سے ہے۔ اور ممکن ہے کہ تصریح باحسان کا بیان ہو یعنی پس اگر شوہر نے دو طلاقوں کے بعد تیسری طلاق بھی دیدی خواہ وہ دو طلاقیں بعوض مال ہوں (خلع) یا بلا مال (فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ) (یعنی تیسری طلاق کے بعد وہ عورت اس شوہر کو کسی طرح حلال نہیں نہ تو رجوع سے اور نہ دوبارہ نکاح سے) (حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ) حتّی حرمت کی حد ہے تنکح کا مادہ نکحٌ ہے جس کے لغوی معنی صحبت کرنا اور شرعی معنی عقد کے ہیں جیسا کہ ہم پہلے تفسیر کبیر کے حوالہ سے بیان کر آئے کہ تنکح کا معنی اگر اجنبی ہو تو بمعنی نکاح ہوتا ہے اور اگر اس کا مفعول زوج یا زوجہ تو بمعنی صحبت نکح امراۃ اور نکح زوجتہ میں فرق ہے یہاں چوں کی زوجاً مفعول ہے اس لیے صحبت کے معنی ہیں ممکن ہے کہ تنکح بمعنی نکاح ہی ہو اور صحبت کی قید حدیث شریف سے لگائی جائے مگر پہلے معنی زیادہ قوی ہیں کہ شان نزول کے مطابق ہیں۔ یعنی طلاق والی عورت اس شوہر کو اس وقت تک حلال نہیں جب تک کہ دوسرے شخص سے صحبت نہ کرے (فَاِنْ طَلَّقَهَا) یہاں طلق کا فاعل دوسرا شوہر ہے۔ اِنْ فرما کر ادھر اشارہ کیا کہ اس کی طلاق مشکوک چاہیے نہ کہ یقینی (نعیمی) (فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ) کا مرجع یہ عورت اور اس کا پہلا شوہر اور یتراجعا کا مادہ رجعٌ بمعنی لوٹنا یہاں عورت کا مرد کی طرف اور مرد کا عورت کی طرف نئے نکاح سے لوٹنا مراد ہے یعنی اگر شوہر ثانی بھی بعد صحبت اسے طلاق دیدے تو اب شوہر اول اور اس عورت پر کچھ گناہ نہیں کہ نکاح ثانی کر کے پھر مل جائیں (مظہری) مگر بشرطیکہ یعنی نکاح میں طلاق دینا مشروط نہ ہو۔

اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ (دونوں کو (غالب) گمان ہو کہ ہم اللہ کی حدوں کو قائم رکھ سکیں گے) یہاں ظن اپنے حقیقی معنی میں ہے یعنی گمان اگرچہ کبھی بمعنی علم کے بھی آتا ہے۔ کیوں

کہ آئندہ کا کسی کو یقین نہیں دوسری وجہ یہ ہے کہ اَنْ ناصبہ توقع کے لیے ہے۔ اور توقع یقین کہ منافی ہے (مظہری) حدود اللہ سے مراد زوجیت کے شرعی حقوق ہیں یعنی اگر وہ دونوں یہ گمان کریں کہ آئندہ شرعی حقوق ادا کر سکیں گے۔ خیال رہے کہ یہ جواز رجوع کی شرط نہیں بلکہ گناہ سے بچنے کی شرط ہے۔ اگر بدنیتی سے بھی رجوع کر لیا تو نکاح ہو جائے گا مگر یہ بدنیت گناہ گار ہوگا (وَتِلْکَ حُدُوْدُ اللّٰہِ) اور یہ (مذکور احکام) اللہ کی حدیں ہیں اور ہر چیز کی خیر اسی میں ہے کہ وہ اپنی حد میں رہے۔ آج مسلمانوں پر وبال اسی کا ہے کہ وہ حدود اللہ کو توڑ چکے ہیں۔

یُبَیِّنُھَا لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ : یبین تبیین سے بنا جس کے معنی ہیں خوب بیان کرنا یا آہستہ آہستہ بیان کرنا واقعی طلاق کے احکام خوب وضاحت سے بیان ہوئے اور آہستگی سے آئے تا کہ لوگوں کو کوئی دشواری نہ ہو کیوں کہ عرب عورتوں کے معاملے میں بہت آزاد واقع ہوئے تھے۔ وہ ایک دم پوری پابندی برداشت نہیں کر سکتے تھے نیز جتنی تفصیل سے طلاق و نکاح کے احکام بیان ہوئے اتنی تفصیل سے دوسرے احکام بیان نہ ہوئے کیوں کہ نکاح و طلاق پر نسل انسانی کا بقاء ہے۔ لِقَوْمٍ کا لام نفع کا ہے اور ممکن ہے کہ صلہ کا ہو۔ اور یَعْلَمُوْنَ سے علماء یا سمجھ دار مسلمان لوگ مراد ہیں کیوں کہ احکام سمجھنا علماء کا ہی کام ہے۔ لہٰذا عوام کو چاہیے قرآنی آیات سے خود مسائل نکالنے کی بجائے علماء سے پوچھ کر عمل کریں ارشاد باری ہے (فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون)

فوائد و مسائل:

اس آیت سے چند فوائد حاصل ہوئے۔

(۱) طلاقیں الگ الگ چاہیں نہ کہ ایک دم جیسا کہ فاء تعقیبیہ سے معلوم ہوا (۲) حلالہ دوسرے شوہر کی صحبت سے ہوگا نہ کہ غیر شوہر کی صحبت سے جیسا کہ زوجا وغیرہ سے معلوم ہوا اس بالغہ عورت کے نکاح میں ولی کی شرط نہیں جیسا کہ تنکح میں نکاح کا فاعل عورت ہے لہٰذا یہ آیت

احناف کی دلیل ہے۔ (۴) حلالہ میں دوسرے شوہر کا وطی کرنا بھی ضروری ہے جیسا کہ تنکح کے بعد زوجاً فرمانے سے معلوم ہوا۔(۵) نکاح بشرط طلاق کرنا سخت مکروہ بلکہ امام مالک، احمد کے نزدیک فاسد ہے جیسا کہ اِنْ طلّقَ کہ اِنْ سے معلوم ہوا۔(۶) قیاس کرنا جائز ہے جیسا کہ (ان ظنا) سے معلوم ہوا۔

مسئلہ: طلاق تین طرح کی ہیں۔(۱) رجعی (۲) بائنہ (۳) مغلظہ ایک یا دو طلاقیں رجعی ہیں۔ کہ دوران عدت شوہر کو رجوع کا حق ہے۔ خواہ عورت راضی ہو یا نہ ہو دوبارہ نکاح کی بھی ضرورت نہیں مبہم طلاق (کنایۃ) طلاق بائنہ ہے ایسے بائنہ کہنے سے بھی طلاق بائنہ واقع ہو جاتی ہے کہ اس میں رجوع جائز نہیں بلکہ دوران عدت یا بعد العدۃ دوبارہ نکاح کرنا لازم ہے۔ حلالہ کی شرط نہیں تین طلاقیں مغلظہ ہیں اس میں حلالہ ضروری ہے۔

مسئلہ: حلالہ کی صورت یہ ہے کہ اگر عورت مدخولہ ہے تو طلاق کی عدت پوری ہونے کے بعد عورت کسی دوسرے بالغ یا قریب بلوغ مرد سے نکاح کرے اور یہ شوہر ثانی اس عورت سے وطی بھی کرے اب اس شوہر ثانی کی طلاق یا موت کے بعد عدت پوری ہونے پر شوہر اول سے نکاح ہو سکتا ہے۔ اور اگر عورت مدخولہ نہیں ہے تو پہلے شوہر کے طلاق دینے کے فوراً بعد دوسرے سے نکاح کر سکتی ہے۔ اس کے لیے عدت نہیں (عامہ کتب)

مسئلہ: لونڈی کی دو طلاقیں ہی مغلظہ ہے۔

مسئلہ: بشرط التحلیل نکاح جس کے بارے میں حدیث میں لعنت آئی ہے وہ یہ ہے کہ عقد نکاح یعنی ایجاب وقبول میں حلالہ کی شرط لگائی جائے اور یہ نکاح مکروہ تحریمی ہے۔ زوج اول وثانی اور عورت تینوں گناہ گار ہونگے مگر عورت اس نکاح سے بھی بشرائط حلالہ

شوہراول کے لیے حلال ہو جائے گی اور شرط باطل اور شوہر ثانی طلاق دینے پر مجبور نہیں کیوں کہ حدیث شریف میں فرمایا گیا (لعن اللّٰہ المحلل والمحلل له لعنت) تو فرمایا مگر محلل کہہ کر اگر یہ حلالہ درست نہ ہوتا تو اسے محلل کیوں کہا جاتا اور اگر عقد میں شرط نہ ہو اگرچہ نیت میں ہو تو کراہیت اصلاً نہیں بلکہ اگر نیت خیر ہو تو مستحق اجر ہے (لقوله عليه السلام انما الاعمال بالنيات) (درمختار وغیرہ)

مسئلہ: متعہ اور دیگر نکاح فاسدہ باطلہ سے حلالہ درست نہیں کیوں کہ ان نکاحوں میں خاوند شرعاً صحیح زوج ہی نہیں بنتا۔

مسئلہ: حلالہ کے بعد جب عورت زوج اول کے پاس آئے گی تو مثل نکاح اول کے پھر شوہر کو تین طلاقوں کا حق حاصل ہوگا۔

مسئلہ: اگر شوہر نے دو طلاقیں دیکر رجوع کرلیا تو اب ایک ہی طلاق کا اختیار رہے گا یعنی اب ایک ہی طلاق سے مغلظہ ہو جائے گی۔

اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ خلع طلاق نہیں بلکہ فسخ نکاح ہے۔ اگر طلاق مانا جائے تو طلاقیں چار ہو جائیں گی دو طلاقیں تو (الطلاق مرّتٰن) والی اور تیسری خلع والی اور چوتھی (فَاِن طَلَّقَهَا فلا تَحِلّ) الخ کی حالاں کہ طلاقیں صرف تین ہی ہیں۔ نہ کہ چار (شوافع)

جواب: خلع طلاق ہی ہے اور وہ ان دو طلاقوں کے علاوہ نہیں بلکہ اس کی ایک صورت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دو طلاقوں کے بعد خواہ وہ بلا عوض رجعیہ ہو یا بطریقہ خلع بائنہ ہو تیسری طلاق دی تو بغیر حلالہ نکاح درست نہ ہوگا۔ اگر خلع کو فسخ مانا جائے تو کلام بگڑ جائے گا کہ طلاقوں کے درمیان اجنبی چیز کا ذکر فصاحت کے خلاف نیز فسخ نکاح کہ بعد طلاق کا ذکر فضول ٹھہرتا ہے۔

اعتراض: قرآن مجید میں حلالہ کی صورت میں عورت کے لیے صرف زوج ثانی سے نکاح کرنے کا ذکر ہے۔ اور تم عورت کے لیے زوج ثانی سے مجامعت (وطی کرانا) بھی ضروری قرار دیتے ہو یہ کتاب اللہ پر زیادتی ہے جو کہ جائز نہیں۔

جواب: زوج ثانی کا وطی کرنا ہم نے اپنی طرف سے زیادتی نہیں کی بلکہ جیسا کہ آیت کی تفسیر میں ہم بیان کر آئے ہیں تنکح زوجاً وغیرہ کے الفاظ سے ثابت ہے یا حضور علیہ السلام کا امرأۃ رفاعہ کے لیے کما قال صاحب التفسیرات الاحمدیہ فی نور الانوار صفحہ ۲۰ یہ فرمانے سے کہ لاحتی تذوقی عسیلتہ ویذوق عسیلتک یہ حدیث درجہ مشہور میں ہے۔ اور خبر مشہور سے قرآن پر زیادتی باتفاق جائز ہے۔ نیز جمہور امت کا اس حدیث کا قبول کر لینا دلیل شہرت ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمٌ (سورۃ البقرۃ:۲۳۱)

"اور جب تم نے عورتوں کو طلاق دیدی تو پھر وہ اپنی عدت گزارنے کے قریب پہنچ جائیں تو انہیں بھلائی کیساتھ روک لو یا انہیں بھلائی کیساتھ چھوڑ دو۔ اور انہیں ضرر کے لیے نہ روکو تاکہ تم حد سے بڑھ جاؤ۔ اور جو شخص ایسا کرے تو اس نے اپنی ہی جان پر ظلم کیا۔ اور اللہ کی آیتوں کو ٹھٹھا نہ بنالو اور یاد کرو اللہ کا احسان جو تم پر ہے اور وہ جو تم پر کتاب اور حکمت اتاری تمہیں نصیحت دینے کو اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جانتے رہو اللہ سب کچھ جانتا ہے"

تعلق:

یہ آیت پچھلی آیتوں کا تتمہ ہے جس میں مردوں کو بتایا جارہا ہے کہ عورتوں کی حق تلفی در حقیقت اپنی جان پر ظلم ہے۔

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ: - (اور جب تم نے اپنی عورتوں کو طلاق (رجعی) دی ہو پھر وہ اپنی عدت گزرنے کے قریب پہنچ جاویں (عدت ختم نہ ہوئی ہو) اجل کا لفظ مدت اور مدت کے منتہا دونوں پر بولا جاتا ہے۔ آدمی کی عمر کو بھی اجل کہتے ہیں اور موت کو بھی جس پر عمر ختم

ہو جاتی ہے۔(مظہری) لیکن یہاں عدت کا اخیر جز مراد ہے۔اور بلوغ کے (اصل) معنی کسی چیز تک پہنچنا کبھی مجاز کے طور پر اس سے قریب ہونے پر ہی بول دیتے ہیں اس آیت میں یہی معنی مراد ہیں تا کہ اس آیت کے آئندہ جملہ کا اس پر مرتب ہونا درست ہو جائے (فَامْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ اَوْ سَرِّحُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ)(تو یا تو انہیں حسن معاشرت سے روک لو یا سلوک کے ساتھ انہیں رخصت کر دے کیونکہ عدت پوری ہو جانے کے بعد روکنا جائز نہیں مقصود آیت سے یہ ہے کہ یا تو بلا ارادہ تکلیف ان سے رجعت کر لو یا انہیں چھوڑ دو کہ وہ اپنی عدت پوری کر لیں (وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِتَعْتَدُوا) (اور تکلیف دینے کے لیے انہیں نہ روکو) یعنی تکلیف دینے کے ارادے سے ان سے رجعت نہ کرو کہ پھر (ان پر) زیادتی کرنے لگو یعنی زیادہ دنوں تک رکھنے اور کچھ دینے پر مجبور کرنے کیساتھ ان پر ظلم کرو۔ پہلے اللہ تعالیٰ نے حسن معاشرت کے ساتھ رکھنے کا حکم دیا پھر اس کی ضد یعنی تکلیف دینے کے ارادے سے منع فرمایا پھر اس کے ظلم اور زیادتی ہونے کی تصریح کی اور اس کے بعد فرمایا (وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ)} (جو ایسا کرے گا اس نے یقیناً اپنی جان پر ظلم کیا) اپنی جان پر ظلم کرنے سے مراد یہ آخروی عذاب ہے۔یا دنیوی بد نامی ابن جریر نے عوفی کے طریق سے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے۔فرماتے ہیں (پہلے یہ حالت تھی) کہ بعض لوگ اپنی بیوی کو ستانے اور مشکل میں ڈالنے کے لیے اسے طلاق دے دیتے تھے پھر عدت پوری ہونے سے پہلے اس سے رجوع کر لیتے تھے۔ پھر طلاق دے دیتے تھے اور اسی طرح کرتے رہتے تھے اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی بغوی اور سدی سے ابن جریر نے نقل کیا کہ یہ آیت ثابت بن یسار انصاری کے بارے میں نازل ہوئی کہ انہوں نے اپنی بیوی کو طلاق دیدی پھر محض ستانے کی غرض سے رجعت کر لی پھر طلاق دیدی اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نازل فرمایا (مظہری و در منثور وغیرہ)

وَلَا تَتَّخِذُوٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا : (اور اللہ کی آیتوں کو مذاق نہ بناؤ) یعنی ان سے اعراض نہ کرو اور تعمیل حکم میں سستی نہ کرو کلبی فرماتے ہیں یعنی اللہ کے حکم (فامساک بمعروف

او تسریحٌ باحسان) کو مذاق نہ بناؤ اور جس نے خلاف شرع کیا اس نے اللہ کی آیتوں کا (گویا) مذاق اڑایا ابن ابی عمر و رضی اللہ عنہ نے اپنی مسند میں اور ابن مردویہ نے ابی الدراء سے روایت کی ہے ۔ فرماتے ہیں ۔ (پہلے لوگوں کی یہ حالت تھی) کہ بعض آدمی اول طلاق دے دیتے اور پھر کہتے ہم نے تو مذاق کیا تھا اور اسی طرح کوئی غلام یا لونڈی کو آزاد کر کے کہتا کہ میں نے تو ہنسی کی تھی ۔ لغوی نے بحوالہ حضرت ابو درداؓ یہ بھی نقل کیا کہ نکاح کر کے بھی لوگ ایسا ہی کہہ دیتے تھے اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی ۔

وَلَا تَتَّخِذُوٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا : ابن مردویہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہ اور ابن جریر نے اسی طرح حسن سے مرسل روایت کی اور ابن منذر نے عبادہ بن صامت سے ان الفاظ کیساتھ روایت کی ہے کہ تین امر ہیں جو شخص انہیں کہے خواہ ہنسی سے ہو یا بلا ہنسی تو وہ اس پر جاری ہو جائیں گے ۔ طلاق عتاق نکاح (ثلاث جدھن جد و ھزلھن جدّ) خیال رہے کہ احکام شرعیہ کا دلی یا قولی مذاق اڑانا کفر ہے ۔ اور عمل مذاق فسق ۔ جیسا کہ امر شریعت میں کوتاہی اور بدعملی کرتے ہوئے داڑھی نہ رکھنا فسق ہے لیکن داڑھی یا سنت رسول کے مطابق داڑھی رکھنے والے شخص کا مذاق اڑانا یا محض ڈاڑھی کی وجہ سے اس کو حقیر جاننا کفر ہے ۔

وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ : (اور اللہ کا احسان اپنے اوپر یاد کرو) یعنی تم اللہ کا وہ احسان یاد کرو کہ اس نے تمہیں انسان بنایا مسلمان کیا مرد بنایا تمہیں طلاق و رجوع کا اختیار دیا ۔ پچھلی امتوں کی طرح تم پر ایک بیوی کی پابندی نہ لگائی بلکہ چار نکاح تک کی اجازت دی وغیرہ (روح البیان) اس کا شکر تم پر لازم ہے ۔ خیال رہے کہ مال کے عوض مال قیمت ہے اور کام کے عوض مال اجرت اور بغیر کسی معاوضہ کے کچھ دینا نعمت ہے ۔ قیمت اور اجرت کا شکریہ واجب نہیں کہ وہ تو اپنا حق ہے مگر نعمت کا شکریہ لازم ہے کہ منعم کا محض فضل ہے اللہ تعالیٰ کے عطیے نہ قیمت ہیں نہ اجرت محض فضل ہیں ۔ اگر ہم میں شرافت و انسانیت کی کچھ بھی بو ہے تو ہمیشہ اس کا شکر کیا کریں ۔ رب تعالیٰ کی ساری نعمتوں سے اعلیٰ نعمت حضور ﷺ کی ذات بابرکات ہے ۔ کہ رب تعالیٰ نے اس

کے متعلق ارشاد فرمایا (لقد من اللہ علی المؤمنین اذا بعث فیھم رسولا) (تفسیر نعیمی)

وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ: (اور جو تم پر کتاب نازل کی اور حکمت اس سے تمہیں نصیحت کرتا ہے) کتاب سے مراد قرآن مجید اور حکمت سے سنت اور حدیث مراد ہے اگرچہ کتاب سنت کا نزول حضور ﷺ پر ہوا مگر چوں کہ حضور پاک ﷺ اصل اور ساری امت فرع آپ امام اور سارے لوگ مقتدی لہٰذا حضور ﷺ پر اترنا گویا ہم سب پر اترنا ہے نیز قرآن ہماری ہی ہدایت کے لیے آیا ہے۔ حضور علیہ السلام تو پہلے ہی ہدایت یافتہ پیدا ہوئے۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ: اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو (اور اس کی اطاعت کرو بیویوں کو ایذا نہ پہنچاؤ) جان لو کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز سے واقف ہے تمہاری باتیں تمہارا ارادہ تمہاری عورتوں سے زیادتی اور ظلم یا اچھا سلوک اس پر مخفی نہیں ہے۔

فوائد و مسائل:

(۱) طلاق رجعی میں عدت کے اندر رجوع کا اختیار ہوگا نہ کہ اس کے بعد جیسا کہ (فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ) سے معلوم ہوا (۲) رجوع میں عورت کی رضامندی ضروری نہیں صرف مرد ہی رجوع کرسکتا ہے۔ جیسا کہ (فَاَمْسِكُوْا) اور (سَرِّحوا) سے معلوم ہوا۔ (۳) رجوع میں کلام کی قید نہیں منہ سے بول کر یا وطی یا بوسہ و کنار سے بھی رجوع ہو سکتا ہے۔ کیوں کہ (فَاَمْسِكُوْا) میں کوئی قید نہیں (سَرِّحُوْهُنَّ) کی طرح یہ بھی مطلق ہے۔

مسئلہ: بہتر یہ ہے کہ رجوع کلام سے کریں اور اس پر گواہ بھی بنالیں (جوہرہ) (۴) طلاق دینے کا حق صرف مرد کو ہے، عورت کو نہیں نہ ہی دونوں کے مشورے پر موقوف کیوں کہ یہاں فرمایا (وَاِذَا طَلَّقْتُمُوْهُنَّ) طلاق کا فاعل تو مرد کو قرار دیا اور مفعول عورت کو دوسری جگہ ارشاد فرمایا (الذی بیدہٖ عقدۃ النکاح) کہ نکاح کی گرہ مرد کے ہاتھ

میں ہے۔ بہر حال نکاح کے وقت عورت اور مرد کا مشورہ ضروری ہے۔ مگر طلاق میں مرد مستقل ہے۔ ہاں فسخ نکاح کبھی عورت کی طرف سے ہو جاتا ہے۔ جیسے خیارِ بلوغ یا خیارِ عتق کے موقع پر مرد راضی ہو یا نہ عورت فسخ نکاح کرا سکتی ہے۔ (۵) عورتوں کو دکھ، تکلیف دینے کے لیے روک رکھنا احکام الٰہیہ کی ہنسی اڑانا ہے۔ بیوی کا معاملہ بہت نازک اور عورتوں کے حقوق نہایت سخت رب تعالیٰ بار بار ڈرا کر اپنے احسان یاد دلا کر مردوں کو ان کے حقوق ادا کرنے پر مائل فرماتا ہے۔ غالباً جس قدر تفصیل عورتوں کے حقوق اور طلاق کے احکام کی کی گئی اتنی دیگر چیزوں کی نہ فرمائی اس کے باوجود جو کوئی ان پر ظلم، زیادتی کرے در حقیقت وہ اپنے پر ظلم کرتا ہے کیوں کہ مظلوم کی تکلیف عارضی اور معمولی مگر ظالم کو سخت عذاب ہوگا۔

پنداشت ستمگر کہ ستم برما کرد   بر گردن او بماند و بر ما بگذشت

۶۔ اللہ کی نعمتوں کا ذکر کرنا رضائے الٰہی کا ذریعہ ہے۔ لہٰذا محفل میلاد شریف وغیرہ جائز کہ اس میں رب کی نعمت یعنی حضور علیہ السلام کی تشریف آوری کا ذکر ہے۔ (تفسیر نعیمی ملخصاً)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَاِذَا طَلَّقۡتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغۡنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعۡضُلُوۡهُنَّ اَنۡ يَّنۡكِحۡنَ اَزۡوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوۡا بَيۡنَهُمۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ ذٰلِكَ يُوۡعَظُ بِهٖ مَنۡ كَانَ مِنۡكُمۡ يُؤۡمِنُ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ ذٰلِكُمۡ اَزۡكٰى لَكُمۡ وَاَطۡهَرُ وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ وَاَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ

(سورۃ البقرۃ:۲۳۲)

"اور جب تم عورتوں کو طلاق دو اور ان کی میعاد پوری ہو جاوے تو اے عورتوں کے والیو! انہیں نہ روکو اس سے کہ اپنے شوہروں سے نکاح کرلیں۔ جب کہ آپس میں موافق شرع رضا مند ہو جاویں۔ یہ نصیحت اسے دی جاتی ہے جو تم میں سے اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتا ہے۔ یہ تمہارے لیے زیادہ ستھرا اور پاکیزہ ہے۔ اور اللہ جانتا ہے تم نہیں جانتے"

تعلق:

گزشتہ آیت میں طلاق دینے والے شوہروں کا اختیار بیان ہوا کہ وہ عدت میں رجوع کر سکتے ہیں۔ اب عدت کے بعد عورتوں کا اختیار بیان ہو رہا ہے کہ وہ اپنے نفس کی مالک ہیں۔ جس سے چاہیں نکاح کریں۔

شان نزول:

ابوداؤد ترمذی وغیرہ نے معقل بن یسار سے روایت کی ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنی بہن کا نکاح ایک شخص سے کر دیا تھا پھر اس نے اسے طلاق دیدی۔ اور جب اس کی عدت پوری ہو گئی تو وہ پھر پیغام لیکر آئے میں نے ان سے یہ بات کہی کہ پہلے تو میں نے تم سے اس کا نکاح کر دیا تھا۔

تمہارا گھر بسا دیا تھا سب طرح تمہاری آبرو تھی لیکن تم نے اسے طلاق دیدی اور اب پھر پیغام لے کر آئے ہو ایسا نہیں ہو سکتا خدا کی قسم اب وہ تمہارے ہاں ہرگز نہیں جاسکتی اور وہ آدمی کچھ برا نہ تھا اور میری بہن بھی اس کے ہاں جانا چاہتی تھی اس پر اللہ تعالٰی نے یہ آیت نازل فرمائی (فَلَا تَعۡضُلُوۡهُنَّ اَنۡ يَّنۡكِحۡنَ اَزۡوَاجَهُنَّ) تب میں نے (حضور ﷺ کی خدمت میں) عرض کیا یارسول اللہ ﷺ میں اپنے نفس کی نہ مانوں گا بلکہ رب تعالٰی کی اطاعت کروں گا چنانچہ اسی سے نکاح کر دیا (احمدی، روح المعانی، کبیر، نعیمی وغیرہ واللفظ للمظہری) اس آیت کے شان نزول کے بارے میں اور بھی اقوال ہیں لیکن زیادہ صحیح اور قوی یہی ہے۔ (مظہری)

وَاِذَا طَلَّقۡتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغۡنَ اَجَلَهُنَّ : ظاہر یہ ہے کہ طلقتم میں خطاب طلاق دینے والے شوہروں سے ہے۔ اور طلاق سے طلاق رجعی یا بائنہ مراد ہے۔ جس میں حلالہ کی ضرورت نہیں۔ النساء سے اپنی بیویاں اور بلوغ سے انتہا کو پہنچ جانا مراد ہے۔ اور اجل سے عدت یعنی اے شوہرو! جب کہ تم اپنی بیویوں کو طلاق رجعی یا بائنہ دے دو اور ان کی عدت پوری ہو جائے تو (فَلَا تَعۡضُلُوۡهُنَّ اَنۡ يَّنۡكِحۡنَ اَزۡوَاجَهُنَّ تَعۡضُلُوۡ) عضل سے بنا بمعنی تنگی اور روکنا پٹھے کے گوشت کو اسی لیے عضلہ کہتے ہیں۔ وہ سخت اور تنگ ہوتا ہے جس عورت کے بچہ دشواری سے پیدا ہو اسے معضلہ کہا جاتا ہے۔ (نعیمی) اصل معنی ضیق اور شدت کے ہیں چناں چہ الداء العضال عرب میں اس بیماری کو کہتے ہیں۔ جس کا علاج نہ ہو سکے۔ (مظہری) ظاہر یہ خطاب عورت کے ولی ورثہ کو ہے۔ اور ازواج سے مراد ان کے پہلے شوہر ہیں جنہوں نے طلاق دیدی تھی۔ یہی مطلب شان نزول کے مطابق ہے۔ یعنی اے عورت کے والیوں عورتوں کو اس سے نہ روکو کہ وہ اپنے شوہروں سے دوبارہ نکاح کرلیں چوں کہ ساری مخلوق رب کے علم میں حاضر ہے۔ اس لیے ایک ہی جملہ میں مختلف لوگوں سے خطاب فرمانا درست ہے۔ بعض نے فرمایا کہ (طلقتم) اور (لا تعضلوا) دونوں جگہ پہلے شوہروں سے خطاب ہے۔ اور ازواج سے (مایؤلُ الیہ) کے اعتبار سے وہ لوگ مراد ہیں جن سے نکاح کرنے کا عورت نے ارادہ کرلیا۔ یعنی اے طلاق دینے والے خاوندوں!

جب تم طلاق دیدو اور ان کی عدت بھی گزر جاوے تو عورتوں کو دوسرے نکاح سے نہ روکو (کبیر ملخصا) کیوں کہ عرب میں یہ ظلم بھی تھا کہ پہلا شوہر طلاق دیکر بھی دوسرے سے عورت کو نکاح نہ کرنے دیتا تھا۔

حکیم الامت مفتی احمد یار خان رحمتہ اللہ علیہ نے بحوالہ تفسیر احمدی ایک یہ قول بھی نقل فرمایا کہ (طلقتم) اور (تعضلوا) دونوں میں دوسرے شوہروں سے خطاب ہے۔ جن سے بطور حلالہ عورت نے نکاح کرلیا تھا اور ازواج سے پہلے شوہر مراد ہیں یعنی (اے دوسرے شوہرو! جب تم نے طلاق والی عورتوں سے نکاح کر کے انہیں طلاق دیدی تو اب انہیں پہلے شوہروں سے نکاح کرنے سے نہ روکو کیوں کہ وہ انہیں حلال ہو چکیں۔ اگر چہ ان دو آخری تفسیروں میں کلام میں انتشار نہ ہوگا مگر پہلی تفسیر زیادہ بہتر ہے کہ وہی شان نزول کے مطابق بھی ہے۔ اور اس پر زیادہ مفسرین کا اعتماد ہے۔ (اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ) معروف بمعنی مشہور و معلوم ہے۔ گویا معروف کام وہ ہے جو شرعاً و عادتاً مشہور ہو اور جس کی بھلائی معلوم ہو یہاں معروف سے جائز نکاح پورا مہر اور عمدہ برتاؤ مراد ہے۔ یعنی جب کہ عورت و مرد آپس میں جائز باتوں پر راضی ہو چکے ہوں تم منع نہ کرو باہم رضامندی شرط ہونے کی بناء پر تمام فقہاء کا اس پر اجماع ہے کہ بالغہ عورت جب بیوہ ہو اس پر زبردستی کرنی جائز نہیں اور کنواری بالغہ میں اختلاف ہے۔

ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ: (یہ اس شخص کو نصیحت کی جاتی ہے۔ جو تم میں سے اللہ تعالیٰ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہے) یہ کہ یہ احکام اگرچہ تمام نیکوں کاروں اور بدکاروں کے لیے ہے۔ مگر نصیحت حاصل کرنے والے اور نفع اٹھانے والے صرف نیکوکار ہی ہیں اس لیے خاص انہی کا ذکر ہوا (ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ) (یہ تمہارے حق سب زیادہ ستھرا اور بڑا پاک کرنے والا ہے۔ ذالکم سے نصیحت قبول کرنے اور عمل کرنے کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی اگر عورتوں کو مطلق نکاح سے روکا جاتا تو اکثر زنا کاری میں مبتلا ہو جاتیں اور اگر اس نکاح سے روکا جاتا جس سے وہ خود رضامند ہو گئیں اور ایسے شخص سے نکاح کرنے پر زبردستی کی

جاتی جس سے وہ رضا مند نہیں تو اندیشہ تھا کہ یہ دونوں میاں بیوی اللہ تعالیٰ کی حدود قائم نہ رکھیں لٰہذا جب ان کا دلی رجحان پہلے شوہر کی طرف ہے۔ اور اس نکاح میں کوئی شرعی خرابی بھی نہیں تو تم اگرچہ اس سے راضی نہ ہو مگر بہتری اور بھلائی اسی میں ہے۔ کیوں کہ (وَاللّٰہُ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ) (ان رازوں کو اللہ جانتا ہے۔ تم پورے پورے واقف نہیں)

فوائد و مسائل

۱۔ احناف کے نزدیک آزاد، عاقلہ، بالغہ، عورت، کفو میں خود نکاح کر سکتی ہے۔ ولی کی اجازت شرط نہیں محمد بن سیرین، شعبی اور قتادہ کا بھی یہی قول ہے۔ اور ابن ابی لیلیٰ، ثوری، حسن بن صالح اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بلا اجازت ولی کیا ہوا نکاح صحیح نہیں ہوتا اس مسئلے کو ہم دو فصلوں میں بیان کرتے ہیں۔ پہلی فصل میں مجوزین کے دلائل۔ دوسری فصل میں مخالفین کے استدلال اور ان کے جوابات۔

فصل اول:

احناف اس مسئلے میں قرآن کریم کی حسب ذیل آیات سے استدلال کرتے ہیں۔ (۱) کہ اس آیت کریمہ میں لفظ (یَنْکِحْنَ) میں نکاح کو خود عورتوں کی طرف نسبت فرمایا۔ (۲) (حتی تنکح زوجا غیرہ)} میں بھی نکاح کی نسبت عورت کی طرف ہے۔ لٰہذا معلوم ہوا کہ عاقلہ، بالغہ عورت اپنا نکاح خود کر سکتی ہے۔ (۳) رب تعالیٰ نے فرمایا (وامرأۃ مؤمنۃ اِنْ وَھَبَتْ نفسھا للنبی) اس سے بھی معلوم ہوا کہ عورت خود اپنا نفس کسی کو بخش سکتی ہے۔ (۴) (فلا جناح علیکم فیما فعلن فی انفسھن) نہیں گناہ ہے تم پر اس بارے میں جو عورتوں نے اپنے نفسوں کے بارے میں کیا ہے۔

احادیث سے استدلال:

(۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی مرفوع حدیث میں ہے (الایم احق بنفسها من ولیها والبکر تستاذن فی نفسها واذنها صماتها) (یعنی بے شوہر عورت اپنی جان کی اپنے ولی سے زیادہ حقدار ہے اور کنواری کا نکاح کرنے میں اس سے اجازت لینی چاہیے اور اس کی اجازت اس کا خاموش ہو جانا ہے)۔ یہ حدیث مسلم امام مالک ابوداؤد ترمذی اور نسائی نے روایت کی اور اس سے استدلال کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اولیاء کا سوائے نکاح کر دینے کے اور کوئی حق نہیں اور بے شوہر والی عورت اپنے نفس کی اس سے زیادہ حق دار ہے۔ پس یہ اپنا نکاح کرنے میں بھی اس سے اولیٰ ہوگی (مظہری) (۲) خنساء بنت خزام کا نکاح اس کے باپ نے کر دیا تھا اور وہ اس نکاح کو ناپسند کرتی تھی چناں چہ وہ حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئی آپ ﷺ نے اس کے نکاح کو رد کر دیا۔ (رواہ البخاری وفی روایہ ابن ماجہ نکاح ابیھا و مشکوٰۃ صفحہ ۸۵) (۳) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک نوجوان عورت ان کے پاس آئی اور کہا کہ میرے باپ نے اپنے بھتیجے سے میرا نکاح کر دیا ہے۔ تاکہ اس کا حسب (نسب) بڑھے اور یہ نکاح مجھے ناپسند ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا بیٹھ جا اتنے میں رسول اللہ ﷺ بھی تشریف لے آئے۔ اس عورت نے یہ قصہ پھر حضور ﷺ سے بیان کیا تو آپ نے اس کے باپ کو بلایا اور اس بارے میں اس عورت کو اختیار دیدیا وہ بولی یا رسول اللہ ﷺ میں اپنے باپ کے کیے ہوئے نکاح کو ایسے ہی رہنے دیتی ہوں میں نے فقط یہ چاہا تھا کہ سب عورتوں کو جتلا دوں کہ باپوں کو اس بارے میں کچھ اختیار نہیں (یہ حدیث نسائی نے روایت کی) وجہ استدلال یہ ہے کہ حضور ﷺ نے اس عورت کے قول پر کہ باپوں کو کچھ اختیار نہیں ثابت رکھا (یعنی اس کا انکار نہ فرمایا)۔ خود حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہ نے اپنی بھتیجی حفصہ بنت عبد الرحمن کا نکاح اس کے باپ کی غیر موجودگی میں منذر بن زبیر سے کر دیا اس سے معلوم ہوتا ہے ام المومنین رضی اللہ عنہ کا بھی یہی مذہب تھا کہ عاقلہ بالغہ بغیر ولی خود اپنا نکاح کر سکتی۔ کروا سکتی ہے۔

فصل دوم:

مخالفین حضرات کا بڑا استدلال اس آیت سے ہے۔ہم ان کے تمام اعتراضات بمعہ جواب بیان کرتے ہیں

اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ عورت کا نکاح بغیر اجازت ولی درست نہیں کیوں کہ یہاں وارثوں سے خطاب ہے کہ (لَاتَعْضُلُوْا هُنَّ) عورتوں کو نکاح سے نہ روکو اگر انہیں نکاح سے روکنے کا اختیار نہ تھا تو یہ ممانعت کیسی؟

جواب: یہ ممانعت عرفی لحاظ سے ہے۔چوں کہ عام طور پر عورتیں اپنے نکاح کا معاملہ اپنے ولی کے سپرد کردیتی ہیں۔اوران کی رائے کے بغیر کوئی کام نہیں کرتیں لہٰذا ان کو یہ ممانعت کردی گئی۔نیز اگر ان کا یہ استنباط صحیح ہو تو لازم آتا ہے کہ عورت کا دوسرا نکاح پہلے شوہر کی اجازت پر موقوف ہو کیوں کہ بعض مفسرین کے نزدیک (لاتعضلوا) پہلے شوہروں سے ہی خطاب ہے۔پھر لطف یہ ہے کہ یہاں فرمایا گیا کہ عورتوں کو نکاح کرلینے سے نہ روکو معلوم ہوا کہ نکاح کرنا عورتوں کا ہی کام ہے وہ اس میں خودمختار ہیں تم اس میں رکاوٹ نہ پیدا کرو (نعیمی) نیز جس حکم میں کسی کام سے باز رہنے کی ہدایت کی جائے وہ ''نہی'' ہے۔اور نہی عدم اختیار کو ظاہر کرتی ہے نہ کہ اثبات حق کو۔

اعتراض: قرآن مجید میں ہے کہ (وانکحو الا یامٰی منکم) (۱۸/۷ سورہ نور آیت نمبر ۳۲) (یعنی تم اپنے میں سے غیر شادی شدہ عورتوں کا نکاح کردو)۔اس آیت میں لفظ ایم جس کا معنی وہ عورت جس کا شوہر نہ ہو خواہ وہ عورت باکرہ ہو یا ثیبہ چناں چہ جب اس عورت پر ولایت قائم ہوگی اور وہ مولیا علیہ بن گئی تو وہ ولیہ کیسے بن سکتی ہے؟ (امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ)

جواب: فقہاء نے اس آیت کے بارے میں کہا ہے کہ سیاق وسباق سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس

آیت میں خطاب اولی الامر یا علمۃ الناس سے ہے۔ نہ محض اولیاء سے اسلیے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ استدلال کہ ولیوں کو غیر شادی شدہ عورتوں کے نکاح کردینے کا حکم ان کے اختیار پر دلالت کرتا ہے محلِ نظر ہے۔ نیز اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ اس آیت قرآنی میں نکاح کے سلسلے میں اولیاء کو خطاب کیا گیا ہے تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ولی کی اجازت کا ہونا نکاح کے جواز کی کوئی شرط ہے۔ بلکہ یہ امر لوگوں کے درمیان عرف اور عادت کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ کیوں کہ عام طور پر لڑکیاں اپنا نکاح خود نہیں کرتیں اس کے لیے ان کو مردوں سے میل جول پیدا کرنے کی ضرورت ہوگی اور ایسا کرنے سے ان کو بے شرم کہا جائے گا۔ اس لیے باکرہ لڑکی کے نکاح میں ولی کی موجودگی یا اجازت عام طور پر مستحب ہے نہ کہ واجب۔

علاوہ ازیں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے (الرجال قوامون علی النساء اور فَانْكِحُوْهن باذن اهلهن) قرآنی آیات سے بھی استدلال کیا ہے لیکن جیسا کہ اہل علم پر واضح ہے کہ پہلی آیت کا تعلق ولایت نکاح سے نہیں بلکہ اس سے عورتوں پر مردوں کی فضیلت کا اظہار ہے۔ اور دوسری آیت کنیزوں کے نکاح کے بارے میں ہے نہ کہ آزاد، عاقلہ، بالغہ عورتوں کے نکاح کے بارے میں۔

احادیث سے استدلال:

۱۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا (ایما امراۃٍ نکحت بغیر اذن ولیها فنکاحها باطل باطل باطلٌ) (جو عورت اپنے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کرے اس کا نکاح باطل ہے باطل ہے باطل ہے)۔

جواب: امام جصاص رازی نے احکام القرآن میں فرمایا کہ یہ حدیث غیر ثابت ہے قد بینا عِلَلَه فی شرح الطحاوی. نیز اس حدیث کی راویہ حضرت ام المومنین حضرت

عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہ ہیں۔

لیکن جیسا کہ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کہ انہوں نے خود اپنی بھتیجی کا نکاح ان کے باپ کی غیر موجودگی میں کر دیا۔ جب راوی حدیث کا عمل اپنی مروی عنہ نہ حدیث کے خلاف ثابت ہو جائے تو وہ حدیث اس راوی کے نزدیک منسوخ ہونے کی دلیل ہوتی ہے۔ ورنہ وہ خود اپنی روایت کے خلاف عمل نہ کرتا۔ (کمابیّن فی الا صول)

۲۔ اسی طرح لا نکاح الا بولی یعنی ولی کے بغیر نکاح نہیں۔ والی حدیث سے بھی استدلال کیا گیا ہے لیکن یہ ہمارے خلاف نہیں۔ اس لیے کہ عاقلہ بالغہ اپنے نفس کی خود ولیہ ہے جس طرح مرد اپنے نفس کا ولی ہے۔ تو یہ نکاح بلا ولی نہ ہوا۔ نیز اس حدیث پر اصول محدثین کے مطابق تفسیر مظہری میں تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ (من شاء فلیر اجعہ) علاوہ ازیں بعض علماء سے منقول ہے کہ لا نکاح الا بولی والی حدیث رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں اس لیے اس کو صحیح بخاری و مسلم نے روایت نہیں کیا۔

ایسے ہی چند اور احادیث جن سے امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ نے استدلال فرمایا نقد و جرح سے خالی نہیں اس کے مقابلہ صحیحین کی روایتیں خصوصاً ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت (الایم احق بنفسھا من ولیھا) ثابت کرتی ہے کہ ولی کے مقابلے میں مولیہ کو اپنے نفس پر زیادہ اختیار حاصل ہے۔

بہر حال ولی کو عاقلہ بالغہ پر جبر کی ولایت حاصل نہیں جیسا کہ ان مذکور احادیث سے معلوم ہوا جن میں باکرہ اور ثیبہ عورتوں کے ان کے ولیوں کے کیے ہوئے نکاح رسول اللہ ﷺ نے ان عورتوں کی شکایت پر ادا کر دئے تھے کہ ولی کو ان عورتوں پر اجبار حاصل نہیں۔

فائدہ:

اگر عورت شرعی یا عرفی قانون شکنی کرنا چاہے تو اس کے ولی وارث نکاح سے روک سکتے ہیں۔ مثلاً مہر مثل سے کم پر یا غیر کفو میں یا چھپ کر بغیر گواہوں کے نکاح کرنا چاہے تو اس کو روکا

جا سکتا ہے شرعی غلطی میں نکاح ہوگا ہی نہیں۔اور ہر مسلمان کو منع کا
حق ہوگا۔عرفی غلطی میں اولیاء کو حق منع ہے نہ کہ دوسروں کو۔ بلکہ درمختار نے فرمایا کہ اگر عورت غیر
کفو میں بغیر اجازت ولی اپنا نکاح خود کرلے تو وہ ہوگا ہی نہیں اس پر فتوی ہے۔ یہ تمام
مسائل (بالمعروف) سے مستنبط ہوئے۔

فائدہ:

نکاح میں زوجین کی رضامندی ضروری ہے۔اگر بغیر اذن نکاح کردیا گیا تو ان کی اجازت
پر موقوف ہے جیسا کہ (تراضو) سے معلوم ہوا۔جبکہ زوجین عاقل بالغہ ہوں۔

۴۔ کفار پر احکام شرعیہ جاری نہیں۔ان کو ان کے شخصی معاملات میں آزادی ہوگی جیسا کہ
(من کان یومن باللہ) سے معلوم ہوا۔ہاں سیاسی احکام اور بعض اجتماعی معاملاتی قوانین
کفار پر بھی جاری ہوں گے اگر کسی بے دین کے نزدیک چوری، زنا یا کشت وخون جائز ہو تو
اسے اس سے روکا جائے گا۔اسی طرح اگر کافر مسلمان سے سود کا لین دین یا شراب کی خرید
وفروخت کرنا چاہے تو نہ کرنے دی جائے گی۔

۵۔ جہاں عورت کے نکاح کرنے کی منشاء ہو اور اس میں کوئی خرابی نہ ہو وہاں نکاح نہ ہونے دینا
منع ہے جیسا کہ (لا تعضلو ھن) سے معلوم ہوا۔

۶۔ نکاح طلاق کے مسائل میں ذمی کفار مذہبی لحاظ سے آزاد نہیں۔ کہ ان پر ان ہی کے مذہب
کے احکام جاری ہونگے حتی کہ اگر ان کے زوجین کے جھگڑے مسلمان حکام کے ہاں پیش
ہوں تو ان ہی کے مذہب کے متعلق فیصلہ کیا جاوے گا جیسا کہ (ذالک یوعظ بہ من
کان یومن با اللہ) سے معلوم ہوا۔واللہ اعلم

دودھ پلانے کے شرعی احکام

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

وَالۡوَالِدٰتُ يُرۡضِعۡنَ اَوۡلَادَهُنَّ حَوۡلَيۡنِ كَامِلَيۡنِ لِمَنۡ اَرَادَ اَنۡ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ وَعَلَى الۡمَوۡلُوۡدِ لَهٗ رِزۡقُهُنَّ وَكِسۡوَتُهُنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ لَا تُكَلَّفُ نَفۡسٌ اِلَّا وُسۡعَهَا لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوۡلُوۡدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ وَعَلَى الۡوَارِثِ مِثۡلُ ذٰلِكَ

(سورۃ البقرۃ:۲۳۳ جز اول)

''اور مائیں دودھ پلائیں اپنے بچوں کو پورے دو برس اس کے لیے جو دودھ کی مدت پوری کرنی چاہے اور جس کا بچہ ہے اس پر عورتوں کا کھانا اور پہننا ہے حسب دستور کسی جان پر بوجھ نہ رکھا جائے گا مگر اس کے مقدار بھر ماں کو ضرر نہ دیا جائے اس کے بچے سے۔اور نہ اولاد والے کو اس کی اولاد سے۔یا ضرر نہ دے اپنے بچے کو اور نہ اولاد والا اپنی اور جو باپ کا قائم مقائم ہے اس پر بھی ایسا ہی واجب ہے۔''

تعلق:

پچھلی آیت میں ذکر تھا کہ طلاق والی عورتوں کو تکلیف نہ پہنچاؤ۔اور تکلیف دو قسم کی ہے جسمانی اور روحانی جسمانی تکلیف کے بعد روحانی تکلیف کی ممانعت کی گئی کہ ان کے دودھ پیتے بچے ان سے نہ چھینو کہ اس میں ان کو روحانی (قلبی) ایذا پہنچے گی۔قبل از اسلام عورتوں پر ایک یہ بھی ظلم ہوتا تھا کہ ان کے شیر خوار بچے ان سے چھڑا دیئے جاتے تھے کبھی تو طلاق دے کر ان سے بچے چھین لیے۔کبھی اس طرح کہ ان کے بچے خصوصاً لڑکیاں ان کی گود سے چھین کر زندہ دفن کر دیتے۔اس ظلم کو روکنے کے لیے یہ آیات نازل ہوئیں۔حضور رحمۃ اللعالمین علیہ الصلوۃ

والتسلیم نے تو لونڈی غلاموں کے بچوں بلکہ دو چھوٹے بھائی غلاموں کو الگ کرنے سے منع فرمادیا بلکہ چڑیوں اور دوسرے جانوروں کے شیر خوار یا بہت چھوٹے بچوں کو الگ کرنا ممنوع قرار دے دیا۔ یہ اسلام کی پیاری پیاری تعلیم ہے۔

تفسیر:

وَالْوَالِدٰتُ یُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ: (مائیں دودھ پلائیں اپنے بچوں کو) وَالْوَالِدٰتُ سے مراد یا تو طلاق والی عورتیں ہیں۔ کہ پہلے طلاق کا ذکر ہوا اور آئندہ فرمایا جارہا ہے کہ ان عورتوں کا کھانا کپڑا بچہ کے باپ پر واجب ہے۔ (کبیر) ممکن ہے کہ اس سے ساری مائیں مراد ہوں خواہ طلاق والی ہوں یا اپنی بیویاں کیوں کہ آنے والے احکام سب کو عام نہیں۔ (والوالدت) فرما کر اپنے بچوں کی پرورش پر مائل کیا گیا۔ عربی زبان میں ماں کو ام بھی کہتے ہیں اور والدہ بھی مگر ان دونوں لفظوں میں فرق ہے کہ ام عام ہے۔ کہ اس میں کبھی سگی، سوتیلی ماں، دادی، نانی خالہ بلکہ استاد کی بیوی بھی شامل ہوتی ہے۔ رب تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ (حُرِّمَتْ عَلَیْکُمْ اُمَّهٰتُکُمْ) اس میں سگی، سوتیلی دادی نانی سب داخل ہیں۔ مگر والدہ صرف سگی ماں کو ہی کہا جائے گا ارشاد باری ہے کہ (اِنْ اُمَّهٰتُهُمْ اِلَّا الّٰئِیْ وَلَدْنَهُمْ) یہاں والدہ فرما کر بتایا گیا کہ صرف سگی ماں دودھ پلائے گی۔ (یُرْضِعْنَ) رضع سے بنا جس کے معنی دودھ کے لیے پستان چوسنا باب انعال میں آکر چوسانے کے معنی پیدا ہوئے یعنی دودھ پلانا۔ اور یہاں یہ لفظ خبر بمعنی امر ہے۔ لیکن یہ امر استحبابی ہے کیوں کہ بچوں کی پرورش اور انہیں دودھ پلانا ماں پر واجب نہیں صرف مستحب ہے۔ (کبیر، ملخصا) چوں کہ ماں کا دودھ بچوں کو زیادہ موافق ہے اور وہی زیادہ مہربان بھی ہے لہٰذا بہتر ہے کہ خود ہی پالے ۔ ہاں اگر باپ میں دائی رکھنے کی طاقت نہ ہو۔ یا دائی ملتی نہ ہو یا بچہ ماں کے سوا کسی کا دودھ قبول نہ کرتا ہو تو ماں پر دودھ پلانا واجب ہے۔ (کبیر، احمدی وغیرہ) (اَوْلَادَهُنَّ) فرما کر یہ بتادیا کہ عورت کے ذمہ اپنے پیٹ کے بچہ کی پرورش ہے نہ کہ سوکن کہ بچے کی۔ مطلقہ بیویوں کو

(والوالدت) فرما کر اور بچوں کو اولادھن کہہ کر لطیف اشارہ اسی طرف کیا گیا ہے بعد طلاق اگر چہ وہ عورتیں تمہاری بیویاں نہ رہیں مگر وہ اپنے بچوں کی بدستور ماں ہیں۔ لہٰذا طلاق کی وجہ سے ان کے حق پرورش اور دودھ پر کیسے اثر پڑے گا وہی بچوں کو دودھ دیں گی اور پالیں گی۔ (نعیمی ملخصا)

حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ : (پورے دو برس) حول کے معنی متغیر ہونا، بدلنا، پلٹنا وغیرہ چوں کہ سال بھر میں سورج اپنی گردش پوری کرلیتا ہے۔ (مفردات) یا سال بھر میں عالم میں ایک انقلاب سا ہو جاتا ہے یا سال بھر میں چند موسم تبدیل ہوتے ہیں اسلیے اسے حول کہتے ہیں۔ حولین کے بعد کاملین فرما کر بتایا کہ اس سے تقریبی مدت مراد نہیں بلکہ پورے دو سال مراد ہیں۔ یعنی مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں۔

لِمَنْ اَرَادَاَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ : (جو دودھ کی مدت پوری کرنا چاہے) یعنی دو سال کا حکم ان ماں باپ کے لیے ہے جو کامل رضاعت چاہیں۔ اور جو اس سے پہلے ہی چھڑانا چاہے چھڑادے بشرطیکہ اس میں بچہ کو خطرہ نہ ہو۔

وَعَلَى الْمَوْلُوْدِلَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ : (اور جس کا بچہ ہے اس پر عورتوں کا کھانا اور پہننا حسب دستور) علیٰ لازم کرنے کے لیے ہے۔ اور مولودلہ سے مراد باپ ہے۔ کیوں کہ بچہ باپ کے لیے جنا جاتا ہے اور اسی کا ہوتا ہے۔ اس لیے اسے مولودلہ کہا گیا (کبیر) اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ماں بچے سے بالکل لاتعلق ہے۔ بلکہ ماں کا حق خدمت اولاد پر باپ سے بہت زیادہ ہے اسی لیے اس آیت میں ایک جگہ تو بچہ کو ماں کی طرف مضاف کیا فرمایا بولدھا اور دوسری جگہ باپ کی طرف اشارہ ہوا بولدہ تاکہ معلوم ہو کہ بچہ ماں کا بھی ہے اور باپ کا بھی۔ رزق سے غذا اور کسوت سے لباس مراد ہے۔ اگر یہاں طلاق والی عورتیں مراد تھیں تب تو اس کے معنی بالکل ظاہر ہیں کہ طلاق والیوں کا کھانا کپڑا دودھ پلانے کی مدت میں باپ پر واجب ہے۔ اور اگر عام عورتیں مراد ہیں تو مطلب یہ ہے کہ اگر بچے کی ماں پرورش کی وجہ سے شوہر کی خدمت نہ کر سکے تب بھی اس کا خرچہ باپ کے ذمے ہے۔ کیوں کہ بچے کی پرورش بھی شوہر کی

خدمت ہے۔ (کبیر ملخصا، نعیمی وغیرہ) بالمعروف سے حسب طاقت خرچہ مراد ہے یا یہ مطلب ہے کہ بچہ کی شیر خوارگی و پرورش کے زمانہ میں جس قسم کا کھانا دینے کا رواج ہے اس قسم کا کھانا دیا جائے۔ یا معروف بمعنی مشہور فی العرف و مروج ہو تو معنی یہ ہونگے کہ شیر خوارگی کے زمانے میں ایسے کھانے دیئے جائیں جس سے دودھ زیادہ ہو۔ (نعیمی)

لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا : (کسی جان پر بوجھ نہ رکھا جائیگا مگر اس کے مقدور بھر) تکلف کلف سے بنا جس کے معنی ہیں۔ چہرہ کے سیاہ دھبے (مفردات) اصطلاح میں مشقت میں ڈالنے یا لازم کرنے کے لیے آتا ہے۔ چوں کہ اس کا اثر بھی چہرہ پر ظاہر ہوتا ہے۔ اسلیے اسے تکلیف کہتے ہیں۔ وسعٌ کے معنی گنجائش اور چوڑائی کے ہیں۔ اصطلاح میں طاقت اور قدرت کے لیے آتا ہے۔ یعنی کسی نفس کو طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دی جاتی۔

لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ : {لَا تُضَآرَّ} کو مجہول و معروف دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔ باء سببیت کے لیے ہے۔ ہر دو قراءت کے اعتبار سے اس کے معنی حسب ذیل بنتے ہے۔ (۱) نہ نقصان پہنچائی جائے ماں اپنے بچہ کی وجہ سے (کہ وہ اسے پالنا نہ چاہے اور باپ میں دائی رکھنے کی گنجائش بھی ہو۔ مگر نہ رکھے اور ماں ہی کو مجبور کرے) اور باپ اپنے بچہ کے ذریعہ نقصان نہ پہنچایا جائے۔ یہ معنی جبکہ مجہول پڑھا جائے۔ (۲) نہ نقصان پہنچائے ماں اپنے بچہ کو کہ اس کی پرورش میں کوتاہی کرے ایسے ہی باپ نہ نقصان پہنچائے اپنے بچہ کو کہ اسکی پرورش میں کوتاہی کرے۔ یا باپ نہ نقصان پہنچائے ماں کو اپنے بچہ کی وجہ سے معنی معروف کی صورت میں ہوگا۔ اور ہر دو صورت میں (لا مولودٌ لہ) میں لا کے بعد یضارّ مخذوف ہوگا (فافہم)

یہ سارے مذکورہ احکام جب ہیں کہ باپ زندہ ہو۔ لیکن اگر نہ ہو تو (**وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ**) (اور جو باپ کا قائم مقائم ہے اس پر بھی ایسا واجب ہے) یہ علی بھی الزام کے لیے ہے۔ اور الوارث میں الف لام مضاف الیہ کے عوض ہے اور اس سے بچے کا وارث مراد ہے۔ اور بعض نے فرمایا کہ باپ کا وارث مراد ہے۔ (روح المعانی) ہمارے نزدیک قول صحیح بچہ کا وارث مراد ہونا

ہےاور وارث سے ذی رحم محرم یعنی وہ قرابت دار جن سے نکاح ہمیشہ حرام ہو یعنی اگر باپ زندہ نہ ہو تو یتیم بچہ کا خرچہ اس کے ذی رحم قرابت داروں پر واجب ہے۔ نیز اگر بچے کی ماں نہ ہو تو اس کی نانی،، بہن، خالہ وغیرہ اس کی پرورش کریں اور پرورش کا خرچہ بچے کے باپ پر ہوگا۔

(فوائد و مسائل)

فائدہ نمبر (۱):

ماں کے ذمہ اپنے حقیقی بچہ کی پرورش ہے نہ کہ سوتیلے کی کیوں کہ یہاں اولادھن فرمایا نہ کہ اولاد الازواج

مسئلہ: بحالت نکاح اور بحالت عدت ماں کو شوہر سے دودھ پلانے کی اجرت لینا جائز نہیں۔ (در مختار) ہاں بعد عدت جائز ہے۔

مسئلہ: ماں کے مقابلے میں دوسری عورت کو بچے کی پرورش کا حق نہیں یعنی باپ ماں سے بچے کو نہیں چھین سکتا ہاں طلاق والی بیوی اگر زیادہ اجرت مانگتی ہے یا بچے کے غیر محرم سے نکاح کر لیا تو اس کا حق پرورش جاتا رہا۔ اگر اس کے محرم سے نکاح کیا تو حق پرورش باطل نہ ہوا۔ (در مختار بقدر ضرورۃ) محرم سے مراد یہ ہے کہ اس بچے سے اس کا ایسا رشتہ ہے کہ اگر اس رشتہ دار اور بچہ میں سے ایک کو عورت فرض کریں تو باہم نکاح درست نہ ہو۔

مسئلہ: دودھ کی مدت امام صاحب کے ہاں ڈھائی سال اور صاحبین کے نزدیک دو سال مگر فتوی صاحبین کے قول پر ہے۔ کہ دو سال پر دودھ چھوڑ دیا جائے۔ مگر جو بچہ ڈھائی سال کی عمر تک کسی عورت کا دودھ پی لے وہ اس کا رضاعی بیٹا ہو جائے گا۔

فائدہ (۲):

یہ آیت بظاہر صاحبین کے قول کی تائید کرتی ہے کہ اس میں مدت رضاعت دو سال فرمائی گئی اور ساتھ ہی اس طرف بھی اشارہ کر دیا گیا کہ اس کی پوری مدت ہے۔ نیز دوسری جگہ ارشاد ہوا (وَحَمْلُهٗ وَفِصَالُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا) یعنی بچے کا حمل اور شیر خوارگی تیس مہینے یعنی ڈھائی سال ہیں۔ جس میں چھ ماہ حمل کی ادنی مدت ہے۔ اور دو سال شیر خوارگی کی۔ نیز عورت کا دودھ بدن انسان کا جز ہے جس کا استعمال بلا ضرورت ناجائز اور چوں کہ دو سال بعد بچے کو اس کی ضرورت نہیں رہتی لہٰذا اس کا استعمال ناجائز ہونا چاہیے۔

امام صاحب رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت دودھ پلانے کی اجرت کے حق کے لیے ہے۔ یعنی طلاق والی بیوی کو دو سال تک شوہر سے دودھ کی اجرت لینے کا حق ہے۔ اس کے بعد باپ پر جبر نہ ہوگا نیز اسی آیت کے اگلے جملہ میں ارشاد ہوتا ہے (فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا) (کہ اگر ماں باپ دو سال کے بچے کا دودھ چھڑانا چاہیں)۔ اگر دو سال ہی دودھ کی مدت ہوتی تو اِنْ اَرَادُ کے کیا معنی ہیں؟ دودھ چھڑانا واجب ہونا چاہیے تھا۔ (نعیمی، مظہری وغیرہ) نیز رب تعالیٰ فرماتا ہے (حَمْلُهٗ وَفِصَالُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا) یعنی اس کا حمل بھی تیس مہینے اور دودھ چھڑانے کی مدت بھی تیس ماہ ہے یعنی (ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا) حمل وفصال میں سے ہر ایک کی خبر ہے۔ یعنی مدت حمل بھی تیس ماہ اور مدت فصال بھی تیس ماہ تو یہ آیت دونوں کی اکثر مدت بیان کرنے کے لیے ہے۔ پھر چوں کہ مدت حمل کے لیے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہ کا یہ صحیح ارشاد موجود ہے۔ (وَاللّٰهِ لَا يَبْقَى الْوَلَدُ فِى الْبَطْنِ اَكْثَرُ مِنْ سنتين) (بچہ پیٹ میں دو سال سے زیادہ نہیں رہتا۔ اور مدت رضاعت کے بارے میں ایسا کوئی حکم نہیں پایا جاتا۔ لہٰذا اکثر مدت حمل دو سال اور اکثر مدت فصال ڈھائی سال (والتفصیل فی التفسیرات الاحمدیہ تحت قولہ تعالیٰ حملہ وفصالہ ثلثون شھراً) ایضاً " الفتح المبین " میں نہایت شرح وبسط سے اس مسئلہ کو بیان کیا گیا ہے۔

فائدہ(۳):

اگر خاوند اپنی بیوی کو خرچہ نہ دے تو وہ حکومت یا پنچایت یا برادری کے زور سے حاصل کرے۔

فائدہ(۴):

بچہ باپ کا ہے اس سے نسب ہے نہ کہ ماں سے کیوں کہ یہاں باپ کو مولودلہٗ فرمایا گیا۔لہٰذا جس کا باپ سید اور ماں غیر سید ہو وہ بچہ سید ہے۔اور جس کی ماں سیدانی اور باپ غیر سید ہو تو بچہ سید نہیں کہ اسے زکواۃ لینا جائز ہے۔

فائدہ(۵):

باپ اپنی اولاد کے مال کا مالک ہے کہ اسے خرچ کرنا جائز کیوں کہ یہاں باپ کو مولودلہٗ فرمایا گیا۔جب وہ بچہ کا مالک ہوا تو اس کے مال کا بدرجہ اولیٰ حدیث شریف میں ہے کہ (اَنْتَ وَمَالُکَ لِاَبِیْکَ)اگر کوئی اپنے بیٹے کا مال خرچ کرلے تو اس پر کوئی تاوان نہیں نیز قاتل باپ پر قصاص نہیں۔(نعیمی)

فائدہ(۶):

اولاد کا خرچہ صرف باپ کے ذمہ ہے۔نہ کہ ماں پر نہ کسی اور پر جیسا کہ (علی المولودلہٗ) سے معلوم ہوا۔

فائدہ(۷):

حاجت مند باپ کا خرچ صرف اولاد پر ہے۔نہ کہ کسی اور پر مگران پر بقدر میراث ہوگا۔ مثلاً ایک غریب آدمی کے ایک بیٹا اور بیٹی مال دار ہیں تو تہائی خرچہ صرف بیٹی کے ذمہ

ہے۔ اور دو تہائی بیٹے کے ذمہ ہے کیوں کہ ان کی میراث بھی ایسے ہی ہے۔

۱۔ چھوٹے بچوں کا خرچہ بہر حال باپ پر ہے۔ خواہ ان کے پاس اپنا مال ہو یا نہ ہو کیوں کہ یہاں دائی کا معاوضہ بہر صورت باپ پر لازم کیا گیا ہے۔

۲۔ جوان بے دست و پاؤ بیٹا اور حاجت مند جوان بیٹی کا خرچ بھی باپ پر لازم ہے۔ کیوں کہ وہ مولودلہٗ ہے۔

۳۔ اگر بچے کی ماں مر جائے تو اس کی نانی پھر بہن پھر خالہ پھر دادی وغیرہ پرورش کریں اور اگر باپ فوت ہو جائے تو پرورش کا خرچہ دادا پھر بھائی پھر چچا وغیرہ برداشت کریں جیسا کہ وعلى الوارث مثل ذالک} سے معلوم ہوا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ

(سورۃ البقرۃ:۲۳۳ جز دوم)

''پھر اگر ماں باپ دونوں آپس کی رضا اور مشورہ سے دودھ چھڑانا چاہیں تو ان پر گناہ نہیں۔ اور اگر تم چاہو کہ دائیوں سے اپنے بچے کو دودھ پلواؤ تو بھی تم پر مضائقہ نہیں جبکہ جو دینا ٹھہرا تھا بھلائی کیساتھ انہیں ادا کر دو اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ اللہ تمہارے کام دیکھ رہا ہے۔''

پچھلے جملہ میں دودھ پلانے کا ذکر تھا اب ان کے دودھ چھڑانے کے احکام وغیرہ بیان ہونگے۔

تفسیر:

فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا : ارادا کا فاعل ماں باپ دونوں ہیں۔(خازن) چوں کہ بچے سے باپ کو نسبت ہے اور ماں کو شفقت اسلیے دودھ چھڑانا دونوں ہی کی مرضی پر یہ موقوف کیا گیا (نعیمی، روح البیان)

فِصَال :فصل سے بنا بمعنی جدائی اونٹ کے بچے کو فصیل یعنی دودھ چھڑایا ہوا بچہ لیکن اونٹ کے بچے ہی کے ساتھ خاص ہے۔ نیز مسافر کے شہر سے نکل جانے کو بھی فصل کہتے ہیں۔(ولما فصلت العیر) راستہ کی مسافت کو فاصلہ کہہ دیتے ہیں (مفردات) یہاں اس سے بچے کا دودھ چھڑانا مراد ہے۔ کہ دودھ چھوٹ کر بچہ ماں سے الگ ہو جاتا ہے۔ امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ

علیہ فرماتے ہیں کہ اکثر مفسرین کا قول یہ ہے کہ فصال بمعنی فطام کے ہیں۔ چوں کہ شیر خوارگی کی مدت تو پہلے جملہ میں بیان ہو چکی لہٰذا فصال کا کچھ اور مقصد ہونا چاہیئے۔ چناں چہ سیدنا عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس سے دو سال سے پیشتر یا دو سال پر یا اس کے بھی بعد دودھ چھڑانا مراد ہے۔ (کبیر) اور یہ امام صاحب کی قوی دلیل ہے۔

عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ : تراض رضا سے بنا باب تفاعل میں آکر آپس کی رضامندی کے معنی میں ہوا۔ ایسے ہی تشاور مشورہ سے بنا بمعنی نکالنا اسی لیے گھر کے سامان کو شوار کہتے ہیں ۔(کبیر) اصطلاح میں چند رائیں جمع کرنے کو مشورہ یا تشاور کیا جاتا ہے۔ یعنی ماں باپ آپس کی رضامندی یا مشورہ سے دودھ چھڑانا چاہیں تو چھڑا سکتے ہیں۔ (نعیمی) یا ماں باپ آپس میں رضامند ہوں اور پھر وہ کسی اہل علم سے مشورہ کریں اور وہ بتائے کہ اس وقت میں دودھ چھڑانا اس بچہ کو کچھ مضر نہیں (مظہری، خازن وغیرہ)

فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا : (تو ان پر گناہ نہیں) دونوں کی رضامندی اس لیے معتبر رکھی گئی تا کہ ان میں سے ایک کسی غرض وغیرہ کی وجہ سے ایسا نہ کر بیٹھے کہ جس سے بچہ کو ضرر ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ دونوں میں سے ایک کی رائے لیے بغیر آپس کی رضامندی اور رائے والوں سے مشورہ لینے کے دو برس سے پہلے دودھ چھڑانا جائز نہیں۔

وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ (اگر تم چاہو کہ دائیوں سے اپنے بچوں کو دودھ پلاؤ) یہاں (اَرَدْتُّمْ) فرما کر صرف باپ سے خطاب ہوا۔ کہ دائی رکھنے میں باپ مستقل ہے۔ بعض علماء نے فرمایا کہ تَسْتَرْضِعُوْٓا کا پہلا مفعول پوشیدہ ہے یعنی دائیاں اور دوسرا مفعول (اولادکم) اور بعض نے فرمایا کہ اولاد سے پہلے لام پوشیدہ ہے اور استرضاع کے معنی ہیں دائی تلاش کرنا یعنی اے والدو! اگر تم دائیوں سے اپنی اولاد کو دودھ پلوانا چاہو یا ان کے لیے کوئی دائی تلاش کرو۔ یہ سب اس وقت ہے جب کہ بچوں کی مائیں انہیں دودھ پلانے سے انکار کر دیں یا تو اپنی کسی تکلیف کی وجہ سے یا دودھ نہ ہونے کی وجہ سے اگر وہ مطلقہ ہوں اور نکاح چاہتی ہوں یا وہ

دائیوں سے زیادہ تنخواہ مانگتی ہوں۔

(کبیر۔ملخصًا)

فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِذَا سَلَّمْتُمْ مَّا آتَيْتُم بِالْمَعْرُوفِ (تو بھی تم پر مضائقہ نہیں جبکہ جو دینا ٹھہرا تھا بھلائی کیساتھ انہیں ادا کردو) **سَلَّمْتُمْ** تسلیم سے بنا اسلام کی طرح اس کا مادہ بھی مسلم ہے۔یعنی آفات سے محفوظ رہنا پوری فرمانبرداری۔راضی برضا رہنے کو بھی تسلیم کہہ دیتے ہیں۔یہاں پورا پورا سونپنا اور سپرد کرنا مراد ہے۔**ما اتيتم** سے ارادہ کرنا دے دینے کا انکار کرنا یا اجرت طے کرنا مراد ہے۔یعنی جب تم ان دائیوں کی طے شدہ اجرت دے دو خیال رہے کہ تسلیم جواز اور صحت کی شرط نہیں بلکہ یہاں استحباب ہے کہ بہتر ہے کہ دائی کی اجرت دینے میں جلدی کرے تاکہ وہ بچے کی پرورش میں دل لگا کر محنت کرے (نعیمی، کبیر وغیرہ)

بالمعروف: یہ **سلمتم** کے متعلق ہے اور اس سے خوش معاملگی اور بھلائی مراد ہے۔بعض علماء نے فرمایا کہ معروف سے مراد رزق حلال ہے۔یعنی دایہ کو حلال کمائی سے اجرت دو کیوں کہ جب وہ حلال کھائے گی تو اس کا دودھ بچے کے لیے بہت زیادہ نافع اور (صالح کان انفع للصبی و اقرب) کی اصلاح ہوگا کیوں کہ ماں کی غذا کا بچہ کی صحت اور اخلاق پر خیر و شر کے اعتبار سے اثر پڑتا ہے۔(روح البیان، نعیمی)

وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ :ان تمام احکام مذکور میں اللہ سے ڈرتے رہو اور یہ دھیان رکھو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال دیکھ رہا ہے۔

(فوائد و مسائل)

۱۔ صاحبین کے قول پر ماں باپ کی رضا مندی سے دو سال پہلے دودھ چھڑایا جا سکتا ہے۔ مگر دو سال پورے ہونے پر دودھ چھڑانا واجب ہے کسی کے مشورے کی حاجت نہیں۔ امام صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے نزدیک اس سے پہلے۔ اس وقت بلکہ اس کے بعد دودھ چھڑانا مشورہ سے ہوگا۔ ہاں ڈھائی برس پورے ہونے پر واجب ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ رضاعت میں فتوی صاحبین کے قول پر ہے یعنی دو سال کے بعد بچے کا دودھ چھڑا لینا چاہیے اگرچہ عند الطلب۔

۲۔ بچہ کے لیے بہترین دائی اور دائی کے لیے بہترین غذا تجویز کی جائے۔

۳۔ معاملات میں خوش اسلوبی نہایت ضروری ہے ساری چیزیں پہلے طے ہو جائیں اور وقت پر ادا کر دی جائیں جیسا کہ بالمعروف سے معلوم ہوا۔

ہدایات:

۱۔ بہتر یہ ہے کہ بچے کی پیدائش کے بعد غسل دے کر فوراً اس کے داہنے کان میں اذان اور بائیں میں تکبیر کہہ دی جائے نیز بچہ کی تحنیک کرادی جائے اور وہ یہ ہے کہ کوئی بزرگ خرمہ چبا کر اپنی زبان سے بچہ کے تالو میں لگا دے تاکہ سب سے پہلے بچہ کے پیٹ میں اللہ والے کا لعاب پہنچے۔

۲۔ عورتوں کو چاہیے کہ بلا ضرورت ہر بچہ کو دودھ نہ پلایا کریں ضرورتاً پلائیں اور پھر سب میر ظاہر بھی کر دیں کیوں کہ دودھ پر بہت سے احکام شرعی جاری ہوتے ہیں۔

عدت وفات کا بیان

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَ الَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّ عَشْرًا فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ (سورۃ البقرۃ:۲۳۴)

''اور تم میں سے جو مریں اور بیویاں چھوڑیں وہ چار مہینہ اور دس دن اپنے آپ کو روکے رہیں تو جب ان کی عدت پوری ہو جائے تو (اے والیو) تم پر مواخذہ نہیں اس کام کا جو عورتیں اپنے معاملے میں موافق شرع کریں اور اللہ کو تمہارے کاموں کی خبر ہے''

وَ الَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُم : (اور تم میں جو مریں) یتوفون۔توفی سے بنا بمعنی پورا لے لینا اس کا مادہ وفی یا وفا ہے وعدہ پورا کرنے کو وفاءِ عہد اور حق لینے کو استیفاءِ حق کہتے ہیں۔اور موت اور نیند پر بھی استعمال ہوتا ہے کیوں کہ انسان اپنی عمر پوری کر کے اور پورا رزق کھا کر ہی مرتا ہے۔اور نیند میں بھی ایک روح نکل جاتی ہے۔اس تناسب سے اسے بھی وفات کہہ دیا جاتا ہے۔(یعنی یہاں بمعنی موت ہے)۔منکم میں مسلمانوں سے خطاب ہے۔معلوم ہوا کہ کفار کے یہ احکام نہیں ۔یعنی اے مسلمانوں! تم میں سے جو مر جائیں (**وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا**) (اور بیویاں چھوڑ جائیں) (یذرون) وِذرا سے بنا بمعنی چھوڑنا۔ازواج جمع زوج کی ہے بمعنی جوڑا بیوی کو بھی زوج کہتے ہیں اور خاوند کو بھی مگر یہاں بیویاں مراد ہیں۔

يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّ عَشْرًا : (وہ چار مہینہ اور دس دن اپنے آپ کو روکے رہیں) لفظِ عشر کو مؤنث ذکر کرنا لیالی کے اعتبار سے ہے۔کیوں کہ لیالی سے ہی مہینوں اور

دنوں کی ابتداء ہوتی ہے۔عرب کا قاعدہ ہے کہ جب کسی عدد کو لیالی اور ایام میں مبہم کرنا منظور ہوتا ہے۔تو لیالی کو ایام پر غلبہ دے کر لیالی کا استعمال کرتے ہیں اور ایسے موقع میں مذکر کا استعمال نہیں کرتے۔چناں چہ کہتے ہیں (صمت عشراً) ۔قرآن مجید میں ہے(ان لبثتم الا عشراً) (مظہری) یعنی ان کی بیویاں چار مہینے دس دن اپنے کو دوسرے نکاح اور تیاری نکاح اور زینت اور بلاضرورت باہر جانے سے روکیں۔یہ آیت حاملہ وغیرہ سب عورتوں کو شامل تھی پھر اس کا حکم حاملہ عورتوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا قول ہے (وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ) نازل ہوا یعنی حاملہ کی عدت وضع حمل ہے۔

فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ :اجل سے انتہائی عدت اور بلوغ سے اس تک پہنچنا مراد ہے۔یعنی جب کہ عورتیں اپنی انتہائی عدت کو پہنچ جائیں کہ عدت پوری ہو جائے۔

فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُم :(تو اے والیو تم پر مواخذہ نہیں) یہ عورتوں کے وارثوں سے خطاب ہے ۔اور حکام سے بھی۔(بیضاوی) کیوں کہ عدت والی کو ان باتوں یعنی نکاح وغیرہ سے روکنا سب پر ضروری ہے۔

فِيْمَا فَعَلْنَ فِیْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ :(اس کام میں جو عورتیں اپنے معاملہ میں موافق شرع کریں) ما سے مراد تمام وہ چیزیں جو عدت میں عورتوں پر حرام ہو گئی تھیں۔یعنی تمام عدت کے بعد عورتیں، زینت یا نکاح ثانی اور گھر سے نکلنا وغیرہ جو کچھ بھی کریں تو اے والیو اور حاکموں تم پر کوئی گناہ نہیں بشرطیکہ موافق شرع کریں۔

وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ :(اور اللہ کو تمہارے کاموں کی خبر ہے) یہ سارے عورتوں مردوں سے خطاب ہے یعنی اے عورتوں اور مردوں اللہ تمہارے ہر نیک و بد عمل سے باخبر ہیں لہٰذا اس کے احکام کی پابندی کرو اور مخالفت سے بچو تا کہ عذاب سے نجات پا کر ثواب دارین پاؤ۔

(فوائد ومسائل)

۱۔ عدت کے احکام صرف مسلمانوں کے لیے ہیں۔ کفار پر جاری نہیں جیسا کہ منکم سے معلوم ہوا لہٰذا اگر کفار بغیر عدت ہی نکاح کرلیں اور یہ ان کے دین میں جائز ہو اور پھر اسلام لائیں تو ان کا پچھلا نکاح باقی رہے گا۔

۲۔ موت کی عدت عورت پر واجب ہے نہ کہ مرد پر جیسا کہ (یتربصن) سے معلوم ہوا۔

مسئلہ: موت کی عدت چار مہینے دس دن ہے۔ یعنی دسویں رات بھی گزرنا ضروری ہے۔ بشرطیکہ نکاح صحیح ہوا ہو دخول ہوا یا نہیں دونوں کا ایک ہی حکم ہے۔ مسلمان کی عورت کتابیہ ہو تو اس کی بھی یہی عدت ہے۔ مگر اس عدت وفات میں شرط یہ ہے کہ عورت کو حمل نہ ہو۔ (جوہرہ)

مسئلہ: خاوند کی موت اگر چاند رات کو ہوئی ہو تو تب یہ مہینے خواہ انتیس کے ہوں یا تیس کے چاند کے حساب سے پورے کیے جائیں گے ورنہ آزاد عورت کے لیے ۱۳۰ (ایک سو تیس دن) اور باندی کے لیے ۶۵ پینسٹھ دن (درمختار)

مسئلہ: شوہر کی موت سے نکاح بالکل نہیں ٹوٹ جاتا مگر عورت کی موت سے بالکل جاتا رہتا ہے لہٰذا عورت اپنے خاوند کی میت کو بوقتِ ضرورت غسل بھی دے سکتی ہے اور چھو بھی سکتی ہے۔ مگر شوہر مردہ بیوی کو نہ چھو سکتا ہے نہ غسل دے سکتا ہے۔ بلکہ اگر غسال نہ ملے تو ہاتھ پر کپڑا لپیٹ کر تیمم کرادے۔ (درمختار)

مسئلہ: عوام میں جو یہ مشہور ہے کہ شوہر عورت کے جنازے کو نہ کندھا دے سکتا ہے، نہ قبر میں اتار سکتا ہے نہ منہ دیکھ سکتا ہے یہ محض غلط ہے۔ صرف نہلانے اور اس کے بدن کو بلا حائل ہاتھ لگانے کی ممانعت ہے۔

مسئلہ: عدت موت ہر بیوی پر یکساں لازم ہے حاملہ اور لونڈی کے سوا باقی سب عورتوں کو چاہے بالغہ ہوں یا نابالغہ چار ماہ دس دن ہی عدت گزارنا ہوگی۔

مسئلہ: حاملہ کی عدت مدت بچہ کی پیدائش ہے اگر ایک منٹ بعد وضع حمل ہوگیا اور اعضاء بن چکے ہیں تو عدت پوری ہو جائے گی ورنہ نہیں۔ (جوہرہ)

مسئلہ: موت کی عدت میں بہر حال سوگ واجب ہے کہ عورت نہ تو سرمہ لگائے، نہ تیل، نہ خوشبو ملے، نہ رنگین یا ریشمی کپڑے پہنے، نہ مہندی لگائے نہ دوسرے نکاح کا پیغام و سلام کرے۔

مسئلہ: شوہر کے سوا اور کسی قرابت دار کی موت پر تین دن سے زیادہ سوگ کرنا حرام ہے۔

تمام مذکور بالا احکام حضور نبی کریم ﷺ کے نہیں کہ حضور ﷺ کی وفات شریف کے بعد ان کی ازواجِ پاک کسی سے کبھی نکاح نہیں کرسکتیں۔ کیوں کہ حضور ﷺ حیات النبی ہیں۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے (ولا ان تنکحوا ازواجه من بعده ابداً) ۔ نہ اس لیے کہ وہ مسلمانوں کی مائیں ہیں وہ بیویاں احترام میں تو ماؤں سے بڑھ کر ہیں۔ مگر احکام میں مائیں نہیں۔ اسی لیے ان سے پردہ فرض، ان کی اولاد سے امت کا نکاح درست، ان کی میراث امت کو نہیں ملتی۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۥ وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ (سورۃ البقرۃ:۲۳۵)

''اور تم پر گناہ نہیں اس بات میں جو پردہ رکھ کر تم عورتوں کے نکاح کا پیغام دو۔یا اپنے دل میں چھپا کر رکھو اللہ جانتا ہے کہ اب تم ان کی یاد کرو گے۔ہاں ان سے خفیہ وعدہ نہ کر رکھو مگر یہ کہ اتنی ہی بات کہو جو شرع میں معروف ہے اور نکاح کی گرہ پکی نہ کرو جب تک لکھا ہوا حکم اپنی میعاد نہ پہنچ جائے اور جان لو کہ اللہ تمہارے دل کی جانتا ہے۔تو اس سے ڈرو اور جان لو کہ اللہ بخشنے والا حلم والا ہے''

گزشتہ آیت میں عدت میں نکاح سے ممانعت کی گئی تھی۔اب نکاح کے پیغام وسلام کی ممانعت فرمائی جارہی ہے،اس زمانہ میں نکاح تو کیا نکاح کا صریح ذکر بھی نہ کرو۔

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ :(اور تم پر گناہ نہیں اس بات میں جو پردہ رکھ کر تم عورتوں کے نکاح کا پیام دو) یہ ان اجنبی مردوں سے خطاب ہے جو بیوہ عورتوں سے نکاح کا ارادہ کریں۔عَـرَّضْتُمْ عریض سے بنا جو تصریح کا مقابل ہے بمعنی اشارۃً کلام کرنا اس کا مادہ عرض بمعنی کنارہ ہے۔تعریض کے معنی ہوئے مقصد کے آس پاس گھومنا اور صاف ظاہر نہ کرنا۔تعریض اور کنایۃ میں یہ فرق ہے کہ کنایۃ کسی شئی کے لوازم بول کر ملزوم مراد ہو

جیسے کثیر الرماد (بہت راکھ والا) بہت بڑے مہمان دار کو بولتے ہیں اور تعریض مقصود پر قرینہ قائم کردینے کا نام (کبیر) خطبۃ خطب سے بنا خ کے کسرہ سے بمعنی پیغام اور خ کے پیش سے بھی وعظ و نصیحت یہاں نکاح کا پیغام دینے کے معنی میں ہے۔ النساء سے عدت موت گزارنے والی عورتیں مراد ہیں۔ یعنی اشارۃً در پردہ ان بیوگان کو پیغامِ نکاح دینے میں کوئی گناہ نہیں (نعیمی) سکینہ بنت حنظلہ بیوہ ہوگئی تو ان کی عدت کے اندر ابو جعفر محمد بن علی الباقر ان کے پاس تشریف لائے اور کہنے لگے اے بنت حنظلہ میں وہ ہوں کہ رسول اللہ ﷺ سے میری قرابت داری کو تم خوب جانتی ہو میرے دادا علی کے حق سے اور ان کے قدیمی مسلمان ہونے سے بھی تم خوب واقف ہو۔ اس پر سکینہ بولیں کیا میری عدت میں ہی تم مجھ سے نکاح کرنے کا پیغام دیتے ہو حالاں کہ اس کا تم سے بھی مواخذہ ہوگا۔ کہنے لگے میں نے تو اپنی حضور سید عالم ﷺ سے قرابت داری ہونی تمہارے سامنے ظاہر کردی ہے۔ (مظہری)

اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِیْۤ اَنْفُسِكُمْ :(یا اپنے دل میں چھپا کر رکھو) اکننتم اکنان سے بنا بمعنی چھپانا اس کا مادہ کِنٌّ ہے بمعنی پردہ (وما تکِنّ صدورھم) یا (لؤلؤ مکنون) یا (کتاب مکنون) وغیرہ انفس جمع نفس بمعنی قلب یعنی اس میں بھی گناہ نہیں تم پیام وسلام کا ارادہ اپنے دل میں چھپا کر رکھو۔ اور کسی پر ظاہر نہ کرو گویا نہ ارادۂ نکاح گناہ نہ اشارۃً نکاح کیوں کہ

عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ :اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ تم چپکے بیٹھ رہنے پر صبر نہ کر سکو گے اس لیے اشارہ سے ذکر کرنا اس نے تمہارے لیے مباح کردیا اور دل میں رکھنے پر کچھ مواخذہ نہیں۔

وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا :(ہاں ان سے خفیہ وعدہ نہ کر رکھو) (تُوَاعِدُو وعدٌ) سے بنا باب مفاعلہ میں آکر شرکت کے معنی پیدا ہوئے یعنی ایک دوسرے سے وعدہ کرنا۔ سِرًّا اعلان کا مقابل ہے بمعنی خفیہ بعض نے فرمایا کہ اس سے نکاح مراد ہے کیوں کہ نکاح کا مقصد یعنی وطی پوشیدہ ہوتی ہے۔ (روح البیان، کبیر وغیرہ) بعض نے فرمایا کہ اس سے در پردہ نکاح کا معاہدہ

یعنی اس سے در پردہ نکاح کا معاہدہ نہ کرلو۔

اِلَّا اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا: (مگر یہ کہ اتنی ہی بات کہو جو شرع میں معروف ہو) قولِ معروف سے جائز بات یعنی نکاح کے اشارے مراد ہیں۔ یعنی اشارۃً اپنی رغبت ظاہر کردو صاف صاف نہ کہو۔

وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ :تعزموا عزم سے بنا بمعنی کسی کام کو قطعی اور حتمی طور پر کرنے کا ارادہ کرنا (مفردات) قرآن کریم میں ہے (فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ) امام راغب فرماتے ہیں کہ قلبی خیالات کے چند درجہ ہیں۔ اولاً خاطر پھر فکر پھر اراہ پھر ہمت پھر عزم۔ ہمت تو کسی کام کی تیاری کرنا ہے اور عزم اس کے کر گزرنے پر تیار ہو جانا ہے۔ (نعیمی، روح البیان وغیرہ) عقدۃ عقد سے بنا بمعنی گرہ باندھنا معاملات منعقد کرنے کو بھی اسی لیے عقد کہتے ہیں کہ اس سے جانبین گویا بندھ جاتے ہیں کہا جاتا ہے کہ عقدِ بیع عقدِ نکاح وغیرہ یعنی نکاح کی گرہ پکی نہ کرو۔

حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ: (جب تک لکھا ہوا حکم اپنی معیاد کو نہ پہنچ لے) حَتّٰى لَا تَعْزِمُوْا کی انتہا ہے کتاب مصدر بمعنی مکتوب جیسا کہ فرض بمعنی مفروض ہوتا ہے جیسے اجل سے میعاد کی انتہا مراد ہے یعنی جب تک کہ عدت مفروضہ ختم نہ ہو جائے تب تک نکاح کر لینے کا پختہ ارادہ نہ کرو۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ: (اور جان لو کہ اللہ تمہارے دل کی بات جانتا ہے) اس میں ارادۂ نکاح سے سختی کے ساتھ روکا جارہا ہے جو کہ شرعاً ممنوع ہے یعنی اگر تم نے نکاح کا عزم کرلیا اور اس میں کامیاب نہ ہوئے تب بھی گناہ گار ہو جاؤ گے۔

فَاحْذَرُوْهُ: حذر کا معنی ڈرنا بھی ہے اور بچنا بھی ہے یعنی پس اللہ سے ڈرو یا ارادۂ نکاح سے بچو۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ: جان رکھو کہ اللہ بخشنے والا بھی ہے لہٰذا جو کوئی ارادہ کر چکنے

کے بعد خوف الٰہی کی وجہ سے نکاح سے باز رہے تو اسے بخش دے گا اور حلم والا بھی ہے گناہ پر جلدی پکڑ نہیں فرماتا لہٰذا کسی بدکاری پر فوراً عذاب نہ آجانا اس کے جائز ہونے کی دلیل نہیں (نعیمی)

(فوائد و مسائل)

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔

۱۔ مرد عورت کو پیغامِ نکاح دے نہ کہ عورت مرد کو جیسا کہ عرضتم اور مِن خِطبة النساء } سے معلوم ہوا لیکن یہ حکمِ استحبابی ہے اس کا عکس بھی جائز ہے۔

۲۔ جیسا کہ دورانِ عدت مرد کو اشارۃً پیغام دینا جائز ہے ایسے ہی عورت کو اشارۃً جواب دینا بھی درست ہے۔

۳۔ عدت والی بیوہ کو پیغامِ نکاح دینا بہر حال حرام ہے۔ مگر طلاق کی عدت والی کا اور حکم ہے۔ پیغامِ نکاح کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ کنواری یا عدت سے فارغ ہو چکنے والی عورت کو صراحۃً یا اشارۃً پیغام دینا جائز ہے۔ اس سے تو نکاح بھی درست ہے۔ ہاں بہتر یہ ہے کہ کنواری لڑکی کے نکاح کا پیغام اس کے والدین یا والی وارثوں کو دے کہ بلا واسطہ لڑکی کو پیغام دینا معیوب ہے لیکن اس کے اولیاء کے لیے لازم ہے کہ لڑکی کی رائے معلوم کرلیں حتی کہ بوقتِ نکاح اس سے اجازت لے کر نکاح کریں۔ ہاں نابالغہ بچی کے نکاح کا پیغام اس کے والدین یا وارثوں کو ہی دیا جائے گا۔ اور وہ لوگ اس نکاح میں مستقل و مختار ہوں گے۔ لڑکی سے اجازت لینے کے محتاج نہ ہونگے لیکن لڑکی بالغہ ہو کر دیگر وارثوں کا کیا ہوا نکاح فسخ کر سکتی ہے۔ باپ دادا کا کیا ہوا فسخ نہیں کر سکتی۔ اس مسئلہ کی مزید تفصیل کتبِ فقہ میں دیکھو۔

۲۔ جس عورت کو کسی نے پیغام دے دیا ہو اور اس سے رضامندی بھی ہو چکی ہو اسے بھی پیغام دینا منع ہے۔ اور حدیث شریف میں (لا یَخْطِبَنَّ اَحَدُ کُمْ عَلٰی خِطْبَةِ اَخِيْهِ) کا یہی

مطلب ہے۔ اگر رضامندی نہیں ہوئی دوسرے شخص کا پیغام دینا بلا کراہت جائز ہے۔ یہی حکم بیع کا ہے کہ جب کسی نے دوکان دار سے نرخ طے کرلیا تو بھاؤ بڑھا کر نہ خریدو لیکن اگر صرف گفتگو ہو رہی ہے۔ تو بھاؤ بڑھا دینا جائز ہے۔ حضور ﷺ نے ایک صحابی کا پیالہ اور کمبل نیلام فرمایا تھا۔ نیلام میں بولی پر بولی دی جاتی ہے اور قیمت بڑھا دی جاتی ہے۔ (ملخصاً، نعیمی وکبیر وغیرہ)

۳۔ تین طلاق والی اور ایسے ہی وہ عورت جو اپنے شوہر پر لعان کی وجہ سے بائن ہوگئی ہو یا رضاعت وغیرہ کا تعلق ثابت ہو جانے کی وجہ سے ہمیشہ کے لیے حرام ہو چکی ہو۔ ایسی عورتوں کو دوران عدت بیوہ کی طرح اشارۃً پیغام دینا جائز اور صراحتاً منع ہے۔

۴۔ طلاقِ بائنہ وخلع وفسخ نکاح جن میں اپنے شوہر سے دوبارہ نکاح جائز ہے ان عورتوں کو بحالت عدت پیغام دینا صراحتاً اور اشارۃً ہر طرح ممنوع ہے۔ ہاں پہلا شوہر ہر طرح پیغام دے سکتا ہے کیونکہ اسے عدت میں نکاح بھی جائز ہے۔

۵۔ طلاقِ رجعی کی عدت میں ہر طرح کا پیغام منع ہے کیونکہ وہ ابھی پہلے شوہر کی بیوی ہے۔

۶۔ کسی کی منکوحہ کو اشارۃً کنایۃً صراحتاً پیغام دینا سخت حرام ہے۔ (ملخصاً تفسیر کبیر، نعیمی وغیرہ)

ارادہ گناہ بھی گناہ ہے جیسا کہ (ولا تعزمو) کے بعد (یعلم ما فی انفسکم) سے معلوم ہوا جبکہ عزم بالجزم ہو۔

مسئلہ: جس عورت سے نکاح کرنا ہو اس کو دیکھ لینا جائز ہے۔ (مشکوۃ باب النظر الی المخطوبہ) مگر چھپ کر یا بہانہ سے دیکھنا چاہیے نہ کہ ظاہر ظہور۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لَا جُنَاحَ عَلَیۡکُمۡ اِنۡ طَلَّقۡتُمُ النِّسَآءَ مَالَمۡ تَمَسُّوۡھُنَّ

اَوۡتَفۡرِضُوۡالَھُنَّ فَرِیۡضَۃً وَّمَتِّعُوۡھُنَّ

عَلَی الۡمُوۡسِعِ قَدَرُہٗ وَعَلَی الۡمُقۡتِرِ قَدَرُہٗ مَتَاعاً بِالۡمَعۡرُوۡفِ حَقًّا عَلَی الۡمُحۡسِنِیۡنَ

(سورۃ البقرۃ:۲۳۶)

''تم پر کچھ مطالبہ نہیں اگر تم عورت کو طلاق دو جب تک تم نے ان کو ہاتھ نہ لگایا ہو یا کوئی مہر مقرر نہ کرلیا ہو اور ان کو کچھ برتنے کو دو مقدور والے پر اس کے لائق اور تنگ دست پر اس کے لائق حسب دستور کچھ برتنے کی چیز یہ واجب ہے بھلائی والوں پر''

شان نزول:

ایک انصاری نے قبیلہ بنی حنفیہ کی ایک عورت سے نکاح کیا اور کچھ مہر مقرر نہ ہوا پھر بغیر ہاتھ لگائے اسے طلاق دے دی چوں کہ اس قسم کی طلاق اس سے پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔ لہٰذا اس کے احکام میں حیرت ہوئی تب یہ آیتِ کریمہ اتری۔ (خازن، نعیمی، خزائن العرفان)

لَاجُنَاحَ عَلَیۡکُمۡ: (تم پر کچھ مطالبہ نہیں) جناح کے معنی جھکنا اور مائل ہونے کے ہیں۔ جنحت السفینۃ کے محاورے سے ماخوذ ہے۔ بوجھ کو بھی اسی لیے جناح کہتے ہیں کہ اس سے آدمی جھک جاتا ہے۔ گناہ بھی چونکہ اخروی بوجھ ہے۔ اس لیے اسے بھی جناح کہنے لگے چونکہ مطالبات مواخذے اور ذمہ داریاں بھی حکما بوجھ ہیں۔ لہٰذا ان سب کو جناح کہتے ہیں۔ (نعیمی) یہاں جناح سے مراد گناہ یا حق مہر وغیرہ ہے۔ (روح البیان) مقصود یہ ہے کہ اگر تم نے انہیں ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دیدی تو تم پر مہر واجب نہیں۔ ہاں اگر تم نے مقرر کرلیا ہو تو اس صورت میں

نصفِ مہر واجب ہوگا جیسا کہ آئندہ آرہا ہے۔ یا اگر ایسی مطلقہ عورتیں طلاق ہوتے ہی دوسرا نکاح کرلیں یا بناؤ سنگار کریں تو تم پر کوئی گناہ نہیں کیونکہ ان عورتوں پر نہ عدت ہے نہ سوگ۔

اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَالَمْ تَمَسُّوْهُنَّ :(اگر تم عورت کو طلاق دو جب تک تم نے ان کو ہاتھ نہ لگایا) یہ لا جناح کی شرط موخر ہے۔ نساء سے بیویاں مراد ہیں۔ تمسّو هنّ سے بنا بمعنی چھوڑنا اور ہاتھ لگانا یہاں صحبت کرنا مراد ہے۔

اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً :(یا کوئی مہر مقرر نہ کرلیا ہو) فرض لغوی معنی قطع کرنا یا لازم کرنا ہیں یہاں اس سے مہر مراد ہے یعنی اگر تم بغیر جماع اور بغیر مہر مقرر کیے عورتوں کو طلاق دے دو تو تم پر مہر یا مطالبہ مہر نہیں۔ **وَّمَتِّعُوْهُنَّ** (اور ان کو کچھ برتنے کو دو) متعۃ اور متاع عارضی نفع یا فائدہ کو کہتے ہے۔ قرآنِ مجید میں ہے (قل متاع الدنیا قلیل) (مفردات) یہاں اس سے وہ چیز مراد ہے جس سے مطلقہ فائدہ اٹھائے۔ احناف کے ہاں اس سے کپڑوں کا جوڑا مراد ہے۔ ایک قمیص، ایک دوپٹہ اور ایک سر سے پیر تک لمبی چادر (احمدی) یعنی جب تم انہیں طلاق دو تو ساتھ ہی ایک جوڑا بھی دے دو۔

وَعَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ :(اور وسعت والے پر اس کے لائق اور تنگ دست پر اس کے لائق) علی وجوب کے لیے ہے۔ وسعٌ یا وسعةٌ سے بنا بمعنی فراخی گنجائش اس سے زیادتی مال بھی مراد ہوتی ہے۔ یہاں بمعنی مال دار ہے۔ مقتر قَتَرٌ سے بنا جو اسراف کا مقابل ہے۔ بمعنی تھوڑا خرچ کرنا (لم یسرفوا ولم یقتروا) نیز مُقْتِرٌ تنگ دست کو بھی کہتے ہے۔ (مفردات) یعنی مال دار پر اس کی گنجائش کے مطابق اور غریب پر اس کی طاقت کے مطابق جوڑا واجب ہے۔

مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ :یعنی دستور کے مطابق خوش اسلوبی کے ساتھ ان کو جوڑا دو۔

حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ :(یہ واجب ہے بھلائی والوں پر) حق بمعنی واجب۔ محسنین سے پرہیز گار مراد ہیں۔ یعنی یہ جوڑا دینا متقیوں پر واجب ہے جو کہ نیک اعمال کر کے اپنی جانوں پر احسان کرتے ہیں۔

(فوائد و مسائل)

۱۔ بوقتِ نکاح مہر مقرر نہ ہوا یا مہر نہ ہونے کی شرط رکھی جب بھی نکاح جائز ہو جائے گا۔ جیسا کہ â اوتفرضو لهن} سے معلوم ہوا۔

مسئلہ: اگر ایسی عورت کو قبل از صحبت اور خلوت صحیحہ کے طلاق دے دی جائے تو کچھ مہر نہیں دینا پڑتا بلکہ ایک جوڑا واجب ہوتا ہے۔ اور یہ جوڑا پانچ درہم یعنی تقریباً ایک تولہ چار ماشہ چاندی کی قیمت سے کم نہ ہو۔

۲۔ جس عورت سے صحبت نہ ہوا سے ہر طرح طلاق دینا جائز ہے۔ البتہ صحبت شدہ عورت میں یہ پابندی ہے کہ حیض میں اور صحبت والے طہر میں طلاق نہ دی جائے۔

مسئلہ: صحبت والی عورت کو اگر طلاق ہوئی تو پورا مہر دینا واجب اور جوڑا مستحب۔

۳۔ جوڑے میں شوہر کی وسعت کا اعتبار ہوگا نہ کہ بیوی کی وسعت کا جیسا کہ علی الموسع سے معلوم ہوا۔

مسئلہ: طلاق والی عورتیں چار قسم کی ہیں۔

۱۔ جن کا مہر بھی مقرر ہوا اور بعد صحبت طلاق دی گئی ہو انہیں مہر دینا واجب اور جوڑا مستحب۔

۲۔ جس کا مہر مقرر نہ ہوا اور بغیر صحبت طلاق دے دی گئی ہو۔ اس کا مہر کچھ نہیں صرف جوڑا دینا واجب ہے اس کا ذکر اس آیت میں ہے۔

۳۔ وہ جن کا مہر مقرر ہوا مگر صحبت سے پہلے طلاق دی گئی ہو انہیں آدھا مہر دیا جائیگا جس کا ذکر آئندہ آیت میں آرہا ہے۔

۴۔ وہ جن کا مہر تو مقرر نہ ہوا مگر صحبت کے بعد طلاق دی گئی ہو اسے مہرِ مثل ملے گا یعنی جو اس کے خاندان میں بندھتا ہو۔ (ملخصاً کبیر، نعیمی، روح البیان)

مسئلہ: جسے صحبت سے پہلے طلاق دی جائے اس پر عدت واجب نہیں، عدت وفات لازم ہے۔

مسئلہ: خلوتِ صحیحہ صحبت ہی کے حکم میں ہے۔ خلوتِ صحیحہ یہ ہے کہ زوج زوجہ ایک مکان میں جمع ہوں۔ اور کوئی چیز مانعِ جماع نہ ہو۔ موانع تین ہیں۔ حسّی۔ شرعی اور طبعی، مانع حسّی جیسے مرض کہ شوہر بیمار ہے۔ تو مطلقاً خلوتِ صحیحہ نہ ہوگی۔ ایسے ہی اگر عورت بیمار ہو کہ وطی سے ضرر کا اندیشہ صحیح ہو۔ مانع طبعی جیسے وہاں کسی تیسرے کا ہونا اگرچہ وہ سوتا ہو یا نابینا ہو۔ مانع شرعی مثلاً حیض یا نفاس میں ہے۔ یا دونوں میں سے کوئی محرم ہو یا دونوں میں سے کسی ایک کا رمضان کا روزہ ادا ہو یا نماز فرض میں ہو۔ ان سب صورتوں میں خلوتِ صحیحہ نہ ہوگی (عالمگیری، درمختار وغیرہ) خیال رہے کہ عدت واجب ہونے کے لیے خلوت اوّل قسم کی معتبر ہے۔ اور پورا مہر واجب ہونے کے لیے دوسری قسم کی خلوت ضروری ہے۔ اگر عورت میں کوئی مانع موجود ہو جس سے صحبت نہ ہو سکے عدت واجب کردے گی مگر مہر پورا واجب نہ کرے گی۔ لیکن اگر مرد میں کوئی نقص تھا جس کی وجہ سے صحبت نہ ہو سکی تو عدت بھی واجب ہوگی مہر بھی پورا کہ یہاں عورت کی طرف سے قصور نہیں بلکہ مرد کی طرف سے ہے۔ تفصیل کتب فقہ میں ہے۔ (نعیمی)

مسئلہ: موت سے پورا مہر واجب ہو جاتا ہے۔ خواہ عورت مرے یا مرد اور موت خواہ خلوت سے پہلے ہی ہو جائے یا بعد میں۔ (روح البیان، کتب فقہ)

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

وَاِنۡ طَلَّقۡتُمُوۡهُنَّ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تَمَسُّوۡهُنَّ وَقَدۡ فَرَضۡتُمۡ لَهُنَّ فَرِيۡضَةً فَنِصۡفُ مَا فَرَضۡتُمۡ اِلَّاۤ اَنۡ يَّعۡفُوۡنَ اَوۡ يَعۡفُوَا الَّذِىۡ بِيَدِهٖ عُقۡدَةُ النِّكَاحِ وَاَنۡ تَعۡفُوۡۤا اَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰى وَلَا تَنۡسَوُا الۡفَضۡلَ بَيۡنَكُمۡ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِيۡرٌ (سورۃ البقرۃ:۲۳۷)

''اور اگر تم نے عورتوں کو بے چھوئے طلاق دیدی۔ اوران کے لیے کچھ مہر مقرر کر چکے تھے۔ تو جتنا ٹھہرا تھا اس کا آدھا واجب ہے۔ مگر یہ عورتیں کچھ چھوڑ دیں۔ یا وہ زیادہ دیں جن کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے۔ اور (اے مردوں) تمہارا زیادہ دینا پرہیز گاری سے نزدیک تر ہے۔ اور اس میں ایک دوسرے پر احسان کو نہ بھلا دو بے شک اللہ تمہارے کام دیکھ رہا ہے''

اس سے پہلی آیت میں صحبت سے پہلے طلاق دینے کا ذکر ہوا۔ اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ نکاح کے وقت مہر مقرر نہ کیا گیا ہو۔ دوسرے یہ کہ کیا گیا ہو۔ پہلی صورت پچھلی آیت میں بیان ہوئی۔ دوسری صورت اور اس کے احکام اب بیان ہوتے ہیں۔

تفسیر:

وَاِنۡ طَلَّقۡتُمُوۡهُنَّ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تَمَسُّوۡهُنَّ :(اگر تم نے عورتوں کو بے چھوئے طلاق دے دی) یہاں طلاق سے مراد طلاقِ بائنہ یا مغلظہ ہے۔ کیونکہ ایسی عورت کو طلاقِ رجعی پڑ ہی نہیں سکتی۔ طلاقِ رجعی وہ ہے۔ جس میں عدت کے اندر بغیر تجدید نکاح رجوع ہو سکے اور اس مطلقہ پر عدت ہی نہیں۔ لہٰذا غیر مدخول بہا کو طلاق ہمیشہ بائنہ ہوگی یا مغلظہ (نعیمی) خیال رہے کہ غیر

مدخول بہا کو اگر تین طلاق بیک کلمہ دیں تو تینوں واقع ہو جائیں گی اور اگر علیحدہ علیحدہ دیں تجھی طلاق طلاق طلاق تو اس صورت میں صرف پہلی طلاق سے وہ بائن ہو جائے گی اور باقی دو کا محل ہی نہ رہے گی (فتاوی رضویہ وغیرہ)

وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً : (اور ان کے لیے کچھ مہر مقرر کر چکے تھے) یہاں واؤ حالیہ ہے۔ یعنی اگر تم اپنی بیویوں کو جماع سے پہلے طلاق دے دو حالاں کہ بوقتِ نکاح ان کے لیے مہر مقرر کر چکے تھے تو۔

فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ : (تو جتنا ٹھہرا اس کا آدھا واجب ہے) اس سے پہلے یا تو لھن پوشیدہ ہے (روح) یا علیکم یعنی ان عورتوں کے لیے مقرر مہر کا آدھا یا تم پر صرف آدھا واجب ہے اور آدھا معاف۔

اِلَّا اَنْ يَّعْفُوْنَ : یعفون کا فاعل طلاق والی عورتیں ہیں۔ یہ لفظ عفو سے بنا بمعنی مٹا دینا (مفردات) معافی کو بھی عفو کہا جاتا ہے کہ اس سے حق یا مطالبہ مٹ جاتا ہے۔

اَوْيَعْفُوَا الَّذِىْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ : (یا وہ زیادہ دیں جن کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے) امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک الذی سے مراد شوہر ہے۔ نہ کہ ولی اور یہی قول سیدنا علی رضی اللہ عنہ، سعید بن مسیّب اور بہت سے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا ہے (روح البیان، کبیر وغیرہ) عفوٗ سے مراد یا تو پورا دیا ہوا مہر واپس نہ لینا یعنی بالکل معاف کر دینا کیوں کہ صحبت سے پہلے طلاق ہو جانے کی صورت میں خاوند کے لیے جائز تھا کہ مہر مقررہ کے نصف سے زائد دیا ہوا واپس لے لیتا (احمدی) یا بطور مہربانی سارا دے دیتا یعنی واجب سے زیادہ ادا کر دینا۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے (یسئلونک مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ العفو) یعنی ایسی طلاق میں آدھا مہر واجب تھا لیکن اگر خاوند بطور مہربانی زائد دے تو بھی جائز ہے (روح البیان وغیرہ)۔

وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى : (اور اے مردوں) تمہارا زیادہ دینا پرہیزگاری سے نزدیک تر ہے) یعنی اے مردوں بمقابلہ عورتوں کے تمہارا معاف کر دینا اور پورا مہر دے دینا پرہیزگاری کے زیادہ قریب ہے۔ (نعیمی) بعض مفسرین نے فرمایا کہ (ان تعفوا) میں شوہر بیویوں دونوں

سے ہی خطاب ہے۔ اور تغلیباً جمع مذکر کا صیغہ آیا یعنی اے مردوں اور عورتوں معافی اور چشم پوشی تقوٰی سے قریب تر ہے۔ (کبیر وغیرہ)

وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ :(اور آپس میں ایک دوسرے پر احسان کو نہ بھلا دو) لا تنسوا میں زوجین سے خطاب ہے۔ جیسا کہ بینکم سے معلوم ہو رہا ہے۔ اور یہ نسان سے بنا بمعنی بھولنا مگر یہاں ترک مراد ہے کیوں کہ بھول جانا وسعتِ انسانی سے باہر ہے۔ (روح کبیر وغیرہ) فضل سے احسان، مہربانی اور خوش معاملگی مراد ہے (نعیمی) یعنی اے شوہروں! اور بیویوں! تم ایک دوسرے کے گزشتہ احسانات نہ بھلاؤ انہیں یاد رکھ کر ایک دوسرے کے احسان مند رہو۔ حدیثِ پاک میں ارشاد ہوا کہ اپنے سسر کو والد کی مثل سمجھو لہٰذا اس کے احسان کو نہ بھولو کہ اس نے اپنی لڑکی تمہارے عقد میں دے دی۔

إِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ :(بے شک اللہ تمہارے کام دیکھ رہا ہے)

(فوائد و مسائل)

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔

۱۔ مہر حقوق العباد سے ہے اسی لیے معافی سے معاف ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ یعفون سے معلوم ہوا۔

۲۔ شوہر مالکِ نکاح ہے لہٰذا اس کا باقی رکھنا یا ختم کرنا اس کے قبضے میں ہے۔ جیسا کہ (بیدہ) سے معلوم ہوا۔

۳۔ وقتِ نکاح کا مقرر شدہ مہر آدھا ہو سکتا ہے نہ کہ بعد کا۔ یعنی اگر کوئی شخص نکاح کو بغیر مہر کے کرے پھر بعد میں کچھ مہر مقرر کرے اور پھر خلوت سے پہلے طلاق دے دے تو اس صورت میں اس پر صرف کپڑوں کا جوڑا ہی واجب ہوگا نہ کہ اس کے بعد والے مہر کا آدھا۔ جیسا کہ (فرضتم) سے معلوم ہوا۔ کیوں کہ بعد کا مقرر کردہ مہر تو زوجین کی ذاتی رضامندی ہے؛

کہ حق نکاح (درمختار، باب المہر بحوالہ نعیمی)

مسئلہ: مہر کم از کم دس درہم ہے۔ جو کہ دو تولہ سات ماشہ چار رتی چاندی کے وزن کے برابر ہے۔ زیادہ کی کوئی حد مقرر نہیں لہٰذا مذکورہ بالا وزن کی رائج الوقت قیمت کا خیال رکھنا چاہیے۔ عوام الناس میں سوا بتیس روپے شرعی حق مہر مشہور ہے۔ لیکن شریعت میں اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔ ہاں حضور علیہ السلام کی ازواج کا مہر پانچ سو درہم اور حضرت سیدہ خاتون جنت فاطمۃ الزہرہ رضی اللہ عنھن کا مہر چار سو مثقال یعنی ڈیڑھ سو تولہ چاندی اگر کوئی سنت کی نیت سے یہ ہی مقرر کرے تو بہتر ورنہ اسے اختیار ہے۔

۴۔ مس اور تمس دونوں کے معنی چھونا ہیں مگر کبھی ان سے صحبت بھی مراد ہوتی ہے۔ جیسا کہ ان دونوں آیتوں میں تمسوھن سے مراد صرف چھو لینا نہیں۔ کیوں کہ عورت کو صرف چھو لینے سے نہ تو عدت واجب ہوتی ہے۔ نہ پورا مہر بلکہ یہ دونوں چیزیں صحبت حقیقی یا صحبت حکمی یعنی خلوت صحیحہ سے واجب ہوتی ہیں۔ لہٰذا آیت کریمہ (اَوْلا مستم النسآء) میں بھی عورت سے صحبت یا مباشرت فاحشہ مراد ہوگی۔ نہ کہ صرف چھونا لہٰذا عورت کو چھو لینے سے وضو نہیں ٹوٹے گا۔ ایسے حدیث (مَنْ مسّ امرءۃً فلیتوضاء) میں مس سے مراد مباشرت ہے نہ کہ صرف چھو لینا جیسا کہ اسی آیت (اولامستم النساء) کے آگے (او جاء احد منکم من الغائط) میں صرف پاخانہ سے آجانا مراد نہیں بلکہ پاخانہ سے فراغت مراد ہے۔ اسی لیے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ بوقتِ تہجد میں حضور ﷺ کے آگے لیٹی ہوتی تھی حضور علیہ السلام جب سجدہ کرتے تو مجھے ہاتھ سے اشارۃً چھو دیتے میں۔ پاؤں سمیٹ لیتی آپ سجدہ کر لیتے بعد میں پھر پاؤں پھیلا لیتی تھی۔ اگر مطلقاً عورت کو چھو لینے سے وضو ٹوٹ جاتا تو آپ نمازِ تہجد کیسے پوری کرتے غرضیکہ کہ مذہب حنفی بہت قوی ہے۔ (افادات حکیم الامت مفتی احمد یار خان رحمۃ اللہ علیہ)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم

حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ

(سورۃ البقرۃ:۲۳۸،۲۳۹)

"نگہبانی کرو سب نمازوں کی اور بیچ کی نماز کی اور کھڑے ہو اللہ کے حضور ادب سے۔ پھر اگر خوف میں ہو تو پیادہ یا سوار جیسے بن پڑے۔ پھر جب اطمینان ہو تو اللہ کی یاد کرو جیسا اس نے سکھایا جو تم نہ جانتے تھے۔"

تعلق:

جب میاں بیوی، اولاد نکاح طلاق کے احکام بیان کرنے میں کلام بہت طویل ہو گیا تو اب اللہ تعالیٰ نے اس پر متنبہ کیا کہ نکاح و طلاق کے مسائل میں مشغول ہو کر کہیں اللہ کی یاد اور نماز سے غافل نہ ہو جانا کیوں کہ نماز دین کا ستون اور گناہوں کو مٹانے والی اور دلوں کے زنگ کو کھرچنے والی ہے۔ لہٰذا فرمایا

تفسیر:

حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰت :(نگہبانی کرو سب نمازوں کی) حافظوا محافظت سے بنا جس میں شرکت بھی ہے اور مبالغہ بھی یہاں دونوں معنٰی بن سکتے ہیں۔ مبالغہ یہ ہے کہ اسے ہمیشہ پڑھنا۔ وقت پر پڑھنا فرائض و واجبات، سنن، مستحبات کا خیال رکھنا حضور قلبی سے ادا کرنا۔ شرکت یہ ہے کہ انسان نماز کی حفاظت کرے اور نماز انسان کی حفاظت کرتی ہے کہ اسے گناہوں سے بچائے (ان الصلوة تنهىٰ عن الفحشاء والمنكر) یا اے مسلمانو! آپس میں ایک

دوسرے کو نماز کا محافظ و پابند بناؤ کہ ہر دوست دوسرے کو، خاوند بیوی کو، بیوی خاوند کو، ہر مسلمان ایک دوسرے کو نماز کا پابند بنائے۔

اس پر تمام امت کا اجماع ہے کہ نماز فرض قطعی ہے اس کا انکار کرنے والا کافر ہوتا ہے۔

والصَّلوٰتِ الْوُسْطٰی :(اور بیچ کی نماز کی) وسطٰی اوسط کا مونث ہے۔اوسط کے معنی بیچ والی کے ہیں۔اور افضل کے بھی جیسے (قال اَو سَطُهُمْ) یعنی (اَفْضَلُهُمْ یا امةً وَسَطًا) یہاں دونوں معنی بن سکتے ہیں صلوۃ وسطٰی کے بارے میں اختلاف ہے۔مگر قول راجح یہ ہے کہ اس سے مراد صلوۃ عصر ہے۔اس کی چند وجوہات ہیں۔

۱۔ جنگ خندق کے موقع پر حضور علیہ السلام کی نماز عصر قضا ہوگئی تو آپ ﷺ نے فرمایا (شَغَلُوْ نا عن الصلوٰة الوسطی صلوٰة العصر ملاء الله قبورهم و بيوتهم نارا)۔ (روح البیان)

۲۔ :حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہ کی قرآت میں اس کے بعد وصلوۃ العصر بھی ہے وہ قرآت اس کی تائید کرتی ہے۔

۳۔ :حضرت علی، ابن مسعود، ابن عباس، ابو ہریرہ، امام نخعی وقتادہ وغیرہم رضی اللہ تعالٰی عنھم کا یہی قول ہے کہ غرضیکہ جمہور صحابہ کا یہ ہی فرمان ہے۔یہ ہی حنفیوں کا مذہب ہے۔

۴۔ حدیث شریف میں ہے کہ جس کی نماز عصر رہ گئی تو گویا اس کا مال، گھر برباد ہوگیا معلوم ہوا کہ اس کی بہت تاکید ہے۔

۵۔ نماز عصر میں دن رات کے ملائکہ جمع ہوجاتے ہیں کہ دن کے جانے نہیں پاتے اور رات کے آجاتے ہیں۔

۶۔ رب تعالٰی نے عصر کی قسم فرمائی (والعصر ان الانسان لفی خسر)۔

۷۔ عصر کا وقت ہی تجارت کے فروغ سیر وتفریح اور کھیل تماشہ کا ہے۔اسی نماز سے غفلت کا اندیشہ تھا لہٰذا اس کی تاکید کی گئی۔

۸۔ عصر سے پہلے دو نمازیں اور اس کے بعد بھی دو نمازیں یہ نماز بالکل بیچ میں ہے۔

۹۔ قبر میں نکیرین کے سوال کے وقت مردہ کو وقت عصر محسوس ہوتا ہے۔تو وہ عرض کرتا ہے کہ مجھے پہلے نماز عصر پڑھ لینے دو پھر سوالات کرنا گویا اس نماز کی پابندی اس آخری امتحان میں مدد دے گی۔ (نعیمی، روح البیان وغیرہ)

وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ: (اور کھڑے ہو اللہ کے حضور ادب سے) **قوموا** سے نماز کا قیام مراد ہے۔اور **قنتين** قنوت سے بنا جس کے معنی ہیں خاموشی، سکون، خشوع وخضوع اور اطاعت وغیرہ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ (وَمن يُقْنُتْ منكن لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ) یہاں سارے معنی درست ہیں ۔حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے پیچھے نماز میں باتیں کیا کرتے تھے ہم میں سے بعض اپنے پاس والے سے بات چیت کر لیتا تھا یہاں تک یہ آیت (وقوموا لِلّٰهِ قنتين) نازل ہوئی تو ہمیں خاموش رہنے کا حکم ہوا۔حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا قنوت بمعنی دعا ہے (اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَاءَ اللّيل) (کبیر) یعنی نماز میں اللہ کے حضور بہ ادب خاموشی عاجزی، زاری کرتے ہوئے کھڑے ہوں۔چناں چہ بعض صورتوں میں قیام فرض نہیں اس لیے ارشاد ہوا۔

فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا : (پھر اگر خوف میں ہو تو پیادہ یا سوار جیسے بن پڑے) صاحب کشاف فرماتے ہیں کہ خوف سے دشمن یا درندے وغیرہ کا وہ ڈر مراد ہے۔جس سے قبلہ رو ہو کر نماز ادا نہ کی جاسکے۔رجال رجل کی جمع ہے جیسے تاجر کی جمع تجار اور صاحب کی جمع صحاب اس کے معنی ہیں پیروں پر رہنے والا خواہ چلتا ہو یا کھڑا ہو (کبیر) رکبان رکب کی جمع ہے۔جیسے فرسان فارس کی جمع بمعنی سوار معنی یہ ہوا کہ اگر تمہیں سخت خوف وڈر کی وجہ سے قیام نہ ممکن ہو تو چلتے ہوئے یا سواری پر ہی نماز پڑھ لو خوف کی چند قسمیں ہیں۔بعض وہ خوف ہیں جن کی وجہ سے نماز میں تیمم جائز ہو جاتا ہے جیسے پانی پر دشمن یا درندہ ہو یا پانی کے استعمال سے موت یا بیماری کا خوف بعض وہ خوف ہیں جن میں نماز خوف پڑھی جاتی ہے۔جس کا ذکر آئندہ سورۃ النساء میں آئے گا۔(انشاء

اللہ) بعض وہ خوف ہیں جن میں چلتے پھرتے سواری پر نماز جائز ہوتی ہے۔

فَاِذَآ اٰمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ : پھر جب اطمینان ہو تو اللہ کی یاد کرو جیسا اس نے سکھایا) امن سے مراد خوف کا اٹھ جانا اور ذکر اللہ سے مراد نماز ہے۔ (لقولہ تعالیٰ فاسعو الی ذکر اللہ) اور (كَمَا عَلَّمَكُمْ) سے اس کا باقاعدہ ادا کرنا (کبیر) یعنی جب کہ تم امن میں آجاؤ اور خوف جاتا رہے تو پھر اسی طرح نماز پڑھو جس طرح رب نے تمہیں بواسطہ پیغمبر سکھائی (نعیمی)

مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ : یعنی رب تعالیٰ نے تم کو ساری وہ باتیں سکھائیں جو تم نہ جانتے تھے۔

(فوائد و مسائل)

اس آیت کریمہ سے مندرجہ ذیل چند فوائد اور مسائل مستنبط ہوتے ہیں۔

۱۔ نماز کی محافظت ضروری ہے۔ یعنی ہمیشہ پڑھنا۔ صحیح وقت پر پڑھنا اس کے فرائض واجبات، سنن و مستحبات کا لحاظ رکھنا اخلاص اور حضور قلب سے ادا کرنا سب اس میں داخل ہیں۔ (نعیمی)

۲۔ نمازیں پانچ ہیں۔ اس لیے کہ صلوٰۃ جمع کا صیغہ فرمایا گیا جو کہ کم از کم تین نمازوں پر دلالت کرتا ہے۔ پھر ان تین کے علاوہ ایک نماز وہ بھی ضروری ہے جو کہ وسطی (بیچ کی) کہلائی جائے۔ چار میں بیچ بنتا نہیں لہٰذا کم سے کم پانچ ضروری ہیں۔ (ملخصا کبیر) نیز پانچ نمازیں قرآن کی بے شمار آیات و احادیث سے بھی ثابت ہیں اسی پر امت مسلمہ کا اجماع ہے۔

۳۔ فرض نماز میں قیام فرض ہے جیسا کہ قوموا صیغہ امر سے معلوم ہوا۔ نیز جماعت بھی ضروری جیسا کہ قوموا صیغہ سے معلوم ہو رہا ہے۔

۴۔ نماز کا قیام دوسرے ارکان سے اعلیٰ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خصوصیت سے اس کا حکم دیا ورنہ نماز میں قیام بھی آ گیا تھا۔ اسی لیے سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ کہ

زیادتی سجود سے درازی قیام افضل ہے۔ چناں چہ زیادہ نوافل پڑھنے سے یہ افضل ہے کہ تھوڑے نفل پڑھے مگر دراز قیام کرلے۔ یہی احناف کا مذہب ہے اور یہ ہی آیت امام صاحب کی دلیل بن سکتی ہے۔ (نعیمی)

مسئلہ: نماز پنجگار میں میں جماعت واجب نماز جمعہ وعیدین میں جماعت شرط ہے۔ اور نوافل میں مکروہ تنزیہی جبکہ ہمیشہ لوگوں کو بلا کر اہتمام سے ادا کی جائے۔ تراویح اور نماز کسوف ہیں سنت (عامہ کتب فقہ) نماز پنجگانہ کی جماعت شعائر اسلام میں سے ہے۔ اگر تمام لوگ چھوڑ دیں تو ان سے جنگ بھی کی جاسکتی ہے (روح البیان)

۵۔ نماز میں کھانا پینا سلام وکلام اِدھر اُدھر دیکھنا سب حرام جیسا کہ قانتین } سے معلوم ہوا۔ لیکن خیال رہے کہ حضور سید عالم ﷺ پر حالت نماز میں سلام کہنا واجب ہے۔ دوسروں کو حضور علیہ السلام پر قیاس کرنا جائز نہیں۔

۶۔ سخت خوف کی حالت میں نماز میں نہ تو قیام فرض رہتا ہے نہ قبلہ رخ ہونا بلکہ پیدل یا سوار جس طرح ممکن ہو ادا کرلی جائے مگر یہ جب ہی ہے کہ نماز کے لیے ٹھہرنا ناممکن ہو۔ (احمدی)

مسئلہ: مسافر فرض واجب کے علاوہ دیگر نمازیں سواری پر بھی پڑھ سکتا ہے بشرطیکہ تکبیر تحریمہ کے وقت کعبہ کو رخ کرلیا ہو۔ لہٰذا چلتی ریل میں سوائے فرائض و وتر کے دیگر نمازیں جائز ہوسکتی ہیں۔

مسئلہ: بحری جہاز میں ہر نماز جائز ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَالَّذِیْنَ یُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَیَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا وَّصِیَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَیْرَ اِخْرَاجٍ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ فِیْ مَا فَعَلْنَ فِیْۤ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ

(سورۃ البقرۃ:۲۴۰)

''اور جو تم میں مریں اور بیویاں چھوڑ جائیں وہ اپنی عورتوں کے لیے وصیت کر جائیں سال بھر تک نان ونفقہ دینے کی بے نکالے پھر اگر وہ خود نکل جائیں تو تم پر اس کا مواخذہ نہیں جو انہوں نے اپنے معاملے میں مناسب طور پر کیا اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔اور طلاق والیوں کے لیے بھی مناسب طور پر نان ونفقہ ہے یہ واجب ہے۔پرہیز گاروں پر اللہ یوں ہی بیان کرتا ہے تمہارے لیے اپنی آیتیں تا کہ تم سمجھو۔''

تعلق:

پہلے طلاق ووفات کی عدتوں کا ذکر ہو رہا تھا درمیان میں پابندی نماز کا ذکر ہوا اب پھر اسکے بقیہ احکام بیان ہو رہے ہیں۔

تفسیر:

وَالَّذِیْنَ یُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ :(اور وہ جو تم میں سے مر جائیں) یتوفون سے قریب وفات اور علامات موت کے ظہور کا وقت ہے۔یہاں مائؤل کے اعتبار سے متوفی کہا جا رہا ہے اور قرینہ مجاز یہ ہے کہ وصیت قبل الوفات ہوتی ہے نہ کہ بعد الوفات (روح البیان) یعنی جو تم سے مرنے لگیں یا قریب الموت ہوں۔

وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا : (اور بیویاں چھوڑ جائیں) ازواج سے مرنے والے کی بیویاں مراد ہیں لونڈیاں نہیں۔ کیوں کہ مولیٰ کی موت سے لونڈی پر عدت واجب نہیں۔

وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ :(وہ اپنی عورتوں کے لیے وصیت کر جائیں سال بھر تک نان ونفقہ کی بے نکالے گھر سے نہ نکالنے کی) یعنی اپنی بیویوں کو ایک سال تک نان ونفقہ کی وصیت کر جائیں اور ایک سال تک گھر سے نہ نکالے جانے کی بھی۔

فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ :(پھر اگر وہ خود نکل جائیں تو تم پر اس کا مواخذہ نہیں) یہاں علیکم میں میت کے ورثہ وغیرہ سے خطاب ہے یعنی اگر وہ عورتیں اس مدت میں خود بخود ہی نکل جائیں تو اے ورثائے میت اس کا تم پر الزام نہیں کیوں کہ تمہارا نکالنا حرام تھا نہ کہ ان نکلنا۔

فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْۤ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ :(جوانہوں نے اپنے معاملہ میں مناسب طور پر کیا) ما سے مراد زینت، خوشبو لگانا، سوگ چھوڑنا اور دوسرے نکاح کی تیاری وغیرہ مراد ہے۔ یعنی اگر وہ عورتیں یہ کام مناسب طور کریں تو اس کا تم پر کوئی گناہ نہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتداء معتدہ وفات پر خاوند کے گھر ایک سال تک رکے رہنا اور سوگ کرنا واجب نہ تھا بلکہ اس کو اختیار تھا کہ سال بھر تک خاوند کے گھر رہے اور نان ونفقہ لیتی رہے یا از خود نکل جائے اور اپنا نان ونفقہ خود تلاش کرے (ملخصا روح البیان)

وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ :(اللہ تعالیٰ غالب حکمت والا ہے) جس وقت چاہے جو احکام جاری فرمادے اور جس وقت چاہے جو حکم منسوخ کردے۔

وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ :(اور طلاق والیوں کے لیے بھی مناسب طور پر نان ونفقہ ہے) یہاں مطلقات سے ساری معتدہ طلاق کی صورتیں مراد ہیں۔ خواہ ان کا مہر بوقت نکاح مقرر ہوا ہو یا نہ ہوا اور متاع سے عدت کا خرچہ مراد ہے۔ اور یہ حکم وجوبی ہے لہٰذا نہ تو یہ آیت منسوخ ہے نہ پچھلی آیت کے خلاف اور ممکن ہے کہ مطلقات سے عدت اور غیر عدت والی مطلقہ بیویاں مراد

ہیں۔اور متاع سے جوڑا مقصود ہو اور یہ حکم وجوبی واستحبابی کو شامل ہو تب بھی یہ آیت منسوخ نہیں یعنی ہر طلاق والی کے لیے متاع بھلائی کیساتھ واجب ہے۔یا مستحب کیوں کہ عدت والی مطلقہ کو پورا مہر یا مہر مثل ملے گا اور عدت ختم ہونے پر اسے جوڑا دینا مستحب ہوگا اور غیر عدت والی مطلقہ جس کا مہر مقرر نہ ہوا تھا اسے مہر نہ ملے گا مگر اسے جوڑا دینا واجب یہ حکم اب بھی باقی ہے۔اور اگر مطلقات سے طلاق والی عورتیں مراد ہیں اور متاع سے جوڑا مراد اور حکم وجوبی ہو تو یہ حکم اب منسوخ ہے۔(نعیمی، روح البیان وغیرہ)

حقاً عَلَى الْمُتَّقِين :(یہ واجب ہے پرہیزگاروں پر) متقین سے مراد کفر سے بچنے والے مسلمان یہ حکم وجوبی ہے یعنی متاع سارے مسلمانوں پر واجب ہے۔

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهِ :(اللہ یوں بیان کرتا ہے تمہارے لیے اپنی آیتیں) ذالک سے یا تو طلاق عدت وغیرہ احکام کی طرف اشارہ ہے۔(روح البیان) یا اس طریقہ بیان کی طرف کہ معاملات کیساتھ عبادت کا ذکر ہوتا ہے (نعیمی)

لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُون :(تاکہ تم سمجھو) تاکہ تم خوب سوچ سمجھ کر ان پر عمل کرو اور ان میں کسی قسم کا خفا نہ رہے۔

(فوائد و مسائل)

گزشتہ آیت سے یہ فوائد و مسائل حاصل ہوتے ہیں۔

۱۔ پہلی آیت سے معلوم ہوتا ہے پہلے یہ احکام تھے بیوہ عورت کی عدت ایک سال۔

۲۔ اپنے شوہر کے مال کی وارث نہ بنتا۔

۳۔ شوہر کے ذمہ واجب تھا کہ اپنی بیوی کے لیے ایک سال نان ونفقہ دینے کی اہل قرابت کو وصیت کر جائے۔

۴۔ بیوہ کو نان ونفقہ کے علاوہ ایک سال تک شوہر کی طرف سے مکان بھی ملے۔

۵۔ بیوہ پر یہ عدت گزارنا واجب نہ تھا اس سے پہلے بھی وہ گھر سے نکل سکتی تھی لیکن جب آیت (وَ الَّذِینَ یُتَوَفَّوْنَ مِنکُمْ وَیَذَرُوْنَ اَزْوَاجاً یَّتَرَبَّصْنَ بِاَنفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّ عَشْرًا) نازل ہوئی تو ایک سال کی عدت تو (اربعۃ اشھر وعشرا) سے منسوخ ہوئی اور اب عدت موت صرف چار ماہ دس دن رہ گئی آیت اگرچہ تلاوت میں پہلے ہے۔ لیکن نزول اس کے بعد ہوا۔ عدت کا نان ونفقہ اور بیوی کا میراث نہ پانا آیت میراث سے منسوخ ہوا کہ اب انہیں چوتھائی یا آٹھویں حصہ میراث ملے گی حکم سکنہ حدیث سے منسوخ ہوا یعنی بیوہ اپنی عدت کے لیے مکان کی مستحق نہیں کیوں کہ اب یہ مکان میت کا نہ رہا بلکہ ورثہ کا ہو گیا۔ نان ونفقہ اور مکان کی مستحق نہ رہی تو اسے بوقت ضرورت دن میں گھر سے باہر نکلنا بھی جائز ہوا نیز آیت میراث سے حکم وصیت بھی ختم ہوا کیوں کہ وارث کے لیے وصیت جائز نہیں۔ (اربعۃ اشھرٍ وعشراً) سے عدت کا اختیار بھی منسوخ ہو گیا کیوں کہ وہاں (یَتَرَبَّصْن) بھی امر ہے۔ غرضیکہ آیت ہر طرح منسوخ ہے۔ بعض لوگوں نے بہت کھینچ تان کر اس کو غیر منسوخ قرار دینے کی کوشش کی مگر وہ صحیح نہیں غرضیکہ اس آیت کے چار احکام منسوخ ہو گئے۔

۱۔ بیوہ کی عدت ایک سال ہونا۔

۲۔ عدت میں اختیار ہونا بعد موت خاوند کے مال سے ایک سال خرچ ملنا بیوی کے لیے وصیت کرنا اب کسی حال میں بھی عدت ایک سال نہیں کیوں کہ اب عدت چار قسم کی ہیں۔

۳۔ تین ماہ پر اس مطلقہ کے لیے جسے حیض نہ آتا ہو خواہ نابالغہ ہونے کی وجہ سے یا آئسہ (زائد العمر) ہونے کی وجہ سے۔

۴۔ تین حیض اس مطلقہ کے لیے جسے حیض آتا ہو۔

۵۔ چار ماہ دس دن جس کا خاوند فوت ہو جائے۔

۶۔ بچہ وضع حمل (بچہ کا جنم دینا) مطلقہ حاملہ کے لیے جب کہ حمل حلال ہو جو لوگ کہتے ہیں کہ قرآن مجید کی کوئی آیت منسوخ نہیں وہ اس آیت کو غیر منسوخ کیسے مانیں گے۔ اور جو کہتے ہیں کہ قرآنی آیت حدیث سے منسوخ نہیں ہو سکتیں وہ بیویوں کے لیے وصیت کس آیت سے منسوخ مانیں گے۔ حدیث شریف میں ہے (لا وصیة للوارث) اس حدیث سے وہ تمام آیات منسوخ ہوئیں جن میں وارثوں کے لیے وصیت کا حکم دوسری آیت سے مندرجہ ذیل فوائد و مسائل حاصل ہوئے۔

۱۔ عدت طلاق میں عدت کا سارا خرچہ اور مکان شوہر کے ذمہ ہے جیسا کہ (للمطلقت) الخ سے معلوم ہوا۔

۲۔ یہ خرچ طلاق دینے والے مسلمان پر واجب ہے جیسا کہ (حقًا علی المتقین) سے معلوم ہوا۔

۳۔ اس عورت پر عدت واجب نہ ہو یعنی خلوت صحیحہ سے پہلے طلاق پانے والی اسے صرف ایک جوڑا دیا جائے گا۔ مگر جس کو مہر بالکل نہ ملے اسے دینا واجب اور جسے مہر مقررہ کا آدھا ملے اسے مستحب۔

۴۔ ہر مطلقہ بیوی خاوند کے بعد طلاق کچھ نہ کچھ وصول کرے گی کوئی تو عدت کا خرچہ، جوڑا اور پورا مقرر کردا مہر یا مہر مثل لے گی۔ جیسے وہ عورت جسے بعد خلوت طلاق ہوئی۔
بعض وہ ہیں جنہیں صرف آدھا مہر ملے گا جیسے وہ عورت جسے خلوت سے پہلے طلاق ہوا اور مہر مقرر کیا گیا ہو۔ بعض وہ ہیں جن کو صرف جوڑا ملے گا وہ عورتیں جن کو خلوت سے پہلے طلاق ہوئی اور ان کا مہر بھی نہ مقرر کیا گیا تھا۔ ہاں اگر عورت نے خلع یا اور کسی طرح فسخ نکاح کیا ہو جیسا کہ خیار عتق یا خیار بلوغ وغیرہ سے تو ان کو مذکورہ چیزوں سے کچھ نہ پائے گی۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ثُمَّ اَحْيَاهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ (سورۃ البقرۃ:۲۴۳)

"اے محبوب! کیا تم نے نہ دیکھا تھا انہوں نے جو اپنے گھروں سے نکلے اور وہ ہزاروں تھے موت کے ڈر سے تو اللہ نے ان سے فرمایا مر جاؤ پھر انہیں زندہ فرما دیا بیشک اللہ لوگوں پر فضل کرنے والا ہے۔ مگر اکثر لوگ ناشکرے ہیں۔"

یہاں تک مختلف احکام بیان ہوئے جس سے بعض سیاسی جیسے قصاص و جہاد وغیرہ بعض معاشرتی جیسے نکاح رضاع، طلاق اور بعض معاملات جیسے سود قرض گواہی رہن وغیرہ۔ چوں کہ یہ تمام احکام سلطنت اسلامی پر موقوف ہیں اس کا ذریعہ جہاد کی تمہید کے لیے اولاً مسلمانوں کو موت سے بے خوف کر کے پھر گزشتہ امتوں کے جہاد کا ذکر فرمایا۔ تا کہ قوم مسلم میں جذبہ جہاد اجاگر ہو۔ (نعیمی)

شانِ نزول:

اشعث بن اسلم بصری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے ایک بار حضرت سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نماز پڑھ رہے تھے۔ آپ کے پیچھے دو یہودی بیٹھے تھے ایک نے دوسرے سے کہا یہ وہی ہیں پھر کہنے لگے کہ ہماری کتاب میں تو یہ ہے کہ ہم ان کو لوہے کا قلعہ پاتے ہیں اور جو حضرت حزقیل کو دیا گیا کہ جنہوں نے مردوں کو اللہ تعالیٰ کے حکم سے زندہ کیا، وہ ان کو بھی ملے گا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نماز سے فارغ ہونے کے بعد ان سے فرمایا قرآن شریف میں حضرت حزقیل کا ذکر نہیں

اور نہ سوائے حضرت عیسٰی علیہ السلام کے اور کسی کے مردوں کو زندہ کرنے کا ذکر ہے۔انہوں نے کہا کیا کتاب اللہ میں (ورسلاً لم نقصصھم علیک) نہیں ہے (کہ ہم نے بہت سے رسولوں کے قصے بیان نہ فرمائے) آپ نے فرمایا ہاں ہے تو انہوں نے کہا کہ یہ پیغمبر بھی ہیں جنہوں نے مردوں کو زندہ کیا۔ پھر وہ سارا واقعہ سنایا جو کہ آیت میں مذکور ہے۔اس کے بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بارگاہ نبوی میں حاضر ہوئے تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔(مظہری، درمنثور)۔ابن جریر۔

اَلَمْ تَرَاِلَی الَّذِیْنَ خَرَجُوْامِنْ دِیَارِھِم :(اے محبوب کیا تم نے نہیں دیکھا تھا انہیں جو اپنے گھروں سے نکلے تھے) ظاہر یہ ہے کہ یہ خطاب نبی کریم ﷺ سے ہے۔ترَرویتہ سے بنا جس کے معنی آنکھ سے دیکھنا بھی ہیں اور قلوب سے جاننا بھی جیسے (واَرِنا مَنَا سِکَنَا)۔مگر جب اس کے بعد الی ہو تو بمعنی نظر (آنکھ سے دیکھنا) ہوتا ہے۔(وقال الراغب ان الفعل مما یتعدی بنفسہ لکن لما استعیر لمعنی الم تنظر عدی تعدیتہ یالیٰ) (روح المعانی) بعضوں نے کہا ہے کہ یہاں رویئت اور سارے تاریخ دان لوگوں سے خطاب ہے دیار جمع دار کی ہے بمعنی گھر یعنی اے محبوب ﷺ! آپ نے پہلے انہیں نہ دیکھا تھا جو اپنے گھروں سے نکل کھڑے ہوئے تھے۔

وَھُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَالْمَوْتِ :(اور وہ ہزاروں تھے موت کے ڈر سے) الوالف کی جمع کثرت ہے بمعنی ہزار ہا۔الموت سے طاعون کی موت مراد ہے۔یعنی ہزاروں کی تعداد میں طاعون کی موت کے خوف سے یہ لوگ نکل گئے یا موت سے بچنے کے لیے موت سے بچنے کی تدبیر کرنا منع ہے۔ہاں موت سے ڈر کر نیک اعمال کرنا اچھا ہے۔یہاں پہلی صورت مراد ہے۔(نعیمی) بعض نے کہا کہ الوف الف کی جمع ہے جیسے قاعد کی جمع قعود اور شاہد کی جمع شہود ہے۔اَلف اَلفٌ سے بنا بمعنی الفت و محبت تو معنی ہیں۔کہ وہ متفق ہو کر ایک ہی طرف نکلیں (کبیر)

فَقَالَ لَھُمُ اللّٰہُ مُوْتُوْ :(اللہ نے ان سے فرمایا مر جاؤ) قال یا تو اپنے معنی میں ہے۔اور لفظ

اللہ سے پہلے ملائکہ پوشیدہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کی موت کا ارادہ کیا اور حکم دیا یا فرشتوں نے چیخ کر کہا (موتوا ثم اَحیاھُم) (پھر انہیں زندہ فرمادیا) لفظ ثم سے معلوم ہوتا ہے کہ زندہ کرنے کا واقعہ موت سے کچھ عرصہ بعد واقعہ ہوا) اَحیا سے ایک پیغمبر کی دعا سے زندہ فرمانا منظور ہے۔ یعنی پس وہ مر گئے پھر کچھ مدت بعد حزقیل علیہ السلام کی دعا سے سب کو زندہ فرمادیا۔

اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ :(بے شک اللہ لوگوں پر فضل کرنے والا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ تمام انسانوں پر بڑا فضل فرمانے والا ہے کہ مردے زندہ کر کے انہیں اپنی قدرت دکھا دیتا ہے۔

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ :(مگر اکثر لوگ ناشکرے ہیں)۔ اکثر لوگ سے مراد یا تو کفار ہیں یا سارے عبرت نہ پکڑنے والے یعنی بہت سے لوگ اللہ یا اس کی نعمتوں کا شکر نہیں کرتے یہ قصہ اللہ تعالیٰ اس لیے ذکر کیا کہ مسلمانوں کو توکل کرنے کی ترغیب ہو اور قضا و قدر کو دل و جان سے مانیں اور جہاد پر جانے کے لیے دلیر رہیں۔

اصل واقعہ مفسرین نے یوں بیان فرمایا کہ دَاوَدَانُ علاقہ واسط میں ایک بستی تھی وہاں طاعون پھیلا تو وہاں کے کچھ آدمی تو بھاگ گئے اور کچھ وہیں رہے۔ جو وہاں رہ گئے ان میں سے اکثر مر گئے اور جو بھاگ گئے وہ بچ گئے اور جب طاعون رفع ہو گیا تو وہ آدمی پھر اپنے گھروں میں لوٹ آئے۔ اور جو وہیں رہ گئے تھے وہ انہیں دیکھ کر کہنے لگے کہ ہمارے یہ ساتھی بہت ہوشیار تھے۔ اگر ہم بھی گھر چھوڑ کر چلے جاتے تو بچ جاتے اگر اب دوبارہ طاعون پھیلا تو ہم بھی کسی ایسی جگہ چلے جائیں گے جہاں وبا نہ ہو قدرت الٰہی سے پھر طاعون پھیل گیا تو اس گاؤں کے رہنے والے ہزاروں کی تعداد میں بھاگ کر ایک چٹیل میدان میں جا اترے لیکن وہاں ایک فرشتہ نے نشیبی جانب اور دوسرے نے اوپر سے آواز دی کہ مُوتوا (مرجاؤ) تو وہ سب کے سب وہیں مر گئے کچھ مدت کے بعد حضرت حزقیل علیہ السلام کا گزر اس طرف سے ہوا تو ان مرنے والوں کی ہڈیاں چمک رہی تھیں اور تمام جوڑ علیحدہ علیحدہ ہو چکے تھے۔ تو آپ کو اس سے بہت تعجب ہوا کہ بھلا اب

یہ کیوں کہ زندہ ہونگے اللہ تعالیٰ نے اسی وقت ان کی طرف وحی بھیجی کہ تم ان کے پاس کھڑے ہو کر دعا کرو اور پکارو (قوموا باذن اللہ) آپ نے آواز دی تو وہ سب کے سب زندہ ہو کر کھڑے ہو گئے (مظہری، ابن جریر وغیرہ)

حضرت حزقیل بن یوذی موسی علیہ السلام کے تیسرے خلیفہ تھے انہیں ہی ذوالکفل بھی کہا گیا۔

(فوائد و مسائل)

۱۔ انبیاء کرام علیہ السلام کی بارگاہ ایزدی میں بہت زیادہ عزت ہے۔ کہ اگر وہ کسی بات پر بطریقہ ناز ضد کر جائیں یا قسم کھالیں تو رب تعالیٰ پوری فرما دیتا ہے۔ بلکہ ان کی ضد پر اپنا قانون بدل دیتا ہے۔ قانون یہ ہے کہ مردہ قیامت سے پہلے زندہ نہ ہو گا لیکن حدیث شریف ہے۔ (رُبَّ اشعث اغبر لو اقسم علی اللہ لابرّہ او کماقال) دیکھئے حضرت حزقیل علیہ السلام کی دعا سے ان سب کو دوبارہ پہلے ہی زندہ فرما دیا۔

۲۔ اللہ والوں کی پھونک یا آواز اثر رکھتی ہے حضرت حزقیل علیہ السلام کی پکار سے نفخ صدر کی طرح اتنی بڑی جماعت زندہ ہو گئی عیسٰی علیہ السلام کی پھونک بھی یہی اثر رکھتی تھی۔

۳۔ کسی بھی تدبیر سے تقدیر بالکل نہیں بدل سکتی۔ اور نہ آنے والی موت ٹل سکتی ہے۔ لہٰذا اے مسلمانوں جہاد نہ چھوڑو جب اپنے وقت پر موت نے آنا ہی ہے تو بہتر ہے کہ راہ مولیٰ میں آئے۔

۴۔ طاعون سے بھاگنا منع ہے۔ دیکھو یہ لوگ طاعون سے بھاگے تھے عتاب الٰہی میں گرفتار ہوئے۔ ساری وبائی بیماریوں کا یہی حکم ہے۔

طاعون بنی اسرائیل کے زمانہ سے شروع ہوا یہ ان کے واسطے عذاب تھا مسلمانوں کے واسطے رحمت حدیث صحیح میں وارد ہوا کہ جو لوگ وباء کی جگہ میں رب کی رضا پر صابر رہیں اگر وہ وبا

سے محفوظ بھی رہے جب بھی شہادت کا ثواب پائیں گے۔ (تفسیر خزائن العرفان وغیرہ)

امام احمد امام بخاری امام مسلم اور نسائی نے اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کی کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا (اذا سمعتم بالطاعون فی الارض فلا تدخلوا علیہ واذا وقع بارضٍ فلا تخرجوا منھا وانتم فرار منہ) ۔یعنی جب کسی مقام میں تم طاعون سنو تو اس مقام میں نہ جاؤ اور جب کسی مقام میں پھیل جائے۔ (اور تم بھی وہیں ہو) تو تم اس کے ڈر سے نہ بھاگو۔

بغوی نے اپنی سند کیساتھ روایت کی ہے کہ حضرت عمر ابن الخطاب رضی اللہ عنہ (ملک) شام کی طرف تشریف لے گئے۔اور جب آپ (شام کے قریب مقام) سرغ پہنچے تو وہاں آپ نے سنا کہ شام میں وباء کا بہت زور ہے اس وقت حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے انہیں یہ حدیث سنائی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہا (اذا سمعتم بالطاعون) الخ اسلیے حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالی عنہ مقام سرغ سے ہی لوٹ آئے۔ (مظہری)

فائدہ:

چندوہ حضرات ہیں جن کو شہادت کا درجہ ملتا ہے۔ (۱) جو پانی میں ڈوب جائے (۲) جل کر مرے (۳) سفر میں مرے (۴) دیوار وغیرہ کے نیچے دب کر مرے (۵) پیٹ کی بیماری میں مرے (۶) طاعون سے مرے (۷) زچہ عورت مدت نفاس میں مرے (۸) جو جمعہ کی رات میں مرے (۹) ذات الجنب کی بیماری میں مرے (۱۰) طلب علم میں مرے (علم دین سیکھنے والا) (۱۱) سل (۱۲) مرگی (۱۳) بخار کے مرض سے مرے (۱۴) جو کسی کے عشق میں مرے بشرطیکہ پاک دامن ہو اور عشق کو چھپانے والا ہو (یعنی عشق نفسانی نہ ہو) (۱۵) جس کو درندہ کھا جائے (۱۶) جس کو زہریلا جانور کاٹ لے (۱۷) فی سبیل اللہ اذان دینے والا (۱۸) سچا تاجر (۱۹) حلال روزی کما کر بچوں کو پالنے والا (۲۰) دریا کا مسافر (۲۱) جو روزانہ پچیس مرتبہ یہ پڑھ لیا کرے۔

اَللّٰھُمَّ بَارِکْ لِیْ فِی الْموتِ وَفِیْ ما بَعْدَ الْمَوْت ۔(۲۲) جو نماز چاشت اور ہر مہینے میں تین روزوں کا پابند ہو (۲۳) جو وتر کا پابند ہو (۲۴) جو روزانہ سو بار درود شریف پڑھتا ہو (۲۵) شہادت کی تمنا میں رہے (۲۶) جو تاجر ضرورت کے وقت باہر سے مسلمانوں کے لیے غلہ لائے (۲۷) جو سنت کا پابند ہو جب کہ مسلمان سنت کو چھوڑ رہے ہوں (۲۸) جو اپنی بیماری میں چالیس بار آیت کریمہ پڑھے (۲۹) جو ہر رات سورہ یٰسین پڑھنے کا پابند ہو (۳۰) جو روزانہ صبح شام درود شریف پڑھتا ہو۔ (۳۱) جو روزانہ تین بار اعوذ پڑھ کر سورہ حشر کی آخری آیتیں (لا یَسْتَوِیْ) سے آخر تک پڑھ لیا کرے (شامی باب الشہید)

مسئلہ: جو طاعون سے مرے اس سے حساب قبر نہیں ہوتا۔

مسئلہ: مدینہ منورہ طاعون اور دوسرے وبائی امراض سے محفوظ رہے گا۔

مسئلہ: طاعون سے بھاگنا حرام ہے۔ ہاں کسی صورت کی وجہ سے باہر گیا تو جائز۔

مسئلہ: مرض اُڑ کر نہیں لگتا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ کفار بیماریوں میں قدرت مانتے ہیں ۔اسی لیے ان کی پوجا کرتے ہیں، چیچک اور ماتا کے بُت بنا کر پوجتے ہیں۔ یہ عقیدہ مشرکانہ ہے اور حدیث لا (عدویٰ) کے یہی معنی ہیں۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ کسی بیماری کی وجہ سے وہاں کی آب وہوا بگڑ جائے جس سے دوسرے لوگ بیمار ہو جائیں جیسے کہ متعفن آب وہوا سے بچنا بہتر ہے۔ ایسے ہی بعض بیماروں سے بھی احتیاط کرنا جائز ہے جیسے جزامی اور مدقوق (سل والا) وغیرہ اسی لیے بعض احادیث میں ان سے بچنے کا حکم دیا گیا البتہ وبائی امراض سے بھاگنا حرام ہے۔ کیوں کہ وباء میں اکثر اپنے اہل قرابت اور دوست واحباب بیمار ہو جاتے ہیں اور وہ بھاگ نہیں سکتے اگر اس موقع پر تندرستوں کو بھاگنے کی اجازت دی جائے تو ان بیماروں کی تیمارداری کون کرے۔ یہ لوگ یقیناً سخت تکلیف سے مریں گے اور ان کو گور وکفن بھی میسر نہیں ہوگا۔ اس لیے

یہاں ٹھہرنا بہت ثواب کا کام ہے۔ جیسے جہاد کی صف میں ٹھہرنا قحط سالی اور دیگر بلاؤں میں یہ بات نہیں وہاں سب بھاگ سکتے ہیں۔ بلکہ مفلس اور غریب پہلے بھاگتے ہیں (تفسیر عزیزی) اسی مقام پر حکیم الامت مفتی احمد یار خان (مرحوم) نے لکھا کہ ایک دفعہ بدایوں میں طاعون پڑی مسلمانوں کے جنازے بہت عزت واحترام سے جاتے تھے ان کے آگے بڑا مجمع اور آگے نعت خوانی ہوتی تھی۔ ہندوؤں کی لاشوں کو حکومت نے چھکڑوں اور بیل گاڑیوں میں لدوا کر پھینکوا دیا یا زمین میں دبوایا کیوں کہ تندرست ہندو انہیں چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ اس واقعہ سے کئی ہندو مسلمان ہو گئے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ طاعون وباء خبیث جنات کے اثر سے ہے اسی لیے اس کو طاعون کہتے ہیں۔ کیوں کہ یہ طعن سے بنا جس کے معنی نیزا مارنا طاعونی بیمار کو بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ میرے کوئی برچھیاں مار رہا ہے۔ اس کے مقابلہ سے بھاگنا گویا اس سے ڈر جانا ہے۔ جس طرح ظاہری جہاد میں کفار کے مقابلہ سے بھاگنا منع ہے۔ ایسے ہی وباؤں کے مقابلہ سے بھی (تفسیر نعیمی زیر آیت (فَاَنْزَلنَا علی الذین ظلموء رِجزاً) الخ)

مسئلہ: وباء اور بیماری وغیرہ کا علاج جائز ہے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ طاعون کا سب سے بہتر علاج تسبیح و تحلیل اور درود شریف ہے۔ بشرطیکہ ظاہری باطنی شرطوں کیساتھ ہو نیز فرمایا گیا کہ وباء کے زمانے میں سورہ دخان شریف بلند آواز سے صبح کے وقت پڑھنے سے جہاں تک اس کی آواز جائے وہاں تک امن رہتا ہے۔ (نعیمی) نیز زمانہ وباء میں بلند آواز سے اذانیں کہنا بھی مفید ثابت ہوا ہے۔ اسلیے کہ طاعون جنات کا اثر ہے اور غلبہ جن کے وقت اذان کہنا سنت ہے۔ (شامی باب الاذان)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ (سورۃ البقرۃ:۲۵۳)

''یہ رسول ہیں کہ ہم نے انہیں ایک دوسرے پر افضل کیا، ان میں سے کسی سے اللہ نے کلام فرمایا اور کوئی وہ ہیں جسے سب پر درجوں بلند کیا اور ہم نے مریم کے بیٹے عیسیٰ کو کھلی نشانیاں دیں اور پاکیزہ روح سے اس کی مدد کی۔''

تفسیر:

تِلْكَ الرُّسُل: (یہ رسول ہیں) تِلْكَ اسم اشارہ ہے۔ اور اس کا مشارالیہ یا تو وہ مرسلین ہیں جنکا ذکر ابھی گزشتہ آیات میں گزرا جیسے حضرت موسیٰ، حضرت ابراہیم، حضرت اسمٰعیل اور حضرت داؤد علیہم السلام یا تمام وہ جو حضور ﷺ کے علم میں ہیں۔ چوں کہ انکا زمانہ حضور سے بہت دور تھا۔ نیز وہ حضرات بڑے درجے والے ہیں۔ اس لیے تلک اشارہ بعید فرمایا۔ الرُّسُلُ یہ رسول کی جمع ہے۔ اس کا لغوی معنی قاصد اور اصطلاح میں رسول وہ باکمال مرد ہیں۔ جو رب تعالیٰ کی طرف سے تبلیغ کے لیے بھیجے گئے۔ اور ان کے ساتھ کوئی نئی یا پرانی آسمانی کتاب بھی ہو۔ نبی میں کتاب کی قید نہیں۔ لہٰذا ہر رسول نبی ہے اور ہر نبی رسول نہیں۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ نبی ایک لاکھ چوبیس ہزار یا کم و بیش ہیں۔ اور رسول تین سو تیرہ۔ لغوی معنی کے اعتبار سے فرشتے بھی رسول ہیں۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ (جاعل الملٰئكةِ رسلا اولی اجنحة) مگر شرعی معنی سے رسول صرف

انسان ہی ہیں۔یعنی (مبعوث من اللہ للتبلیغ) لہٰذا حضرت جبریل وغیرہ علیہم السلام نہ کسی قوم کے مبلغ، نہ کوئی قوم ان کی امت۔قرآنِ کریم میں جب رسول مطلق ہوتا ہے تو اس سے شرعی رسول یعنی انسان پیغمبر مراد ہوتے ہیں۔رسول وہی ہوسکتا ہے۔جو بھیجنے والے سے لے سکے اور جس کی طرف بھیجا گیا ہے۔اسے دے سکے کہ اس کے بغیر رسالت ناممکن ہے۔اسی وجہ سے رسول کی نسبت بھیجنے والے سے کی جاتی ہے۔اور جس کی طرف بھیجا گیا اس سے بھی۔چناں چہ حضور ﷺ اللہ کے بھی رسول ہیں یعنی اُس سے لینے والے اور ہمارے بھی رسول یعنی ہم کو دینے والے جو کہے رسول کچھ نہیں دیتے وہ درحقیقت ان کی رسالت کا انکار کررہا ہے۔ایسے ہی جو کہے اللہ نے رسول کو کچھ نہ دیا وہ بھی ان کی رسالت کا منکر ہے۔جب ان میں رب سے لینے اور ہم کو دینے کی طاقت نہیں۔تو وہ رسول کیوں کہلائے؟ (از افادات حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ)۔

فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ :(ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر بزرگی دی ہے) فَضَّلْنَا تفضیل سے بنا جس کا مادہ فضل ہے۔فضل کا لغوی معنی ہے کسی صفت میں زیادتی یعنی وصفِ مشترک میں ایک چیز کا دوسری چیز سے بڑھ جانا۔لیکن عرف اور اصطلاح میں فضل ایسے کمال کی زیادتی کو کہتے ہیں جس پر دنیا میں ستائش اور آخرت میں ثواب مرتب ہو۔اب اگر ایک میں مخصوص طور پر ایک کمال ہو اور دوسرے میں خصوصیت کیساتھ دوسرا کمال تو فی الجملہ ہر ایک کو دوسرے پر برتری حاصل ہوجاتی ہے۔یعنی (جدا جدا) دنیوی ستائش اور اُخروی ثواب کا استحقاق دونوں کو حاصل ہوتا ہے۔لیکن پوری پوری فضیلت اسی کو حاصل ہوتی ہے۔جس کو تو رب اور قرب الٰہی زیادہ حاصل ہو۔تمام انبیاء اور پیغمبر علیہم السلام اگر چہ وصفِ رسالت و نبوت میں شریک ہیں اور سب کو اجر و ثواب کا استحقاق ہے۔لیکن کثرتِ ثواب اور مراتبِ قرب میں اتنا تفاوت ہے کہ اللہ کے سوا کوئی بھی اس سے واقف نہیں۔ہاں اللہ کے بتانے سے اس کا علم ہوسکتا ہے۔(مظہری)

چناں چہ فرمایا۔

مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ :(ان میں سے کسی سے اللہ نے کلام فرمایا) اہل تفسیر کے نزدیک من سے مراد موسیٰ علیہ السلام ہے۔کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق ہی فرمایا (فَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰى

لمیقاتنا و کلّمہٗ ربّہٗ) الخ لیکن اس آیت سے قطعی طور پر معلوم نہیں ہوتا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ہی یہ فضیلت دی گئی۔ اسی لیے بعض نے کہا کہ آیت مذکورہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضور سید المرسلین ﷺ دونوں مراد ہے کہ موسیٰ علیہ السلام سے تو اللہ تعالیٰ نے کوہِ طور پر کلام کیا اور حضور سرورِ کائنات فخرِ موجودات ﷺ سے شب معراج میں جب کہ بقدر دو کمانوں کے یا اس سے بھی کم فاصلہ رہ گیا تھا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے اپنے بندۂ خاص کو وحی سے سرفراز فرمایا۔ اب دونوں حالتوں اور کلاموں میں عظیم الشان تفاوت ہے۔

وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ :(اور کوئی وہ ہے جسے سب پر درجوں میں بلند کیا) رَفع کے معنی اٹھانا اور بلند کرنا کبھی تو مادی چیز جو پڑی ہو، اسے اس کی جگہ سے اٹھا کر بلند کرنے پر بولا جاتا ہے جیسے (وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّور) (مفردات) جہاں اس کے بعد علی یا الی ہو تو اس سے رفع مکانی یعنی اٹھانا یا نیچے سے اوپر پہنچانا مراد ہوتا ہے۔ (وَرَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ) یعنی (یوسف علیہ السلام نے اپنے والدین کو تخت پر اٹھالیا) اور (بَل رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ) (رب تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو اپنی طرف یعنی آسمان پر اٹھالیا) اور کبھی عمارت کو کھڑا کر کے اوراوپر لے جانے کے معنی میں آتا ہے۔ جیسے (اِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ) (ابراہیم علیہ السلام خانہ کعبہ کی بنیادیں اٹھا رہے تھے) اور کبھی بلندی مراتب اور شہرت کے معنی میں آتا ہے۔ اور یہاں یہی معنی مراد ہیں۔ بَعْضَهُمْ سے ہمارے نبی ﷺ مراد ہیں۔ (روح المعانی، روح البیان وغیرہ) ابہاماً اشارہ کرنے میں اعلیٰ درجہ کی اظہارِ شان ہے جیسا کہ اہلِ ذوق پر ظاہر ہے۔ دَرَجٰتٍ درجۃ کی جمع ہے۔ لغوی معنی زینہ کی سیڑھیاں مگر اصطلاح میں مراتب وفضائل کو درجات کہا جاتا ہے۔ درجات کی جمع کثرت اور تنکیر عظمت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ یعنی بے شمار اور عظیم الشان درجوں میں بلند کیا۔ نیز درجات کی تنکیر اور جمع سے معلوم ہوا کہ دائرۂ عبدیت میں رہ کر جس قدر بلندی درجات دی جاسکتی ہے۔ وہ سب حضور ﷺ کو عطا فرمادی گئی۔ حضور انور ﷺ عبدیت کے اعلیٰ مرتبہ پر ہیں آپ کے بعد صرف الوہیت کا درجہ ہے (نعیمی)

وَاٰتَیْنَا عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ الْبَیِّنٰتِ: (اور ہم نے مریم کے بیٹے عیسیٰ کو کھلی نشانیاں دیں) چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بہت بڑی خصوصیت یہ تھی کہ آپ بغیر والد کے پیدا ہوئے۔ اسلیے ابہاماً بیان کرنے میں آپ کا یہ وصف ظاہر نہ ہوتا۔ لہٰذا صراحۃً ان کا اسم شریف بیان ہوا۔ آپ کا نام بزبان عبرانی یسوع بمعنی مخلص اور والدہ کا نام مریم یعنی خادمہ، عابدہ تھا۔ قرآن مجید میں ہر جگہ آپ کو ابنِ مریم فرمانے سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ صرف والدہ سے پیدا ہوئے۔ بَیِّنٰت جمع بَیِّنَۃ کی ہے۔ بمعنی کھلی دلیل چوں کہ آپ کو بہت سے معجزات عطا فرمائے جن کا ذکر سورہ آلِ عمران میں ہے اس لیے (بینات) جمع ارشاد ہوا ہے۔

وَاَیَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ: (اور پاکیزہ روح سے اس کی مدد کی) اَیَّدْنٰهُ سے بنا بمعنی قوت اسی لیے رائے شامل کرنے کو تائید کہتے ہیں کہ اس سے پہلی رائے کو قوت ملتی ہے۔ بِرُوْحِ الْقُدُسِ یہاں موصوف کی اضافت صفت کی طرف ہے۔ روح حضرت جبرائیل علیہ السلام کا نام ہے۔ کیوں کہ اس سے زندگی ملتی ہے۔ انہی کے گھوڑے کی ٹاپ کی خاک سامری کے بچھڑے کے منھ میں پہنچی تو اس کو زندگی مل گئی۔ چوں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش ان ہی کی سانس سے ہوئی اس لیے آپ کے ساتھ ان کا ذکر ہوا (نعیمی) بعض نے کہا کہ روح سے مراد اسمِ اعظم ہے جس کے ذریعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مردوں کو زندہ کرتے تھے۔ بعض نے کہا کہ روح سے مراد کتاب اللہ ہے چنانچہ ارشاد ہے۔ (اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا) کتاب اللہ کو روح اس لیے کہا کہ جس طرح روح بدن کی حیات کا سبب ہے اسی طرح کتاب اللہ دلوں کی حیات کا ذریعہ ہے۔ (مظہری، روح المعانی) قُدُس بمعنی طہارت مصدر بمعنی اسمِ فاعل یعنی طاہر اور قدس (پاک) سے مراد اللہ تعالیٰ ہے۔ اور اس کی روح کی طرف اضافت تشریفی ہے۔ جیسے بیتُ اللہ، ناقۃُ اللہ وغیرہ۔ اسی کے ہم معنی دوسرے مقام پر فرمایا (وَنَفَخْنَا فِیْهِ مِنْ رُّوْحِنَا) (اور پھونکا ہم نے اس میں اپنی روح سے) یعنی ہم نے بذریعہ جبریل عیسی علیہ السلام کو قوت دی کہ ان ہی کے سانس سے پیدا ہوئے اور ان ہی کے ذریعہ ان کو دشمنوں کے شر سے محفوظ رکھا کہ حضرت جبریل

امین علیہ السلام ہر وقت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ رہتے تھے۔ آخر کار یہود نے آپ کو شہید کرنا چاہا تو ان ہی کے ذریعہ انہیں آسمان پر اٹھالیا۔ اور ممکن ہے کہ روح القدس سے مراد حضور سید عالم ﷺ ہوں۔ کیوں کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے حضور ﷺ کو روح القدس ہی فرمایا کہ: میں جاتا ہوں تا کہ روح القدس آئے، اگر میں نہ جاؤں تو وہ نہ آئے اور مجھ میں اس کا کچھ نہیں (برنباس) موجودہ انجیل یوحنا میں بھی کچھ تحریف کے ساتھ اسی معنی میں عبارت موجود ہے۔ (انا اذھب ثم اٰتی الیکم ..... لان رئیس ھذا العالم یاتی لیس لہ فِیَّ شئیٌ) (باب ۱۴، آیت ۳۰) باب نمبر ۱۶ میں ہے کہ (اَمّا متٰی جاءَ ذاک روح الحق فھو یُرشدکم الیٰ جمیع الحق لِاَنَّہٗ لا یتکلم من نفسہٖ بل کل ما یسمع بہ ویخبرکم بامورٍ آتیہ. ذاک یمجّدنی) الخ (باب ۱۶، آیت ۱۴) پہلی عبارت میں (رئیس ھذا العالم) (سردار جہاں) کہا اور دوسری عبارت میں کہا کہ جب وہ روحِ حق } آئے گا پس وہ تم کو سچائی کی رہ دکھائے گا اور وہ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہے گا بلکہ جو اس نے سنا ہوگا (وہی کہے گا) اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا۔ اور میری وہ عزت بڑھائے گا۔ اور وہ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہے گا الخ۔ (وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الّا وحی یوحیٰ) (النجم) قرآن مجید کی آیت کا ترجمہ ہے۔ (ذاک یمجدانی) (وہ میری بزرگی بیان کرے گا) ظاہر ہے کہ حضور سید عالم ﷺ کے طفیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ ماجدہ بتول مریم کی عظمت کے خطبے پڑھے گئے ان کی حقانیت کا دنیا نے اقرار کیا۔ ورنہ یہود نے عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا انکار کر دیا تھا۔ ان کی والدہ طیبہ طاہرہ کو تہمت لگا دی تھی۔ دنیا والے ان کی نبوت سے مشکوک ہو چکے تھے۔ ان کی نبوت کا اعلان اور ان کی والدہ کی عظمت کے خطبے قرآن مجید نے بیان فرمائے تو یہ ہے جناب مسیح علیہ السلام کی تائید روح القدس (حضور ﷺ) کے ذریعہ۔ (واللہ اعلم)

حضور علیہ الصلوۃ والسلام افضل الانبیاء ہیں۔ ہمارے حضور پر نور شافع یوم النور سید عالم ﷺ تمام پیغمبروں سے افضل ہیں۔ بلکہ بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر } کے مطابق خدا کے بعد آپ کا ہی درجہ ہے اس پر امت کا اجماع ہے۔ اس پر بے شمار دلائلِ نقلیہ، عقلیہ قائم ہیں۔ اس

مقام پر صاحب تفسیرِ کبیر حضرت امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ نے حضور علیہ السلام کے افضل الانبیاء ہونے پر بہت سے عقلی ونقلی دلائل قائم فرمائے اور ہونے والے اعتراضات کے عمدہ جو ابات مرقوم فرمائے ہم ذیل میں ان کا خلاصہ بیان کرتے ہیں جس کو تفصیل کی ضرورت ہو وہ تفسیر کبیر کا مطالعہ کرے۔

۱۔ رب تبارک وتعالیٰ نے آپ ﷺ کے بارے میں ارشاد فرمایا (وما ارسلناک الا رحمة للعالمين) اور ظاہر ہے عالمین میں انبیاء داخل ہیں لہٰذا آپ ﷺ ان کے لیے بھی رحمت ہوئے اور یقیناً رحمت مرحوم سے افضل ہے۔

۲۔ رب تعالیٰ نے فرمایا (وَرَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ) (اے محبوب ہم نے تمہارا ذکر بلند کردیا) چناں چہ کلمہِ شہادت، اذان، التحیات بلکہ تقریباً ہر جگہ اپنے نام کے ساتھ حضور ﷺ کا نام رکھا۔ یہ درجہ کسی پیغمبر کو نہ ملا۔

۳۔ رب تعالیٰ نے حضور ﷺ کی اطاعت کو اپنی اطاعت، حضور ﷺ کی بیعت کو اپنی بیعت، حضور ﷺ کی عزت کو اپنی عزت اور آپ کی رضا کو اپنی رضا اور آپ کی اجابت کو اپنی اجابت قرار دیا۔ چناں چہ ارشاد باری ہے۔ (من يطع الرسول فقد اطاع الله) اور فرمایا (ان الذين يبايعونک انما يبايعون الله يد الله فوق ايديهم) اور فرمایا (ولِلّٰهِ العزة ولرسوله) اور فرمایا (والله ورسولهٗ احق ان يرضوه) اور فرمایا (استجيبو لِلّٰهِ لِلرّسول) بلکہ رب تعالیٰ نے حضور ﷺ کی رضا کے مطابق ہی کعبہ کو قبلہ بنایا (فَلَنُوَلِّيَنَّکَ قبلة ترضها) اور فرمایا (ولسوف يُعْطِيْکَ ربک فترضیٰ) یہ شرف کسی اور پیغمبر کو نہ ملا۔

۴۔ حضور علیہ السلام کو سب سے زیادہ معجزے ملے کیوں کہ قرآنِ مجید کی کل چھ ہزار چھ سو چھیاسٹھ (۶۶۶۶) آیات ہیں اور ہر آیت مستقل معجزے ہیں کیوں کہ ایک ایک آیت کے بارے میں تحدی کی گئی۔ علاوہ ازیں آپ سراپہ معجزہ ہیں ارشاد ہے کہ (قد جاء کم

برھانٌ من رّبکم) الخ دیگر انبیاء علیہ السلام کو محدود معجزات ملے سب سے زیادہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یعنی کل نو(۹) معلوم ہوا کہ حضور علیہ السلام سب سے افضل ہیں۔

۶۔ حضور علیہ اسلام کے معجزات تمام انبیاء علیہم السلام کے معجزوں سے افضل اور اعلیٰ ہیں۔ اولاً تو اس لیے کہ ان تمام حضرات کے معجزے عارضی اور غیر باقی تھے کہ نہ عصا رہا، نہ ید بیضاء مگر حضور ﷺ کا بڑا معجزہ قرآنِ کریم قیامت تک باقی رہے گا کہ دنیا باوجود اس سائنسی ترقی کے اس کے مقابلہ سے آج تک عاجز ہے۔ (کبیر) تو اس لیے حضور ﷺ کے معجزات سب پر فوقیت رکھتے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے طور پر حجاب میں رب سے کلام کیا، مگر ہمارے آقا مولیٰ ﷺ نے شبِ معراج میں بلا حجاب کلام فرمایا۔ عیسٰی علیہ السلام چہارم آسمان پر بلائے گئے مگر ہمارے آقا ﷺ وہاں پہنچے جہاں کہاں تھا نہ وہاں تھا۔

وہی لامکاں کے مکیں ہوئے سرِ عرش تخت نشیں ہوئے
وہ نبی ہے جس کے ہیں سب مکاں وہ خدا ہے جس کا مکان نہیں
سراغ این و متاع کہاں تھا نشانِ کیف و اِلیٰ کہاں تھا
نہ کوئی راہی نہ کوئی ساتھی نہ سنگِ منزل نہ مرحلے تھے

مسیح علیہ السلام نے مردے زندہ کیے مگر ہمارے حضور ﷺ نے خشک لکڑیوں اور بے جان کنکروں کو زندگی بخش کر اپنا کلمہ پڑھوالیا۔ اور آپ کو شجر و حجر نے سلام کیا اور جانوروں نے سجدے کیے۔ موسیٰ علیہ السلام نے پتھر سے پانی کے بارہ چشمے جاری فرمائے۔ حضور علیہ اسلام نے انگلیوں سے پانی کے چشمے جاری فرمادیئے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے عصا سے بحرِ قلزم کو پھاڑا مگر ہمارے آقا ﷺ نے انگلی کے اشارے سے چاند کے دو ٹکڑے کردیئے وغیرہ۔

۷۔ حضور علیہ السلام تمام انبیاء کی صفات کے جامع ہیں یعنی ہر نبی کے کمالات آپ کی ذات میں موجود ہیں۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے (اولٰئک الذین ھدی اللہ فبھدٰھم اقتدہ) اس آیت کا نہ تو یہ مطلب ہے کہ اے محبوب آپ اصولِ دین میں سارے پیغمبروں کی

پیروی کیجئے کہ اصول دین میں تقلید ناجائز ہے۔ اور نہ ہی یہ معنی ہیں کہ فروع دین میں ان کی اطاعت کریں کیوں کہ آپ کا دین تمام ادیان کا ناسخ ہے۔ پس یہی مطلب ہوسکتا ہے کہ آپ ان کے اخلاق سے متصف ہوجایئے۔ (کبیر)

۸۔ تمام پیغمبر خاص خاص جماعتوں اور قبیلوں کی طرف آئے مگر حضور علیہ السلام ساری مخلوق کے لیے نبی ہوئے۔ فرمایا گیا (وما ارسلنک الا کافة للناس) نیز فرمایا (لیکون للعالمین نذیرا) خود حضور ﷺ کا ارشاد ہے۔ (بعثت الی الخلق کافة) ظاہر ہے جس کی سلطنت بڑی ہے وہ سلطان بھی معظم۔

۹۔ حضور سید عالم ﷺ کا دین تمام دینوں سے افضل ہے۔ کیوں کہ وہ سب کا ناسخ ہے۔ لہٰذا حضور ﷺ بھی سارے پیغمبروں سے افضل۔

۱۰۔ حدیث شریف میں ہے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قیامت کے دن میں بنی آدم کا سردار ہونگا اور (میرا یہ کلام بطور) فخر نہیں ہے۔ میرے ہاتھ میں لواُالحمد (حمد کا جھنڈا) ہوگا اور (میرا یہ قول بھی) بطور فخر نہیں ہے آدم کی تمام اولاد اور اس کے علاوہ دوسرے بھی میرے ہی جھنڈے کے نیچے ہونگے اور قبر سے سب سے پہلے میں ہی اٹھوں گا۔ (میرا یہ کلام بطور) فخر نہیں ہے) اور میں ہی سب سے اول سفارشی ہوں گا اور میری ہی سفارش سب سے پہلے قبول کی جائے گی۔ (احمد، ترمذی، ابن ماجہ) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ کچھ صحابی بیٹھے باتیں کررہے تھے کہ حضور اقدس ﷺ تشریف لائے اور ان صحابیوں کو باتیں کرتے سنا۔ ایک صاحب کہہ رہے تھے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ نے اپنا خلیل بنایا۔ دوسروں نے کہا کہ موسیٰ علیہ السلام سے اللہ نے کلام کیا۔ تیسرے نے کہا کہ عیسیٰ علیہ السلام کلمۃ اللہ اور روح اللہ تھے۔ چوتھے بولے آدم علیہ السلام کو صفی اللہ بنایا۔ حضور علیہ السلام ان کے سامنے تشریف لائے اور فرمایا: میں نے تمہاری تعجب آگیں باتیں سنیں کہ ابراہیم خلیل اللہ تھے بیشک وہ ایسے ہی تھے اور موسیٰ کلیم اللہ تھے واقعی وہ ایسے تھے اور عیسیٰ علیہ السلام کلمۃ اللہ اور روح اللہ

تھے حقیقت میں وہ ایسے ہی تھے اور آدم علیہ السلام صفی اللہ تھے وہ اسی طرح تھے۔ لیکن (اَلا وَاَنَا حبیب اللّٰہ ولا فخر) (میں اللہ کا حبیب ہوں (ﷺ) اور (میرا یہ کلام) بطور فخر نہیں۔ میں ہی جنت کی زنجیر سب سے پہلے کھٹ کھٹاؤں گا۔ اور اللہ تعالیٰ میرے لیے جنت کو کھول دے گا اور مجھے اندر داخل فرمائے گا اور اس وقت میرے ساتھ فقراء مسلمین بھی ہونگے اور (یہ بات بطور) فخر نہیں اور میں اللہ تعالیٰ کے ہاں تمام اگلوں پچھلوں سے زیادہ معزز ہوں اور (یہ بات بھی بطور) فخر نہیں (ترمذی، دارمی)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ حضور سید عالم ﷺ نے فرمایا: میں قائد المرسلین ہوں اور (یہ بات بطور) فخر نہیں۔ میں خاتم النبیین ہوں اور (یہ کلام بھی بطور) فخر نہیں۔ میں سب سے اول سفارش کرنے والا ہوں اور سب سے پہلے میری سفارش مانی جائے گی اور (یہ بات بھی بطور فخر نہیں) (دارمی) حضرت ابن ابی کعب رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول ﷺ نے فرمایا: جب قیامت کا دن ہوگا تو میں تمام انبیاء کا امام اور خطیب اور ان کی طرف سے سفارشی ہونگا اور کوئی فخر نہیں ہے۔ (ترمذی) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ: سب سے پہلے میں ہی قبر سے اٹھوں گا۔ مجھے جنت کا خلعت پہنایا جائیگا۔ پھر میں عرش کی دائیں جانب اس مقام پر کھڑا ہونگا کہ میرے سوا اس جگہ پر مخلوق میں سے کوئی کھڑا نہیں ہوگا۔ (ترمذی)

شبہ: ا

آیتِ مذکورہ سے ثابت ہو رہا ہے کہ بعض انبیاء علیہ السلام بعض سے افضل تھے۔ مگر دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ سارے نبی یکساں ہیں ان میں کوئی فرق نہیں۔ (لا نفرق بین احد من رسله) نیز حضرت ابو سعید، حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہم) کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ: اللہ کے پیغمبروں کے درمیان تفضیل نہ کرو۔ نیز آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ مجھے یونس علیہ السلام پر بھی فضیلت مت دو یا موسیٰ علیہ اسلام سے افضل نہ کہو۔

شبہ کا ازالہ:

آیت (لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ) الخ کا مطلب یہ ہے کہ ہم یہود ونصاری کی طرح انبیاء کرام علیہم السلام پر ایمان لانے میں فرق نہیں کرتے کہ بعض کو مانیں اور بعض کا انکار کریں۔ بلکہ سب پر ایمان لاتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ہم نفسِ نبوت میں فرق نہیں کرتے کہ دیو بندیوں اور قادیانیوں کی طرح بعض کی نبوت اصلی اور بعض کی عارضی مانیں۔ بلکہ سب کو یکساں مانتے ہیں۔ اور حضور علیہ السلام کے ارشادات کا مطلب یہ ہے کہ جب تک اللہ تعالیٰ نہ بتادے، خود اپنی رائے سے دلیلِ شرعی کے بغیر ایک پیغمبر کو دوسرے پر فضیلت دینا جائز نہیں۔ کیوں کہ فضیلت کا معنی کثرتِ ثواب اور قربِ خداوندی کی زیادتی کے علاوہ اور کچھ نہیں اور انسانی رائے سے اس کا فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔ ہاں جب قرآن یا حدیث سے بعض انبیاء کی بعض پر فضیلت ثابت ہوجائے تو تفضیل بین الانبیاء میں کوئی حرج نہیں۔ یا حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں یونس یا موسیٰ علیہ السلام پر اسطرح فضیلت نہ دو کہ ان کی توہین نہ ہو جائے۔ چناں چہ امام اہل سنت مولانا الشاہ احمد رضا خان رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے کسی نعت خواں نے پڑھا شانِ یوسف جو دبی وہ بھی یہیں آکے دبی۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: یوں نہ کہو۔ بلکہ یوں کہو! شان یوسف جو بڑھی وہ بھی اسی در سے بڑھی۔ حضور علیہ السلام سے بلندیاں ملتی ہیں اور شانیں چمکتی ہیں نہ کہ دبتی ہیں۔

شبہ:

بعض انبیاءِ کرام کے معجزات حضور ﷺ کے معجزات سے کہیں بڑھ کر ہیں۔

آدم علیہ السلام کو ملائکہ نے سجدہ کیا۔ ابراہیم علیہ السلام پر آگ گلزار ہوئی۔ موسیٰ علیہ السلام کو عصا اور یدِ بیضاء ملا۔ داوٗد علیہ السلام کے ہاتھ میں لوہا نرم ہوا سلیمان علیہ السلام کے قبضے میں جن وانس وحوش وطیور اور ہوائیں تھیں۔ عیسیٰ علیہ السلام نے مردہ زندہ کیے، بیماروں کو شفا بخشی، لقب کلمۃ اللہ۔ ان مذکورہ بالا میں سے حضور علیہ السلام کے لیے ایک بھی ثابت نہیں لہٰذا یہ حضرات حضور ﷺ سے افضل ہوئے۔

ازالہ:

اس شبہ کا ایک تو اجمالی جواب ہے جو کہ حکیم الامت مفتی احمد یار خان مرحوم نے اپنی تفسیرِ نعیمی میں مرقوم فرمایا وہ یہ ہے کہ یہ خصوصی فضیلتیں ہیں۔اور حضور علیہ السلام کو فضیلتِ کلی حاصل ہے۔اگر بادشاہ کسی جرنیل کو کوئی خاص تمغہ عنایت فرمائے تو اگر چہ یہ تمغہ وزیر اعظم کو نہ ملا مگر درجہ اسی کا بڑا ہے۔اور قرب اسی کو زیادہ ہے تفصیلی جواب جو کہ دیگر مفسرین اور خصوصاً امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیرِ کبیر میں لکھا وہ یہ ہے۔کہ آدم علیہ السلام محض مسجودِ ملائکہ ہونے کی وجہ سے حضور علیہ السلام سے افضل نہ ہوئے کیوں کہ قیامت میں حضور ﷺ ہی کے جھنڈے کے نیچے ہونگے۔علاوہ ازیں آدم علیہ السلام کا مسجودِ ملائکہ بھی آپ ہی کے صدقہ سے تھا۔(ان الملائکۃ امروا بالسجود لآدم لاجل ان نور محمدٍ علیہ السلام فی جبھۃ آدم) (صفحہ ۲۰۰/۶، طبع ثانی طہران) نیز حضور علیہ السلام اس وقت بھی نبی تھے جب آدم علیہ السلام آب وگل میں تھے۔نیز سارے فرشتے اور خود رب تعالیٰ حضور ﷺ پر ہمیشہ درود بھیجتے ہیں۔سجدہ ایک خاص وقت میں ہوا اور صرف ملائکہ نے کیا مگر یہ درود قیامت تک جاری رہے گا۔اور منقول ہے کہ جبرئیل علیہ السلام نے شبِ معراج براقِ مصطفیٰ ﷺ کی رکاب تھامی یہ سجدہ سے بڑھ کر ہے۔ابراہیم علیہ السلام پر آگ کا گلزار ہو جانا اسی وجہ سے تھا کہ ان کی پیشانی میں نورِ محمدی ﷺ جلوہ گر تھا۔نیز آپ ﷺ کے غلاموں پر دوزخ کی آگ گلزار ہو جائیگی بلکہ پکارے گی (جزیا مومن فان نورک اطفا لھبی) (او کما قال) نیز سارے وحوش وطیور، نباتات، جمادات، چاند، سورج، زمین، بادل سب آپ کے قبضے میں تھے۔جیسا کہ علمِ حدیث پڑھنے والوں پر عیاں ہے۔تو معلوم ہوا

سب سے اولیٰ واعلیٰ ہمارا نبی — سب سے بالا واعلیٰ ہمارا نبی (ﷺ)

آیت الکرسی کی تفسیر

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ لَا تَاْخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّلَا نَوْمٌ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗٓ اِلَّا بِاِذْنِہٖ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ وَمَا خَلْفَھُمْ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِہٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ وَسِعَ کُرْسِیُّہُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَا یَؤُدُہٗ حِفْظُھُمَا وَھُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ (سورۃ البقرۃ:۲۵۵)

”اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ آپ زندہ اور اوروں کو زندہ رکھنے والا۔ اسے نہ اونگھ آئے اور نہ نیند۔ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ وہ کون ہے جو اس کے یہاں سفارش کرے بے اس کے حکم کے۔ جانتا ہے جو کچھ ان کے آگے ہے، اور جو کچھ ان کے پیچھے۔ اور وہ نہیں پاتے اس کے علم میں سے مگر جتنا وہ چاہے۔ اس کی کرسی میں سمائے ہوئے آسمان اور زمین اور اسے بھاری نہیں ان کی نگہبانی اور وہی ہے بلند بڑائی والا۔“

تفسیر:

اَللّٰہُ: یہ اسم ذات ہے اور باقی نام رب تعالیٰ کے صفاتی ہیں۔ اسی لیے قادر، علیم، رحیم وغیرہ مخلوق کو بھی کہہ سکتے ہیں مگر اللہ کسی کو نہیں کہہ سکتے۔

لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ: الٰہ کے معنی معبود ہیں۔ معبود سے مراد لائق عبادت نہ کہ ہر وہ جس کی عبادت ہوتی ہو۔ یہاں الٰہ سے مراد سچا معبود کیوں کہ جھوٹے معبود تو بت وغیرہ بھی ہیں۔ یعنی اُس کے سوا کوئی سچا معبود نہیں۔ عبادت کے معنی ہیں انتہائی عجز و انکسار، عابد، انتہائی عاجز۔ معبود انتہائی عزت والا

جس کے سامنے دوسرے انتہائی عاجزی کریں۔ بندہ جو کام اپنے کو بندہ سمجھ کر اور دوسرے کو رب یا رب کی مثل سمجھ کر کرے وہ عبادت ہے۔

حَیٌّ: یہ حیات سے بنا اور اس کا معنی زندگی ہے۔ صاحب تفسیر روح المعانی نے فرمایا کہ: ہر کامل فی الجنس کو حی کہا جاتا ہے۔ اسی لیے بنجر زمین کے آباد کرنے کو احیاءِ اموات کہتے ہیں۔ چوں کہ زندگی ہی جسم کا کمال ہے۔ اور وہ تمام صفات کی موقوف علیہ ہے۔ اسی لیے اسے بھی حیات کہہ دیتے ہیں۔ درختوں کی سر سبزی کو بھی حیات کہا جاتا ہے۔ لہٰذا اس کا مطلب یہ ہوا کہ اپنی صفات میں کامل کہ وہ اور اس کی صفاتِ حقیقیہ وصفاتِ اضافیہ قابل عدم نہیں اور نہ ہی اس کے کمال کی کوئی حد بندی ہے۔

اَلْقَیُّوْمُ: یہ قیام کا مبالغہ ہے۔ قیوم کا معنی ہے نگراں (ابن مجاہد) یا ہر نفس کے اعمال کا نگراں (کلبی) قیوم کا ترجمہ منتظم بھی کیا گیا ہے۔ ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے کہا قیوم کا معنی غیر فانی ہے۔ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا کہ قیوم وہ ہے جو ہمیشہ مخلوق کی حفاظت اور تدبیر کرنے والا۔ علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے ترجمہ کیا ہمیشہ باقی رہنے والا (مظہری) مولانا شاہ احمد رضا فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ترجمہ کیا۔ اوروں کو زندہ رکھنے والا۔ بہر حال ان تمام اقوال کا مشترک معنی یہ ہے کہ اللہ لازوال بذاتِ خود موجود۔ دوسری چیزوں کی نگرانی کرنے اور ہستی کا قائم رکھنے والا۔ اس کے بغیر کسی چیز کی بقاء اور ہستی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اللہ کے قیوم ہونے کا تقاضا ہے کہ جس طرح ہر چیز اپنی ہستی کے لیے خدا کی محتاج ہے اسی طرح بقاءِ ہستی میں بھی اس سے بے نیاز نہیں ہے۔ جس طرح سایہ اصل شی کا محتاج ہوتا ہے۔ اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ کائنات اللہ تعالیٰ کی محتاج ہے۔ شان اعلیٰ اللہ کی ہی ہے۔ نیز تمام موجودات تین قسم کے ہیں۔ بعض وہ جو دوسرے سے قائم یعنی اپنے محل کے محتاج، انہیں عرض کہتے ہیں۔ بعض وہ جو بغیر کسی محل کے خود موجود ہیں جیسے اجسام انہیں جوہر یا قائم بالذات کہا جاتا ہے۔ بعض وہ جو خود بھی موجود اور ان سے دوسرے بھی موجود اسے قیوم کہتے ہیں۔ رب تعالیٰ قیوم حقیقی ہے کہ اس کے ارادہ واذن سے عالم موجود و قائم ہے اور بعض حضرات اولیآء قیوم بالعرض ہیں جن کے ذریعہ عالم کو رب نے قائم رکھا ہے۔

لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ : (اسے نہ اونگھ آئے اور نہ نیند) تَاْخُذُ اخذ سے بنا بمعنی پکڑنا۔ یہ کبھی غلبہ کے ساتھ جسے بطش کہتے ہیں۔ اور کبھی عارضی یہاں ہر قسم کی پکڑ کی نفی ہے۔ سِنَةٌ وسَنٌ سے بنا۔ جس کا معنی غفلت ہے۔ اصطلاح میں نیند کے مقدمہ کو جس سے اعضاء بے قابو ہو جائیں اور پوری غفلت طاری نہ ہو سِنَةٌ کہتے ہیں۔ اور نینداس استرخائی کیفیت کو کہتے ہیں جو مرطوب کے بخارات چڑھنے سے دماغی اعصاب میں پیدا ہو جاتی ہے اور پٹھوں کے اسی ڈھیلے پن کی وجہ سے ظاہری حواس احساس سے بیکار ہو جاتے ہیں۔ آیت مذکور میں صفت سلبیہ کا اظہار ہے۔ جس سے تشبیہ (مخلوق سے مشابہت) کی نفی ہو رہی ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ کے حی و قیوم ہونے کی یہ تاکید ہے۔ نیند موت کی بہن ہے۔ جس کو نیند یا اونگھ آتی ہے۔ اس کا نظام زندگی درست نہیں رہتا و اشیاء کی حفاظت اور نگہداشت سے (نیند کے اوقات میں) قاصر ہو جاتا ہے۔ اسی لیے (القیوم) اور (لا تاخذہ) کے درمیان حرف عاطف نہیں لایا گیا کیونکہ حرف عطف مغائرت پر دلالت کرتا ہے۔ اور یہاں فقدانِ نعاس ونوم اللہ کی قیومیت کی دلیل ہے۔ (مظہری)

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجمع میں کھڑے ہو کر پانچ باتیں فرمائیں۔ فرمایا: کوئی شک نہیں کہ اللہ نہیں سوتا اور نہ سونا اس کے لیے زیبا ہے۔ و میزان کو نیچا اونچا کرتا ہے۔ اس کے سامنے رات کے اعمال دن کے اعمال سے پہلے لائے جا۔ ہیں۔ اور دن کے اعمال کی پیشی پہلی رات کے اعمال سے پہلے ہو جاتی ہے۔ اس کا حجاب نور ہے اگر ہر پردہ نور الٹ جائے تو اس کے انوار جمال حد نگاہ تک مخلوق کو سوختہ کر دیں (مسلم بحوالہ مدارک وغیرہ)

لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ : (اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے) یہ جملہ اللہ تعالیٰ کی قیومیت، الوھیت اور معبودیت کی دلیل ہے۔ یعنی آسمانوں اور زمین کی ساری چیزیں اس کی مخلوق اور حقیقی مملوک ہیں کوئی اس کا شریک نہیں۔

مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗٓ اِلَّا بِاِذْنِہٖ :(وہ کون ہے جو اس کے یہاں سفارش کرے بے اس کے حکم کے) چونکہ کفار اپنے بتوں کی شفاعت کے امیدوار تھے۔ان کا عقیدہ تھا کہ یہ بت حکومتِ الٰہیہ کے ارکان دولت اور اس کے چلانے والے ہیں اس لیے رب کو ان کی شفاعت ماننی پڑے گی ان کی تردید کے لیے ارشاد ہوا۔اس جملہ کے دو معنی ہیں۔ایک یہ کہ کون ہے جو رب کے نزدیک بلا اجازت کسی کی سفارش کر سکے؟ دوسرے یہ کہ جو بندے رب کے نزدیک رہتے ہیں ان میں سے بھی بغیر اجازت کون کسی کی سفارش کر سکتا ہے؟ (روح البیان) جب نزدیکوں کا یہ حال ہے تو وہ بت جنہیں رب سے دور کا بھی تعلق نہیں وہ کیا شفاعت کر سکتے ہیں؟

ذیل میں ہم مسئلہ شفاعت کے بارے میں چند ضروری باتیں بیان کرتے ہیں۔

۱۔ کفار اپنے بتوں کے متعلق دو عقیدے رکھتے تھے۔ایک یہ کہ ان میں الوہیت ایسے حلول کیے ہوئے ہے جیسے پھول میں رنگ و بو اسی لیے ان کو الٰہ اور شرکاء کہتے ہیں اور خدا تعالیٰ کو الٰہِ اکبر ۔ان کا عقیدہ تھا کہ اکیلا اللہ تعالیٰ اتنا بڑا جہان نہ سنبھال سکتا ہے، نہ چلا سکتا ہے ۔اس نے اپنی مدد کے لیے اپنے کچھ بندوں کو اپنا معاون و مددگار بنایا ہے۔اور ان میں کام تقسیم کر دیئے ہیں۔ان بندوں میں بعض تو اللہ کی لڑکیاں ہیں۔اور بعض اللہ کی بیویاں اور بیٹے اور بعض اگرچہ ہیں تو بندے مگر حکومت الٰہیہ کی پارلیمنٹ کے ممبر ہیں۔اسی لیے انہیں خدا کا بندہ بھی کہتے اور خدا کا شریک بھی۔انہی کی تردید کے لیے رب نے فرمایا(ولم یکن لہ ولی من الذل و کبرہ تکبیرا) (اللہ نے عاجزی اور مجبوری کی بنا پر کسی کو ولی نہ بنایا)۔یہ عقیدہ شرک ہے ۔دوسرے یہ کہ یہ چھوٹے خدا بڑے خدا کے ہاں ہماری شفاعت کریں گے۔اور اس بڑے خدا کو جبراً ان کی شفاعت ماننی پڑے گی۔جیسے بادشاہ کو ارکانِ سلطنت کی سفارش اسلیے ماننی پڑتی ہے کہ ان کے بگڑ جانے سے زوالِ سلطنت کا اندیشہ ہے۔اس آیت میں دونوں عقیدوں کا ردِ بلیغ فرمایا گیا۔گویا فرمایا گیا۔وہاں تو وہی شفاعت کرے گا جسے اس کی اجازت مل چکی ہو۔یعنی انبیآء ملائکہ اور مومنین وغیرہ۔آیتِ

مذکورہ بالا میں دباؤ کی شفاعت کا انکار ہے۔اور شفاعت بالوجاہت اور شفاعت بالمحبة جو کہ شفاعت بالاذن کی قسمیں ہیں۔ان کا ثبوت ہے۔لہٰذا صاحب تفسیر احمدی نے اسی آیت کے تحت لکھا (وفیه دلیلٌ علی نفی الشفاعة للکفار علی مافی الزاهدی واقول یلزم منه جواز الشفاعة بعد الاذن فی الجملة للمومنین فیکون رداً علی المعتزلة فی انکار الشفاعة) الخ اگر مطلقاً شفاعت نہ ہو تو نماز جنازہ اور زیارت قبور اور مومنین کے لیے دعا سب بے کار ہو جائیں (نعیمی مع الزیادة القلیلہ)؟

۲۔ انبیاء، اولیاء، مشائخ، حجر اسود، قرآن مجید، خانہ کعبہ، ماہ رمضان اور مسلمانوں کے نابالغ بچے سب شفاعت کریں گے۔مگر چوں کہ قیامت کے دن اول وقت میں جب سب نفسی نفسی پکار رہے ہوں گے حضور علیہ ﷺ ہی شفاعت کی ابتداء فرمائیں گے۔اور دروازہ شفاعت آپ کے ہاتھ پر کھلے گا اسی لیے شفیع المذنبین آپکا ہی لقب ہے۔

۳۔ شفاعت تین قسم کی ہوگی۔بلندی درجات کے لیے اور معافی سیئات کے لیے۔میدان حشر سے نجات دلانے کے لیے۔پہلی شفاعت بے گناہوں کے لیے اور دوسری صرف گناہ گار مسلمانوں کے لیے۔اور تیسری شفاعت سے فائدہ کفار بھی حاصل کریں گے۔معلوم یہ ہوا کہ سارا جہاں حضور سید عالم ﷺ کی شفاعت کا حاجت مند ہے۔وہ جو ایک روایت میں آتا ہے کہ تارک سنت شفاعت سے محروم ہے۔اس سے پہلی شفاعت مراد ہے اور دوسری روایت میں ہے کہ میری شفاعت گناہ کبیرہ والوں کے لیے بھی ہے۔اس سے دوسری شفاعت مراد ہے۔یعنی عفو سیئات (شامی کتاب الصلوۃ)

۴۔ بعض گناہ گاروں کو تو بغیر عذاب شفاعت نصیب ہو جائے گی۔بعض کی مدت عذاب میں کمی ہو جائے گی۔اور بعض گناہ گار اپنی پوری سزا بھگت کر شفاعت پائیں گے۔بعض جنت میں پہنچ کر شفاعت کی بدولت بلند درجے پائیں گے۔(اللھم ارزقنا شفاعة نبیک الکریم علیہ ﷺ) (آمین)

فائدہ: کفار کے لیے دُعائے مغفرت کرنا، ان پر نمازہ جنازہ پڑھنا، انہیں مرحوم و مغفور کہنا حرام ہے۔ کیوں کہ یہ سب دعائیں اور شفاعتیں ہیں۔ اور کفار کے لیے شفاعت منع ہے۔

فائدہ: رب تعالیٰ کے لیے غفلت، بے توجہی، بے علمی محال ہے۔ جو کوئی ایک آن کے لیے اسے بے علم مانے وہ بے دین ہے۔ جیسے بعض دیوبندی جو رب کو ہر وقت عالم الغیب نہیں مانتے (دیکھئے تقویۃ الایمان اور بلغۃ الحیر ان) اور انسان خود مختار ہے۔ اچھے کام کرے یا نہ کرے اور اللہ کو پہلے سے کوئی علم نہیں ہوتا کہ کیا کرے گا۔ بلکہ اللہ کو ان کے کرنے کے بعد معلوم ہوگا اور آیت قرآنی جیسا کہ (ولیعلم الذین) وغیرہ بھی اور احادیث کے الفاظ بھی اس مذہب پر منطبق ہیں۔ (نعوذ باللہ من ذالک) (تفسیر بلغۃ الحران مطبوعہ حمایت اسلام پریس لاہور، بار اول صفحہ ۱۵۸/ ۱۵۷)

حالاں کہ علم الٰہی کے متعلق کتاب و سنت کی روشنی میں مذہب مھذب اہل سنت والجماعت یہ ہے کہ علم الٰہی کا منکر خارج از اسلام ہے۔ (دیکھئے شرح فقہ اکبر ۲۰۱) (من اعتقد ان اللّٰہ لا یعلم الاشیاء قبل وقوعها فهو کافر وان عد قائلة من اهل البدعة) (جس شخص کا یہ اعتراض ہو کہ اللہ تعالیٰ کسی چیز کو اس کے واقع ہونے سے پہلے نہیں جانتا وہ کافر ہے۔ اگر چہ اس قائل کو اہل بدعت سے شمار کیا گیا ہو) آیۃ کریمہ (بحکم ولیعلم الذین) اور اس قسم کی دیگر آیات و احادیث میں مجاہدین و غیر مجاہدین اور مؤمنین و منافقین کا امتیاز باہمی مراد ہے۔ اور معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے غیر مجاہدین کو مجاہدین سے اور منافقین کو مومنین سے ابھی تک جدا نہیں کیا (آئندہ علمِ الٰہی کے مطابق) انہیں الگ کر دیا جائے گا۔ یہاں علم سے تمیز مراد ہے (فلیعلمن اللّٰہ بمنزلہ فلیمیز اللّٰہ) کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے قول (لیمیز اللّٰہ الخبیث من الطیب) میں خبیث کا طیب سے جدا ہونا منصوص ہے۔ ایسے ان آیات میں (جنہیں مولوی حسین علی واں بھچری نے) نفیِ علمِ الٰہی کی دلیل سمجھا ہے۔ مومنین، منافقین وغیرہ کا ایک دوسرے سے

الگ ہونا مذکور ہے۔ دیکھئے بخاری شریف جلد ثانی صفحہ ۷۰۳ (فلیعلمن اللہ علم اللہ ذالک انما ھی بمنزلہ فلیمیز اللہ لقولہ لیمیز اللہ الخبیث) الخ یہ مطلب ہرگز نہیں کہ معاذ اللہ خدائے علیم وخبیر کو ان کا علم نہیں۔ اللہ تعالیٰ تو ہر چیز کو جانتا ہے۔

(نوٹ): اس مقام پر یہ کہنا کہ اس عبارت میں مولوی حسین علی صاحب نے اپنا مذہب بیان نہیں کیا بلکہ معتزلہ کا مذہب نقل کیا ہے۔ انتہائی مضحکہ خیز ہے اس لیے کہ جب مولوی صاحب مذکور نے قرآن وحدیث کو اس مذہب پر منطبق مانا تو اس کی حقانیت کو تسلیم کر لیا خواہ وہ معتزلہ کا مذہب ہو (الحق المبین)

اعتراض: مسئلہ شفاعت عقل کے خلاف ہے۔ کیونکہ جو لوگ شفاعت سے بخشے جائیں، رب تعالیٰ انہیں بخشنا چاہتا تھا یا نہیں۔ اگر چاہتا تھا تو شفاعت بے کار ہوئی وہ تو ویسے ہی بخشے جائیں اور اگر نہ چاہتا تو رب تعالیٰ کی مجبوری لازم آئی۔ کہ رب بخشنا تو نہ چاہتا تھا مگر شفیع کی وجہ سے اسے بخشنا پڑ گیا۔

جواب: اس اعتراض کے دو جواب ہیں ایک الزامی اور دوسرا تحقیقی۔ الزامی جواب یہ ہے کہ پھر تو دوائیں دعائیں بلکہ عالم کے تمام اسباب بے کار ہوئے۔ بیمار نے دوا کھائی شفاء پائی بتاؤ رب نے اس کی شفاء چاہی تھی یا نہیں اگر چاہی تھی دوا کی کیا ضرورت تھی خود ہی آرام ہو جاتا اور اگر نہ چاہی تو خدا کے ارادے کے خلاف کیسے ہو گیا؟ جواب تحقیقی یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے انہیں بخشنا چاہا تھا بذریعہ شفاعت کے یعنی بخشش بھی رب کے حکم سے، شفاعت بھی اس کے حکم سے، رب نے بیمار کی شفاء چاہی اور دوا بھی یہ معنی ہیں شفاعت کے۔

شبہ: فقہاء فرماتے ہیں کہ کسی بندہ کو قیوم کہنا کفر ہے حالاں کہ مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کتب میں بعض اولیاء کو قیوم اول اور قیوم دوم وغیرہ کہا گیا ہے۔

قائم تنصرون

شبہ کا ازالہ: جس معنی سے خدا تعالیٰ کو قیوم کہتے ہیں اس معنی میں (مستقل بالذات) اوروں کو قیوم کہنا کفر ہے۔ ہاں صوفیائے کرام کی اصطلاح میں ولایت کا ایک درجہ قیومیت بھی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ عالم کا قیام رکھنے والا قیوم اوران حضرات کے ذریعے عالم قائم جیسے مرکز سے دائرہ اور دیوار سے چھت لہٰذا وہ قیوم عالم ہوئے چوں کہ آسمان وزمین مثلِ دائرہ گول ہیں۔ اور دائرہ میں مرکز قطبین وغیرہ سب ہوتے ہیں ایسے ہی عالم میں ابدال، اوتاد، قطب اور قیوم ہونا ضروری ہے۔ جس سے عالم باقی رہے۔ حدیث شریف میں ہے (بھم ترزقون بھم تنصرون) (الحدیث)

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ: (جانتا ہے جو کچھ ان کے آگے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے) یعلم حال استمراری ہے یعنی ہمیشہ سے جانتا ہے۔ ما سے مراد مخلوق کے سارے حالات ہیں۔ ھم کی ضمیر (مافی السمٰوت والارض) کی طرف راجع ہے۔ عاقل اور غیر عاقل دونوں کو شامل ہے لیکن اہلِ عقل کو بے عقل مخلوق پر ترجیح دے کر ایسی ضمیر ذکر کر دی جو اہلِ عقل کے لیے مخصوص ہے۔ یا ھم کی ضمیر ذا کی طرف راجع ہے۔ (جو من ذا الذی میں مذکور ہے) اور ذا سے مراد انبیاء اور ملائکہ ہیں۔ یعنی رب تعالیٰ باوجود اس قدر وسیع سلطنت کی تمام چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی چیزوں کے تمام جزوی وکلی حالات جانتا ہے۔ نیز وہ تمام مخلوق کے سارے اگلے پچھلے حالات جانتا ہے کہ کیا ہو چکا اور کیا ہوگا۔

وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَىْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ: (اور وہ نہیں پاتے اس کے علم میں سے مگر جتنا وہ چاہے) یحیطون احاطہ سے بنا اس کا معنی گھیر لینا۔ کبھی بمعنی حفاظت آتا ہے۔ (الا انہ بکل شیئ محیط) محیط کبھی روکنے کے معنی میں آتا ہے۔ (الا ان یحاط بکم) (مفردات) کسی چیز پر علم کے ذریعہ احاطہ کرنے کا معنی یہ ہوتا ہے کہ انسان اس چیز کے وجود، جنس، کیفیت اس کی غرض اور اس کو وجود میں لانے کے مقصد الغرض اس کے مالہٗ وماعلیہ کو پوری طرح جان لے اور اس قسم کا احاطہ اللہ کے سوا کسی اور کو حاصل نہیں ہو سکتا (امام راغب) من علمہ سے

مالہ

مراد معلومات ہیں۔ چوں کہ من تبعیضیہ ہے۔اور خدا کی صفت میں بعضیت محال ہے۔(کبیر) یعنی کوئی بھی اس کی معلومات کو نہیں جانتا مگر اسی کے جانے سے۔اس کی تفسیر یہ آیت ہے۔ (فَلا یُظْهِرُ عَلیٰ غَیْبِهِ احدا الا من ارتضیٰ من رسول) اس استثناء میں انبیاء کرام اور اولیاء اللہ داخل ہیں کہ رب تعالیٰ انہیں علوم غیبیہ عطا فرماتا ہے۔(کبیر و خازن)

وَسِعَ کُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْض : اس جملہ میں اللہ تعالیٰ کی وسعت علمی کا بیان ہے۔ وَسِعَ وُسْعَةٌ سے بنا بمعنی اندر لے لینا، سما لینا، گھیر لینا، وسعت اور احاطہ قریب المعنی ہیں برداشت کرنے اور طاقت رکھنے کو بھی وسعت کہہ دیتے ہیں۔حدیث میں ہے ما وسعه الا تباعی مگر یہاں پہلے معنی مراد ہیں۔(نعیمی)

کرسی کا اصل کرس ہے جس کا معنی اوپر تلے جم جانیوالا اور جمع ہو جانے والا اسی سے کراسۃ (مجموعہ اوراق) ہے۔(کَرَسْتُ البناء) میں نے عمارت کی بنیاد رکھی چناں چہ وہ بنیاد پڑ گئی۔الکرس کسی چیز کی اصل اور بنیاد کو بھی کہتے ہیں۔محاورہ ہے (ھو قدیم الکرس) اس کی بنیاد پرانی ہے۔ کسی چیز کے ڈھیر کو بھی کرس کہہ دیتے ہیں۔کروس کے معنی بڑے سر والا کے بھی ہے۔علامہ زمخشری نے اس کی تفسیر ملک اور علم سے کی اسی لیے علماء کو کراسی کہا جاتا ہے۔مشہور محاورہ ہے۔(خیر ھذہ الحیوان الاناسی ثم الکراسی) مخلوقات میں سب سے بہتر انسان اور ان میں سے علماء۔

آیت میں لفظ کرسی کی تفسیر میں ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ کرسی سے مراد علم باری تعالیٰ ہے۔اور بعض نے کہا کرسی سے مراد حکومت و اقتدار کے ہیں۔بعض کہتے ہیں کہ فلک محیط یعنی فلک الافلاک کا دوسرا نام کرسی ہے۔اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے کہ سات آسمان کی مثال کرسی کے مقابلے میں ایسی ہی ہے جیسے بیابان میں ایک انگھوٹی پڑی ہو۔(المفردات فی غریب القرآن للراغب الاصفہانی) (ایضا قد اخرج ابن جریر و ابن المنذر عن ابن عباس و روی بمعناہ عن ابی ذر مرفوعا) (روح المعانی) علامہ محمود آلوسی فرماتے ہیں کہ متاخرین کی ایک بہت بڑی جماعت اس طرف گئی ہے کہ کرسی کا لفظ بطور تمثیل ذکر کیا گیا ہے اور یہ عظمت باری تعالیٰ اس کی وسعت سلطنت اور اس کے احاطہ علم سے کنایہ ہے۔لیکن احادیث صحیحہ سے کرسی

کا ہونا ثابت ہے اور اس کی کیفیت اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔
بعض صوفیاء نے کہا کہ یہ تمام صفات فعلیہ کی تجلی سے عبارت ہے کہ اکثر سلف نے اسے متشابہات سے مانا ہے کسائر صفاتہ تبارک وتعالیٰ (روح المعانی صفحہ ۹/۳ ج)

وَلَا يَئُودُهُ حِفْظُهُمَا: (اور اسے بھاری نہیں ان کی نگہبانی) يَئُودُهُ اودٌ سے بنا ہے۔ بمعنی مشقت اور بوجھ یہ باب نصر سے ہے۔ اور ہٗ کا مرجع رب تعالیٰ ہے۔ حِفْظُهُمَا حفظ سے بنا یعنی نگہبانی ھما کا مرجع آسمان وزمین کیوں کہ یہ دو مختلف جنسیں ہیں۔ یعنی رب تعالیٰ کو اتنے بڑے آسمان وزمین کی نگہبانی بھاری نہیں۔

وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ: (اور وہی ہے بلند بڑائی والا) یہ دونوں لفظ قریب المعنیٰ ہیں۔ علی بمعنی بلند اس سے مکانی بلندی مراد نہیں۔ بلکہ کمالات میں اعلیٰ ہونا مراد ہے۔ یعنی وہ علم وسلطنت اور صفات میں سب سے اعلیٰ درجہ والا اور عظیم ہے کہ اس کے سامنے ہر چیز حقیر ہے عظمت صفت اضافی ہے۔ ہر چیز اپنے حقیر کے مقابل عظیم ہوتی ہے۔ اسی لیے رب تعالیٰ سب سے عظیم ہے۔

(آیت الکرسی کے فضائل وفوائد)

اس آیت کا نام آیت الکرسی ہے کیوں کہ اس میں کرسی کا ذکر ہے۔ اس کے فضائل وفوائد بے شمار ہیں۔ ہم کچھ فضائل اور پھر کچھ فوائد ذکر کرتے ہیں۔

آیت الکرسی میں خصوصیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے مباحث بیان کیے گئے ہیں۔ یہ آیت بتا رہی ہے کہ اللہ ہی کا وجود حقیقی اور اصلی ہے۔ اس کی ہر صفت کامل ہے۔ اس کی حیات اور حیات کی تابع دوسری صفات مثلاً علم، قدرت، ارادہ، سننا، دیکھنا اور کلام کرنا سب ہی اوصاف کمال ہیں۔ وہ ساری کائنات کو ہستی اور اقوام ہستی عطا کرنے والا ہے۔ ہر چیز کا قیام اسی کی ذات سے ہے۔ لیکن یہ قیام ایسا نہیں جیسا عرض کا جوہر کیساتھ ہوتا ہے۔ بعض اکابر کا قول

کہ عالم ایک مجموعہ اعراض ہے۔ جو ذات واحد میں جمع ہیں۔اس قول سے دھوکہ ہوسکتا ہے کہ ذات خداوندی سے عالم کا قیام اس طرح ہے۔جس طرح جوہر کیساتھ عرض کا قیام ہوتا ہے۔مگر یہ مطلب غلط ہے۔قیام عالم باللہ کی کیفیت نا قابل تصور ہے۔خیال کی پنہائیاں اس کو نہیں سما سکتی ۔قیام کے مفہوم کی قریب الفہم تعبیر کے لیے ہم اتنا کہہ سکتے ہیں کہ اللہ ہماری جان سے بھی زیادہ قریب ہے۔ مگر یہ قرب مکانی نہیں نہ حلولی اللہ تعالیٰ احتیاج مکانی اور حلول سے پاک ہے۔ہر تغیر اور ضعف سے منزہ ہے مالک الملک والملکوت ہے۔اس کی گرفت بہت سخت ہے۔اس کا انتقام نا قابل برداشت ہے۔اس کی اجازت کے بغیر کوئی اس سے سفارش ہی نہیں کر سکتا۔اس کا علم ہمہ گیر ہے۔ہر ظاہر اور پوشیدہ چیز کی حقیقت کو ہر طرح محیط ہے۔اس کی معلومات کا علم کسی کو نہیں ہاں وہی اگر کچھ بتادے تو ہوسکتا ہے۔اس کی حکومت اور قدرت سے کوئی چیز خارج نہیں ۔کوئی امر دشوار اس کے لیے تعب آفریں نہیں ہوتا کسی شئی میں مشغولیت اس کو دوسری شئے سے غافل نہیں بنا سکتی وہ تمام نامناسب اوصاف سے پاک اور کل حمد کرنے والوں کی ستائش سے برتر ہے۔وہ سید المرسلین ﷺ جن کے دست مبارک میں قیامت کے دن حمد کا جھنڈا ہوگا وہ بھی فرماویں کہ (کما اثنیت علی نفسک) کی عظمت کے سامنے ہر چیز حقیر ہے۔اس کی بزرگی پورے طور پر کوئی عالم نہیں جانتا نہ کسی عابد کی عبادت اللہ کی عظمت کا حق ادا کر سکتی ہے۔حضور ﷺ نے جو کہ سب سے بڑھ کر اللہ کی عبادت کرنے والے ہیں۔فرمایا (ما عبدنا کحق عبادتک) (ہم نے تیری عبادت کا حق ادا نہیں کیا) اسی لیے جب حضور سید عالم ﷺ سے سوال کیا گیا کہ قرآن میں سب سے بڑھ کر عظمت والی کونسی آیت ہے تو آپ علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا آیت الکرسی (اللہ لا الہ الا ھو الحی القیوم) الخ عرض کیا گیا سب سے زیادہ عظمت والی سورت کونسی ہے۔تو آپ نے فرمایا (قل ھو اللہ احد)} (دارمی بروایت اسقع بن عبد کلابی بحوالہ مظہری) جب کہ یہ آیت اللہ تعالیٰ کی توحید، تعظیم، تمجید، صفات کی جامع ہے تو اس کے بارہ میں بہت سی احادیث صحیحہ وارد ہیں ہوئی۔

۱۔ حدیث شریف میں ہے کہ آدم علیہ السلام سید البشر ہیں۔ نبی کریم ﷺ سید العرب والعجم ہیں۔ سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سید اہل فارس ہیں۔ صہیب رضی اللہ عنہ سردار روم ہیں۔ بلال رضی اللہ عنہ سردار حبشہ ہیں۔ طور پہاڑوں کا سردار جمعہ دنوں کا سردار ہے۔ قرآن سید الکلام سورہ بقرہ سید القرآن اور آیت الکرسی سید البقر ہے۔

۲۔ جب یہ آیت کسی گھر میں پڑھی جائے تو اس گھر کو شیطان تین دن تک چھوڑ جائے گا اور چالیس یوم تک کوئی جادوگر وغیرہ اس گھر میں داخل نہیں ہو سکے گا (یعنی جادو کا اثر وغیرہ نہیں ہوگا) (بحوالہ احمدی)

۳۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص آیت الکرسی اور (حٰم تنزیل الکتاب من اللہ العزیز الحکیم) کی دو آیتیں صبح کو پڑھے گا وہ دن بھر شام تک محفوظ رہے گا اور جو شام کو پڑھے گا وہ رات بھر اللہ کی امان میں صبح تک رہے گا۔ (رواہ الترمذی، والدارمی)

۴۔ بخاری نے اپنی تاریخ میں انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ حضور علیہ السلام فرماتے ہیں کہ ہمیں آیت الکرسی عرش کے نیچے سے عنایت فرمائی گئی۔ (درمنثور)

۵۔ احمد نے انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ آیت لکرسی چہارم قرآن ہے۔

۶۔ ہر چیز کی کوئی زینت ہوتی ہے قرآن کی زینت سورہ بقرہ اور اس میں آیت الکرسی قرآن کی سردار ہے۔ (ترمذی بحوالہ خازن)

۷۔ سیدنا علی المرتضی کرم اللہ وجھہ سے روایت ہے کہ جو کوئی ہر فرض نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھ لیا کرے تو اس میں اور جنت میں صرف موت کی آڑ ہوگی کہ مرتے ہی جنت میں داخل ہو جائے۔ اس پر ہمیشگی کرنے والا صدیقین و عابدین کے زمرہ میں شمار ہوگا۔ (کبیر)

عوف بن محمد سیرین حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے زکوۃ رمضان کی حفاظت پر مقرر فرمایا پس ایک آنے والا آیا اور اناج میں سے لینے لگا۔ میں نے اسے پکڑ لیا اور کہا خدا کی قسم میں ضرور تمہیں رسول اللہ ﷺ کے پاس لے جاؤں گا۔ اس نے کہا کہ

میں محتاج ہوں اور میرے بچے ہیں۔ اور مجھے سخت ضرورت ہے پس میں نے اسے چھوڑ دیا۔ صبح ہوئی تو نبی ﷺ نے فرمایا اے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ! رات تم نے اپنے قیدی کا کیا کیا؟ عرض گزار ہوا کہ یارسول اللہ ﷺ اس نے سخت حاجت اور بچوں کی شکایت کی تو مجھے ترس آ گیا لہٰذا میں نے اسے چھوڑ دیا۔ فرمایا کہ اس نے تم سے جھوٹ بولا ہے۔ اور وہ پھر آئے گا پس میں نے جان لیا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے فرمانے کے مطابق ضرور آئے گا۔ چنانچہ وہ پھر آیا اور اناج میں سے لے جانے لگا تو میں نے اسے پکڑ لیا کہا کہ میں تمہیں رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں ضرور لے جاؤں گا۔ کہا کہ مجھے چھوڑ دو میں محتاج اور بال بچے دار ہوں پھر نہیں آؤں گا۔ پس مجھے ترس آ گیا اور میں نے اسے چھوڑ دیا۔ صبح کو رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ! اپنے قیدی کا کیا کیا! عرض گزار ہوا کہ یارسول اللہ ﷺ! اس نے سخت حاجت اور بال بچوں کی شکایت کی تو مجھے ترس آ گیا اور اسے چھوڑ دیا۔ فرمایا کہ اس نے تم سے غلط کہا ہے۔ اور وہ پھر آئے گا پس میں تیسری رات اس کا منتظر رہا تو وہ آ کر اناج لینے لگا پس میں نے اسے پکڑ لیا اور کہا کہ میں تجھے ضرور رسول اللہ ﷺ کی بارگارہ میں پیش کروں گا۔ کیوں کہ آج تیسری رات ہے۔ تم ہر دفعہ کہتے ہو کہ اب نہیں آؤں گا مگر آتے رہے۔ کہا کہ مجھے چھوڑ دو میں آپ کو ایسے الفاظ سکھا دیتا ہوں جو آپ کو نفع دیں گے۔ میں نے کہا وہ کیا ہیں! کہا کہ جب تم اپنے بستر پر جاؤ تو آیت الکرسی آخر تک پڑھ لیا کرو تو ساری رات تم اللہ کی حفاظت میں رہو گے۔ اور صبح تک شیطان تمہارے نزدیک نہیں آئے گا۔ پس میں نے اسے چھوڑ دیا صبح کے وقت رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا تم نے اپنے رات کے چور کا کیا بنایا؟ عرض گزار ہوا کہ یارسول اللہ ﷺ! اس نے مجھے ایسے کلمہ سکھانے کا دعویٰ کیا جو مجھے اللہ کے پاس فائدہ دیں تو میں نے اسے چھوڑ دیا۔ فرمایا کہ وہ کیا ہیں؟ عرض گزار ہوا اس نے کہا کہ جب تم بستر پر جاؤ تو اول سے آخر تک آیت الکرسی پڑھ لیا کرو تو تم برابر اللہ کی حفاظت میں رہو گے۔ اور صبح تک شیطان تمہارے قریب نہیں آئے گا۔ اور وہ حضرات نیک کاموں کے بڑے حریص تھے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ بات اس نے سچی کہی ہے۔ جب کہ آپ وہ جھوٹا ہے اے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ! جانتے ہو یہ تین راتوں تک کون تم سے مخاطب ہوتا رہا عرض گزار ہوئے

نہیں۔فرمایا کہ وہ شیطان تھا(صحیح بخاری شریف ۱/۳۰۱)(کتاب الوکالۃ)

ایک بار ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ نے ایک جن کو پکڑ لیا اور اس سے پوچھا کہ انسان تم سے کیونکر بچیں اس نے عرض کیا کہ صبح شام آیت الکرسی پڑھ لیا کریں۔صبح کو یہ واقعہ حضورﷺ کی خدمت میں پیش کیا گیا تو آپ علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا اس خبیث نے سچ کہا(روح البیان)اور بخاری شریف میں آیت الکرسی کی فضیلت میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے شیطان کو قابو کرنے کا واقعہ مشہور ہے۔

۸۔ ابن سنی نے امام زین العابدین سے نقل کیا کہ آیت الکرسی دردزہ میں مفید ہے۔

۹۔ ایک صحابی نے حضورﷺ کی بارگاہ میں بے برکتی کی شکایت کی کہ میرے گھر میں برکت نہیں ہوتی فرمایا آیت الکرسی پڑھا کرو۔جو کوئی سفر کے وقت اپنے گھر پر آیت الکرسی پڑھ کر دم کر جائے تو اس کا مال واہل وعیال اس کی واپسی تک محفوظ رہیں گے۔

۱۰۔ آیت الکرسی سے شیطان بھاگتے ہیں۔بے چین دل کو چین آتا ہے مرگی والے کو فائدہ ہوتا ہے۔اس سے غصہ شر اور حرام شہوت دور ہوتی ہے۔ظالم کا ظلم کم ہوتا ہے مگر اخلاص شرط ہے۔(نعیمی،روح البیان بحوالہ نعیمی)بزرگان دین کی مجربات سے ہے کہ جو کوئی نماز پنجگانہ کے بعد آیت الکرسی پڑھے اور جب(ولا یودہ حفظہما)تک پہنچے تو اپنی پانچوں انگلیوں کے پورے دونوں آنکھوں پر رکھ کر گیارہ بار یہ لفظ پڑھے اور پھر ایک بار(وھو العلی العظیم)پڑھ کر اپنے پوروں پر دم کر کے آنکھوں پر پھیرے تو ان شاء اللہ اندھا نہ ہوگا۔نیز جو کوئی فجر اور مغرب کے بعد اول آخر تین بار درود شریف اور درمیان میں اکتالیس بار یاحی یاقیوم پڑھ لیا کرے تو انشاء اللہ اسے خاتمہ بالخیر نصیب ہوگا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْ مِنْ بِا للّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (سورۃ البقرۃ:۲۵۶)

"کچھ زبردستی نہیں دین میں بیشک خوب جدا ہوگئی ہے نیک راہ گمراہی سے تو جو شیطان کو نہ مانے اور اللہ پر ایمان لائے اس نے بڑی محکم گرہ تھامی جسے کبھی کھلنا نہیں اور اللہ سنتا جانتا ہے۔"

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ، چوں کہ آیت الکرسی میں صفات الٰہیہ کا کچھ اس طرح ذکر فرمایا گیا جس کے قبول کرنے پر ہر عاقل مجبور ہے۔ اب فرمایا جارہا ہے چوں کہ اس بیان کے بعد عاقل کے لیے قبول حق میں کوئی تامل کی گنجائش نہ رہی۔ لہٰذا اسلام پر کسی کو مجبور نہ کیا جائے جو چاہے مانے جو چاہے نہ مانے حجت پوری ہو چکی۔ (نعیمی)

شان نزول:

ابوداؤد نسائی اور ابن حبان نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول نقل فرمایا ہے کہ قبل از اسلام مدینہ میں جس عورت کا بچہ زندہ نہ رہتا تھا وہ منت مان لیتی تھی کہ اگر میرا بچہ زندہ رہا تو میں اس کو یہودی بنادوں گی۔ (یہ منت قبائل انصار کی عورتیں مانتی تھیں) چناں چہ جب قبیلہ بنونضیر کے یہودیوں کو جلاوطن کیا گیا تو ان میں سے کچھ انصار کے بچے بھی تھے۔ (جن کو یہودی بنادیا گیا تھا) انصار کہنے لگے یہ تو ہمارے بچے ہیں۔ ہم ان کو نہیں جانے دیں گے اس پر مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم اپنے آدمیوں کو اختیار دے دو اگر وہ تمہارے ساتھ رہنا پسند کریں تو تم میں سے ہیں۔ اگر وہ ان یہودیوں کے ساتھ رہیں تو ان کو بھی جلاوطن کردو

(مظہری) علاوہ ازیں مفسرین نے چند اور اقوال بھی نقل کیے ہیں۔ اِکْــــرَاہُ کرہ سے بنا بمعنی ناپسندیدگی، زبردستی یعنی انسان کو ایسے کام پر مجبور کرنا جسے وہ ناپسند کرتا ہو (مفردات) آیت کا مطلب یہ ہے کہ ایمان میں جبر کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں کہ اکراہ (جبر) کا صرف یہ معنی ہے کہ کسی سے بزور ایسا کام کرایا جائے جس کو وہ اپنی خوشی سے نہ کرنا چاہتا ہو۔ ایسا اکراہ قول و فعل میں تو ممکن ہے ایمان میں ممکن نہیں کیوں کہ ایمان تو صرف ایک قلبی عقیدہ کا نام ہے۔ اور قلبی عقیدہ اکراہ سے پیدا نہیں ہوتا۔ یا (لا اکراہ فی الدین) ہے تو جملہ خبریہ منفیہ مگر اس کا معنی (انشائی) نہی کا ہے۔ یعنی ایمان پر کسی کو مجبور نہ کرو کیوں کہ ایمان جبر سے نہیں پیدا ہوتا جبر کرنا بے فائدہ ہے۔ یا ممانعت کی یہ وجہ ہے کہ ایمان اور دوسری تمام عبادتوں کا حکم آزمائش کے لیے ہے۔ (کون کرتا ہے اور کون نہیں کرتا) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ (لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلاً) اور تعمیل حکم میں خلوص کا ہی اعتبار ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ (فَاعْبُدُوْ اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدين) لیکن جبر کرنے میں نہ آزمائش رہتی ہے نہ خلوص۔ (مظہری) یا جو کافر جنگ کے بعد ایمان لائے اسے صحیح مسلمان جانو یہ نہ کہو کہ مجبوراً ڈر کے مارے ایمان لایا جس کی تفسیر یہ آیت ہے۔ (وَلَا تَقُوْلُوا لِمَنْ اَلْقٰى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِناً) خیال رہے! کہ کسی کافر کو جبراً مسلمان بنانا جائز نہیں۔ مسلمان سے جبراً دین پر عمل کرانا جائز بلکہ ضروری ہے۔ لہٰذا بے نماز پر سختی درست ماہ رمضان کی بے حرمتی کرنے پر سخت سزا دینا درست، بلکہ اعلانیہ ماہ رمضان کی بے حرمتی کرنے والے کے لیے فقہاء عظام نے قتل لکھا ہے۔ (شامی) زانی کو رجم اور چور کے ہاتھ کاٹنا ضروری ہیں زکوۃ کے منکرین پر حضرت سیدنا صدیق اکبرؓ نے فوج کشی کی۔ یہ تمام امور اس آیت کے خلاف نہیں اسلیے آیت کریمہ (یامرون بالمعروف وینھون عن المنکر) میں امر بالمعروف زبانی بھی ہوتا ہے۔ اور قلمی بھی (ہاتھ سے بھی) (نعیمی)

بعض علما نے کہا آیت مذکورہ کا حکم آیت (قاتلو المشرکین کافۃ اور جاھد الکفار والمنافقین) کے حکم سے منسوخ ہو گیا۔ بقول بغوی حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا یہی قول ہے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ قول بالنسخ کی ضرورت نہیں نسخ تو تب مانا جائے۔ جب دو حکموں میں

تعارض ہو مگر یہاں تو ایک حکم دوسرے حکم کی ضد ہے قتال اور جہاد اس لیے تو نہیں دیا گیا کہ جبراً مومن بنایا جائے۔ بلکہ زمین پر بگاڑ اور تباہی کو روکنے کے لیے جہاد کا حکم دیا گیا ہے کافر ملک میں تباہی مچاتے ہیں۔ اور اللہ کے بندوں کو راہ مستقیم پر چلنے اور اللہ کی عبادت کرنے سے روکتے ہیں۔ پس! ان کو قتل کرنا ایسا ہی ہے جیسے سانپ، بچھو اور کاٹنے والے کتے کو قتل کرنا بلکہ اس سے بھی زیادہ اہم ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے رواہ جزیہ کی صورت میں قتال کے حکم کو ختم کر دیا اور فرما دیا (حتی یعطوا الجزیہ ید وھم صاغرون) اور یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بچوں، عورتوں اور تارک الدنیا، درویشوں، عالموں، اپاہجوں اور اندھوں کو قتل کرنے کی ممانعت فرما دی۔ کیونکہ ان کی طرف سے بگاڑ اور تباہی ممکن نہیں۔ جبراً ایمان کا تو تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ پھر اس کے منسوخ ہونے کا معنی ہی کیا ہو سکتا ہے۔ (مظہری)

فائدہ (۱): کسی کو جبراً مسلمان کرنا جائز نہیں اس لیے جہاد سے پہلے اسلام پیش کیا جاتا ہے۔ اگر کفار نہ مانیں تو جزیہ کی پیشکش ہوتی ہے۔ اگر اس سے بھی انکار کریں تب جنگ اگر اسلام میں جبر ہوتا تو جزیہ کی پیش کشی نہ ہوتی۔ مگر اس حکم سے مرتدین اور مشرکین عرب مستثنیٰ ہیں کہ ان کے لیے دو ہی صورتیں ہیں۔ اسلام یا تلوار۔ کیونکہ جزیرہ عرب سلطنت الٰہیہ کا دارالخلافہ ہے۔ وہاں صرف خدام ہی رہنا چاہیے۔ شاہی عمارتوں میں مخلص خدام ہی رہ سکتے ہیں۔ ایسے ہی قتل مرتد کہ وہ سلطنت الٰہیہ کا باغی ہے جس کی سزا قتل یا اطاعت ہے۔

فائدہ (۲): اس آیت سے موجودہ غیر مسلم اقوام کا یہ الزام بھی اٹھ گیا کہ اسلام تلوار سے پھیلایا مسلمانوں نے کفار کو جبراً کلمہ پڑھایا۔ کیونکہ جبراً مسلمان کرنا، اسلام کا قانون ہی نہیں۔ اگر یہ قانون ہوتا آج اس برصغیر پاک و ہند میں مسلمان بیس کروڑ اور ہندو پچاس پچپن کروڑ نہ ہوتے بلکہ یہاں سب مسلمان ہوتے کیوں کہ اس ملک پر مسلمانوں کی حکومت تقریباً آٹھ سو سال تک رہی بلکہ اس ملک کا نام ہندوستان ہی نہ ہوتا۔ سوچنے کی بات ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ دنیا میں توحید کے علمبردار تھے اور ان کے

پاس دنیاوی ساز وسامان کچھ نہ تھا تمام عرب ان کا مخالف آپ ﷺ نے اس وقت کس پر تلوار چلائی ؟ باوجود اس کے وہ کونسی کشش تھی کہ اس بے سروسامانی کی حالت میں لوگ مسلمان ہوتے تھے اور اسلام لا کر ہزار ہا مصائب والام جھیلتے اور دنیا کے مظالم برداشت کرتے تھے۔ حضرت سیدنا بلال حبشی ،صہیب رومی ،عمار بن یاسر ،سلمان فارسی ،ابوذر غفاری رضوان اللہ علیہم اجمعین کے حالات پڑھ کر ایمان تازہ ہوتا ہے۔

اب ہندوستان کے مسلمانوں کے پاس کونسی تلوار ہے ۔ جبکہ ۱۴۰۱ ھ ہجری میں ہندوستان میں ہندوؤں کے قبیلے مسلمان ہو رہے تھے۔ ۱۴ اگست ۱۹۸۱ء کے موقع پر تقریباً چھبیس ہزار اچھوت ہندوؤں نے اسلام قبول کرنے کا فیصلہ کیا۔ آج کے اخبار مورخہ ۲۳ شوال المکرم ۱۴۰۱ء بمطابق ۲۴ اگست ۱۹۸۱ء بروز پیروار میں ہندوستان کے صوبہ تامل ناڈو کے ضلع ارکاٹ کے ۱۲۳ اچھوت کے اسلام قبول کرنے کی خبر ہے۔ سرکاری اعلان کے مطابق صوبے بھر میں آٹھ نو سو غیر مسلم اسلام قبول کر چکے ہیں۔ تو معلوم ہوا کہ اسلام بے شک تلوار سے پھیلا مگر لوہے کی تلوار سے نہیں بلکہ حقانیت و صداقت کی تلوار سے۔

خلق دے کے آپ نوں رب نے کہا
سوھنیا ہن لوڑ نہیں تلوار دی

مسئلہ: کسی کو جبراً مسلمان کرنا جائز نہیں لیکن اگر کوئی لالچ یا مجبوری سے مسلمان ہو جائے تو شرعاً وہ مسلمان ہوگا۔ اور اس پر اسلامی احکام نماز جنازہ وغیرہ جاری ہونگے۔ اگر مرتد جان کے خوف سے یا کافر بحالت جنگ مسلمان کی زد میں آکر کلمہ پڑھ لے تو اسے چھوڑ دیا جائے گا۔ مگر عند اللہ مومن ہونے کے لیے اخلاص شرط ہے۔

مسئلہ: اگر کوئی ہندو یا پارسی یہودی ہو جائے یا عیسائی یہودی یا بت پرست بن جائے۔ تو ہمارے نزدیک اسے اپنے مذہب کی طرف لوٹ جانے پے مجبور نہ کیا جائے گا۔ بلکہ اسے دینی آزادی ہوگی۔ (احکام القرآن جصاص رازی)

قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ :(بے شک خوب جدا ہو گئی نیک راہ گمراہی سے) تبیّن بین سے بنا بمعنی فاصلہ اور جدائی طلاق کو بائنہ اور کلام کو بیان اسی لیے کہتے ہیں۔ کہ طلاق سے عورت جدا ہو جاتی ہے۔ اور کلام سے مقصود اور غیر مقصود میں فرق ہو جاتا ہے۔ نیز ظاہر کو بین اسی وجہ سے کہا جاتا ہے۔ وہ ظہور کی وجہ سے دوسروں سے جدا ہو گیا۔ یہاں یہی معنی مراد ہے۔ رشد میں تین لغت ہیں۔ اشد راشد اور رشاد ہر خیر کو رشد اور ہر شر کو غی کہا جاتا ہے۔ مگر یہاں رشد سے ایمان مراد ہے۔ جو دائمی سعادت کا ذریعہ ہے اور غی سے مراد کفر ہے۔

فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ: (تو جو شیطان کو نہ مانے اور اللہ پر ایمان لائے) کفر بمعنی چھپانا انکار کو اس لیے کفر کہتے ہیں کہ اس سے کوئی بات چھپائی جاتی ہے۔ یہاں انکار مراد ہے۔ کفر کی تفصیلی بحث ہم نے اپنے رسالہ عقائد اسلام میں بیان کر دی ہے۔ طاغوت طغیٰ سے بنا بمعنی حد سے گزرنا (لما طغی الماء) سیلاب کو اسی لیے طغیانی کہتے ہیں۔ ہر سرکش اور گمراہ کو طاغوت کہا جاتا ہے۔ شیطان کاہن جادوگر بت وغیرہ سب پر یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ کیوں کہ یہ طغیان کے اسباب ہیں۔ چناں چہ صاحب التفسیر روح البیان نے لفظ طاغوت کی نہایت عمدہ تفسیر بیان فرمائی۔

(هو كل ما عبد من دون الله مما هو مذموم فی نفسهٖ و ستمرد كالا نس والجن و الشياطين وغير هم فلا يرد عيسى عليه السلام) (صفحہ ۱/۴۰۷) لہٰذا بعض مفسرین جو اس لفظ کی تفسیر میں لکھا کہ (كل ما عبد من دون الله) یعنی ہر وہ جس کی من دون اللہ عبادت کی جائے یہ غلط ہے۔ حتٰی کہ حسین علی واں بچھرنی دیوبندی نے اپنی کتاب تفسیر بلغۃ الحیر ان میں لکھا ہے کہ طاغوت میں انبیاء اولیاء بھی داخل ہیں (معاذ اللہ) حالانکہ کہ یہ تفسیر مفسر خبثِ باطنی اور سراسر جہالت پر دال ہے۔ کیوں کہ یہ (كل كا عبد من دون الله) میں ما کہ اصل میں غیر ذوی العقول کے لیے آتا ہے۔ نیز آیت میں طاغوت کے ساتھ کفر کرنے ہے۔ اگر بقول البعض انبیاء بھی اس میں داخل ہوں تو آیت یہ معنی ہونگے کہ جو نبی کا کفر کر

حالاں کہ نبی پر ایمان لانا ایسے ہی ضروری ہے کہ جیسا کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ (اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ) اس ظالم نے انبیائے کرام کو بجائے مومن نہ کے ما یُکْفَرُ بنا دیا یہ تحریف ہے۔ حالاں کہ طاغوت وہ ہے جو لوگوں کو گمراہ کرے۔ جیسے شیطان سرداران کفر یا وہ ذریعہ گمراہی ہو جیسے بت وغیرہ۔ جیسا کہ روح البیان کے حوالہ سے پہلے بیان ہو چکا۔ اور حضرات انبیائے کرام علیہ السلام ہادی اور سبب ہدایت ہیں۔ اگر کسی نے انہیں خدا یا خدا کا بیٹا مان لیا یا ان کی عبادت کی تو یہ ان کی جہالت اور بدقسمتی ہے۔ یہ تفسیر اس آیت کے صریح خلاف ہے۔ (ان یتحا کموا الی الطاغوت و قد امروا ان یکفروا) بہ معلوم ہوا کہ طاغوت کو حاکم بنانا کفر ہے۔ حالاں کہ نبی کو حاکم بنانا مدار اور ایمان ہے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ (فلا وربک لا یومنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم)۔

فَقَدِ اسْتَمْسَکَ بِالْعُرْوَۃِ الْوُثْقٰی : (اس نے بڑی محکم گرہ تھامی) اِسْتَمْسَکَ سے بنا بمعنی اخذ بالقوۃ مضبوطی سے تھامنا۔ عروۃ اصل میں عری تھا بمعنی ننگا ہونا اسلیے کھلے میدان کو عراء کہا جاتا ہے۔ فَنَبَذْنَاہُ کے معنی جانب یا کنارہ کے بھی ہیں۔ عروۃ دستہ کو بھی کہتے ہیں جو برتن کے کنارے پر ہو جس سے برتن پکڑا جائے۔ عروۃ ہر وہ چیز جسے پکڑ کر کوئی لٹک جائے۔ یعنی رسی۔ (مفردات)

وُثْقٰی اوثق کا مؤنث ہے۔ بمعنی مضبوط یہاں قوی دلائل کو مضبوط گرہ والی رسی سے تشبیہ دی گئی ہے جو ہاتھ سے نہ چھوٹے۔

لَا انْفِصَامَ لَھَا : (جسے کبھی کھلنا نہیں) یہ وثقی کا بیان ہے۔ انفصام فصم سے بنا (کسر الشی من غیر ابانۃ) (کبیر) یعنی کھل کر ٹوٹنا۔ کٹنے کو ابانت کہتے ہیں۔ (وَاللّٰہُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ) سمیع کا مفعول اقوال اور علیم کا مفعول عقائد، خطرات اور ارادے ہیں (ملخصا کبیر) یعنی اللہ تعالیٰ ہر ایک کی بات سننے والا اور ہر ایک کی نیت جاننے والا ہے۔

فائدہ: ایمانیات کے اقرار سے پہلے کفریات سے بیزاری ضروری ہے۔ دیکھئے! اس آیت کریمہ میں ایمان باللہ سے پہلے کفر بالطاغوت کا ذکر ہوا۔ اسی لیے کلمہ میں لا الہ پہلے

اور الا اللہ بعد میں۔ کفریات سے بیزاری کامل یہ ہے کہ کفار کے عقائد اور ان کی شکل وصورت، وضع قطع، لباس وغیرہ تمام چیزوں سے نفرت ہو۔

فائدہ: کفر کے لغوی معنی انکار کرنا یا چھپانا۔ شرعی معنی ہیں اسلامی عقائد قطعیہ کا انکار کرنا۔ مطلق کفر سے شرعی معنی مراد ہوتے ہیں۔ لغوی معنی کے لیے کچھ قید لگانی ہوتی ہے۔ جیسے یہاں کفر کے ساتھ طاغوت ارشاد ہوا۔ اس معنی میں امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں (کافر عشقم مسلمانی مرادرکار نیست) یعنی (میں عشق کا چھپانے والا ہوں مجھے اظہار کی ضرورت نہیں)۔ ایمان باللہ کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اس کے احکام اور اس کے انبیا والمرسلین تمام پر ایمان لائے۔ صرف اللہ کی توحید تو شیطان بھی مانتا ہے اور بہت سے کفار سکھ وغیرہ بھی موحد ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اس لیے دوسرے مقام پر ارشاد ہوا۔ (امنو باللّٰہ ورسولہ) اور ارشاد ہوا (کل امن باللہ و ملائکتہ و کتبہٖ ورسلہ): الایۃ

شبہ: جب اسلام مضبوط رسی ہے کہ اس کا پکڑنے والا خطرے سے نکل جاتا ہے تو لوگ مرتد کیوں ہو جاتے ہیں؟

ازالہ شبہ: بعض لوگوں کا ارتداد اسلام کی کمزوری سے نہیں بلکہ اپنی کمزوری سے ہوتا ہے کہ انہوں نے اس مضبوط رسی کو مضبوطی سے پکڑا نہیں۔ ان کی اپنی گرفت کمزور ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم

یٰۤاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡفِقُوۡا مِنۡ طَیِّبٰتِ مَا کَسَبۡتُمۡ وَمِمَّاۤ اَخۡرَجۡنَا لَکُمۡ مِّنَ الۡاَرۡضِ وَلَا تَیَمَّمُوا الۡخَبِیۡثَ مِنۡہُ تُنۡفِقُوۡنَ وَلَسۡتُمۡ بِاٰخِذِیۡہِ اِلَّاۤ اَنۡ تُغۡمِضُوۡا فِیۡہِ وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ حَمِیۡدٌ

(سورۃ البقرۃ: ۲۶۷)

"اے ایمان والوں! اپنی اپنی پاک کمائی سے کچھ خرچ کرو۔ اور اس سے جو ہم نے تمہارے لیے زمین سے نکالا اور خاص ناقص کا ارادہ نہ کرو کہ اس سے خرچ کرتے رہو حالانکہ کہ تم اس کے لینے والے نہیں ہو جب تک اس پر چشم پوشی نہ کرو۔ اور جان رکھو کہ اللہ بے پرواہ ہے تعریف کیا گیا ہے۔"

صاحب تفسیرِ درمنشور نے بحوالہ بیہقی، ابوداؤد، نسائی روایت کی کہ ایک بار نبی کریم ﷺ نے لوگوں کو صدقہ کا حکم دیا تو بعض لوگ ردی خرموں کے خوشے لے کر حاضر ہوئے۔ اس کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی۔ اسی کے قریب قریب مفسرین نے چند اور روایات بھی نقل فرمائی ہیں۔

یٰۤاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡفِقُوۡا مِنۡ طَیِّبٰتِ مَا کَسَبۡتُمۡ: (اے ایمان والوں اپنی پاک کمائی سے کچھ خرچ کرو)۔ حضرت سیدنا علی المرتضٰی کی روایت کے مطابق یہ امر وجوب کے لیے ہے۔ اور خرچ سے مراد صدقاتِ واجبہ زکواۃ، عشر وغیرہ ہیں۔ بعض نے کہا یہ امر استحبابی ہے اور خرچ سے مراد نفلی صدقات ہیں۔ مگر پہلا قول قوی ہے۔ طَیِّبٰتٌ طیبۃ کی جمع ہے جو طیب کی تانیث ہے اور طیب خبیث کا مقابل ہے۔ اس کے معنی عمدہ اور کھری چیز۔ لیکن ابن مسعود اور مجاہد رضی اللہ عنہما نے اس کی تشریح میں فرمایا کہ حلال چیزیں مراد ہیں۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے ہی مروی ہے کہ حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا: جو بندہ حرام مال کما کر اسے خیرات کرے اس کی خیرات

قبول نہیں ہوتی، نہ حرام مال خرچ کرنے میں برکت ہوتی ہے۔الخ (رواہ احمد) یہاں دونوں معنی مراد ہو سکتے ہیں۔یعنی شرعاً وعقلاً اور طبعاً پسندیدہ مال وہی ہوگا جو حلال بھی ہو اور کھرا بھی۔ (مَـا كَسَبْتُمْ) میں ما موصولہ ہے یا مصدریہ اور کسب بمعنی مکسوب۔کسب ہر وہ کام جو نفع کی غرض سے کیا جائے۔(مفردات) اس میں مال تجارت، سونا، چاندی، جانور وغیرہ سب شامل ہیں۔نیز اس سے مراد کسب حلال ہے۔حضور علیہ السلام سے سوال کیا گیا۔ (اَیُّ الْکسب اَطْیَبُ) (کون سا کسب زیادہ پاکیزہ ہے) تو آپ ﷺ نے فرمایا: (انسان کا اپنے ہاتھ سے کام کرنا اور نیز فرمایا (سب سے زیادہ پاکیزہ رزق وہ ہے جو انسان اپنے ہاتھ سے کما کر کھائے) اور اس کی اولاد بھی اس کے کسب سے ہے (مفردات)

وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَکُمْ مِّنَ الْاَرْضِ: (اور اس سے جو ہم نے تمہارے لیے زمین سے نکالا) واؤ عاطفہ اور من تبعیضیہ اور ما سے ہر زمینی پیداوار مراد ہے۔خواہ ترکاریاں ہوں یا پھل غلے وغیرہ یعنی اس میں سے خیرات کرو جو ہم تمہارے لیے زمین سے نکالیں۔

وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ: (اور خاص ناقص کا ارادہ نہ کرو) تَيَمَّمُوا امّ سے بنا بمعنی قصد امـمته ويـمـمته تامـمته سب کا معنی قصد تہٗ ہے۔(کبیر) تیمم کو بھی اسی لیے تیمم کہا جاتا ہے کہ اس میں پانی کو چھوڑ کر مٹی کا قصد کیا جاتا ہے۔خبیث طیب کا مقابل ہے۔بمعنی ناپسندیدہ ہر وہ چیز جو ردی اور خسیس ہونے کی وجہ سے بری معلوم ہو خواہ وہ چیز محسوسات سے ہو یا معقولات (غلط عقائد و خیالات) سے تعلق رکھتی ہو۔لہٰذا غلط اعتقاد اور برے افعال، گندی چیزیں، برے لوگ سب کو خبیث کہا جا سکتا ہے۔جیسے (يحرم عليهم الخبائث) بمعنی گندی چیزیں (كانت تعمل الخبائث) بمعنی بداعمالیاں (الخبيثات للخبيثين) بمعنی گندے لوگ (مفردات وغیرہ) اگر یہاں طیب سے مراد حلال تھا تو خبیث سے حرام اور اگر اس سے کھرا مال مراد تھا تو خبیث سے ردی مال مراد ہوگا۔یعنی حرام اور ردی مال کی خیرات کا اراداہ بھی نہ کرو۔**مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ:** (اس سے تم خرچ کرتے ہو) یہ جملہ تیمموا کے فاعل سے حال ہے یعنی تم صرف ردی ہی سے

خرچ کرو۔(وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِیْهِ) یہ تنفقون کی خبر سے حال ہے یعنی تم ردی مال خیرات تو کرتے ہو مگر تم خود اس کا لینا گوارا نہیں کرتے۔

اِلَّا اَنْ تُغْمِضُوْا فِیْهِ: (جب تک اس میں چشم پوشی نہ کرو) تُغْمِضُوْا اغماض سے بنا بمعنی آنکھ بند کرنا اور استعارۃً تغافل اور تساہل برتنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔چھپی بات کو کلام غامض کہتے ہیں۔یہاں درگزر اور چشم پوشی مراد ہے۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ حَمِیْدٌ: جان لو کہ اللہ تعالیٰ تمہاری خیرات سے بے پرواہ اور مستحق حمد ہے۔(روح) یا خیرات کرنے والوں کی حمد فرمانے والا ہے۔(کبیر)

(فوائد و مسائل)

اس آیتِ کریمہ سے مندرجہ ذیل فوائد و مسائل مستنبط ہوئے ہیں۔

انفاق فی سبیل اللہ کا خطاب مسلمانوں سے ہے کفار کیسا ہی عمدہ نفیس مال خرچ کریں آخرت میں مستحقِ ثواب نہیں جیسا کہ (یا ایھا الذین امنو) کے خطاب سے معلوم ہوا۔

۱۔ مال تجارت پر زکواۃ فرض ہے۔فرضیت (انفقوا) سے معلوم ہوئی کہ تجارت یا (کسبتم) کے عموم سے۔

۲۔ سیدنا امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک زمین کی ہر پیداوار پر زکواۃ واجب ہے۔خواہ تھوڑی ہو یا زیادہ، خواہ گلنے سڑنے والی چیز ہو یا باقی رہنے والی۔لہٰذا غلہ، پھل، ترکاریاں سب میں زکواۃ (عشر) واجب ہے۔جیسا کہ (ما اخرجنا) کے عموم سے معلوم ہوا۔

۳۔ عشری زمین میں عشر واجب ہے۔اس مسئلہ میں آئمہ کا اختلاف ہے کہ عشر مستاجر و مزارع پر یا مالکِ زمین پر۔صاحبین کے نزدیک کل عشر صرف مستاجر اور مزارع پر ہوگا جیسا کہ

(لکم) کے لام سے معلوم ہوا جس کی پیداوار اسی پر زکواۃ۔ لیکن امام صاحب (لکم) کا مخاطب مجموعہ کو کہتے ہیں۔ ہمارے نزدیک حضرات آئمہ کے اس اختلاف کے بارے میں قول فیصل یہ ہے۔ زمین اگر بٹائی پر دی جائے تو مالکِ زمین پر صرف بقدر حصہ عشر کے آئے گا۔ یعنی زمین کی کل پیداوار سے جو حصہ اس کو ملے گا اس میں سے عشر ادا کرے۔ اور مستاجری کی صورت میں ہمارے ان دیار میں عشر مالک کی بجائے مستاجر پر ہوگا۔ اگر مالک کو عشر ادا کرنا پڑے تو اس کو بہت کم بچت ہوگی۔ بلکہ بعض اپنے پاس سے کچھ دینا پڑے گا تفصیل کے لیے اہلِ علم حضرات شامی اور فتاویٰ رضویہ کی طرف رجوع کریں۔

۴۔ حرام پیشہ اختیار کرنا حرام ہے۔ جیسے شراب وسود وغیرہ کی تجارت یا جوا وغیرہ کیوں کہ اس آیت میں حلال مال خیرات کرنے کا حکم ہے۔ اور ظاہر ہے کہ حرام پیشہ سے مال حرام ہی ہوگا۔

۵۔ جس کے پاس کھرا مال نہ ہو کھوٹا ہو تو وہ کھوٹا ہی خیرات کرے۔

۶۔ ہر قسم کے مال سے بعض حصہ خیرات کرنا چاہیے جیسا کہ (من) تبعیضیہ سے معلوم ہوا۔

۷۔ جس کے پاس مالِ حرام ہو وہ یہ مال خیرات نہ کرے۔ اگر خیرات کرنا چاہتا ہو تو کسی سے مال۔ حلال قرض لے کر خیرات کرے۔ پھر قرض اپنے مال سے ادا کر دے۔ حرام مال کو بہ نیت ثواب خرچ کرنا سخت گناہ ہے۔ بلکہ بعض فقہا نے اس کو کفر لکھا ہے۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

وَمَاۤ اَنۡفَقۡتُمۡ مِّنۡ نَّفَقَةٍ اَوۡ نَذَرۡتُمۡ مِّنۡ نَّذۡرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعۡلَمُهٗ

وَمَا لِلظّٰلِمِيۡنَ مِنۡ اَنۡصَارٍ (سورۃ البقرۃ:۲۷۰)

''اورتم جوخرچ کرو یا منت مانو اللہ کو اس کی خبر ہے۔اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔''

تفسیر:

وَمَاۤ اَنۡفَقۡتُمۡ مِّنۡ نَّفَقَةٍ: (اور تم جو خرچ کرو) نفقہ سے مطلقاً خرچ کرنا مراد ہے۔خواہ دینی کاموں کے لیے ہو یا دنیاوی کاروبار میں۔نفقہ نکرہ ہے اور اس کا عموم من کی وجہ سے اور بھی زیادہ ہو گیا۔اس سے حلال و حرام، قلیل و کثیر، ریاء و اخلاص، حق و باطل، پوشیدہ و ظاہر سارے خرچہ مراد ہیں۔

اَوۡ نَذَرۡتُمۡ مِّنۡ نَّذۡرٍ: (یا منت مانو) نذر کے لغوی معنی خوف ڈر۔اسی سے نذیر و انذار ہے۔کسی غیر واجب چیز کو اپنے اوپر واجب کر لینا نذر ہے۔(مفردات) چوں کہ ڈر کے وقت صدقہ وغیرہ لازم کیا جاتا ہے۔اور التزام کے بعد ادا نہ کرنے سے بھی ڈر لگتا ہے لہٰذا اسے نذر کہتے ہیں۔شریعت میں کوئی عبادت اپنے اوپر لازم کر لینے کو نذر کہا جاتا ہے۔(نعیمی) مگر اس کی کچھ شرائط ہیں جو آگے بیان ہونگی۔یہاں بھی نذر کی تنکیر اور من کی زیادتی سے معلوم ہوا کہ تم منت مال کی مانو یا اعمال کی، طاعت کی یا معصیت کی معلق بالشرط یا بغیر شرط۔

فَاِنَّ اللّٰهَ يَعۡلَمُهٗ: (اللہ کو اس کی خبر ہے) ہ ضمیر کا مرجع ما ہے۔یعنی اگر خیر ہے تو خیر اور شر ہے تو شر کی سزا ملے گی۔اس میں ترغیب و ترہیب اور وعد و وعید جمع ہیں۔(روح البیان)

وَمَا لِلظّٰلِمِيۡنَ مِنۡ اَنۡصَارٍ: (اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں) ما نافیہ ہے۔ظلم بمعنی تاریکی

ہے۔ اصطلاح میں ظلم کے معنی ہیں۔ (ھو عبارۃ عن وضع الشی فی غیر موضعہٖ الذی یحق ان یوضع فیہ) (روح البیان) (یعنی کسی شئ کو اس کے غیر میں استعمال کرنا) چوں کہ اندھیرے میں بھی چیز جگہ سے بے جگہ ہو جاتی ہے۔ اس مناسبت سے اسے بھی ظلم کہا جاتا ہے۔ ظلم کی بہت سی قسمیں ہیں: جان پر ظلم، مال یا اولاد یا غیروں پر ظلم اسی لیے یہاں ظالمین جمع فرمایا گیا۔ یہاں اس سے مراد یا بخیل ہیں یا منت پوری نہ کرنے والے یا سارے ظالم۔ انصار ناصر یا نصیر کی جمع ہے بمعنی مددگار۔

(فوائد و مسائل)

ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو یہ منت مانے کہ اللہ کی اطاعت کرے گا تو اس کی اطاعت کرے یعنی منت پوری کرے اور جو اس کی نافرمانی کرنے کی منت مانے تو اس کی نافرمانی نہ کرے یعنی اس منت کو پورا نہ کرے (بخاری، امام احمد حاکم)۔

مسئلہ: نذر پوری کرنا فرض ہے بشرطیکہ اللہ کے لیے ہو اور جنس واجب سے ہو یعنی اسی چیز کی نذر مانے جو شرعاً کہیں واجب ہے۔ جیسے نماز، روزہ، حج، قربانی وغیرہ۔ اولیآء کے نام کی نذر اور ایسے ہی غیر واجب فعل کی نذر کا پورا کرنا واجب نہیں ہے۔ مسجد میں چراغ جلانا ، وہاں جھاڑو دینا وغیرہ کی نذر کے یہ کام شرعاً کہیں واجب نہیں۔

مسئلہ: نذر عبادت ہے۔

مسئلہ: اولیآء اللہ کے نام کی نذر حلال طیب ہے۔ (احمدی) یہ نظر شرعی نہیں جس کو فقہاء نے عبادت کہا ہے۔ بلکہ نذر بھی ہدیہ و نذرانہ ہے۔ (عقائدِ اسلام) جیسے کہا جاتا ہے کہ یہ روپیہ آپ کی نذر ہے اور اس کا ادا کرنا ایسا ضروری ہے جیسے وعدے کا پورا کرنا اور اسے

عرف میں نذر براہِ ادب کہا جاتا ہے۔(فتاویٰ،عزیزی،مظہری) حدیث: ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے کوئی منت مانی اور اسے ذکر نہ کیا یعنی فقط اتنا کہا کہ مجھ پر نذر ہے اور کسی چیز کو معین نہ کیا مثلاً یہ نہ کہا کہ اتنے روزے رکھوں گا یا اتنی نماز پڑھوں گا تو اس کا کفارہ قسم کا کفارہ ہے۔اور جس نے گناہ کی منت مانی تو اس پر کفارہ ہے اور جس نے ایسی منت مانی جس کی طاقت نہیں رکھتا تو اس پر کفارہ ہے۔اور جس نے ایسی منت مانی جس کی طاقت رکھتا ہے تو اسے پورا کرے۔(ابوداؤد ابن ماجہ)

مسئلہ: نذر کی چند قسمیں ہیں۔نذرِ معلق جو کسی شئی پر موقوف ہو،نذرِ مطلق جو کسی پر موقوف نہ ہو،پھر نذرِ معین اور غیر معین ان کے احکام مختلف ہیں۔نذرِ معلق شرط کے بعد واجب ہوگی اور مطلق فوراً(اس مسئلہ کی مزید تفصیل کے لیے بہارِ شریعت حصہ نہم دیکھیں)۔

مسئلہ: نذرِ شرعی کی پانچ شرطیں ہیں۔(۱) حرام لعینہٖ کی نذر نہ ہو(۲) وہ فعل بغیر نذر واجب نہ ہو (۳) اپنی ملکیت سے زائد کی نذر نہ ہو(۴) غیر ممکن کام کی نذر نہ ہو(۵) واجب کے جنس سے ہو۔(درمختار) نذر کے بارے میں مزید مسائل ان شاء اللہ سورہ حج میں بیان ہونگے۔

مسئلہ:۔ حرام لغیرہٖ کی نذر صحیح ہے جیسے روزہ،عید اور حرام لعینہٖ کی نذر باطل مگر امام طحاوی نے فرمایا وہ بھی صحیح ہے۔(شامی باب النذر)

مسئلہ: نذر کے مسائل میں جہاں کفارہ واجب ہے وہاں کفارہ سے مراد کفارۂ قسم ہے۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اِنۡ تُبۡدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِىَ ۚ وَاِنۡ تُخۡفُوۡهَا وَتُؤۡتُوۡهَا الۡفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيۡرٌ لَّكُمۡ ؕ وَيُكَفِّرُ عَنۡكُمۡ مِّنۡ سَيِّاٰتِكُمۡ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِيۡرٌ (سورۃ البقرۃ:۲۷۱)

"اگر خیرات علانیہ دو تو وہ کیا ہی اچھی بات ہے۔ اور اگر چھپا کر فقیروں کو دو تو تمہارے لیے سب سے بہتر ہے۔ اور اس میں تمہارے کچھ گناہ گھٹیں گے اور اللہ کو تمہارے کاموں کی خبر ہے۔"

تفسیر:

اس آیتِ کریمہ سے مندرجہ ذیل فوائد و مسائل مستنبط ہوتے ہیں۔

۱۔ نیتِ خیر کے ساتھ ہر طرح کی خیرات معتبر ہے۔ اعلانیہ ہو یا پوشیدہ بدنیتی سے کوئی عمل قبول نہیں۔

۲۔ صدقاتِ واجبہ ظاہر کر کے اور نفلی صدقہ چھپا کر دینا بہتر ہے۔

۳۔ نفلی صدقہ بھی اگر دوسروں کو خیرات کی رغبت دینے کے لیے ظاہر کر کے دیئے تو یہ بھی افضل ہے۔

۴۔ صدقاتِ واجبہ صرف فقراء کے لیے ہے۔ جیسا کہ (تو تو ھا الفقراء) سے معلوم ہوا۔ اغنیاء کو نہ دیئے جائیں۔

۵۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کبھی ذکر بالجہر بھی افضل ہے کہ اس میں دوسروں کو ترغیب دینا ہے۔ نیز اس سے شیطان کو بھگانا ہے۔ دوسروں کو جگانا مقصود ہوتا ہے تاہم نیز جہر مفرط سے اجتناب چاہیے۔ مزید تفصیل سورہ توبہ میں آئے گی۔ ان شاء اللہ۔

مسئلہ: جب خیرات لینے والا کھلا فقیر نہ ہو تو اسے ہر قسم کا صدقہ چھپا کر دینا ہی بہتر ہے۔

مسئلہ: اگر خیرات دینے والا غناء میں مشہور نہ ہو تو اسے بھی چھپا کر خیرات کرنا ہی افضل ہے۔(مدارک)۔

مسئلہ: چندہ کے موقع پر اعلانیہ خیرات خفیہ سے افضل ہے اس لیے کہ صحابہ کرام جو امام المخلصین تھے۔ چندہ اعلانیہ دیا کرتے تھے۔ ورنہ سیدنا ابوبکر صدیق اور عثمان غنی (رضی اللہ عنہما) کے صدقات مشہور نہ ہوتے۔ لوگ اب تک ان کے واقعات سن کر جوش سے خیرات کرتے ہیں۔ ان سب کا ثواب ان کو بھی ملے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ: صدقاتِ جاریہ کو اغنیاء بھی استعمال کر سکتے ہیں جیسے قبرستان، مسجد کی زمین، مسافر خانے، وقف کنویں کا پانی۔

مسئلہ: اموالِ ظاہرہ (ظاہر مال) جانور، زمین کی پیداوار اور وہ مالِ تجارت جسے تاجر عاشر پر لے کر گزرے۔ اموال ظاہرہ شمار ہوتا ہے ان کی زکواۃ سلطانِ اسلام کو دی جائے۔ اموال باطنہ کی زکواۃ براہ راست فقراء کو دی جاسکتی ہے (احکام القرآن)

مسئلہ: جیسے صدقاتِ واجبہ اور بعض نفلی صدقے اعلانیہ بہتر اور اکثر نفلی صدقے خفیہ دینا افضل۔ ایسے ہی دیگر عبادات نماز، حج وغیرہ کا بھی یہ حکم ہے۔ نماز پنج گانہ، عید، جمعہ جماعت سے ہی پڑھے (نوافل میں اخفاء بہتر ہے) اشراق، تحیۃ الوضو، تحیۃ المسجد وغیرہ مسجد میں ہی افضل، باقی نوافل گھر میں بہتر۔(ملخصاً احکام القرآن)۔

مسئلہ: اعلان کے ساتھ حج کو جانا اسی لیے بہتر کہ اس سے دوسروں کو حج کی رغبت ہوتی ہے۔

مسئلہ: خفیہ صدقہ اکثر اعلانیہ سے افضل ہے جیسا کہ (خیر لکم) سے معلوم ہوا۔ تو حدیث شریف کہ سات شخص قیامت کے دن عرش کے سایہ میں ہونگے۔ ان میں ایک وہ شخص بھی ہے کہ صدقہ اس قدر چھپا کر دے کہ بائیں ہاتھ کو خبر نہ ہو کہ دائیں نے کیا خرچ کیا ہے (بخاری مسلم)۔

مسئلہ: کبھی صدقہ حقوق العباد اور حقوقِ شریعت سے بھی بری کر دیتا ہے۔ کمزور بوڑھا روزے کا فدیہ دے سکتا ہے۔ میت کے فوت شدہ روزے، جب قرض خواہ کا پتہ نہ لگے یا امین کے پاس امانت کا مال پڑا ہے اور مالک گم ہو گیا اور اس کے ورثہ موجود ہوں تب تو انہیں دے دے ورنہ نہیں۔ بعد انتظار کے اس کے نام پر خیرات کر دے۔

مسئلہ: کسی اعلانیہ عبادت کرنے والے کو ریاکار نہ کہنا چاہیے۔ (ظُنُّوا المُومِنِین خیراء)

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

لَيۡسَ عَلَيۡكَ هُدٰهُمۡ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهۡدِىۡ مَنۡ يَّشَآءُ وَمَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ خَيۡرٍ فَلِاَنۡفُسِكُمۡ وَمَا تُنۡفِقُوۡنَ اِلَّا ابۡتِغَآءَ وَجۡهِ اللّٰهِ وَمَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ خَيۡرٍ يُّوَفَّ اِلَيۡكُمۡ وَاَنۡتُمۡ لَا تُظۡلَمُوۡنَ

(سورۃ البقرۃ:۲:۲۷۲)

''انہیں راہ دکھانا تمہارے ذمہ لازم نہیں۔ہاں! اللہ راہ دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور تم جو بھی کوئی اچھی چیز دو تو تمہارا بھلا ہے۔اور تمہیں خرچ کرنا مناسب نہیں مگر اللہ کی مرضی سے اور جو مال دو تمہیں پورا ملے گا اور نقصان نہ دیئے جاؤ گے۔''

شان نزول:

اس کے شانِ نزول میں چند روایتیں ہیں۔

۱۔ ایک یہ کہ اسماء بنت ابی بکر کی والدہ نفیلہ اور ان کی دادی ان کے پاس کچھ حاجت لے کر آئیں مگر یہ دونوں مشرکہ تھیں۔آپ نے فرمایا کہ میں حضور ﷺ کی اجازت کے بغیر تمہیں کچھ نہیں دے سکتی کیوں کہ تم بے دین ہو۔بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئیں تب یہ آیت نازل ہوئی تو حضور علیہ السلام نے انہیں مشرکہ ماں، دادی پر صدقہ کرنے کا حکم دیا۔

۲۔ بعض انصار کی یہود بنی قریظہ، بنی نضیر سے قرابت تھی۔انصار انہیں اپنی خیرات، صدقہ نہ دیتے تھے اور کہتے تھے کہ تم جب تک مسلمان نہ ہو جاؤ ہماری خیرات کے حقدار نہیں بن سکتے (کبیر)

۳۔ معنوی طور پر اس سے ملتی جلتی چند اور روایات بھی ہیں۔

اس آیتِ کریمہ سے مندرجہ ذیل فوائد و مسائل کا استنباط کیا گیا ہے۔

فوائد:

۱۔ اہلِ قرابت کافر کے ساتھ بھی دنیا میں حسنِ سلوک ضروری ہے۔ کفار سے نسبی رشتہ نہیں ٹوٹتا یعنی کفر کی وجہ سے بیٹا بنوت سے یا ماں باپ ابوت سے نہیں نکل جاتا بلکہ ان کے حقوقِ ابوت و بنوت ادا کرنا ضروری ہیں ہاں رشتۂ زوجیت کفر سے ٹوٹ جاتا ہے۔ کہ اگر زوجین میں سے کوئی مسلمان ہو جائے دوسرا کافر رہے یا مسلمان زوجین میں سے خاوند کافر ہو جائے تو نکاح جاتا رہے گا۔ ہاں کافر و مومن میں میراث نہیں۔

۲۔ ذمی کفار کو صدقۂ نفلی دینا جائز ہے نہ کہ فرض جیسا کہ من خیر سے معلوم ہوا۔ حربی کفار کو بالاتفاق صدقات واجبہ و نافلہ نہیں دیئے جائیں گے۔

۳۔ کافر حربی کو کوئی صدقہ نفلی یا فرضی دینا اگرچہ جائز نہیں مگر ان کے حقوق قرابت ادا کیے جائیں گے۔

۴۔ صدقاتِ واجبہ جیسے فطرہ، نذر وغیرہ میں اختلاف ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک کافر ذمی کو دیئے جاسکتے ہیں۔ اور دیگر آئمہ کے ہاں نہیں۔ ہاں قربانی کے جانور کا گوشت ذمی غیر مسلم کو دینا جائز ہے کیوں کہ یہ صدقۂ نافلہ ہے۔

۵۔ مال حلال سے خیرات کرنی چاہیے نہ کہ حرام سے جیسا کہ من خیر سے معلوم ہوا۔ لینے والا کیسا بھی ہو۔ سعدی علیہ الرحمۃ نے کیا خوب فرمایا۔

گر آں می بر دپیش آتش سجود

تو بایں چرا می کشی دستِ جُود

۶۔ اگرچہ فقیر خیرات کا مال حرام جگہ خرچ کردے تو دینے والے کے ثواب میں کمی نہ ہوگی (کبیر) جب کہ دینے والے کو معلوم نہ ہو کہ وہ یقیناً گناہ میں خرچ کرے گا۔

فائدہ:

اس آیتِ کریمہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے صدقات وخیرات اخلاص پر مبنی تھے۔ وہ حضرات ریاکاری، نام ونمود، دکھاوے سے بالکل پاک صاف تھے۔ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

وَمَا تُنفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰه : یعنی ہم گواہ ہیں کہ تم رضائے الٰہی کی تلاش میں مال خرچ کرتے ہو۔ بلکہ جن لوگوں نے انہیں ریاکار کہا ان منافقوں پر سخت عتاب ہوا۔

مسئلہ: ذمی کافر کو خیرات دینا جائز مگر ان کی خیرات لینا مسلمانوں کے لیے بے غیرتی ہے کہ اس میں ذلت ورسوائی ہے۔ ہاں ان سے قرض لینا یا ان کا مال غنیمت میں لینا جائز۔ ان کے پاس کوئی چیز گروی تو رکھی جاسکتی ہے۔ لیکن انہیں سود دینا سخت حرام ہے۔

مسئلہ: کفار کی نوکری جائز مگر حرام کام کی نوکری بہت بری۔

مسئلہ: تبلیغ دین کے لیے ناجائز ذریعہ اختیار کرنا منع ہے۔ جیسا کہ مسلمانوں نے اشاعتِ اسلام کی نیت سے اہلِ قرابت کفار کے حقوق روکنا چاہے لیکن انہیں منع کردیا گیا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ (سورة البقرة:۲۷۳)

"اپنے صدقات ان فقیروں کے لیے (مقرر کرو) جو راہ خدا میں رو کے گئے۔زمین میں چل نہیں سکتے، نادان انہیں تو نگر سمجھے بچنے کے سبب۔تو انہیں ان کی صورت سے پہچان لیگا لوگوں سے سوال نہیں کرتے کہ گڑگڑانا پڑے اور جو تم خیرات کرو اللہ اسے جانتا ہے۔"

شان نزول:

مسجدِ نبوی شریف کے پاس ایک صفہ (چبوترا) تھا جہاں چار پانچ سو فقراء مہاجرین رہتے تھے۔جن کے پاس نہ گھر تھا نہ دنیوی سامان۔ ہمیشہ مسجد میں حاضر رہنا اور دن میں روزہ وتلاوت قرآن اور رات کی شب بیداری، ہر جہاد میں لشکرِ اسلام کیساتھ جانا ان کا کام تھا۔نہ ان کا یہاں کنبہ یا قبیلہ تھا۔ان کی غریبی کا یہ حال تھا کہ ان میں سے متعدد کے پاس ستر پوشی کے لیے پورا کپڑا بھی نہ تھا۔ایک بار حضور علیہ السلام ان کے پاس تشریف فرما ہوئے ان کی سخت فقیری اور بھوک کی شدت ملاحظہ فرما کرارشاد فرمایا۔ (ابشروا یا اصحاب الصفة فمن لقینی من امتی علی النعت الذی انتم علیه (راضیاً بما فیه فانه من رفاقی) (اے صفہ والو! تمہیں بشارت ہو کہ میری امت سے جو تمہاری طرح (صابر، شاکر اور پرہیزگار) ہوگا وہ (قیامت) میں میرا رفیق ہوگا)

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِیْنَ : فقراء جمع فقیر کی ہے۔ فقیر اس شخص کو کہتے ہیں جس کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹی ہوتی ہے۔ چناں چہ محاورہ ہے۔ **فَقَرَتْہُ فَاقِرَۃٌ** یعنی مصیبت نے اس کی کمر توڑ دی (مفردات) فقر کے معنی جوڑ کے بھی آتے ہیں۔ چناں چہ ذوالفقار جوڑوں والی تلوار۔ فقرہ مضمون کا ایک جملہ یعنی جوڑ (نعیمی)۔ فقر بمعنی کسر یعنی توڑنا بھی آتا ہے (روح المعانی) غریبی، تنگدستی کو فقر اسی لیے کہتے ہیں کہ اس سے پیٹھ کے جوڑ ٹوٹ جاتے ہیں (اجعلو اصدقاتکم) محذوف مانا جائے گا جیسا کہ ترجمہ میں بیان کیا گیا ہے۔ یعنی جو کچھ تم فقراء پر خرچ کرو گے اس کا تمہیں پورا پورا اجر ملے گا۔

اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ : احصروا احصار سے بنا جس کا مادہ حصر ہے بمعنی رک جانا۔ اصطلاح میں بیماری یا حاجت یا خوف کی وجہ سے مقصود سے رک جانا احصار کہلاتا ہے۔ جو حاجی ادائے حج سے مرض یا خوف کی وجہ سے رُک جاتا ہے۔ محصر کہلاتا ہے۔ فی سبیل اللہ سے ہر نیک کام مراد ہے۔ جہاد ہو یا طلب علم یا دیگر عبادات۔ یعنی وہ فقراء جو جہاد یا طلب علم یا ضروری عبادات کی وجہ سے دنیوی کاروبار سے روک دیئے گئے۔ اس میں طلباء کی طرح فقیر، علماء، مصنف، مفتی وغیرہ سب داخل ہیں کہ یہ لوگ دینی خدمت کرتے ہیں۔ اگر دنیا (معاش) کی طلب میں مشغول ہو جائیں تو دین برباد ہو جائے گا۔ (نعیمی)

لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ : ضرب سے چلنا پھرنا اور دنیوی کاروبار کے لیے نقل و حرکت کرنا مراد ہے۔ یعنی یہ حضرات طلب علم اور تیاری جہاد میں اس قدر مشغول ہیں کہ زمین میں چل پھر کر کمائی نہیں کر سکتے۔ حضرت ابن مسیب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس سے جہاد کے زخمی مراد ہیں جو جہاد میں اپاہج ہو گئے اور کمانے سے مجبور ہو گئے (کبیر)۔ بہر حال ہر وہ شخص جو کمائی سے مجبور ہو خواہ اس کی مجبوری حسی ہو یا معنوی جیسے دین کی مشغولی وہ اس میں داخل ہے اور یہ حکم قیامت تک جاری ہے۔

يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ : یہاں یحسب حسبان بمعنی ظن سے ہے۔ جاہل، جہل سے مشتق ہے یہاں جہل خبر کا مقابل ہے یعنی بے خبر، نادان وغیرہ نہ کہ علم وعقل (کبیر) **تعفف عفّ یا عفةً** سے بنا عف اور کف کے معنی ہیں۔ رکنا، چھوڑنا اور صبر کرنا۔ اصطلاح میں ناجائز مرغوب شئے کو طاقت ہونے کے باوجود چھوڑنے اور بچنے کو کہتے ہیں۔ (روح المعانی) عفیفہ وہ عورت ہوتی ہے جس کا دامن بے حیائی کے دھبہ سے پاک صاف ہو۔ کف مطلقاً رکنے کو کہتے ہیں۔ یعنی ان کے سوال سے باز رہنے اور اپنے فقر کو چھپانے کی وجہ سے ناواقف آدمی غنی مالدار سمجھتا ہے۔

تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُم : تعرف عرفان یا معرفت سے بنا۔ مفعول جس کا معنی پہچاننا ہے۔ تو ان کو پہچانے گا۔ سیما سمۃ سے بنا جس کی اصل وسم ہے بمعنی علامت و بلندی مجاہد فرماتے ہیں یہاں ان کے خشوع وخضوع کے آثار مراد ہیں۔ ضحاک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بھوک کی وجہ سے ان کے چہروں کا زرد رنگ ہو جانا مراد ہے۔ ابن زید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ان کے لباس کا پھٹا پرانا ہونا مراد ہے۔ لیکن صاحب تفسیر کبیر فرماتے ہیں کہ یہ معنی یہاں غیر مناسب ہے کیوں کہ یہ تمام علامات ان کے حصول فقر پر دلالت کرتی ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کے قول (**یحسبھم الجاھل اغنیاء من التعفف**) کے مناقص ہے بلکہ یہاں علامت سے اللہ کے مخلص بندوں کا وہ ہیبت وجلال مراد ہے جو مخلوق کے دل میں ہوتا ہے اور جو کوئی ان کو دیکھتا ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اور ان کے سامنے تواضع کا اظہار کرتا ہے۔ یہ روحانی ادراکات ہیں جسمانی علامات نہیں۔ یہ حضرات رات کو قیام فرماتے اور دن کو جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر بیچا کرتے تھے۔ صاحب روح المعانی نے فرمایا کہ اصحاب صفہ میں سے بعض بھوک کی وجہ سے نماز میں گر جاتے تھے لوگ انہیں دیوانہ کہتے تھے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں بھی اصحاب صفہ میں سے تھا۔ کبھی بھوک سے گر جاتا تو گزرنے والوں سے آیت پوچھتا کہ شاید میری آواز سے کمزوری محسوس کر کے کچھ کھلا دیں۔

لَا یَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا : الحاف لحف سے بنا جس کا معنی ڈھانک لینا ہے۔اسی لیے رضائی کو لحاف کہتے ہیں کہ وہ اوڑھنے والے کے سارے جسم کو ڈھانک لیتا ہے۔ اصطلاح میں گڑگڑا کر مانگنے یا سوال میں اصرار کرنے کو الحاف یا الحاح کہتے ہیں کہ اس سے سامنے والے کا دل غیرت سے گویا ڈھک جاتا ہے۔ یہاں الحاف یا تو بمعنی اسمِ فاعل ہے۔لا یَسْئَلُوْنَ النَّاس کی ضمیر سے حال ہے یعنی وہ لوگوں سے اصرار سے نہیں مانگتے۔مگر ہم نے جو ترجمہ لکھا ہے اس کا ماخذ تفسیر کبیر ہے کہ (الحافاً) یَسْئَلُون کا مفعول ہے۔یعنی وہ کسی سے مانگتے ہی نہیں کہ گڑگڑانا پڑے۔(لعدم الصدور السئوال منهم اصلا)

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ : یعنی جو کچھ تم کارِ خیر میں خرچ کرو گے رب تعالیٰ اسے جانتا ہے بقدر اخلاص ثواب دے گا۔ اس آیت سے مندرجہ ذیل فوائد و مسائل حاصل ہوئے ہیں۔

۱۔ بہترین زندگی وہ ہے جو رب کے لیے وقف ہو۔دیکھئے اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے لیے خصوصی صدقات کا حکم دیا جو اپنی زندگیاں اللہ کے لیے وقف کر چکے انہیں (احصروا فی سبیل اللّٰہ) فرمایا گیا۔اصحابِ کہف کے کتے نے اپنی زندگی اللہ کے پیاروں کی خدمت کے لیے وقف کی تو اسے حیاتِ جاودانی مل گئی۔ناپاک کتا اس وقفِ زندگی کی وجہ سے شان والا ہو گیا تو اگر انسان اپنی زندگی اللہ رسول کی رضا جوئی اور دین اسلام کی خدمت کے لیے وقف کر دیں تو ان شاء اللہ فرشتوں سے افضل ہو جائے۔(از افادات عالیہ حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ

تمنا ہے کہ اس دنیا میں کوئی کام کر جائیں
اگر کچھ ہو سکے تو خدمت اسلام کر جائیں

۲۔ فی نفسہٖ متقی پرہیزگار کی خدمت کرنا بہت ثواب ہے۔اگرچہ خاص ضرورت کے وقت گنہگار بلکہ کافر کے ساتھ بھی احسان کرنا بہتر ہے۔

۳۔ آج کل ہمارے ان دیار میں اس آیت کے مصداق سب سے زیادہ وہ حضرات ہے۔ جو علوم دینیہ کے حصول واشاعت میں مشغول ہیں۔ (غریب علماء، دینی طلبہ، مدرسین وغیرہ) سب سے اچھا مصرف ہے۔ بعض جاہلوں کا یہ اعتراض کہ کیا ان سے کمایا نہیں جاتا اس کا جواب ظاہر ہے کہ اگر ان کی خدمت نہ کی گئی اور یہ طلب معاش کے لیے مجبور ہو گئے تو دین کا سخت نقصان ہوگا۔ یہ سب لوگ (احصروا فی فی سبیل الله) میں داخل ہیں۔ ایک شخص بیک وقت دو ایسے کام نہیں کرسکتا۔ جن میں ایک یا دونوں میں پوری مشغولی کی ضرورت ہو جس کو علمِ دین کیساتھ ذرا بھی مس ہو وہ بخوبی سمجھتا ہے کہ اس میں انتہائی مشغولی اور انہماک کی ضرورت ہے۔ اسلیے اس کیساتھ اکتساب کا شغل نہیں ہوسکتا۔ اور اس کے کرنے سے علم دین کی خدمت ناتمام رہ جاتی ہے۔

۴۔ قیمتی لباس والے فقیر کو زکواۃ دینا جائز ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو زکواۃ دینے کا حکم دیا جو بظاہر غنی معلوم ہوتے ہیں۔ (احکام القرآن) ایضاً تندرست فقیر کو بھی زکواۃ دینا جائز ہے رب تعالیٰ نے ان مہاجرین کو زکواۃ دینے کا حکم دیا جو تندرست مجاہد تھے اپاہج یا نابینا نہ تھے۔ (احکام القرآن)

۵۔ پیشہ ور گداگروں، بھکاریوں کے مقابلے میں اپنی حالت چھپانے والے محتاج لوگوں کو صدقہ دینا زیادہ اچھا ہے۔ جیسا کہ (تعفف) سے معلوم ہوا۔

۶۔ مخلوق سے اپنی تنگ دستی اور فقر و فاقہ چھپانہ بہت اچھا عمل ہے۔ حدیث میں ہے (جو مسلمان بھیک نہ مانگنے کا عہد کرلے۔ میں اس کے لیے جنت کا ضامن ہوں)۔ (مشکوۃ)

۷۔ حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر تم میں سے کوئی رسی لے کر (جنگل میں جا کر لکڑی کاٹ کر) گٹھا باندھ کر پشت پر لاد کر بازار میں لائے (اور فروخت کرے) اور اسطرح اللہ اس کی آبرو بچالے تو اس سے بہتر ہے کہ لوگوں سے سوال کرے وہ دیں یا نہ دیں (بخاری) حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے

کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر کوئی شخص لوگوں سے کچھ مانگے حالاں کہ (سوال سے) غنی بنا دینے والی (مقدار) اس کے پاس موجود ہو تو قیامت کے دن اس سوال سے اسکے منہ پر خراشیں پڑی ہونگی۔ عرض کیا گیا یارسول اللہ ﷺ غنی کر دینے والی مقدار کیا ہے فرمایا درھم یا اتنی قیمت کا سونا (تیرہ تولہ 2 ماشہ، 6 رتی چاندی یا اس کی قیمت) رواہ ابوداؤد والترمذی و ابن ماجہ والدارمی۔ اور بعض روایت میں چالیس درھم کی مقدار آتی ہے۔

سہل بن حنظلہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص ایسی حالت میں سوال کرے کہ اس کے پاس غنی کر دینے والی مقدار (صاحب نصاب ہونا) موجود ہو تو یقیناً وہ (اپنے لیے) آگ بڑھانا چاہتا ہے۔ نفیلی کی روایت میں (اتنا زائد ہے کہ کسی نے پوچھا یارسول اللہ ﷺ) وہ مقدار کیا ہے جس کی موجودگی میں سوال کرنا درست نہیں فرمایا جس میں صبح اور شام کا کھانا بنا سکے دوسری روایت میں آیا ہے کہ ایک دن رات کی پوری خوراک، (رواہ ابوداؤد بحوالہ تفسیر مظہری)

احادیث مذکورہ بالا میں بظاہر اختلاف نظر آتا ہے کہ کتنے مال کی موجودگی سوال کو حرام کر دیتی ہیں۔ لیکن ان احادیث کے اختلاف کو لوگوں کے احوال کے اختلاف پر محمول کیا جائے گا۔ مثلاً

۱۔ قدر نصاب سے کم مال کا مالک ہو یا اس کے پاس آج کے لیے پورا پورا کھانا ہو تو ایسے آدمی کے لیے اگرچہ زکواۃ لینا جائز ہے مگر سوال کرنا نادرست بلکہ حرام ہے۔

۲۔ چند فاقے یا مقروض ہونا اس صورت میں سوال بھی جائز ہے۔

۳۔ جس کے پاس کھانا تو بقدر ضرورت میسر ہو مگر ستر عورت کے لیے لباس نہ ہو یا دوسری ضرورتیں پوری کرنے کی سبیل نہ ہو اس کے لیے اپنی ضرورت کے موافق سوال کرنا درست ہے۔

۴۔ جو بھوک سے قریب المرگ ہو اور کوئی حلال غذا میسر نہ ہو تو اس صورت میں بھی سوال کرنا

درست بلکہ اس صورت میں تو جان بچانے کے لیے مردار کھانا بھی جائز ہے۔(فمن اضطُرَّ غیر باغٍ ولاَ عادٍ)۔

۵۔ جس پر فقر کی علامت دیکھے اسے زکواۃ دینا جائز جیسا کہ (سیماھم) سے معلوم ہوا۔

۶۔ علامت پر احکام شرعی جاری ہو سکتے ہیں۔لہٰذا میت کی زنار چوٹی۔عدم ختنہ وغیرہ اسکے کفر کی علامت ہوگا۔اسے غسل وکفن نہ دیا جائے گا نہ مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے گا ایسے ہی ختنہ علامت اسلام ہے۔اگر کوئی اور علامت نہ ہو تو مسلمانوں کے محلے یا دارالاسلام میں ہونا علامت اسلام اور دار الکفر میں ہونا علامت کفر ہے۔یہی حکم لقیط (پڑے ہوئے بچہ) کا ہے۔شیر خوار بچہ نے عزیز مصر سے کہا تھا۔(وان کان قمیصہ قدمنّ دبرٍ فکذبت وھومن الصّٰدقین)یوسف علیہ السلام کی چاک دامنی پاکدامنی کی دلیل ٹھہری۔ایک جگہ ارشاد فرمایا(سیما ھم فی وجو ھھم من الر السجود) پیشانی میں سجدہ قلبی ایمان کی نشانی ٹھہرا۔ایسے ہی ارشاد باری تعالی (ولتعر فنھم فی لحن القول) کی علامت دلیل نفاق قرار دی گئی (احکام القرآن للجصاص الرازی)

مسئلہ: عام معمولی استعمالی چیزوں کا سوال جائز ہے۔جیسے ضرورتاً آگ، پانی، سوئی دھاگا اور تھوڑا سا نمک وغیرہ

مسئلہ: مسجد میں اپنے لیے سوال سخت منع ہے۔ہاں دیگر فقراء یا دینی ضرورت کے لیے چندہ کرنا جائز ہے۔خود حضور سید عالم ﷺ سے ثابت ہے۔

ربٰو (سود) کی ممانعت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلَّذِیۡنَ یَاۡکُلُوۡنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوۡمُوۡنَ اِلَّا کَمَا یَقُوۡمُ الَّذِیۡ یَتَخَبَّطُہُ الشَّیۡطٰنُ مِنَ الۡمَسِّ ذٰلِکَ بِاَنَّہُمۡ قَالُوۡۤا اِنَّمَا الۡبَیۡعُ مِثۡلُ الرِّبٰوا وَ اَحَلَّ اللّٰہُ الۡبَیۡعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا فَمَنۡ جَآءَہٗ مَوۡعِظَۃٌ مِّنۡ رَّبِّہٖ فَانۡتَہٰی فَلَہٗ مَا سَلَفَ وَ اَمۡرُہٗۤ اِلَی اللّٰہِ وَ مَنۡ عَادَ فَاُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ہُمۡ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ (سورۃ البقرۃ:۲۷۵)

''وہ لوگ جو سود کھاتے ہیں۔ قیامت کے دن نہ کھڑے ہوں گے مگر جیسا کہ کھڑا ہوتا ہے۔ وہ جسے آسیب نے چھو کر خبطی بنا دیا ہو۔ یہ اس لیے کہ انہوں نے کہا کہ تجارت بھی تو سود کی مانند ہے۔ حالاں کہ اللہ نے حلال کیا ہے بیع کو اور حرام کیا سود کو۔ تو جسے اس کے رب کے پاس سے نصیحت آئی اور وہ باز رہا تو اسے حلال ہے۔ جو پہلے لے چکا۔ اور اس کا معاملہ خدا کے سپرد ہے۔ اور جو اب ایسی حرکت کرے گا تو وہ دوزخی ہے۔ وہ اس میں مدتوں رہیں گے۔''

تفسیر:

اَلَّذِیۡنَ یَاۡکُلُوۡنَ الرِّبٰوا : (وہ لوگ جو سود کھاتے ہیں) یہاں الذین سے ان امرائے عرب کی طرف اشارہ ہے جو سودی کاروبار کرتے ہیں۔ مگر لفظی عموم کی وجہ سے سارے سود خوار مراد ہیں۔ (نعیمی)

یاکلون : سے سود لینا مراد ہے۔ مگر چونکہ کھانا مال کا مقصد اعلیٰ ہے اس لیے اس کا ذکر فرمایا گیا جیسے (**الذین یا کلون اموال الیتٰمیٰ**) جیسے مال یتامی کھانا جائز نہیں۔ ایسے اس کا اتلاف بھی جائز نہیں۔ صاحب تفسیر کبیر فرماتے ہیں۔ **یاکلون** بمعنی **یعاملون** کے ہے۔ حضور علیہ السلام سے ثابت ہے کہ (**لعن اللّٰہ آکل الربٰاء و موکلہ و شاھدۃ و کاتبہٖ و المحلل لہ**) پس معلوم ہوا کہ حرمت صرف سود کھانے سے مختص نہیں۔ اردو زبان میں سود لینے والے کو سود خوار کہتے ہیں۔ یعنی سود کھانے والے بہر حال اس آیت میں سود لینے کا ذکر ہے۔ سود دینے کی حرمت دیگر دلائل سے معلوم ہوتی ہے۔

ربٰو :

ربٰو کو صلوۃ کی طرح واؤ کے ساتھ ان لوگوں کے نزدیک لکھا جاتا ہے جو اس کو پُر پڑھتے ہیں۔ اس کا لغوی معنی مطلقاً زیادتی ہے۔ (مفردات) اصطلاح شریعت میں سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے نزدیک۔ ناپنے تولنے والی ہم جنس چیزیں بلا عوض زیادتی کو ربٰو کہتے ہیں۔ (روح البیان)

لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا کَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَس : (قیامت کے دن نہ کھڑے ہونگے مگر جیسا کہ کھڑا ہوتا ہے وہ جسے آسیب نے چھو کر خبطی بنا دیا ہو) صاحب روح البیان کے نزدیک اس قیام سے مراد اپنی قبر سے اٹھنا اور محشر کی طرف چلنا ہے۔ کیوں کہ اس دن سود خور کی یہی پہچان ہوگی۔ **یَتَخَبَّطُهُ** خبط سے بنا ہے۔ تخبط دیوانہ بنانا۔ باؤلا کرنا (مفردات) قاموس میں ہے (**خبط الشیطان فلاناً یا تخبط الشیطان فلاناً**) (فلاں شخص کو جن نے چھو کر دکھ پہنچا دیا) المس سے مراد جنوں یا چھو جانا من المس کا تعلق یقوم سے ہے۔ یا یتخبط سے مطلب اسطرح ہوگا کہ سود خوار قبروں سے اس طرح اٹھیں گے جیسے جن کے جھپٹنے میں آیا ہوا آدمی جنوں زدہ ہو کر اٹھتا ہے۔ اور شیطان اس کی عقل خراب کر دیتا ہے۔ یا اگر مس کا معنی لمس لیا جائے تو

معنی یہ ہوگا کہ وہ اس طرح اٹھیں گے جیسے وہ شخص اٹھتا ہے جس کو شیطان کے چھو جانے سے دکھ پہنچ گیا ہو یعنی جن کے چھو جانے سے اس کا دماغ خراب ہو گیا ہو۔ جسمانی بیماری، مرگی اور جنون کبھی جن کے چھو جانے سے پیدا ہو جاتا ہے۔ اسلیے آیت میں جس کی تاویل ضروری نہیں کیوں کہ جن کے چھو جانے سے مرض کا پیدا ہو جانا قرآن و حدیث سے ثابت ہے۔ قرآن مجید میں حضرت ایوب علیہ السلام کے قصے میں آیا ہے کہ (اذنادیٰ رَبہٗ اَنّی مسّنی الشیطان بِنُصُبٍ وعذاب) اور حدیث میں استحاضہ کے بیان میں ہے کہ یہ شیطان کی ایک رگڑ (ایڑ) لگنے سے ہوتا ہے۔

بہر حال سود خوروں کے پیٹوں کو بڑھا کر اللہ تعالیٰ ان کو ٹھریوں کی طرح کردے گا جن کے اندر سانپ بھرے ہوں اسلیے وہ بوجھل ہو کر ٹھیک طرح کھڑے نہ ہو سکیں گے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (میں شب معراج ایسے لوگوں پر پہنچا جن کے پیٹ سانپ بھری کوٹھریوں کی طرح تھے۔ اور پیٹ کے باہر ہی سے سانپ نظر آرہے تھے۔ میں نے پوچھا جبرئیل علیہ السلام یہ کون لوگ ہیں؟ جبرئیل نے عرض کیا یہ سود خوار ہیں)۔ (رواہ احمد وابن ماجہ)

ابو یعلیٰ نے اس آیت کی تشریح میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے کہ قیامت کے دن وہ لوگ اسی علامت سے پہچانے جائیں گے کہ وہ کھڑے نہ ہو سکیں گے مگر جس طرح جن زدہ لرزتا اٹھتا ہے۔ (مظہری)

ابن ابی حاتم نے صحیح سند سے حضرت ابن عباسؓ کا قول بیان کیا ہے کہ سود خوار قیامت کے دن پاگل دیوانہ ہو کر اٹھے گا۔

آیت کا یہ معنی بھی ہو سکتا ہے۔ کہ سود خور سود خوری کے مقام سے دیوانہ ہی کی ہی طرح اٹھتے ہیں۔ مطلب یہ کہ سود کا لقمہ کھاتے ہی سود خوار کا دل سیاہ پڑ جاتا ہے۔ حق و باطل اور حلال و حرام کی تمیز اس کو جاتی رہتی ہے۔ جس طرح دیوانہ کو اچھے برے کی تمیز نہیں رہتی۔ دراصل لقمہ حرام اسکے

بدن کا جز بن جاتا ہے جس کی وجہ سے اس کی حقیقت بدل جاتی ہے۔ دوسرے گناہ چوں کہ بیرونی ہوتے ہیں اس لیے ان سے اندرونی جوہر نہیں بدلتا عارضی احوال کا تغیر ہو جاتا ہے۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے سود خور پر لعنت کی ہے۔ اور سود خواری کو زنا سے بھی سخت قرار دیا ہے۔

مسلم نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت سے اور بخاری نے حضرت ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سود کھانے والے اور سود کھلانے والے پر لعنت کی ہے۔ بعض روایات میں سود کے لکھنے والے اور سود کے گواہوں پر بھی فرمایا اور یہ سب برابر ہیں۔

ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا: (یہ اس لیے کہ انہوں نے کہا کہ تجارت بھی تو سود کی مانند ہے) یہ عذاب اسلیے ہوگا کہ انہوں نے کہا تھا کہ بیع بھی تو سود کی طرح ہے۔ یعنی یہ عذاب ان کے کفر اور حرام کو حلال قرار دینے کی وجہ سے ہوگا۔

آیت میں زور کلام پیدا کرنے کے لیے ترتیب الفاظ کو الٹ دیا کہنا تو یہ چاہیے تھا کہ (انما الربا مثل البیع) لیکن ان لوگوں نے سود کو جائز کہنے میں اتنا غلو کیا کہ تجارت مشبہ اور سود کو مشبہ بہ بنایا گویا کہ سود ایسا حلال ہے کہ تمام تجارتیں بھی مثل اس کی حلال ہیں مطلب یہ کہ بقول ان کے سود تو حلال ہی ہے اور بیع بھی منفعت میں کسی قدر سود کی طرح ہوتی ہیں اسی لیے وہ بھی درست غرض اصلی حرف فائدہ اندوزی ہے۔

وَاَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا : (حالاں کہ اللہ نے بیع کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام) فخر الاسلام بزدوی نے لکھا ہے کہ بیع لغت میں مالی تبادلہ کو کہتے ہیں۔ مگر باہم رضامندی کی شرط شرعاً ضروری ہے۔ لہٰذا بغیر رضامندی کے اگر مالی تبادلہ ہو تو اس پر غصب کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ اختیار اور تراضی کے لیے اچھے برے اور نفع و نقصان کی تمیز ضروری ہے۔ اسی لیے پاگل اور نا سمجھ بچے کی بیع اجماعاً درست نہیں۔ مگر سمجھدار بچے کی بیع امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک درست ہے۔ مگر اس کے سرپرست کی رائے کا شامل ہونا ضروری ہے۔ اللہ

تعالیٰ فرماتا ہے۔(فلیملل ولیهٗ بالعدل) بیع کی اقسام شرائط معلوم کرنے کے لیے اردو زبان میں بہار شریعت حصہ یازدھم یا دیگر کتب فقہ کی طرف رجوع فرمائیں۔ آیت کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال کیا اور سود کو حرام اتنا فرق ہوتے ہوئے جو تجارت اور سود یکساں سمجھے وہ پاگل ہے۔

فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ وَاَمْرُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ : (پس جسے اس کے رب کی طرف سے نصیحت آئی اور وہ باز رہا تو اسے حلال ہے جو پہلے لے چکا اور اس کا معاملہ خدا کے سپرد ہے) من شرطیہ یا موصولہ ہے جاء بمعنی بلغ موعظۃ وعظ سے بنا نصیحت یا جھڑک فانتھی باز رہ گیا (توبہ کرلی) سلف یعنی گزر گیا اسی سے ہے امۃ سلفۃ گزری ہوئی امت = مطلب یہ ہے کہ جس کو خدائی نصیحت اور زجر پہنچی اور فوراً سود خواری سے رک گیا اور توبہ کرلی تو اسے پہلے کا لیا ہوا سود جائز ہے کیوں کہ وہ ممانعت سے پہلے لے چکا اب اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے بلا وجہ کسی پر بدگمانی نہ کرو۔

وَمَنْ عَادَ : (جواب ایسی حرکت کرے گا) عاد عود سے بنا بمعنی لوٹنا یہاں عقیدہ یا عقل کی طرف لوٹنا مراد ہے یعنی جو کوئی سود کو حرام سمجھ کر پھر حلال سمجھنے لگا یا اسے چھوڑ کر پھر لینے لگا۔

فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ : (تو وہ دوزخی ہے وہ اس میں مدتوں رہیں گے) اگر عود سے حلال سمجھنا مراد تھا تو خلود بمعنی ہمیشگی تھے کیوں کہ حرام کو حلال قرار دینا کفر ہے۔ اور کفر دوامی دوزخی بنا دیتا ہے۔ اگر دوبارہ سود لینا مراد تھا تو گناہ ہے تو خلود بمعنی مدت دراز ہوگا یعنی جو کوئی سود کو چھوڑ کر پھر لینے لگا تو وہ جہنمی ہے اس میں مدتوں رہے گا۔ پھر نبی کریم ﷺ کی شفاعت یا رب تعالیٰ کی رحمت اور توحید و رسالت محمدیہ ﷺ کے اقرار کی وجہ سے آخر کار نجات ہو جائے گی۔ کیوں کہ سود کو حرام سمجھتے ہوئے پھر کوئی شخص اس کا مرتکب ہوتا ہے تو بہت بڑا گناہ ہے کفر نہیں اور جب کفر نہیں تو دائمی دوزخ اس کی سزا نہیں ہو سکتی جسطرح کہ آیت (ومن یقتل مؤمنا متعمداً فجزآئه جهنم خالداً فیها) میں خلود سے طویل مدت تک رہنا مراد ہے۔

یا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے۔ کہ سود خور دوسرے گناہ گاروں کے مقابلے میں دوزخ میں زیادہ رہے گا۔ کہ یہ رب کا بھی مجرم ہے اور انسانوں پر ظلم کرنے والا بھی۔ حق اللہ اور حقوق العباد کے بوجھ اس کے سر پر ہیں۔ سود خور جب ایک مقروض سے سود لیتا ہے تو وہ اس مقروض پر اس کے بال بچوں پر اس کے تمام اہل قرابت پر ظلم کرتا ہے کہ ان کے منہ کا لقمہ چھین کر ظلماً خود کھاتا ہے اسلیے اسے اصحاب النار بھی کہا اور خلدون بھی۔

(فوائد و مسائل)

اس آیت سے مندرجہ ذیل فوائد و مسائل معلوم ہوئے۔

۱۔ جن (بھوت وغیرہ) کا وجود برحق ہے۔ اس کا انکار اس آیت کا انکار ہے۔

۲۔ بھوت پریت وغیرہ میں انسان کو دیوانہ مجنوں کر دینے کی طاقت ہے اس کے لپٹنے یا پکڑنے سے انسان بدحواس ہوسکتا ہے۔

۳۔ سود لینا گناہ کبیرہ و حرام قطعی۔ لینے والا فاسق اور حلال جاننے والا کافر ہے۔ ممانعت سے پہلے کے جرم معاف ہیں۔ بشرطیکہ اب سچی توبہ کرلے جیسا کہ فانتھی سے معلوم ہوا۔

مسئلہ: مسائل شرعیہ میں بے علمی عذر نہیں لہٰذا جو کوئی بے عذری میں سود لیتا رہا وہ گناہ گار ہے۔

مسئلہ: سود کا پیسہ قبضہ سے بھی ملک میں نہیں آتا۔ لہٰذا سود خوار سود کا مالک نہیں اس پر واجب ہے کہ مقروض کو واپس کردے۔ اگر مقروض مرگیا تو اس کے ورثاء کو واپس کردے۔ وہ بھی نہ ہوں تو مقروض کے نام پر خیرات کردے۔ یہ حق العباد ہے محض توبہ سے معاف نہیں ہوسکتا۔

مسئلہ: اگر مقروض بعینہ سود کا پیسہ قرض خواہ سے چھین لے تو جائز ہے۔ مگر بعینہ کی قید کا لحاظ رہے۔ کیوں کہ یہ سود کا پیسہ خود مقروض کا اپنا پیسہ ہے نہ کہ قرض خواہ کا۔

مسئلہ ربٰو (سود)

ربٰو کا لغوی معنی مطلقاً زیادتی ہے۔ (مفردات) ارشاد باری تعالیٰ ہے (ویربی الصدقات) (اللہ تعالیٰ صدقات (خیرات) کو بڑھاتا ہے۔ اصطلاح شریعت میں سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ناپنے تلنے والی ہم جنس چیز میں بلاعوض زیادتی کو ربٰو کہتے ہیں۔ (روح البیان)

احناف کے نزدیک بیع کا جواز مطلق اور ربٰو کی حرمت مجمل ہے۔ (کبیر) مگر شافعی مذہب میں دونوں مجمل یعنی ہمارے یہاں ہر بیع حلال ہے۔ سوائے اس کے جس کی حرمت نص میں آ گئی اور ہر سود حرام ہے مگر سود میں اجمال ہے۔ کیوں کہ ہر تجارت نفع ہی کے لیے ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں صراحۃً فرمایا (لیس علیکم جناحٌ ان تبتغوا فضلاً من ربکم) معلوم ہوا کہ کوئی خاص نفع حرام ہے نہ کہ عام۔

اس مجمل کی تفصیل شارع علیہ السلام کے بیان سے ہوئی حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (الذھب بالذھب والفضة بالفضة والبر بالبر والشعیر بالشعیر والتمر بالتمر والملح بالملح مثلاً بمثل سواءً بسواءٍ یداً بیدٍ فاذا اختلف ھذہ الاصناف فبیعوا کیف شئتم اذا کان یداً بید) (رواہ مسلم) (سونا سونے کے عوض، چاندی چاندی کے عوض، گیہوں گیہوں کے عوض، جو جو کے عوض، چھوارے چھواروں کے عوض اور نمک نمک کے عوض برابر برابر دست بدست فروخت کرو اور جب یہ اقسام مختلف ہوں تو جیسا (کمی بیشی کے ساتھ) چاہو فروخت کرو (مگر) دست بدست) (روایت کیا اس کو مسلم نے) علاوہ ازیں امام مسلم نے ابوسعید خدری کی روایت بھی حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ حدیث کی طرح نقل کی ہے۔ لیکن روایت کے آخر میں اتنا زائد ہے کہ

جس نے زیادہ دیا یا زیادہ لیا اس نے سود دیا یا لیا۔ اس میں سود لینے والا اور دینے والا دونوں برابر ہیں۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے دوسرے سلسلہ اسناد کے ساتھ مروی ہے کہ سونے کو سونے کے عوض نہ بیچو مگر برابر برابر ایک کو دوسرے سے نہ بڑھاؤ اور چاندی کو چاندی کے عوض نہ بیچو مگر برابر برابر ایک کو دوسرے سے نہ بڑھاؤ اور غائب کو نقد (حاضر) کے عوض نہ فروخت کرو (رواہ البخاری و مسلم)

چھ چیزوں میں حرمت ربا کی احادیث حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت سے صحاح ستہ میں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت سے (حاکم کی) مستدرک میں اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی روایت سے صحیحین میں اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے مسلم میں اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت سے دار قطنی میں اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی روایت سے بزار میں اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت سے بیہقی میں مذکور ہے۔

احادیث مذکورہ میں تعداد اشیاء کے پیش نظر اصحاب ظواہر (داؤد ظاہری اور ان کے تبعین) اور ابن عقیل حنبلی کا قول ہے کہ حرمت سود انہی چھ چیزوں میں ہے۔ قتادہ اور طاؤس کی طرف بھی اسی قول کی نسبت کی گئی ہے (مظہری)

جمہور کے نزدیک مذکورہ اشیاء میں تو حرمت منصوص ہی ہے لیکن حکم کی بناء علت پر ہے۔ لہٰذا جہاں علت حرمت موجود ہوگی حکم حرمت ثابت ہوگا۔

چنانچہ ایک گروہ کے نزدیک محض مالیت علت ربا ہے۔ اس قول پر تمام اموال میں ربا حرام ہوگا اکثر علماء کا مسلک ہے کہ ہر جگہ علت ایک نہیں بلکہ سونے چاندی میں علت جدا ہے۔ اور باقی چار چیزوں میں جدا ہے چناں چہ امام شافعی اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ چاندی سونے میں ثمنیت کو علت قرار دیتے ہیں۔ لہٰذا سونے چاندی کے علاوہ جو چیزیں بطور ثمن استعمال کی جاتی ہوں ان میں بھی کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ حرام ہے۔ سیدنا امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وزن علت ہے۔ پس جو چیزیں وزن سے فروخت ہوں جیسے لوہا، رانگ وغیرہ موزون

اشیاء ان سب میں ربٰو حرام ہے۔ باقی چار چیزوں میں جنسی اتحاد کے ساتھ دونوں کا پیمانہ اور ناپ سے فروخت ہونا حرمت ربٰو کی علت ہے خواہ وہ کھائی جاتی ہوں یا نہ کھائی جاتی ہوں یہ قول امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا ہے اور امام احمد کا قول بھی ایک روایت میں یہی آیا ہے۔ دوسری روایت کے اعتبار سے امام احمد رحمتہ اللہ علیہ کے نزدیک جنسی اتحاد کے ساتھ دونوں کا معلوم ہونا علت ربٰو ہے ۔ امام مالک رحمتہ اللہ علیہ کے نزدیک جنسیت اور غذائیت علت ہے۔ امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ کے اولین قول کے مطابق کسی چیز کا معلوم ہونا اور مکیلی یا موزونی ہونا علت حرمت ہے۔ لہٰذا جو مطعوم ہوا (کھائی جانے والی چیز) پیانے یا وزن سے بکتی ہو اس سے حکم ربٰو ثابت ہوتا ہے۔ لیکن اگر مکیلی یا وزنی نہ ہو جیسے انڈے تو اس میں زیادتی حرام نہیں امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ کا آخری قول یہی ہے کہ جنسی اتحاد کے ساتھ دونوں چیزوں کا مطعوم ہونا علت ربٰو ہے۔ لہٰذا تمام کھائی جانے والی چیزوں میں پھل ہوں یا سبزیاں، ترکاریاں، دوائیں (مٹھائیاں) وغیرہ جنسی اتحاد کی صورت میں ربٰو حرام ہے۔ گویا امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ کے نزدیک الثمان میں ثمنی ہونا اور باقی اشیاء میں خوردنی ہونا علت ہے۔ اور امام مالک رحمتہ اللہ علیہ کے نزدیک خوردنی اشیاء میں قابل غذائیت ہونا علت ہے۔ بہرحال ہم اس مقام پر سیدنا امام اعظم ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے قول کی دلیل بیان کرتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے معلوم ہو چکا کہ امام صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے نزدیک اتحاد جنسی اور مکیلی یا موزونی ہونا علت حرمت ہے۔ اس قول کی دلیل یہ ہے کہ حرمت سود کی وجہ صرف یہ ہے کہ لوگوں کا مال تلف ہونے سے محفوظ رہے۔ اس حفاظت کے لیے ناپ تول کی وضع ہوئی اور ناپ تول میں عدل رکھنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا فرمایا (وَزِنُوۡا بِالۡقِسۡطَاسِ المستقیم) دوسری جگہ ارشاد فرمایا (ویل للمطففین الذین اذا کتالوا علی الناس یستوفون واذا کالوھم او وَّزَنوھم یخسرون)۔

رسول اللہ ﷺ نے زیادتی کو حرام قرار دیا اور برابر لین دین کو واجب کیا اور برابری کی شناخت صرف پیانے کی ناپ یا تول سے ہوتی ہے۔ اس لیے مناسب یہی ہے کہ کیل اور وزن کو

ہی علت قرار دیا جائے خود شارع علیہ السلام نے بھی اس کا اعتبار کیا اور فرمایا جو موزون ہو اس کو برابر برابر بدلو جب کہ وہ ایک نوع کی ہوں اور جو کیل ہو اس کا بھی اسی طرح تبادلہ کرو اور جب نوعیں الگ الگ ہوں تو کمی بیشی میں کوئی حرج نہیں (رواہ دار قطنی عن عبادہ، انس رضی اللہ عنہ) خیال رہے احناف کے نزدیک جو اشیاء باوجود مکیلی موزونی ہونے کے کیل و وزن میں نہ آسکیں ان میں کمی بیشی جائز ہے۔ جیسے ایک مٹھی گیہوں بدلے دو مٹھیوں کے کہ (لا یکلف اللہ نفساً الا وسعھا) چناں چہ سود کی دو صورتیں ہیں (۱) زیادتی کا سود (۲) ادھار کا سود۔

۱۔ زیادتی کے سود:

زیادتی کے سود کی حقیقت یہ ہے کہ دو طرفہ ایک جنس اور ایک ناپ تول کا مال ہو پھر ایک طرف زیادہ ہو اور دوسری طرف کم مثلاً چاندی کے عوض چاندی دی مگر وی چار تولہ اور لی پانچ تولہ یہ سود ہے کہ چاندی چاندی کی ہم جنس بھی ہے اور ہم وزن بھی تو تولہ ماشہ رتی سے تولی جاتی ہے۔ خیال رہے کہ ہم جنس وہ ہیں جو نام اور کام میں یکساں ہو اگر نام تو یکساں مگر کام جداگانہ ہو تو ہم جنس نہیں جیسے سرسوں کا تیل، تلوں کا تیل، مٹی کا تیل کے سب کو تیل ہی کہا جاتا ہے۔ مگر ان کے کام اور فائدے جدا جدا ہیں لہٰذا ان میں زیادتی کرنا سود نہیں۔ ایک بکری کے گوشت یا دودھ کے دو کلو گائے کہ گوشت یا دودھ کے بدلے کمی بیشی سے فروخت کرنا جائز ہے۔ (نعیمی)

۲۔ ادھار کا سود:

ادھار کا سود، ہم جنس یا ہم قدر اشیاء میں ایک طرف سے فوری قبضہ اور دوسری طرف سے ادھار درست نہیں۔ طرفین کا دست بدست قبضہ ہونا چاہیے۔ کیوں کہ فوری قبضہ اور عدم قبضہ سے اشیاء کی اقدار مالیت میں فرق آجاتا ہے۔ نقد کی مالی قدر ادھار سے زائد ہوتی ہے۔ اسلیے اگر ایک طرف سے فوری قبضہ اور دوسری طرف سے ایک مدت کے بعد قبضہ کا وعدہ ہو گا تو سود کی شکل پیدا

ہو جائے گی ۔ (مظہری) لہٰذا گندم نقد دیکر گندم ہی یا جو ادھار خریدنا حرام ہے ۔ کیوں کہ پہلی صورت میں متحد الجنس ہے اور جو کی صورت میں ہم وزن ہیں کہ دونوں من یا سیر سے تولے جاتے ہیں ۔ صرف ایک وصف میں یکساں ہونا کافی ہے ۔

یہ بھی درست نہیں کہ فوری ادا نہ کرنے والا تاخیر ادا کے عوض مقدار مال میں کچھ کمی بیشی کر دے تا کہ اس طرح فوری لینا اور تاخیر سے اس کا معاوضہ دینا باہم برابر ہو جائیں ۔ کیوں کہ تاخیر ادا کے عوض مقدار مالی کی کمی بیشی کوئی معنی نہیں رکھتی تاخیر ادا ایک وصف (عرض) ہے اور مالی زیادتی نفس شئی کی زیادتی ہوتی ہے ۔ تاخیر ادا (وصف) کا مقابلہ نفس شئی کی بیشی سے کس طرح کیا جا سکتا ہے؟ دس درہم نقد لے کر گیارہ درہم ادا کرنے کا وعدہ کرنا اور ایک زائد درہم کو مدت ادا کی تاخیر کا عوض قرار دینا دس کو گیارہ کے مساوی نہیں بنا سکتا ۔ شریعت نے اس کی ممانعت کی ہے ۔ اس طرح کھری چیز کے عوض ردی چیز زیادہ دینا اور اول الذکر چیز کے کھرے پن کا عوض ردی چیز کی زیادتی کو قرار دینا بھی درست نہیں ۔ مقدار زائد زائد ہی رہے گی ۔ کم مقدار والی کھری چیز کا وزن کھرے پن سے بڑھ نہیں جاتا اور نہ ردی شئی اپنی زیادتی کی وجہ سے کھری بن سکتی ہے ۔ چناں چہ حدیث شریف میں اس کی ممانعت کر دی گئی حضرت ابو سعید اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول ﷺ نے سواد بن عریہ رضی اللہ عنہ کو خیبر کا امیر بنا کر بھیجا سواد نے وہاں کے عمدہ چھوارے خدمت مبارک میں پیش کیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خیبر کے سب چھوارے ایسے ہی ہوتے ہیں سواد نے عرض کیا جی نہیں ۔ یا رسول اللہ ﷺ ہم مخلوط (عمدہ اور ردی ملے جلے) دو صاع دے کر ایک صاع (عمدہ) اور تین صاع (مخلوط) دے کر دو صاع (عمدہ) خرید لیتے ہیں ۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا ایسا نہ کیا کرو بلکہ اس کو قیمت سے بیچ دیا کرو ۔ پھر اس قیمت سے یہ خرید لیا کرو ۔ یہی حکم موزونی اشیاء کا یعنی ان چیزوں کا ہے جو کہ تولی جاتی ہیں ۔ (رواہ الدار قطنی بحوالہ مظہری)

ہاں ! اگر ناپ تول میں دونوں چیزیں برابر ہوں لیکن ایک کھری ہو اور دوسری خراب تو کیا

ایک کا کھرا پن سود پیدا کر دیتا ہے؟ جمہور کا قول یہ ہے کہ کھرے پن کا کوئی اعتبار نہیں مقدار کی مساوات میں کسی ایک چیز کے کھرے پن سے کوئی فرق نہیں آتا اسلیے وصف جودت موجب ربٰو نہیں۔

اب ہم سود کے متعلق چند ضروری مسائل بیان کرتے ہیں۔

مسئلہ: کاغذ اور چاندی ہم جنس نہیں لہٰذا سو روپیہ کا نوٹ ایک سو دس نقد چاندی روپیہ کے عوض فروخت کرنا جائز ہے۔ایسے ہی ایک روپیہ نقد چاندی کا دس پیسہ کے پندرہ سکون کے عوض بیچنا جائز ہے۔ کیوں کہ روپیہ چاندی کا دس پیسے کے سکے کسی اور دھات کے اس مسئلے کی مکمل تحقیق کے لیے امام اہلسنت مولانا شاہ احمد رضا فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کا رسالہ کفل الفقیہ ملاحظہ فرمائیں۔

مسئلہ: ہمارے ملک میں خصوصاً پنجاب میں مروجہ رہن حرام ہے۔ کیوں کہ یہاں زمین رہن لے کر اس کا نفع قرض خواہ کھاتا رہتا ہے۔اور پھر پورا قرض وصول کر کے زمین واپس کرتا ہے یہ خالص سود ہے۔

مسئلہ: جب جنس بدل جائے یا باوجود ہم جنس ہونے کے کیلی یا موزنی نہ ہو تو کمی بیشی جائز ہے۔

مسئلہ: دارالحرب میں حربی کفار سے نفع لینا سود نہیں (شامی باب الربٰو) کیوں کہ حربی کفار کا مال مسلمان کے لیے مباح ہے۔ جب کہ غدا سے نہ ہو۔

مسئلہ: دارالاسلام میں مسلمانوں کے بنک سے نفع لینا حرام ہے۔

مسئلہ: دارالاسلام میں زندگی یا مالی بیمہ شرعاً ناجائز ہے۔ کیوں کہ یہ قمار (جوا) ہے یا سود۔

مسئلہ: سود کے شبہ سے بھی بچنا ضروری ہے حضرت سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے سود کا بیان شافی فرمانے سے پہلے وفات پائی لہٰذا سود اور مشتبہ سود سے بچو۔(احکام القرآن)

سود کا کم ہونا اور صدقہ کا بڑھنا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِى الصَّدَقٰتِ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ
اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ
اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ

(سورۃ البقرۃ:۲۷۶،۲۷۷)

"مٹاتا ہے سود کو اور بڑھاتا ہے خیرات کو اور اللہ کو پسند نہیں آتا کوئی ناشکرا بڑا گناہ گار بیشک وہ جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے اور نماز قائم کی اور زکواۃ دی ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے۔اور نہ انہیں کچھ اندیشہ ہو اور نہ کچھ غم۔"

قرآن حکم کا طریقہ ہے کہ وہ تصویر کے دونوں رخ دکھلاتا ہے۔اور ضدین کا ذکر فرماتا ہے۔نیکوں کے ساتھ بدوں اور بدوں کے ساتھ نیکوکاروں کا ذکر فرماتا ہے۔کیوں کہ (الاشیاء تعرف باضدادھا) (چیز اپنے مقابل سے پہچانی جاتی ہے) یہاں بھی پہلے سود خور بداعتقاد اور بدعمل لوگوں کا ذکر فرمایا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا :الخ سے خوش اعتقاد و صالحین کا ذکر فرمایا تا کہ قرآن پڑھنے والے بدکاریوں سے بچیں اور نیکی اختیار کریں۔

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا : (اللہ مٹاتا ہے سود کو) يَمْحَقُ محق یا محاق سے بنا جس کا معنی ہے۔گھٹنا کم ہونا یا پورا ہو کر کم ہو جانا اسی لیے قمری مہینہ کی آخری تاریخوں کی محاق کہتے ہیں۔(مفردات) نقصان اور محاق میں فرق ہے کہ نقصان ہر کمی کو کہتے ہیں۔اور محاق اس خاص کمی کو جس

کا پہلے ذکر ہوا۔ یہاں یا تو دینی کمی اور بے برکتی مراد ہے یا اخروی نقصان، خسارا۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (جس کسی کا مال سود سے زیادہ ہوگا آخر کار وہ قلت کی طرف جائے گا) (رواہ ابن ماجہ وغیرہ) یہ معنی بھی ہو سکتا کہ اللہ تعالیٰ تمام انسانوں کا سود آخرت میں مٹا دے گا۔ کہ سودی صدقات و خیرات بالکل برباد ہوں گے۔ یا یہ کہ سودی کاروبار میں برکت نہیں ہوتی اگرچہ کبھی کثرت ہو جائے۔ کثرت اور برکت میں فرق ہے۔

وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ : (اور بڑھاتا ہے خیرات کو) یُرْبِی ارباءٌ سے بنا جس کا مادہ ربا ہے بمعنی بڑھانا۔ یعنی دنیاوی برکت یا اخروی ترقی دینا مراد ہے۔ جس مال سے خیرات نکالی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس میں برکت عطا فرماتا ہے۔ اور ثواب کئی گنا کر دیتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعا روایت ہے کہ اللہ خیرات کو قبول کرتا ہے۔ اور اس کو اس طرح بڑھاتا ہے جس طرح تم اپنے بچھڑے کی پرورش کرتے ہو۔ (متفق علیہ) مسلم اور ترمذی نے آپ ہی سے روایت کی کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ صدقہ مال میں کمی نہیں کرتا اور معاف کر دینے سے اللہ عزت بڑھاتا ہے۔ اور اللہ کے لیے جو شخص تواضع اختیار کرتا ہے اللہ اس کو اور اونچا کر دیتا ہے}۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ روزانہ دو فرشتے اترتے ہیں۔ ایک کہتا ہے۔ الٰہی خیرات کرنیوالے کو عوض عنایت فرما۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی روایت میں ہے کہ صدقہ سے مال میں کمی نہیں ہوتی۔ سخی کبھی فقیر نہیں ہوتا بفضلہٖ تعالیٰ اس کا مال بڑھتا ہے۔ سخی کی اولاد بھی اپنے ماں باپ کی سخاوت کا فائدہ اٹھاتی ہے۔

وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ (اور اللہ کو پسند نہیں آتا کوئی ناشکرا بڑا گنہگار) کفار کفر کا مبالغہ ہے جیسے ضرب کا ضراب اور قول کا قوال یہ کفور کے ہم معنی ہے۔ کافر کی جمع کفار (بضم الکاف) آتی ہے۔ یہاں کفار سے سخت اور اڑیل کافر مراد ہے جو کہ حرام کو حلال بنانے پر اڑا رہے۔ اہل عرب ہر ہٹ دھرم پر یہ صیغہ بولتے ہیں۔ جیسے (فعالّ الخیر یا مناعٌ للخیر) کفر سے اصطلاحی کفر یعنی بے ایمانی یا لغوی کفر یعنی ناشکری مراد ہے۔ الیم الثم کا مبالغہ اس سے دائمی

گناہگار مراد ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ ہر اڑیل کافر اور گناہوں میں منہمک رہنے والے سے ناراض ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ قیوم ہے اور قیومت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو عالم سے محبت ہے۔ لیکن کبھی محبت کسی عارض کی وجہ سے نفرت میں بدل جاتی ہے۔ سب سے بڑا عارض جو کہ محبت کو نفرت سے بدل دے وہ کفر ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مخلوق اللہ کی عیال ہیں جو اللہ کی عیال سے اچھا سلوک کرتا ہے۔ وہی اس کو سب سے پیارا ہوتا ہے۔ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے) یعنی وہ لوگ جو ان ساری چیزوں پر ایمان لائے جن پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اور بقدر طاقت نیکیاں کیں۔

وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ (اور نماز قائم کی اور زکواۃ دی) اقاموا اقامۃ سے بنا بمعنی سیدھا کرنا اور درست رکھنا یہاں نماز پر پابندی کرنا اور اسے صحیح طریقہ پر مستحبات واجبات کیساتھ ادا کرنا مراد ہے۔ اور زکواۃ سے مراد صدقہ فرضی مقصود ہے۔ اگر چہ اعمال صالحہ میں نماز اور زکواۃ بھی داخل تھی مگر اظہار عظمت کے لیے ان کا ذکر علیحدہ کیا گیا کیوں کہ نماز اعمال بدنیہ میں سب سے اعظم اور زکواۃ اعمال مالیہ میں سب سے افضل ہے۔ (روح المعانی)

لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ: (ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور نہ انہیں کچھ اندیشہ ہوگا اور نہ کچھ غم) لھم کے مقدم کرنے سے حصر کا فائدہ ہوا اجر ان کے طے شدہ معاوضہ اور جزا عام بدلہ خواہ باہمی عقد کی وجہ سے ہو یا بغیر عقد کے (مفردات) آئندہ اندیشہ کو خوف اور گزشتہ کے رنج و غم کو حزن کہتے ہیں۔ یعنی ان نیکوکاروں کا اجر ان کے رب کے نزدیک محفوظ ہے جس کے مارے جانے کا کوئی خوف و خطرہ نہیں۔

فوائد و مسائل:

(۱) حلال میں برکت ہے۔ اور حرام میں بے برکتی ہے۔ خیال رہے کہ کثرت اور برکت

میں فرق ہے۔ کثرت کے معنی ہیں زیادتی، برکت کے معنی جم جانا لہٰذا تھوڑی نعمت مبارک ہو تو بہت فائدہ دیتی ہے۔ برکت والی تھوڑی بارش رحمت ہے۔ اور کثرت کی بارش کبھی عذاب بن جاتی ہے۔ یوں ہی سود سے اگرچہ کبھی مال میں کثرت ہو جاتی ہے۔ اور یہ کثرت بھی باعث عذاب ہوتی ہے۔ مگر اس سے برکت مٹ جاتی ہے۔

اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ سود کا انجام بربادی ہے۔ مگر یہ ہے کہ سود خوار خوب پھولتے پھلتے ہیں۔ مغربی اقوام، ہندو مہاجن، یہودی وغیرہ سب ہی سود خوار ہیں۔ مگر ان میں سے کوئی برباد نہیں ہوا؟

جواب: اس کا ایک جواب یہ ہے کہ سود خور کی مالی و بدنی عبادات قیامت کے دن برباد ہوں گی دوسرا یہ کہ سود مسلمان کو پھلتا نہیں اور نہ ہی مسلمان کے لیے مناسب ہے جس طرح غلاظت کیڑے کی خوراک مگر بلبل کے لیے ناگوار سود غلاظت ہے۔ غیر مسلم کیڑے اور مسلمان بلبلیں ہیں انہیں سود پھلتا نہیں ان کی غذا رزق حلال کے پھول ہیں جس طرح ہر جانور کی غذا علیحدہ علیحدہ ہے ایسے ہی مومن و کافر کی غذائیں علیحدہ ہیں۔

اپنی ملت کو قیاس اقوام مغرب پر نہ کر
ہے جدا تعمیر میں قوم رسول ہاشمی ﷺ

تیسرے یہ کہ یہاں قومی ہلاکت مراد ہے نہ کہ شخصی کہ اگر سود کا عام رواج ہو جائے تو مال دار نہیں ہوں گے تو فقراء برباد ہوں گے فقراء کی بربادی قوم کی بربادی ہے۔ سود خور تجارتی خطرات اور مشقتیں برداشت نہیں کرسکتا کیوں کہ جسے بغیر مشقت مال ملے تو اسے کیا ضرورت ہے محنت کرنیکی۔ محنت سے جی چرائے گا محنت سے جی چرانے والی قومیں برباد ہو جاتی ہیں۔ چوتھے یہ کہ قاعدہ اکثریہ ہے کلیہ نہیں۔

سودی کاروبار ترک نہ کرنے والوں کے خلاف جنگ کرنے کا بیان

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ (سورۃ البقرۃ: ۲۷۸، ۲۷۹)

"اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو۔ اور چھوڑ دو جو باقی رہ گیا ہے سود اگر مسلمان ہو۔ پس اگر تم نے ایسا نہ کیا تو یقین کرلو اللہ اور اسکے رسول سے لڑائی کا۔ اور اگر تم توبہ کرو تو اپنا اصل مال لے لو تم کسی کو نقصان نہ پہنچاؤ اور نہ تمہیں کوئی نقصان ہو۔"

شانِ نزول:

کفار مکہ سود کے بہت عادی تھے۔ جب وہ فتح مکہ کے دن ایمان لائے اور حرمت سود کے احکام سنے تو انہوں نے چاہا آئندہ باز رہیں گے۔ مگر پچھلا وصول کرلیں اس پر یہ آیت نازل ہوئی (کبیر) اسی کے ہم معنی خازن روح المعانی، روح البیان وغیرہ نے روایات نقل کیں ہیں۔

تفسیر:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا (اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور چھوڑ دو جو باقی رہ گیا ہے سود) چونکہ سود اہل عرب کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا۔ ان کو یہ مفت کی آمدنی پسند تھی اور اس کا چھوڑنا نفس پر گراں تھا۔ اسلیے رب تعالیٰ نے پیارے خطاب سے مخاطب فرمایا یعنی اے لوگو! جو ایمان لاکر ہمارے وفادار بندے بن چکے ہو۔ ہمارے حکم کے مطابق سود

چھوڑ دو۔ اگر چہ اسلامی حکومت میں کفار کو بھی مسلمانوں سے سود لینے کی اجازت نہیں۔ مگر چوں کہ مسلمانوں کا سود چھوڑنا کفار کے لیے عملی تبلیغ ہوگی۔ اسلیے خصوصیت سے انہیں ہی حکم دیا۔ (نعیمی)

اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ: یعنی اگر تم دل سے ایمان لائے ہو تو اللہ کے حکم کی تکمیل کرو اللہ کے احکام کی پابندی صدق ایمان کی دلیل ہے۔

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا: (پھر اگر ایسا نہ کیا) تفعلوا کا مفعول پوشیدہ ہے یعنی ترک سود۔ اگر تم بقیہ سود لینے سے پرہیز نہ کرو خواہ حرام جانتے ہوئے یا حرمت کے منکر ہو کر۔ تو (فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ)} (تو یقین کر لو اللہ اور اللہ کے رسول سے لڑائی کا) فَاْذَنُوْا کا مادہ اذن ہے اور معنی اس کا سننا ہے۔ اسی لیے کان کو اذن کہتے ہیں۔ اہل عرب سنی ہوئی بات پر بھی اس کا استعمال کرتے ہیں۔ اطلاع اور اعلان کے معنی میں آتا ہے۔ (مفردات) اسی لیے اعلان نماز کو اذان کہتے ہیں۔ کبھی بات کو سن کر جان لینے اور یقین کر لینے کے معنی میں آتا ہے۔ جیسا کہ یہاں آیت کریمہ میں ہیں۔ (مظہری) حرب کی تنوین سے جنگ کی عظمت کی طرف اشارہ ہے۔ سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا اثر نقل کیا ہے کہ قیامت کے دن سود خوار سے کہا جائیگا لڑائی کے لیے اپنے ہتھیار لے لے۔

علماء فرماتے ہیں کہ اللہ کی طرف سے جنگ دوزخ ہے اور اللہ کے رسول کی طرف سے جنگ تلوار ہے۔ (روح البیان) اسی بنیاد پر علامہ بیضاوی نے لکھا کہ یہ لفظ چاہتا ہے کہ باغی کی طرح سود خوار سے توبہ طلب کی جائے۔ تاکہ وہ امر خداوندی کی طرف لوٹ آئے توبہ نہ کرے تو اس سے جنگ کی جائے۔ (مظہری)

میں کہتا ہوں۔ سود خوار کے پاس اگر اپنی حفاظت کی طاقت نہ ہو تو اسلامی ریاست کے امام (اقتدار اعلیٰ کے عہدہ پر فائز شخص) پر واجب ہے کہ اس کو قید کر دے اور جب تک توبہ نہ کرے قید رکھے۔ اور اگر اس کے پاس حفاظتی طاقت ہو اور امام اس کو گرفتار نہ کر سکے تو وہ باغی قرار دیا جائیگا اور اس سے اس وقت تک جنگ کی جائے جب تک وہ توبہ نہ کرے۔ یہی حکم ہر تارک فرض کا ہے

مثلاً نماز، زکوۃ وغیرہ کا تارک گناہ کبیرہ کا مرتکب ہے۔ جب کہ علی الاعلان وہ گناہ پر جمار ہے سب کا یہی حکم ہے۔ صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ان الفاظ سے آتی ہے کہ حضرت سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا خدا کی قسم میں اس شخص سے ضرور قتال کرونگا جو نماز اور زکواۃ میں تفریق کرتا ہے۔ کیونکہ زکواۃ مالی فریضہ ہے اگر یہ لوگ وہ بکری کا بچہ بھی دینے سے انکار کریں گے جو رسول اللہ ﷺ کو دیا کرتے تھے تو خدا کی قسم اس باز داشت پر میں ان سے لڑونگا حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا فیصلہ ہی حق ہے۔ (مظہری) فقہاء فرماتے ہیں۔ اگر کوئی قوم اذان یا مردوں کو دفن کرنا چھوڑ دے تو حاکم اسلام ان سے جنگ کرے کہ وہ باغی ہیں۔ (کبیر) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ کہ سود خوار سے توبہ کروائی جائے اگر توبہ کرے تو فبہا ورنہ اس کی گردن اڑادی جائے۔ (کبیر) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے چھواروں کو کھانے کے قابل ہونے سے پہلے خریدنے کی ممانعت فرمائی۔ اور فرمایا جب کسی بستی میں سود کھلم کھلا ہو جاتا ہے تو اس بستی والے اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کے عذاب کو اتار لیتے ہیں۔ (رواہ الحاکم)

حضرت عمرو بن عباس عاص رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں نے خود حضور سید عالم ﷺ سے سنا کہ جس قوم میں سود کھلم کھلا ہو جاتا ہے۔ ان کی پکڑ بصورت قحط ہوتی ہے۔ اور جس قوم میں رشوت کھلم کھلا ہو جاتی ہے وہ دشمنوں کے خوف کے عذاب میں پکڑے جاتے ہیں۔ (رواہ احمد)

وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ (اور اگر تم توبہ کرو تو اپنا اصل مال لے لو۔ تم کسی کو نقصان نہ پہنچاؤ نہ تمہیں کوئی نقصان ہو)

تُبْتُمْ **توبٌ** سے بنا بمعنی لوٹنا، رجوع کرنا۔ بندے کے حق میں گناہ سے رجوع کرنا اور رب تعالیٰ کے حق میں عذاب سے رجوع کرنا توبہ ہے۔ رأس المال سے مراد اصل مال جو بطور قرض مقروض کو دیا گیا یعنی اگر تم توبہ کرلو تو تمہارے لیے اپنا اصل مال لینا جائز ہے۔ اصل سے زیادہ لے کر تم قرضدار پر ظلم نہ کرو اور نہ ادائیگی میں ٹال مٹول یا اصل مال میں کمی کر کے تم پر ظلم کیا جائیگا۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (ادائے اصل میں) غنی کا ٹال مٹول کرنا ظلم

ہے) (متفق علیہ)

علامہ بیضاوی رحمتہ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اس آیت سے سمجھا جاتا ہے کہ اگر (سود خواری کو حلال سمجھنے والے) توبہ نہ کریں تو اصل مال بھی انکا نہ رہے گا۔ کیونکہ حرام کو حلال قرار دینے پر اڑ جانے والا مرتد ہے۔ اور اس کا مال فئی (مفت کی غنیمت) ہے۔ یہی قول امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک مرتد کا کل مال غنیمت ہے۔ لیکن سراج امت المصطفٰی (ﷺ) سیدنا امام اعظم ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے نزدیک چونکہ مفہوم مخالف حجت نہیں۔ لہٰذا وہ فرماتے ہیں کہ اگر مرتد کو قتل کر دیا گیا یا بھاگ کر دار الحرب (کفرستان) میں چلا گیا ہو تو اس کی حالت اسلام کی کمائی اس کے مسلمان وارثوں کو تقسیم کر دی جائے گی اور حالت ارتداد کی کمائی غنیمت کے حکم میں ہو گی۔

خلاصہ مضمون یہ ہے کہ تم غور کر لو، کیا تم اللہ رسول سے لڑ سکتے ہو؟ کیا تم اس کے عذاب کو برداشت کر سکتے ہو؟ ہرگز نہیں کر سکتے تم تو اس کی حقیر مخلوق مچھر چیونٹی کا مقابلہ بھی نہیں کر سکتے۔ تو گناہ کس ہمت اور دلیری پر کرتے ہو لہٰذا تم توبہ کر کے معافی چاہ لو تو ہم بخش دیں گے۔ نہ تم کسی پر ظلم کرو تا کہ نہ تم پر ظلم کیا جائے۔

فائدہ:

۱۔ صاحب تفسیر کبیر فرماتے ہیں کہ اس آیت سے بہت سے احکام کفار مستنبط ہوتے ہیں۔ مثلاً اگر کافر نے کسی ایسی چیز پر نکاح کیا ہو جو ان کے ہاں جائز ہے مثلاً سود، شراب وغیرہ اور پھر مسلمان ہو گیا تو اگر یہ مہر ادا کر چکا تو جائز ہے اور اگر نہ کر چکا تو اب خنزیر، شراب نہیں دے سکتا بلکہ اس عورت کے لیے مہر مثلی ہو گا۔

۲۔ اگر تجارت میں قبضہ سے پہلے مفسد پایا جائے تو بیع باطل ہے اور قبضہ کے بعد پایا جائے تو بیع درست ہو گی۔ مثلاً دو کافروں نے آپس میں شراب کی بیع کی اور قبضہ کے بعد اسلام لائے تو بیع درست ہے۔ لیکن قبل القبض اگر دونوں مسلمان ہو جائیں یا دونوں میں سے ایک

مسلمان ہو جائے تو بیع باطل ہو جائے گی۔ (احکام القرآن)

۳۔ اگر مسلمان نے شکار خرید کر احرام باندھا تو اگر قبضہ سے پہلے احرام باندھا ہو تو بیع فاسد ورنہ درست کیوں کہ اس آیت نے مقبوض سود کو حلال رکھا اور غیر مقبوض سے روک دیا۔ (احکام القرآن)

۴۔ اگر کافر نے بحالت کفر شراب ادھار بیچی اگر قبضہ دیکر مسلمان ہوا تو خریدار سے قیمت وصول کر سکتا ہے ورنہ بیع فاسد ہوگی۔

۵۔ دار الحرب کے عقود فسخ نہ کیے جائیں گے ہاں (اذاظهر عليها الامام لا يعترض عليها بالفسخ) مگر آئندہ کے لیے بند کر دئے جائیں گے۔ (احکام القرآن)

۶۔ کفار کے خلاف قاعدۂ اسلامی نکاح باقی رکھے جائیں گے۔ لہٰذا اگر شوہر بیوی مسلمان ہو جائیں تو انہیں دوبارہ نکاح کی ضرورت نہیں۔ ان کا پہلا نکاح قائم رہے گا اگر چہ بغیر مہر دوران عدت بغیر ایجاب وقبول ہو، بغیر گواہان ہو۔ ہاں اگر کسی نے حالت کفر میں اپنی محرم عورت سے نکاح کر لیا تو بعد اسلام ان کے درمیان جدائی کرادی جائے گی۔ (ہدایہ باب نکاح اہل الشرک)

اسلام کے بعد زمانہ کفر کے گناہ مٹ جاتے ہیں۔ مگر آئندہ گناہ سے روکا جائے گا۔ لہٰذا جو کافر سودی لین کے بعد اسلام لائے تو اس پر گزشتہ سود واپس کرنا واجب نہ ہوگا۔ ہاں زمانہ کفر کے قرض پر اب سود نہ لے سکے گا۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ سود خور توبہ کرنے کے بعد اصل قرض مقروض سے لے گا۔ اگر چہ توبہ سے پہلے وہ قرض سے کہیں زیادہ وصول کر چکا ہو۔ تو کیا اب بھی سود خوار کو یہ رعایت ملے گی کہ پہلے تو خوب سود وصول کرے پھر توبہ کر کے پورا قرض بھی لے لے۔

ازالہ شبہ: ہر گز نہیں یہ رعایت صرف اس وقت کے لیے تھی۔ جبکہ حرمت سود کا قانون نازل ہونے سے پہلے لوگوں نے سود لے لیا تھا۔ اور وہ سود اس وقت ان کے لیے جائز تھا۔ اب جبکہ سود حرام ہو چکا ہے۔ تو جو بھی لے گا حرام ہی لے گا اور اب توبہ کرنے پر لیا ہوا سود وضع کیا جائے گا۔ اگر قرض سے زیادہ لے چکا ہے تو واپس کرنا ہوگا۔ (نعیمی)

مقروض کو مہلت دینے اور اس سے قرض وصول کرنے کا طریقہ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

وَاِنۡ كَانَ ذُوۡ عُسۡرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيۡسَرَةٍ وَاَنۡ تَصَدَّقُوۡا خَيۡرٌ لَّكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ وَاتَّقُوۡا يَوۡمًا تُرۡجَعُوۡنَ فِيۡهِ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفۡسٍ مَّا كَسَبَتۡ وَهُمۡ لَا يُظۡلَمُوۡنَ (سورۃ البقرۃ: ۲۸۰،۲۸۱)

"اور اگر قرض دار تنگی والا ہے۔ تو اسے مہلت دو آسانی تک اور یہ کہ معاف ہی کر دو (تو یہ) تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے اگر جانو۔ اور ڈرو اس دن سے جس میں اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے اور ہر جان کو اس کی کمائی پوری دی جائے گی اور ان پر ظلم نہ ہوگا۔"

وَاِنۡ كَانَ ذُوۡ عُسۡرَةٍ : (اور اگر قرض دار تنگی والا (تنگ دست) ہے) بعض نے کہا کہ اس جگہ کان تامہ بمعنی وقع یا ثبت ہے اور خبر کی ضرورت نہیں۔ بعض نے کہا کہ ناقصہ ہے ذوعسرہ اس کا اسم اور مغرماً (مقروض) خبر محذوف ہے۔ عسر کے معنی تنگی اور سختی کے ہیں ہر یسرًا (آسانی فارغ البالی عنا) کا مقابل ہے قرآن مجید میں ہے (فان مع العسر یسرا ان مع یسراً) (مفردات) یعنی اگر مقروض اگر تنگدست واقع ہو۔ تو۔

فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيۡسَرَةٍ : (تو اسے مہلت دو آسانی تک) نظرۃٌ کا معنی مہلت اور ڈھیل دینا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے۔ (وَمَا كَانُوۤا اِذًا مُّنۡظَرِيۡنَ) (۱۰-۸) (قال انظرنی الی یوم یبعثون) اس نے کہا کہ مجھے اس دن تک مہلت عطا فرماؤ جس دن لوگ قبروں سے اٹھائے جائیں گے۔ (۷-۸۲) اسی سے انتظار ہے۔ غور کرنے کو بھی نظر اسی لیے کہتے ہیں کہ اس کے لیے مہلت درکار ہوتی ہے۔ دیکھنے کو نظر اسی واسطے کہتے ہیں کہ اس میں قوت باصرہ کو اپنے کام کرنے

کی ڈھیل دی جاتی ہے۔ مَیْسَرَۃ کا مادہ یسر ہے اور اس کا معنی جیسا کہ پہلے بیان ہوا۔ غناء آسانی اور فارغ البالی وغیرہ کے ہیں۔ یعنی غنا تک اسے مہلت دو۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو تنگدست کو سہولت دے گا اللہ اس کو دنیا اور آخرت میں سہولت دے گا۔ (رواہ مسلم وابن حبان بحوالہ مظہری)

وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَیْرٌ لَّکُمْ : (یہ کہ معاف ہی کر دو تو یہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے) ان مصدر یہ ہے تصدقوا صدقۃ سے بنا صدقہ ہر وہ چیز جو انسان اپنے مال سے قرب الٰہی حاصل کرنے کے لیے دیتا ہے اور یہی معنی زکواۃ کے ہیں۔ مگر عموماً صدقہ اسے کہتے ہیں جو واجب نہ ہو۔ اور زکوۃ وہ جس کا دینا واجب ہو۔ کبھی واجب کو بھی صدقہ سے موسوم کر دیا جاتا ہے۔ جبکہ خیرات دینے والا اس سے صِدق یعنی صلاح وتقویٰ کا قصد کرے۔ قرآن مجید میں ہے کہ (خُذْ مِنْ اموالهم صَدَقَةً ایسے تَصَدَق به) قرآن حکیم میں معاف کر دینے کے معنی میں بھی آیا ہے کہ جیسا کہ ارشاد باری ہے (والجُرُوحُ قِصَاصٌ فَمَنْ تَصَدَّق بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ) (زخموں کا بدلہ اسی طرح ہے لیکن جو شخص بدلہ معاف کر دے وہ اس کے لیے کفارہ ہوگا)۔ یہاں اس آیت میں بھی معاف کر دینے کے معنی میں ہے۔ (مفردات) بعض نے کہا اس صدقہ سے مہلت دینا مراد ہے مگر یہ درست نہیں کیوں کہ مہلت کا حکم تو پہلے ہی ہو چکا۔ نیز مہلت دینا واجب اور معاف کر دینا مستحب ہے کیوں کہ (خیرٌ لکم) ندب پر دال ہے۔ (کبیر) لہٰذا صحیح یہ ہے کہ اس سے قرض کی معافی مراد ہے خواہ کلاً ہو یا بعضاً ہو مگر ظاہر ہے کہ کل کی معافی مراد ہے۔ (نعیمی) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں شہادت دیتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے۔ قیامت کے دن جس شخص پر سب سے پہلے اللہ کا سایہ ہوگا وہ شخص وہ ہوگا جس نے کسی تنگدست کو ادائے قرض کی مہلت اس وقت تک دی جب تک اسے میسر آئے یا اپنا معاملہ بالکل معاف کر دیا ہو اور کہہ دیا ہو کہ میں اپنے حق سے اللہ واسطے تجھے سبکدوش کرتا ہوں اور (معاف کر دینے کے بعد) قرض کی تحریر جلا دی ہو۔ (رواہ الطبرانی) (ایضاً بغوی فی الشرح السنۃ بالفاظہٖ)

حضرت ابو مسعود رضی اللہ عنہ کا قول مروی ہے کہ گزشتہ اقوام میں سے ایک آدمی کی جان ملائکہ نے قبض کی اور اس کی روح سے پوچھا کیا تو نے کبھی کوئی نیک کام کیا ہے۔اس نے جواب دیا نہیں۔ملائکہ نے کہا نہیں کیا یاد کرلے اس نے کہا اور تو کوئی نیکی نہیں کی۔ہاں اتنی بات ضرور تھی کہ میں لوگوں کو قرض دیا کرتا تھا اور میں اپنے نوکروں سے کہہ دیا کرتا تھا کہ فراخ دست کو (ادائیگی کی) مہلت دیا کرو اور تنگدست سے (بالکل ہی) درگزر کرلیا کرو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا تم بھی اس شخص سے درگزر کرو (رواہ مسلم)

اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ: (یعنی اگر مہلت دینے اور معاف کردینے کی فضیلت تم جان جاؤ تو پھر یہ کام تم پر دشوار نہ ہو یعنی آیت میں شرط مذکور ہے۔جس کی جزا محذوف ہے۔جس طرح قیدی آزاد کرنا ثواب ہے۔ایسے ہی کسی مقروض کی گردن سے قرضے کا بار معاف کردینا ثواب ہے۔کہ قرض بھی ایک طرح کی قید ہے۔جس میں مقروض دنیا اور آخرت میں پھنسا ہوا ہے۔لہٰذا حاجت مند کو قرض دینا غریب مقروض کو مہلت دینا یا بالکل معاف کردینا باعث اجر و ثواب ہے رب تعالیٰ نے صدقات و خیرات کو قرض فرمایا تا کہ مسلمانوں کو قرض دینے کے فضائل معلوم ہوں۔ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

(**مَنْ ذَالَّذِیْ یقرض اللّٰه قرضاً حسناً**) حدیث شریف میں ہے (**لایحل دین رجلٍ مسلم فیؤخره الاکان له بکل یوم صدقه**) یعنی جو کوئی قرض کی معیاد کے بعد مہلت دے اسے ہر دن کے عوض اتنی خیرات کا ثواب ملتا ہے (روح البیان) مثلاً کسی نے پچاس روپے ایک ماہ کے وعدے پر قرض دیئے اب اگر ایک ماہ بعد مقروض ادا کرنے سے قاصر ہے اور قرض خواہ نے اسے مہلت دیدی تو اسے ہر روز پچاس روپے خیرات کرنے کا ثواب ملے گا۔اس مقام پر صاحب روح البیان نے نقل فرمایا کہ حضرت امامۃ باہلی رضی اللہ عنہ نے خواب میں جنت کے دروازے پر لکھا ہوا دیکھا کہ قرض دینے کا ثواب اٹھارہ گنا اور صدقہ کا دس گنا ہے۔پوچھا کہ یہ کس لیے ہے؟ جواب ملا کہ صدقہ تو کبھی غیر ضرورتمند بھی لے لیتا ہے۔مگر قرض حاجت مند ہی لیتا ہے۔جہاں

بوقت ضرورت قرض لینا شرعاً جائز ہے لیکن بلاضرورت لینا اور قصداً اسے ادانہ کرنا بہت برا ہے حدیث شریف میں ہے (عن ابی موسی عن النبی ﷺ قال اِنَّ اعظم الذنوب عند اللّٰہ ان یلقاہ بھا عبدٌ بعد الکبائر التی نھی اللّٰہ عنھا ان یموت رجلٌ وعلیہ دینٌ لایدع لہ قضآءً) (رواہ احمد وابوداؤد) حضور ﷺ فرماتے ہیں کبائر کے بعد سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ انسان مقروض ہو کر مرے اور ادا کے لیے مال نہ چھوڑے۔

۲۔ تین پیسے کے عوض مقروض کی سات سو نمازیں مسلمان قرض خواہ کو قیامت میں دلوائی جائیں گی (شامی)

۳۔ حدیث شریف میں ہے کہ نبی کریم ﷺ اس مقروض کی نماز جنازہ نہ پڑھاتے تھے جس نے ادا کے لیے مال نہ چھوڑا ہوتا بلکہ دوسرے مسلمانوں سے فرماتے کہ تم اس کی نماز جنازہ پڑھ لو (مسلم بحوالہ مشکوٰۃ)

۴۔ امام احمد رحمتہ اللہ علیہ کی روایت میں ہے کہ اگر کوئی شخص تین بار بھی زندہ ہو کر شہید ہوتا رہے جنت میں نہیں جاسکتا جب تک قرض ادا نہ کرے (مشکوٰۃ)

۵۔ حضور سید عالم ﷺ نے فرمایا اگر جنت میں جانا چاہتے ہو تو تین چیزوں سے بچو غرور، خیانت، قرض (ترمذی ابن ماجہ مشکوٰۃ)

۶۔ قروض بعد موت بھی قرض میں گرفتار رہتا ہے جب کہ ادانہ کر دیا جائے۔ (عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ نفس المومن معلّقہ بدینہِ حتیٰ یُقضیٰ عنہ) (رواہ الشافعی واحمد والترمذی) مسلمان ان روایات سے عبرت پکڑیں آج کل شادی ،موت کے بعد حرام رسمیں پوری کرنے کے لیے قرض لینے کی عام عادت ہوگئی ہے سودی قرض اور بھی وبال ہے۔ حضور علیہ السلام نے سود دینے اور لینے والے پر لعنت فرمائی اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اس عادت بد سے بچائے۔ اور شریعت مطہرہ کے مطابق شادی غمی ہر موقع پر اسلامی سادگی کو اپنانے کی توفیق دے۔

(فوائد و مسائل)

مسئلہ: صحیح یہ ہے کہ غریب مقروض کو مہلت دینا واجب ہے۔اور بالکل معاف کر دینا مستحب ہے۔

مسئلہ: اگر کسی مقروض کا غریب ہونا مشتبہ ہو اور احتمال ہو کہ شاید یہ اپنے مال کو چھپاتا ہے تو قرض خواہ کی درخواست پر حاکم مقروض کو قید کر دے اور جب قرینہ سے معلوم ہو جائے کہ واقعی یہ غریب ہے اگر اس کے پاس مال ہوتا تو ظاہر کر دیتا تب اسے چھوڑ دے۔

مسئلہ: معسر تنگ دست وہ مقروض ہے جس کے پاس ادائے قرض کے لائق مال نہ ہو۔

مسئلہ: قرض خواہ کو یہ بھی حق ہے کہ مقروض کو پکڑ لے کہ ہر وقت اسکے ساتھ ساتھ پھرے۔

مسئلہ: حاکم کو یہ حق نہیں کہ مقروض کی جائداد اور مکانات خود فروخت کرے اور اس کا قرض ادا کر دے بلکہ اسے قید کر کر بیچنے پر مجبور کر سکتا ہے۔ہاں اسکے پیسہ پر قبضہ کر کے بقدر حصہ قرض ادا کر سکتا ہے۔(درمختار کتاب القضاء)

مسئلہ: مگر اب فتویٰ اس پر ہے کہ قاضی (مجسٹریٹ) دیوالیہ کی ہر چیز فروخت کر دے یعنی کچھ کپڑے اور رہنے کا مکان، حرفت کے آلات کے سوا سب کچھ فروخت کر کے قرض ادا کرے۔(شامی) آج کل اسی پر عمل ہے۔

مسئلہ: مہلت دینا اس قرض میں واجب ہے جو مالی کاروبار کا ہو جیسے تجارتی قرض وغیرہ مگر دین مہر، کفالہ حوالہ، صلح کے روپے پر مہلت واجب نہیں۔(احکام القرآن، للجصاص الرازی)

مسئلہ: جو مقروض فقیر ظاہر ہوا سے قید نہیں کر سکتے کیوں کہ قید تو ظہور فقر کے لیے تھی۔

مسئلہ: شرعاً مہلت کی کوئی مدت مقرر نہیں غناء تک مہلت دی جائے جیسا کہ (فنظرة الی میسرة) سے ظاہر ہے۔

فائدہ ضروریہ:

شرعاً قرض اور دین میں فرق ہے۔ دست گردان یعنی نقدی کے لین دین کو قرض کہا جاتا ہے اور معاوضات کے ذمہ رہ جانے کو دین کسی سے دس روپے ادھار لیے یہ قرض ہے لیکن دس روپے کا مال خریدا اور قیمت ادا نہیں کی یہ دین ہے۔ قرض کی میعاد کوئی نہیں قرض خواہ جب چاہے مانگ لے طے شدہ میعاد کی لازمی پابندی نہیں مگر دین میں مقررہ میعاد کی پابندی کرنی ہوگی۔ کہ وقت مقررہ سے پہلے تقاضہ نہیں ہوسکتا۔ (کتب فقہ) نیز قرض میں زیادتی حرام کہ سود بنتی ہے اور دین میں جائز کہ تاجر کہہ سکتا ہے کہ اس شئی کی نقد قیمت ایک روپے اور ادھار پر ڈیڑھ روپیہ ہے۔ تاہم خلاف مروت ہے۔

وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ (اور ڈرو اس دن سے جس میں اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے) یہاں تقویٰ سے ڈرنا مراد ہے۔ اور یوم سے قیامت کا دن یا مرنے کا وقت مراد ہے۔ (مظہری) **(ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ)** (ہر جان کو اس کی کمائی پوری دی جاوے گی) **توفی توفیۃ** سے بنا اس کا مادہ وفاء ہے۔ بمعنی پورا پورا دینا (**اخذا شئی وافیاً**) **ماکسبت** کا مضاف جزاء پوشیدہ ہے یعنی ہر نفس کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا خیر کا خیر اور شر کا شر۔

کسب ہر اختیاری فعل کو کہتے ہیں خواہ ہاتھ سے صادر ہو یا دیگر اعضاء سے اور کل نفس سے ہر عاقل بالغ انسان مراد ہے کیوں کہ بچے دیوانے اور جانور کے اعمال کی آخروی جزا نہیں۔ (نعیمی)

وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ : (اور ان پر ظلم نہ ہوگا) یعنی ثواب گھٹا کر یا (جرم سے زیادہ) عذاب بڑھا کر ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ مفسرین فرماتے ہیں کہ (**واتقوا یوماً**) الخ یہ سب سے آخری آیت ہے۔ جو حضور ﷺ پر نازل ہوئی حضرت جبرئیل علیہ السلام نے عرض کیا کہ اسے سورہ بقرہ میں (۲۸۰) دوسو اسی آیتوں کے بعد رکھیئے چناں چہ یہاں رکھی گئی اس کے بعد حضور علیہ السلام دنیا میں

سات دن یا نو دن یا اکیس دن رہے۔(بقول ابن عباس رضی اللہ عنہ) بقول بعض ۸۱ اکیاسی دن دنیا میں رہے (روح البیان و کبیر) بعض روایت میں آیا ہے کہ یہ آیت وفات شریف سے تین گھنٹہ پہلے نازل ہوئی (روح البیان و کبیر) (واللہ اعلم بالصواب) حضور نبی کریم ﷺ کی پیدائش ،آپ کی بعثت، دخول مدینہ اور وفات شریف یوم الاثنین یعنی پیروار ہوئی۔آپ ﷺ اٹھارہ دن بیمار رہے تاریخ وصال دو، یا نو یا تیرہ ربیع الاول ہے عوام میں جو بارہ تاریخ مشہور ہے یہ درست نہیں عوام میں اس غلط تاریخ کے مشہور ہو جانے کی وجہ علامہ ابن حجر عقلانی نے فتح الباری میں یہ لکھی ہے (فالمعتمد ماقال ابو مخنف وکان سبب غلط غیرہ انهم قالو مات فی ثانی شهر ربیع الاول فتغیرت فصارت ثانی عشر واستمر الوهم بذالک یتبع بعضهم بعضاً من غیر تامل واللہ اعلم قالو مات فی ثانی شهر ربیع الاول غیر تامل واللہ اعلم)۔ یعنی لوگوں نے غلطی سے لفظ ثانی شھر کو ثانی عشر بنالیا اور اسی کی تائید مصنف سیرت النبی ﷺ اور صاحب نشر الطیب نے بھی اپنی کتب میں کی ہے۔چناں چہ لکھا ہے" اور تاریخ کی تحقیق نہیں ہوئی اور بارہویں جو مشہور ہے وہ حساب درست نہیں ہوتا کیوں کہ اس سال ذی الحجہ کی نویں جمعہ کی تھی اور یوم وفات دوشنبہ (پیروار) ثابت ہے۔پس جمعہ کو نویں ذی الحجہ ہو کر بارہ ربیع الاول دوشنبہ کو کسی طرح نہیں ہو سکتی"۔(نشر الطیب مطبوعہ تاج کمپنی ۲۴۱)

ابن کثیر نے وفات ۲ ربیع الاول بروز پیروار رکھی ہے۔چناں چہ فرماتے ہیں (وعاش النبی ﷺ بعد نزول هذه الایة تسع لیال ثم مات یوم الاثنین لیلتین خلتا من ربیع الاول) (رواہ ابن ابی حاتم) (تفسیر ابن کثیر صفحہ ۱/۳۳۳)

امام اہل سنت مولانا الشاہ احمد رضا فاضل بریلوی نے تاریخ وفات تیرہ ربیع الاول لکھی ہے اور ان کی تحقیق یہ ہے۔

تجارت میں لین دین کے احکام

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ (سورۃ البقرۃ:۲۸۲)

''اے ایمان والو! جب تم ایک مقررہ حد تک کسی دین کا لین دین کرو تو اسے لکھ لو۔ اور چاہیے کہ تمہارے درمیان کوئی لکھنے والا ٹھیک لکھے۔ اور لکھنے والا لکھنے سے انکار نہ کرے جیسا کہ اللہ نے اسے سکھایا تو اسے لکھ دینا چاہیے۔''

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت بیع سلم کے بارے میں نازل ہوئی۔ (تفسیرات احمدیہ)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى (اے ایمان والو جب تم ایک مقررہ مدت تک کسی دین کا لین دین کرو) تداینتم دین سے بنا بمعنی قرض کا معاملہ کرنا۔ اگر ایک جنس میں ادھار کا لین دین ہو تو اسے قرض کہا جاتا ہے۔ جیسے روپیہ یا گندم یا کھجوریں ادھار لی جائیں کہ چند روز میں ایسا ہی مال واپس کر دیا جائے۔ اس میں زیادتی حرام اس کی میعاد کوئی نہیں۔ اور دین خلاف جنسی ادھار کو کہتے ہیں۔ مثلاً اگر غلہ آج خرید لیا اس کی قیمت پھر دیں گے۔ اس میں زیادتی بھی حلال اور میعاد بھی معتبر (احمدی۔ نعیمی وغیرہ) ظاہر یہ ہے کہ اس لفظ سے ہر ادھار مراد ہے۔ مگر بقول ابن عباس رضی اللہ عنہ صرف بیع سلم مراد ہے۔ تداینتم میں شبہ ہو سکتا تھا کہ یہ لفظ دین بمعنی بدلہ سے بنا ہو اور اس سے وہ تجارت مراد ہو جس میں مال بھی ادھار اور قیمت

بھی ادھار۔ان دونوں وہموں کو دفع فرمانے کے لیے ارشاد ہوا ہے (مدین)۔جس سے معلوم ہوا کہ تجارت میں ادھار یک طرفہ ہی ہونا چاہیے۔دو طرفہ ادھار کی بیع (سٹہ) درست نہیں۔غیر مقبوض کی بیع غیر مقبوض کے عوض بالاجماع صحیح نہیں۔حاکم اور بیہقی نے ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بیع الکائی بالکائی کی ممانعت فرمائی (مظہری)۔ (الی اجلٍ مسمًّی) اجل کے معنی کسی چیز کے لیے مقرر مدت کے ہیں۔قرآن مجید میں ہے (ولتبلغوا اجلا مسمًّی) (مفردات) اسی لیے موت کو بھی اجل کہا جاتا ہے وہ انتہائے عمر کے لیے مقرر ہے۔ (کبیر) اجل کی کم سے کم مدت ایک مہینہ ہے۔(احمدی)۔چوں کہ اجل (میعاد) کبھی مبہم ہوتی ہے مثلاً یوں کہا کہ جب فصل کٹے گی تو یہ قرض دوں گا۔اسلیے لفظ مسمی لا کر معین کر دیا کہ ایسی اجل (میعاد) جس میں کمی بیشی ناممکن ہو جیسے سال۔مہینہ اور تاریخ کا تقرر (اجل مسمی) سے اشارۃً معلوم ہوا کہ لمبی مدت کے قرض جن میں بھول چوک کا خطرہ ہو وہ لکھے جائیں۔ایک آدھ گھنٹے کا قرض کہ کوئی چیز خریدی جیب میں پوری رقم نہیں۔کہہ دیا کہ ابھی گھر سے بھجوائے دیتا ہوں ۔یا کل تک پہنچ جائے گی۔اس کے لکھنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ اتنی مدت میں بھول چوک اور جھگڑے شاذ و نادر ہیں۔اس لیے لکھنے کو (اجل مسمی) پر مرتب فرمایا غرض یہ کہ اس مختصری عبارت میں دیوان کے بہت سے احکام وقوانین بیان فرما دیے۔مطلب یہ ہوا کہ اے مسلمانوں! جب تم آپس میں قرض کا لین دین کرو کہ مال ادھار پر بیچو یا قیمت نقد لے کر مال ادھار دینا ہو جیسا کہ بیع سلم میں ہوتا ہے تو اس میں صحیح طور پر میعاد مقرر ہونا چاہیے۔

فَاکْتُبُوْهُ (پس اسے لکھ لو) یعنی آئندہ نزاع کو دور کرنے اور معاملہ کو پختہ کرنے کے لیے عقد کو (مع تفصیل) کے لکھ لیا کرو یہ حکم سب کے لیے ہے۔خواہ قرض دینے والا یا لینے والا ہو۔ھا کا مرجع دین ہے یا اجل جمہور کے نزدیک یہ حکم استحبابی ہے وجوبی نہیں۔اگر وجوبی ہو تو آیت (فان امن بعضکم بعضاً) الخ سے منسوخ ہے۔(نعیمی۔مظہری) یہی وجہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہ نے بارہا ادھار کے معاملات بغیر تحریر بھی کیے۔خود لکھنے کی بجائے کسی دوسرے

سے لکھوانا زیادہ بہتر ہے جیسا کہ اگلے جملہ سے معلوم ہوتا ہے۔

وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ :(اور چاہیے کہ تمہارے درمیان کوئی لکھنے والا ٹھیک ٹھیک لکھے) بالعدل یا یکتب کے متعلق ہے۔یا متصفا پوشیدہ کے اور کاتب کی صفت پہلی صورت میں اس کے معنی انصاف یا برابری یا وضاحت کے ہیں اور اگر کاتب کی صفت ہو تو بمعنی عدالت و پرہیزگاری۔یعنی تم معاملہ کرنے والوں کے درمیان کاتب (وثیقہ نویس) انصاف کیساتھ صاف صاف دستاویز لکھے یا پرہیزگار متقی کاتب دستاویز لکھے۔چوں کہ دستاویزات اور تمسکات ہر لکھا پڑھا آدمی نہیں لکھ سکتا اس کے لیے قانون دان ہونا بھی ضروری ہے۔اس لیے کاتب محرر سے لکھوانے کا خصوصیت سے ذکر فرمایا۔لہٰذا ہوسکتا ہے کہ کاتبٌ کی تنوین بھی تعظیمی ہو یعنی کوئی شاندار قانون دان کاتب دستاویز لکھے۔(نعیمی)

وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ :(اور لکھنے والا لکھنے سے انکار نہ کرے جیسا کہ اسے اللہ نے سکھایا تو اسے لکھ دینا چاہیے)

لَا يَأْبَ ابَاءٌ سے بنا بمعنی انکار کرنا۔مطلب یہ کہ کوئی لکھنے والا بلاوجہ لکھنے سے انکار نہ کرے۔ بلکہ جس طرح اللہ نے اس پر کرم فرمایا اور اس کو لکھنا سکھایا۔ویسے ہی اسے چاہیے کہ اپنے فن سے دوسروں کو فائدہ پہنچائے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے (**اَحْسِنْ كَمَا اَحْسَنَ اللّٰهُ عليك**) (جس طرح اللہ نے تمہارے ساتھ احسان کیا اسی طرح تم بھی لوگوں سے بھلائی کرو) (بیضاوی)

فَلْيَكْتُبْ نہی کے بعد تاکید کے لیے حکم دیا یعنی سیکھی ہوئی تحریر کے موافق لکھے۔یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ جملہ (**كما علّمهٗ**) کے متعلق ہو۔یعنی جیسا اللہ نے اسے سکھایا ہے گویا پہلے نہی انکار کے ذیل میں کتابت عام کا حکم تھا۔اور اب حکم کتابت کو مقید کر دیا کہ اس طرح لکھے جسطرح اللہ نے اسے سکھایا۔

کیا کاتب پر تحریر اور شاہد پر شہادت دینا واجب ہے؟ یہ مسئلہ اختلافی ہے۔مجاہد وجوب کے قائل نہیں۔بشرطیکہ کاتب سے لکھنے اور شاہد سے شہادت کا مطالبہ کیا جائے۔حسن بصری رحمۃ اللہ

علیہ بھی وجوب کے قائل ہیں۔ لیکن وجوب کفایہ کے یعنی اس کاتب پر تو یہ واجب ہے جو تحریر کے لیے مقرر ہو۔ ضحاک کا قول ہے کہ کاتب پر کتابت اور شاہد پر شہادت واجب تھی لیکن آیت (وَلَا يُضَارُّ كَاتِبٌ وَلَا شَهِيد) سے منسوخ ہو گئی (مظہری)

تنقیح: شہادت کے تفصیلی مسائل آئندہ آیات میں آ رہے ہیں۔

(فوائد و مسائل)

ا۔ بہتر یہ ہے کہ کاتب ہر دو معاملہ کرنے والوں کے سوا کوئی تیسرا شخص ہو جیسا کہ (كَاتِبٌ) سے معلوم ہوا۔

۲۔ بہتر یہ ہے کہ کاتب عاقدین کے درمیان بیٹھے تا کہ دونوں کی بات بخوبی سن سکے جیسا کہ (بينكم) سے معلوم ہوا بلکہ ایک کی غیر موجودگی میں دستاویز بالکل نہ لکھے (روح البیان)

۳۔ کاتب متقی پرہیز گار مسائل شرع جاننے والا ہونا چاہیے بلکہ فقیہ (قانون دان) ہو تو بہتر ہے۔ (کبیر)

۴۔ ضرورت ہے کہ دستاویز کی عبارت نہایت صاف اور واضح ہو جس میں آئندہ جھگڑا کا احتمال نہ ہو (احکام القرآن)

بعض لوگ صد کو چند اور چند کو صد بنا لیتے ہیں ایسا نہیں ہونا چاہیے بلکہ اگر سو لکھنا ہے تو حرف میں یوں لکھیں کہ سو روپیہ نصف جس کے پچاس روپے ہوتے ہیں جیسا کہ (بالعدل) کی پہلی تفسیر سے معلوم ہوا۔ (نعیمی)

۵۔ جمہور علماء کے نزدیک یہ تحریر مستحب ہے مگر عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ واجب ہے۔

۶۔ دین کی میعاد ایسی مقرر ہونی چاہیے جس میں جھگڑے کی گنجائش نہ رہے یوں لکھے فلاں ماہ فلاں تاریخ فلاں دن پر روپیہ ادا کروں گا۔ یوں نہ کہیں جب فصل کٹے گی تو دوں گا کیوں کہ فصل کٹنے میں بڑا فرق ہوتا ہے کبھی جلدی کٹتی ہے کبھی دیر میں۔

۷۔ بیع سلم جائز ہے اور بقول ابن عباس رضی اللہ عنہ قرآن سے ثابت ہے۔ بیع سلم یہ ہے کہ قیمت فی الحال دیدی جائے اور مال ادھار ہو اس کے درست ہونے کی سات شرطیں ہیں۔ (۱) مال کی جنس مقرر ہو مثلاً گندم، جو یا چنے وغیرہ (۲) مال کی قسم مقرر ہے مثلاً میکسی پاک یا ۵۹۱ وغیرہ

اگر کپڑا ہے تو لٹھا فلاں نمبر کورا یا دھلا ہو۔ یا فلیٹ ک، مرے وغیرہ (۳) مال کی صفت مقرر ہو عمدہ یا معمولی (۴) مال کی مقدار مقرر ہو مثلاً کہے کہ اس بھاؤ سے اتنے روپے کے کل اتنے خریدے ہیں (۵) وقت ادا مقرر ہو کہ فلاں مہینہ فلاں تاریخ۔ (۶) ادا کی جگہ مقرر ہو کہ فلاں جگہ مال دیا جائے گا قیمت فی الحال نقد دی جائے اور اور اس کی مقدار بھی معلوم ہو اس میں یہ بھی شرط ہے کہ وہ مال ایسا ہو جو وقت عقد سے وقت ادا تک بازار میں مل سکے۔

مسئلہ: بیع سلم میں خریدار کو (رب السلم) اور بیچنے والے کو (رب المال یا سلم الیہ) اور قیمت کو (راس المال) اور مال کو (سلم فیہ) کہتے ہیں۔ (کتب فقہیہ)

مسئلہ: بیع کی چار صورتیں ہیں نقد کی نقد سے نقد کی ادھار سے، ادھار کی نقد سے اور ادھار کی ادھار سے اول تین جائز ہیں اور چوتھی ناجائز کہ مال بھی ادھار ہو اور قیمت بھی ادھار یعنی سٹہ اسی لیے آیت میں بدین } فرمادیا تا کہ معلوم ہو جائے کہ یک طرفہ دین جائز ہے دو طرفہ ناجائز۔

مسئلہ: کاتب لکھائی کی اجرت لے سکتا ہے لیکن مسئلہ بتانے کی اجرت لینا حرام ہے کیوں کہ لکھنا یا مستحب ہے یا فرض کفایہ (احکام القرآن، الجصاص للرازی) مگر مسئلہ بتانا فرض عین ہے۔ (نعیمی)

مسئلہ: فرض عین اور حرام پر اجرت لینا حرام ہے۔ باقی کاموں پر جائز۔

مسئلہ: جہاں اجرت لینا حرام ہو وہاں دینا بھی حرام۔داڑھی مونڈنے ،حرام تماشہ دکھانے، شراب پلانے وغیرہ کی اجرت لینا بھی حرام اور دینا بھی۔

فائدہ:

رب تعالیٰ نے جو فوائد و منافع حرام طریقوں سے حاصل کرنا حرام کیے ان کے حصول کے لیے حلال ذریعہ بھی مقرر فرمادیئے۔(کبیر) زنا حرام مگر بیوی سے جماع حلال،سود حرام اور بیع سلم حلال،شراب حرام شہد حلال جس میں شراب سے بڑھ کر طاقت ہے اور نشہ بالکل نہیں۔(تفسیر نعیمی)

فائدہ:

دستاویز کی تحریر اور معاملات کے مسائل سیکھنا فرض کفایہ ہیں ۔(احکام القرآن) جن کو یہ کام پڑتے رہتے ہیں۔انہیں ان مسائل کا سیکھنا فرض عین ہے۔باقی مسلمانوں میں سے اگر ایک بھی سیکھ لے تو سب کا فرض ادا ہو جاوے گا۔

(تنبیہ) دستاویز نویس کو وثیقہ نویسی کے شرعی احکام سیکھنا چاہیے اور معاملات و مقدمات والوں کو ان احکام شرعیہ سے ضرور واقف ہونا چاہیے۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

وَلۡيُمۡلِلِ الَّذِىۡ عَلَيۡهِ الۡحَـقُّ وَلۡيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبۡخَسۡ مِنۡهُ شَيۡـئًا ‌ؕ فَاِنۡ كَانَ الَّذِىۡ عَلَيۡهِ الۡحَـقُّ سَفِيۡهًا اَوۡ ضَعِيۡفًا اَوۡ لَا يَسۡتَطِيۡعُ اَنۡ يُّمِلَّ هُوَ فَلۡيُمۡلِلۡ وَلِيُّهٗ بِالۡعَدۡلِ

"اور جس پر حق آتا ہے۔ وہ لکھوائے اور اللہ سے ڈرے جو اس کا رب ہے۔ اور حق میں سے کچھ کم نہ کرے۔ پھر جس پر حق آتا ہے۔ اگر بے عقل یا ناتواں ہو یہ کہ لکھ نہ سکے تو ولی اس کا انصاف کے ساتھ لکھائے۔"

تفسیر:

رب تعالیٰ نے قرض کے معاملات میں چند احتیاطوں کا حکم فرمایا ایک کا ذکر پہلے ہو چکا یعنی لکھوانا دو احتیاطوں کا اب ذکر ہے۔ مضمون مقروض کی طرف سے ہو جو کہ اس جملہ میں ہے۔ اور تحریر پر گواہ بنالینا تا کہ کسی قسم کے جھگڑے کا احتمال نہ رہے آئندہ جملہ میں ذکر ہے۔

وَلۡيُمۡلِلِ الَّذِىۡ عَلَيۡهِ الۡحَـقُّ : (اور جس پر حق آتا ہے وہ لکھواتا جائے) املال اور املاء ہم معنی ہیں یعنی لکھوانا (مظہری) مطلب یہ کہ مدیون لکھوائے۔ کہ میں فلاں مال فلاں سے اتنی مقدار میں قرض لے رہا ہوں۔ کیوں کہ اس کا اقرار حجت الزامی ہے۔ خیال رہے! کہ مقروض کا مضمون ہونا ضروری ہے۔ نہ کہ عین عبارت لہٰذا مقروض اگر کسی اور زبان میں بات کرے یا کوئی بے ڈھنگی سی عبارت بولے تو کاتب کے لیے جائز ہوگا کہ اس کی اصلاح کر کے تحریر کرے بشرطیکہ اس کا مقصود نہ بدلے۔ (ملخصاً تفسیرات احمدیہ)

وَلۡيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ : (اور اللہ سے ڈرے جو اس کا رب ہے) یعنی لکھوانے والا یا کاتب مضمون لکھواتے یا لکھتے وقت رب کا خوف دل میں رکھیں لفظی ہیر پھیر سے اپنے مسلمان بھائی کو دھوکہ

دینے کی کوشش نہ کرے۔ نکاح، بیع، اجارہ، قرض، بیع سلم ان سب کا یہی حکم ہے۔

وَلَا يَبۡخَسۡ مِنۡهُ شَيۡئًا : (اور حق میں سے کچھ کم نہ کرے) یعنی واجبی حق سے نہ کاتب کم لکھے اور نہ لکھوانے والا کم لکھوائے۔

فَإِن كَانَ الَّذِي عَلَيۡهِ الۡحَقُّ سَفِيهًا أَوۡ ضَعِيفًا : (پھر جس پر حق آتا ہے اگر بے عقل یا ناتواں ہو)

سفیہ: سفة یا سفاهة سے مشتق ہے بمعنی بے وقوف، احمق، بے عقل اس میں دیوانے، پاگل، جنونی، خبطی، مخبوط الحواس سبھی شامل ہیں (کبیر معانی، نعیمی، مظہری وغیرہ) ضعیف ضعف سے بنا ہے بمعنی کمزوری۔ یہاں کمزوری سے مراد ہے جو عمر کے لحاظ سے ہو یعنی لڑکپن یا بڑھاپا بعض نے کہا کہ ضعیف سے مراد ضعیف العقل ہے۔

أَوۡ لَا يَسۡتَطِيعُ أَن يُمِلَّ هُوَ : (یا یہ نہ لکھوا سکے) یعنی خود نہ لکھوا سکتا ہو خواہ گونگے ہونے کے سبب سے یا صحیح طور پر مطلب کو ادا نہ کر سکنے کی وجہ سے یا زبان نہ جاننے کی وجہ سے یا قید یا بیماری یا غیر حاضری کی وجہ سے کہ کاتب اس کے پاس نہ پہنچ سکتا ہو یا پردہ نشین عورت ہو کہ کاتب اندرون پردہ نہ جا سکتا ہو۔

فَلۡيُمۡلِلۡ وَلِيُّهُۥ بِالۡعَدۡلِ : (تو ولی اس کا انصاف کے ساتھ لکھوائے) یعنی بچہ، دیوانہ، ضعیف العقل کا سرپرست یا وکیل یا ترجمان انصاف کیساتھ یعنی بغیر کسی کمی بیشی کے لکھوائے۔ دوسروں کے مقابلہ میں مدیون کا ولی ہی حق سے زیادہ واقف ہوتا ہے اور اسی کو لکھوانے کا سب سے زیادہ استحقاق ہوتا ہے۔

(فائدہ)

۱۔ سفیہ یعنی مخبوط الحواس کو تصرف (کاروبار) سے مجبور روک نہیں سکتے۔ (امام ابوحنیفہ) دیکھو شریعت میں سفیہ کو قرض لینے کی اجازت دی قرض لینا بھی تصرف ہے۔ (احکام القرآن) مگر صاحبین فرماتے ہیں اس کو تصرف سے مجبور کیا جائے گا۔ اور اسی پر فتویٰ ہے (درمختار) کیوں کہ اس آیت میں سفیہ کے لیے ولی کی قید لگادی۔ اس سے معلوم ہوا کے اس کہ تصرف میں بچہ کی طرح ولی کی ضرورت ہے۔

۲۔ بچہ دیوانہ اور دیگر مجبور لوگوں کا ولی ان پر قرض کا اقرار کرسکتا ہے۔ اسی لیے ولی کو اشٹام لکھانے کی اجازت دی گئی کیوں کہ اشٹام بھی گویا اقرار نامہ ہی ہے۔ اور جب ولی کا املاء بولنا معتبر تو اس کا اقرار بھی معتبر۔

مسئلہ: نابالغ اور مجنون کی بیع وشراء و اقرار تو شرعاً نا قابل اعتبار ہے بلکہ ایسے لوگوں کے معاملات کے صحیح و نافذ ہونے کے لیے ولی شرعی کی اجازت درکار ہے۔ اور ایسا ولی جس کا تصرف ان کے مال میں نافذ ہو سکے صرف باپ دادا یا ان کا وصی یا قاضی یعنی حاکم شرعی ہیں۔

مسئلہ: بوڑھا آدمی اگر ضعیف البدن ہو جائے اگر وہ اپنی طرف سے مختار کردے اس کو وکیل کہتے ہیں۔ گونگے یا دوسری زبان بولنے والے کے لیے مفہم یا مترجم کی ضرورت ہے۔ وہ ہر معتبر آدمی ہوسکتا ہے۔

مسئلہ: قرآن کریم میں اس مقام پر لفظ ولی کے مفہوم عام میں مختار، وکیل، مترجم اور مفہم سب کو شامل ہے۔

دستاویز کی تحریر کے ساتھ گواہ مقرر کرنے کا شرعی حکم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَاسۡتَشۡهِدُوۡا شَهِيۡدَيۡنِ مِنۡ رِّجَالِكُمۡ فَاِنۡ لَّمۡ يَكُوۡنَا رَجُلَيۡنِ فَرَجُلٌ وَّامۡرَاَتٰنِ مِمَّنۡ تَرۡضَوۡنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنۡ تَضِلَّ اِحۡدٰٮهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحۡدٰٮهُمَا الۡاُخۡرٰى

''اور دو گواہ کرلو اپنے مردوں سے پس اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ایسے گواہ جن کو پسند کرو۔ کہ کہیں ان میں سے ایک عورت بھولے تو اس کو دوسری یاد دلائے۔''

دستاویز کی تحریر میں تین شخص ضروری ہیں۔ کاتب، مقر یعنی لکھوانے والا، گواہ و شاہد آیت کریمہ میں پہلے کاتب پھر مقر کا ذکر گزرا اب گواہوں کا تذکرہ ہے۔ (نعیمی)

وَاسۡتَشۡهِدُوۡا: باب استفعال بمعنی طلب سے ہے۔ استشهاد شاہد یا طلب شہادت کردن۔ یہاں پہلے معنی مراد ہیں۔ یعنی گواہ تلاش کرو۔ صاحب روح المعانی نے فرمایا کہ یہ باب افعال ہے س اور تاء زائدہ ہیں۔ اور صیغہ مبالغہ اختیار کرنے میں اشارہ اس طرف ہے کہ ایسے گواہ ڈھونڈو جو بار بار عدالت میں جاتے ہوں گواہی حکام قبول کرتے ہوں یعنی عادل متقی گواہ۔ شہید شھود سے بنا بمعنی حاضری چوں کہ گواہ اکثر موقع واردات پر موجود ہوتا ہے۔ اسلیے اسے شہید کہا جاتا ہے۔ چونکہ تحریر میں بھی مقروض کے پھر جانے کا اندیشہ ہے۔ کہ اپنی تحریر کا ہی انکار کردے اسلیے اس پر دو گواہ بنالو خواہ زبانی ہوں خواہ ان کے نام بھی تحریر میں لکھ دیئے جائیں۔

مِنۡ رِّجَالِكُمۡ : (اپنے مردوں سے) رجال جمع رجل کی ہے۔ بمعنی عاقل بالغ مرد۔ اس سے عورتیں بچے دیوانے خنثی وغیرہ سب نکل گئے۔ کُمۡ ضمیر جمع مذکر حاضر میں مسلمانوں سے خطاب ہے۔ اس اضافت سے کفار، غلام، فاسق و فاجر نکل گئے۔ یعنی اپنے مسلمان متقی عاقل بالغ مردوں

میں سے دو گواہ بنالو۔ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ (پس اگر دو مرد نہ ہوں) یعنی دو مردوں کو گواہ بنانا میسر نہ آسکے۔

فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ : (تو ایک مرد اور دو عورتیں) دو مردوں کے میسر نہ آنے کی صورت میں ایک مرد اور دو عورتوں کو گواہ بنانے کی صراحت ہے۔ اصل میں تو یہی ہے کہ کہ عورتوں کی گواہی نہ لی جا ئے۔ لیکن ایک مرد کا بدل دو عورتوں کو مان لیا گیا ہے۔

اسی شبہ بدلیت کی بنا پر حدود قصاص میں جن کا سقوط ادنی اشتباہ سے ہو جاتا ہے۔ عورتوں کی شہادت اجماعاً غیر معتبر ہے۔ بروایت ابن ابی شیبہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے بعد دونوں خلفاء کا یہی طریقہ رہا ہے کہ حدود قصاص میں عورتوں کی شہادت جائز نہیں۔

مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ : (ایسے گواہ جن ک و پسند کرو) یعنی ان لوگوں میں سے گواہ چنو جن کی راست بازی، دیانت داری اور پرہیز گاری سے تم راضی ہو۔ یہ خطاب عام مومنین (قرض خواہ و مقروض) دونوں کو ہے یا حکام وقت کو (روح المعانی)

اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰهُمَا : (کہ کہیں ان میں ایک عورت بھولے) یہ جملہ دو عورتوں کو ایک مرد کا بدل قرار دینے کی حکمت بیان کر رہا ہے۔ تَضِلَّ ضلالٌ سے بنا بمعنی بھول جانا۔ بہک جانا۔ (وضل عنهم ما كانوا يفترون) ای ذهب منهم ابوعمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ضلال کے لغوی معنی غائب ہونا بھی ہیں۔ (کبیر) گمراہ کو ضال اس لیے کہتے ہیں کہ وہ صحیح عقیدہ بھول جاتا ہے۔

یہاں تضل کا مفہوم پوشیدہ ہے۔ کیوں کہ بھولنے میں بہت سے احتمال ہیں۔ اصل واقعہ ہی بھول جائے۔ یا قرض کی مقدار بھول جائے۔ یا اس کی مدت یا شرائط وغیرہ بھول جائے۔ غرضیکہ کچھ بھی بھول جائے۔

فَتُذَكِّرَ اِحْدٰهُمَا الْاُخْرٰى : (تو اس ایک کو دوسری یاد دلا دے) تذکر تذکیر سے بنا بمعنی یاد

دلانا۔ یہاں تذکر تضل کے مقابل میں آیا تو معلوم ہوا کہ تضل کے معنی بھولنا مراد ہیں نہ کہ دوسرے۔ یعنی ایک مرد کے قائم مقائم دوعورتیں اس لیے رکھی گئی ہیں کہ عورتوں کے مزاج میں رطوبت زیادہ ہے جس سے ان پر بھول چوک غالب ہے۔(روح المعانی) اگران میں سے ایک بھول جائے تو دوسری یاددلادے۔اس سے اشارۃً یہ بھی معلوم ہوا کہ دونوں عورتیں بیک وقت قاضی کے سامنے گواہی دینے کے لیے کھڑی ہوں۔نہ کہ علیحدہ علیحدہ مردوں کی طرح چوں کہ گواہی بڑی اہم چیز ہے۔جس پر سارے مقدمے اور حاکم کے فیصلے اور عدل وانصاف کا دارومدار ہے اس لیے دوران مقدمہ مدعی اور مدعیٰ علیہ کے وکلاء کا سارازور گواہیوں پر ہوتا ہے۔اس لیے رب تعالیٰ نے شہادت کے متعلق بہت سی تاکیدیں فرمائیں۔افسوس! کہ فی زمانہ لوگ گواہیوں کو بالکل کھیل سمجھ رہے ہیں۔رشوت لے کر جھوٹی گواہی دینا عام ہے حالاں کہ حدیث شریف میں جھوٹی گواہی کو گناہ کبیرہ شمار فرمایا گیا ہے۔

(فوائد ومسائل)

۱۔ مسلمان کے معاملات میں کافر کی گواہی معتبر نہیں جیسا کہ (من رجالکم) سے معلوم ہوا کہ کم میں خطاب مسلمانوں سے ہے۔(احمدی)

۲۔ مالی معاملات میں صرف عورتوں کی گواہی معتبر نہیں۔یا تو دومرد ہوں یا ایک مرد اور دو عورتیں، اگر ایک مرد نہ ہو تو عورتیں خواہ کتنی ہی ہو کیوں نہ ہو جائیں تب بھی معتبر نہیں۔

۳۔ فاسق وفاجر کی گواہی مقبول نہیں۔جیسا کہ (ممن ترضون) سے معلوم ہوا۔کیونکہ رضا سے دینی رضامندی مراد ہے۔یہ حکم قبول گواہی کا ہے۔مگر فاسق کا گواہ بنانا معتبر ہے۔لہٰذا جو عقود گواہی پر موقوف ہیں۔دوفاسق کی گواہی سے منعقد ہو جائیں گے۔

مثلاً فاسق کی موجودگی میں جو نکاح کیا جائے وہ درست ہے۔کہ ان کی گواہی سے نکاح ہو جائے گا۔ہاں اگر آگے جاکر زوجین میں اختلاف پیدا ہو جائے تو فاسق کی گواہی سے حاکم کے

نزدیک نکاح ثابت نہ ہوگا۔ نکاح کا انعقاد کچھ اور ہے۔ اور ثبوت کچھ اور (الحاصل تحمل شہادت اور ادائے شہادت میں فرق ہے)

۴۔ بچوں کی گواہی معتبر نہیں جیسا کہ رجال سے معلوم ہوا۔

۵۔ گواہی میں لفظ شہادت بولنا چاہیے جیسا کہ (فاستشهدوا) سے معلوم ہوا۔ (احمدی)

۶۔ معاملات قرض کی گواہی میں ضروری ہے کہ گواہ موقعہ واردات پر موجود ہو۔ جیسا کہ (شهيدين) سے معلوم ہوا۔

۷۔ مرد عورت سے افضل ہے۔ اسی لیے محض مردوں کی گواہی معتبر اور بعض معاملات میں محض عورتوں کی گواہی غیر معتبر بلکہ حدود قصاص میں مردوں کی گواہی کا اعتبار ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ عورتوں کی عقل بھی ناقص اور دین بھی۔ عقل تو اسلیے کہ ان دو کی گواہی ایک مرد کی گواہی کے قائم مقام ہے۔ ان میں بھول چوک غالب ہے۔ اور دین اس لیے کہ یہ نماز ہمیشہ نہیں پڑھ سکتیں حیض ونفاس میں اس سے محروم ہیں۔ (نعیمی)

ذیل میں ہم شاہد اور شہادت کے موضوع پر ایک مختصر سا مقالہ خصوصی درج کرتے ہیں۔

قضا: لوگوں کے جھگڑوں اور منازعات کے فیصلہ کرنے کو قضاء کہتے ہیں۔ (درمختار)

منصب قضاء:

نظام مصطفےٰ ﷺ میں منصب قضاء نہایت اہم اور نازک ترین عہدہ ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر نہ لوگوں کے حقوق کی محافظت ہوسکتی ہے اور نہ امن عامہ قائم رہ سکتا ہے۔

ضرورت شاہد:

قاضی اسلام کے فیصلہ کا دارمدار مدعی کے گواہوں کی شہادت پر ہوتا ہے۔ لہٰذا گواہوں کے بارے میں قاضی کا ادنیٰ سا تساہل بھی بہت بڑی خرابیوں کا پیش خیمہ بن سکتا ہے۔

شهادة: اخبار صدقٍ لاثبات حقٍ بلفظ الشهادة فی مجلس القضاء (فتح القدیری

بحوالہ عالمگیری صفحہ۲۰۲/۳) (حق کو ثابت کرنے کے لیے مجلس قاضی میں لفظ شہادت کیساتھ سچی خبر دینے کو شہادت یا گواہی کہتے ہیں)۔

شاہد کے لیے دو قسم کی شرائط سے متصف ہونا ضروری۔(۱) شرائط تحمل (معاملہ کے لیے گواہ بننا) (۲) شرائط اداء: تحمل کی تین شرطیں ہیں۔ (۱) عاقل ہونا (۲) انکھیارا ہونا (۳) جس چیز کا گواہ بنے اس کا مشاہدہ کرنا۔لہٰذا مجنوں یا لایعقل اور اندھے میں گواہ بننے کی صلاحیت نہیں۔ہاں تحمل کے لیے بلوغ، حریت، اسلام، عدالت وغیرہ شرط نہیں۔چناں چہ عالمگیری میں ہے کہ کوئی شخص وقت تحمل بچہ یا غلام یا کافر یا فاسق تھا مگر بوقت ادائے شہادت بچہ بالغ ہو چکا ہے۔غلام آزاد ہو چکا ہے۔کافر مسلمان اور فاسق تائب ہو چکا ہے تو گواہی مقبول ہوگی (۳/۲۰۲ نمبر۱) (کذا فی البحر الرائق)۔

شرائط ادا:

(قبول گواہی کی شرائط) (۱) گواہ کا آزاد ہونا۔(۲) مسلمان ہونا (۳) بالغ ہونا (۴) متقی ہونا (۵) واقعہ سے واقف ہونا (۶) اس کی گواہی میں گواہ کا اپنا نفع نہ ہونا اور اس سے دفع ضرر نہ ہونا (۷) محدود فی القذف نہ ہونا یعنی اسے قبل ازیں تہمت کی حد نہ لگائی ہو۔(۸) انکھیارا ہونا (۹) ناطق ہونا (۱۰) گواہ کا فریق مقدمہ نہ ہونا (۱۱) شہادت کا دعوی کے موافق ہونا (۱۲) شاہد مشہود لہ کا بیٹا یا غلام نہ ہونا (۱۳) گواہ کا مشہود علیہ کا دشمن نہ ہونا (۱۴) حدود قصاص میں گواہ کا مرد ہونا (۱۵) حقوق العباد میں جس کی گواہی دیتا ہے اس کا پہلے سے دعوی ہونا۔(کتب فقیہہ متداولہ عالمگیری درمختار وغیرہ نمبر۱) جسکے خلاف گواہی دے رہا ہے وہ مسلمان ہو تو گواہ کا بھی مسلمان ہونا ضروری ہے۔ورنہ کفار کی گواہی ایک دوسرے کے خلاف جائز ہے۔

رکن شہادت:

بوقت ادائے شہادت گواہ یہ لفظ کہے کہ میں گواہی دیتا ہوں۔اس لفظ کا مطلب یہ ہے کہ میں خدا

قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں اس بات پر مطلع ہوا اور اب اس کی خبر دیتا ہوں۔ اگر گواہی میں یہ لفظ کہے کہ میرے علم میں ہے یا گمان تو گواہی مقبول نہ ہوگی (درمختار۔ فتح القدیر وغیرہ)

حکم شہادت:

گواہوں میں جب تمام شرائط پائے گئے تو قاضی کے لیے ان کے موافق حکم کرنا واجب ہے۔ اور ان کے موافق فیصلہ نہ کیا تو گناہ گار ہوگا بلکہ مستحق عزل وتعزیر ہے۔ (درمختار)

نصاب شہادت:

گواہی کی تین قسمیں ہیں۔

۱۔ جہاں صرف مرد گواہ بن سکتے ہیں جیسے حدود وقصاص۔ ان میں سے زنا کے لیے چار مرد اور اور بقیہ امور کے لیے دو مردوں کا ہونا ضروری ہے۔ قرآن حکیم میں ہے **(واللاتی یاتین الفاحشه من نسائکم فاستشهدوا علیهن اربعة منکم وقوله تعالیٰ ثم لم یا تو باربعة شهداء، ولفظ اربعة نص فی العدد المذکورة کذافی البنائیه)** (بحر الرائق صفحہ ۷/۶۰) زنا کے علاوہ دیگر حدود وقصاص کے بارے میں قرآن مجید میں ہے۔ **(واشهدوا ذوی عدل منکم).**

۲۔ وہ امور جہاں صرف عورتوں کی گواہی معتبر ہے جیسے عورتوں کے وہ راز جن پر مرد اطلاع نہ پا سکے مثلاً ولادت یا عورت کا باکرہ یا ثیبہ ہونا۔ طلاق کی عدت کا پورا ہونا۔ ایسے امور میں فقط ایک آزاد مسلمان عورت کی گواہی کافی ہے۔ دو ہوں تو بہتر (درمختار)

۳۔ علاوہ ازیں معاملات چاہے وہ مالی ہوں یا غیر مالی مثلاً نکاح، طلاق وغیرہ تو ایسے امور میں ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی معتبر ہے۔ جس کا اس آیت کریمہ میں ذکر ہے۔

مسئلہ: دنیاوی خبر کافر کی بھی معتبر ہے۔ لہٰذا سلطان کی طرف سے منادی کرنے والا۔ وکیل،

مضارب کافر بھی ہوسکتا ہے دینی خبر ایک متقی مسلمان کی بھی معتبر اور گواہوں میں کم از کم دو مسلمان چاہیے۔(عالمگیری کتاب الکراہتہ)

مسئلہ: کافر کی خبر معاملات کے ضمن میں دیانات میں قبول ہوجائے گی۔مثلاً کافر نے خبر دی کہ یہ گوشت مسلمان کا ذبیحہ ہے کھالو نامقبول کیوں کہ حلال وحرام ہونا دینی خبر ہے ۔لیکن کسی مسلمان کا کافر نوکر ہمارے پاس گوشت لایا اور کہا کہ یہ میرے آقا نے بھیجا ہے۔تو مقبول کیوں کہ وہ بھیجنے کی خبر دے رہا ہے جو کہ دنیوی خبر ہے۔جب یہ بات منظور ہوگئی تو اس کے ضمن میں گوشت کی حلت بھی آگئی (عالمگیری، جامع الصغیر للامام محمد رحمتہ اللہ علیہ)

مسئلہ: بعض اوقات محض شہرت یا علامت کی بناء پر گواہی دی جاسکتی ہے۔اگرچہ اس نے خود مشاہدہ نہیں کیا ہو جبکہ ایسے لوگوں سے سنا ہو جن پر اعتماد ہو۔مثلاً نکاح ،طلاق، نسبت، قاضی، تبرکات، موت وغیرہ۔ایک شخص کو دیکھا کہ وہ ایک عورت کے پاس جاتا ہے اور معتبر لوگوں سے سنا کہ یہ اس کی بیوی ہے۔یہ نکاح کی گواہی دے سکتا ہے یا لوگوں سے سنا کہ یہ فلاں کا بیٹا ہے۔(علی ہذا القاس دیگر اشیاء)۔مگر ان تمام صورتوں میں گواہ کو چاہیے کہ یہ ظاہر نہ کرے کہ میں نے سنا ہے۔اگر سننا بیان کردے گا تو گواہی رد ہوجائے گی۔(ہدایہ عالمگیری)

مسئلہ: اولاد کی گواہی ماں باپ کے حق میں قبول نہیں ان کے خلاف قبول ہے۔اور دشمن کی گواہی دشمن کے خلاف مردود اور موافق قبول۔

مسئلہ: ایک گواہ اور ایک قسم سے مدعی کے حق میں فیصلہ نہیں ہوسکتا۔اسی آیت مذکورہ میں ارشاد ہوا کہ اگر دو گواہ میسر نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتوں کو گواہ بنالو یہ نہ فرمایا گیا کہ ایک ہی گواہ رکھ لو اور ایک قسم کھالینا جس سے معلوم ہوا کہ دو مرد گواہ نہ ملنے کی صورت

میں صرف یہی حکم ہے کہ ایک مرد اور دو عورتیں گواہ مقرر کی جائیں نیز حدیث شریف میں ہے کہ (البیّنة علی المدعی والیمین علی من انکر) مدعی کے ذمہ گواہ ہیں اور منکر پر قسم اس سے معلوم ہوا کہ مدعی کی قسم اور مدعی علیہ کے گواہ معتبر نہیں۔ وہ جو حدیث میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے ایک گواہ اور ایک قسم سے مدعی کے حق میں فیصلہ کیا یہ خبر واحد۔ خبر متواتر اور قرآنی آیات کے مقابلے میں غیر معتبر ہے۔ نیز مودل ہے ومن شاء البسط فلیر اجع الی الطحاوی۔

مسئلہ: خنثیٰ مشکل کی گواہی معتبر نہیں کیوں کہ وہ نہ مرد ہے نہ عورت اسی لیے اس کی میت کو کوئی غسل نہیں دے سکتا تیمم کرایا جائے گا۔

مسئلہ: تمام امور میں عادل کی گواہی معتبر ہے۔ عادل وہ متقی مسلمان ہے۔ جو نہ گناہ کبیرہ کرتا ہے اور نہ صغیرہ پر جمتا ہے کیوں کہ صغیرہ ہمیشہ کرنے سے گناہ کبیرہ بن جاتا ہے۔ داڑھی منڈوانا، کبھی جھوٹ بول دینا گناہ صغیرہ ہے۔ مگر ہمیشگی سے کبیرہ۔

مسئلہ: غیر عادل (فاسق) اگر توبہ کرلے تو کچھ مدت گزرنے کے بعد اس کی گواہی قبول کی جائے گی۔ چناں چہ قرآن کریم میں (الا الذین تابوا من بعد ذالک اصلحوا) تابوا کے بعد اصلحوا فرمانا اس بات کی دلیل ہے کہ توبہ کے بعد آثار اصلاح کا ظہور ضروری ہے۔ چناں چہ اس کی تحدید سال یا چھ سال مقرر کی گئی ہے۔ اور زیادہ صحیح یہ ہے کہ یہ امر قاضی کی رائے پر مفوض ہے۔ جیسا کہ ہم نے حاشیہ میں مجلہ اور قاضی خان کے حوالے سے لکھ دیا ہے واللہ اعلم۔

چنانچہ صاحب الفتح القدیر نے فرمایا۔ (لو تاب الفاسق لا تقبل شهادته مالم تمض ستة اشهر وقال بعضهم سنةُ ولو كان عدلاً شهر بالزور ثم تاب شهد من غير تدةٍ) (صفحہ ۶/۱۱۳) (ترجمہ) (اگر فاسق توبہ کرلے تو چھ ماہ گزرنے سے قبل اس کی شہادت قبول نہیں ہوگی۔ بعض نے ایک سال کہا۔ اور اگر عادل ہے اور اس نے جھوٹی گواہی دی ہے۔ پھر توبہ

کرلی تو اس کی شہادت بغیر مدت مقرر کیے قبول کی جائے گی)۔وفی شرح المجلہ والصحیح ان ذالک مفوض الی القاضی شرح مجلہ ۱۰۴۱، ۱۷۰۵ اقاضی خان صفحہ ۳/۵۳۵، شرح علامہ قاضی خان میں ہے کہ صحیح یہ ہے کہ فاسق کی توبہ کی مدت کا تعین قاضی کی رائے پر چھوڑا جائے گا۔

فرع:

بعض داڑھی منڈے حافظ قرآن ماہ رمضان آنے پر چھوٹی چھوٹی داڑھی رکھ لیتے ہیں اور نماز تراویح پڑھاتے ہیں لیکن بعد میں پھر منڈا دیتے ہیں۔ایسے حافظ کی اقتداء میں نماز مکروہ تحریمی اور واجب الاعادہ ہے۔ ہاں اگر وہ داڑھی منڈانے سے سچے دل سے توبہ کرلیں اور ان کو توبہ پر قائم رہتے ہوئے سال چھ ماہ گزر جائیں تو جب ان کو مصلی پر کھڑا ہونے کی اجازت دی جائے۔

فرع ۲:

آجکل کے اس پرفتن دور میں جہاں پر صرف فسق وفجور کا غلبہ اور غیر اسلامی معاشرے کا دور دورہ ہے۔تو شرعی تقاضوں کے مطابق گواہ کا ملنا محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔لہٰذا لوگوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے بقول قاضی القضاہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا مشروط طور پر فاسق کی گواہی کو بھی قبول رکھا گیا ہے۔یعنی کم از کم فرائض کا پابند ہو ذی مروۃ ہو۔ چنانچہ ہدایہ شریف میں ہے(وعن ابی یوسف ان الفاسق اذا کان وجیھا فی الناس ذا مروۃ تقبل) (ھدایہ مع الفتح صفحہ ۶/۱۱) ایضا درالمختار صفحہ ۴/۵۱۶ وغیرہ)

(وجیھا فی الناس) کا مطلب یہ ہے کہ وہ آدمی معاشرے میں معزز اور باکردار انسان شمار ہوتا ہو۔ چناں چہ مظہری میں ہے (اب ہم اگر شہادت کے دائرے کو تنگ کردیں گے تو حقوق تباہ ہوجائیں گے اور فیصلہ کے تمام راستے بند ہوجائیں گے بلکہ ہمارے زمانہ میں تو فاسق کی شہادت بھی قبول ہونی چاہیے۔بشرطیکہ وہ دنیا میں باوجاہت اور آبرو والا ہو۔اور غالب گمان ہو کہ

وہ جھوٹی شہادت نہیں دے گا یا قرائن سے اس کا صدق معلوم ہو)

مسئلہ: فیصلہ کا مدار گواہی پر ہے نہ کہ محض دستاویز پر دستاویز تو صرف گواہوں کو واقعہ یاد دلانے کے لیے ہیں۔

مسئلہ: اگر گواہ کو دستاویز دیکھ کر بھی واقعہ یاد نہ ہو اس کی گواہی درست نہیں۔

مسئلہ: قرض کی گواہی واقعہ دیکھ کر جائز ہے۔ نہ کہ محض دستاویز کی تحریر سن کر ہاں اس صورت میں یہ گواہی دے سکتا ہے۔ کہ ہمیں فلاں شخص نے اپنا اقرار نامہ سنایا۔

مسئلہ: دستاویز میں گواہوں کے دستخط ضروری نہیں ہاں بہتر ہیں۔ تا کہ یاد رہے اور حاکم گواہوں کو کچہری میں حاضر کر سکے۔

گواہوں کو گواہی دینے کا حکم اور گواہی چھپانے سے ممانعت

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا وَلَا تَسْئَمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَ اَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَدْنٰٓى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ

”اور گواہ جب بلائے جائیں تو آنے سے انکار نہ کریں۔اور اسے بھاری نہ جانو کہ دین چھوٹا ہو یا بڑا اس کی میعاد تک لکھت لرلو۔یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک زیادہ انصاف کی بات ہے۔اور اس میں گواہی خوب ٹھیک رہے گی۔اور یہ اس سے زیادہ قریب ہے کہ تمہیں شبہ نہ پڑے۔مگر یہ سودا دست بدست ہو تو اس کے نہ لکھنے کا تم پر گناہ نہیں۔“

آیت کریمہ کے پچھلے جملہ میں گواہ بنانے کا حکم تھا اب گواہوں کو گواہی دینے کا حکم اور گواہی چھپانے سے ممانعت ہے۔

وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا : (اور گواہ جب بلائے جائیں تو آنے سے انکار نہ کریں)لَا یَاْبَ اباء سے بنا بمعنی باز رہنا یا انکار کرنا۔شہداء سے مراد یا تو وہ لوگ مراد ہیں۔جو گواہ بن چکے یا وہ جنہیں گواہ بنایا جاتا ہے۔چوں کہ ایسے لوگوں کو آئندہ گواہ بننا ہوتا ہے۔اسلیے مجازاً پہلے سے ہی ان کو شہداء فرمادیا(مظہری) دعوا سے بھی یا تو گواہ بننے کے لیے موقع کی طرف بلانا مراد ہے۔یا گواہ بن چکنے کے بعد گواہی دینے کے لیے عدالت میں بلانا مراد ہے۔یعنی جو گواہ بن چکے ہوں جب کبھی انہیں قاضی کی کچہری میں گواہی دینے کے لیے بلایا جائے تو وہ آنے سے انکار نہ کریں جب کبھی مسلمان بھائی موقع واردات پر کسی کو گواہ بنانے کے لیے بلائے تو اس کو بلا وجہ اس

سے باز نہ رہنا چاہیے اور ممکن ہے کہ بطرق عموم مشترک یہ دونوں معنی مراد ہوں یہ ہی عبداللہ ابن عباس اور حسن رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔

خیال رہے! کہ گواہی چند قسم کی ہے۔قصاص وحدود کی گواہی۔حقوق کی گواہی۔شرعی احکام کی گواہی حدود وقصاص کی گواہی میں گواہی دینے یا نہ دینے کا اختیار ہے۔ بلکہ زنا وغیرہ کی گواہی چھپانا مستحب ہے۔حضور علیہ السلام نے فرمایا

(من ستر مسلماً ستره الله فی الدنیا والآخرة)(مشکوۃ کتاب العلم)(جو کوئی مسلمان کی پردہ پوشی کرے رب تعالٰی اس کی دنیا اور آخرت میں پردہ پوشی کرے گا)۔مگر چوری میں مال لینے کی گواہی دے تا کہ مال والے کا حق نہ مارا جائے۔یہ نہ کہے کہ چوری سے لیا تا کہ ہاتھ کٹنے سے بچ جائے (ہدایہ) لہٰذا زنا کا چھپانا بہتر اور باقی گواہیاں دینا بہتر ہے۔

مسئلہ: اگر گواہی چھپانے سے کسی کا دینی یا دنیاوی حق مارا جاتا ہے۔تو چھپانا منع ہے۔طلاق کی گواہی ضروری ہے۔

مسئلہ: شرعی حقوق کی گواہی دعویٰ پر موقوف نہیں۔گواہ پر ضروری ہے کہ بغیر دعویٰ اور بغیر کسی کے بلائے گواہی دے جیسے رمضان،شوال کا چاند دیکھ لیا ہے خود حاکم کے سامنے پیش ہو کر گواہی دی ایسے ہی رضاعت یا کسی خاوند کو طلاق دیتے سن لیا فوراً گواہی دے ۔(ملخصاً درمختار، بحرالرائق)

مسئلہ: اگر کسی کے پاس گواہی ہو اور مدعی اس سے بے خبر ہو اور اس کا حق مارا جارہا ہے تو گواہ پر لازم ہے کہ بلا طلب جا کر گواہی دے (درمختار) لہٰذا (اذا ما دعوا) کی قید وہاں ہے جہاں حقوق انسانی کی گواہی ہو اور مدعی کے علم میں ہو۔یعنی (اذا ما دعوا) کی قید حقوق عباد کے لیے ہے۔

مسئلہ: اگر کسی معاملہ کے بہت سے گواہ ہوں۔تو گواہی دینا فرض کفایہ ہے۔اور دو ہی ہوں ان پر فرض عین ہے (بحر الرائق)۔

مسئلہ: اگر گواہ ایسی جگہ ہو کہ وہ کچہری سے قریب ہو۔ یعنی قاضی کے ہاں جا کر گواہی دے کر شام تک اپنے گھر واپس آسکتا ہے تو اس کے لیے ادائے شہادت واجب ہے۔ اگر فاصلہ زیادہ ہو کہ شام تک واپس نہ آسکتا ہو تو گواہی نہ دینے میں گناہ نہیں۔ (بحر الرائق)

مسئلہ: گواہ اگر بوڑھا ہے۔ کہ پیدل کچہری تک نہیں جاسکتا اور خود اس کے پاس سواری نہیں کرایہ وغیرہ دینے کے لیے پیسے نہیں تو اس صورت میں اگر مدعی نے اس کے سفر کے اخراجات اسے ادا کیے تو شہادت مقبول ہے۔ ورنہ نامقبول (مظہری)

مسئلہ: مدعی نے گواہوں کو کھانا کھلایا۔ اگر اس کی یہ صورت ہے کہ کھانا تیار تھا اور گواہ اس موقع پر پہنچ گئے اور ان کو بھی کھلا دیا تو گواہی مقبول اور اگر خاص گواہوں کے لیے تیار ہوا تو گواہی مقبول نہیں مگر امام ابو یوسف رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس صورت میں بھی مقبول ہے۔ (بحر الرائق)

امام ابن ہمام نے فرمایا کہ یہی زیادہ مناسب ہے کہ کیوں کہ عرفاً ایسا ہی ہوتا ہے کہ اگر کوئی معزز آدمی کسی کے گھر جاتا ہے تو صاحب خانہ اس کو کھانا کھلاتا ہی ہے جانے والا گواہ ہو یا نہ ہو۔ (مظہری)

یہ فتویٰ اس صورت میں ہے کہ کھانے کی پہلے سے شرط نہ کر لی گئی ہو تو یہ معاوضہ اور رشوت ہو جائیگی جو کہ حرام ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر گواہ متعین ہو کوئی دوسرا نہ ہو تو اجرت لینا ناجائز ہے لانہ فرض تعین فلمّ یجز ان یاخذ علیه اجرة کسائر الفرائض الخ (المجموع شرح مھذب ج ۲ ، صفحه ۲۲۶) اور شہادت کے لیے اگر یہی متعین نہ ہو بلکہ دوسرے بھی گواہ ہوں تو اجرت لینا جائز ہے اگر چہ نہیں کیوں کہ اس صورت میں گواہی دینا فرض نہیں۔

وَلَا تَسْئَمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ : (اور لکھنے سے ملال نہ کرو (معاملہ) چھوٹا ہو یا بڑا اس کی مدت تک تَسْئَمُوْا سامۃ سے بنا بمعنی ملال، دل و تنگی، اکتانا، سستی وغیرہ کے ہیں۔ صغیراً و کبیراً سے تھوڑا یا زیادہ قرض یا صغیر سے مراد مجمل اور کبیر سے مراد مفصل طور پر لکھنا ہے۔ (روح المعانی) الیٰ بمعنی مع ہے یعنی معاملہ خواہ چھوٹا ہو یا بڑا میعاد کی تعیین کیساتھ اس کی دستاویز لکھ لینے میں تساہل نہ کرو۔ یا قرض کی تحریر میں کوتاہی نہ کرو تھوڑی بہت مجمل مفصل تحریر ضرور کر لو۔

ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ : (یہ اللہ کے نزدیک زیادہ انصاف کی بات ہے) اقسط۔ قسط سے بنا۔ اس کا معنی عدل بھی ہے اور ظلم بھی اور حصہ بھی۔ جب یہ مجرد کا باب ہوگا تو بمعنی ظلم ہوگا۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے (اما القاسطون فكانو جهنم حطبا) یعنی ظالم جہنم کا ایندھن ہیں۔ اور باب افعال میں آکر بمعنی انصاف کے ہوتا ہے۔ (ان الله يحب المقسطين) تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ بعض فرماتے ہیں کہ یہاں اقسط بمعنی ذی قسط ہے یعنی یہ تحریر اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت ہی انصاف کی بات ہے۔ کہ اس سے ایک کا حق دوسرے کا پاس نہ جائے گا۔

وَ اَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ: (اس میں گواہی خوب ٹھیک رہے گی) اقوم قیام کا اسم تفضیل ہے بمعنی درستی اور سیدھا۔ کھڑے ہونے کو بھی قیام اسی لیے کہتے ہیں کہ اس حالت میں سارے اعضاء سیدھے رہتے ہیں۔ یعنی اس تحریر سے شہادت قائم ہونے میں زیادہ سہولت رہے گی۔ گواہ غلطی سے بچیں گے اور قاضی اور مدعی کے علم میں رہیں گے۔

(وَاَدْنٰٓى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا) (اور یہ اس سے زیادہ قریب ہے کہ تمہیں شبہ میں نہ پڑے)

یعنی تحریر کر لینے کا تیسرا فائدہ یہ ہوگا۔ کہ فریقین قرض اس کی مقدار اور مدت وغیرہ کے بارے میں کسی قسم کا شک اور وہم نہ کریں گے بلکہ ہر ایک کا دوسرے کے بارے میں دل صاف رہے گا۔

(اِلَّا اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ) (مگر یہ سودا دست بدست گردان ہو جس کو باہم لیتے دیتے ہو) یہ جملہ حکم کتابت سے مستثنیٰ منقطع ہے۔ اِلَّا بمعنی لکن ہے (روح المعانی)۔ تجارۃً کے معنی نفع کمانے کے لیے رأس المال کو کاروبار میں لگانے ہیں (مفردات) حاضرۃً موجود یعنی نقد کی بیع خواہ مبادلہ عین کا عین سے ہو یا کسی چیز کو قیمت سے خرید اجائے۔ مگر دست بدست ہو نقد۔ مطلب یہ ہے کہ اگر دست بدست تجارت ہو جس کا لین دین فوراً کیا جاتا ہے۔ اس کو اگر نہ بھی لکھا جائے تو اس میں حرج نہیں جیسا کہ اگلے جملے میں ارشاد فرمایا۔ (فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا) تو اس نہ لکھنے میں تم پر کوئی گناہ نہیں اگر یہ روزمرہ کی خرید و فروخت میں بھی معاملہ بیع تحریر میں آجاتا بہتر ہے جیسا کہ آجکل اکثر دوکانداروں میں روزنامچے اور کیش میمو وغیرہ لکھنے کا طریقہ مروج ہے۔ لیکن ایسا کرنا ضروری نہیں۔ ایسے ہمسایہ دوکاندار شب و روز ایک دوسرے سے جو لین دین کرتے رہتے ہیں اس کو بھی اگر تحریر میں نہ لایا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔

کاتب اور گواہ کے ضرر کا بیان

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌ بِكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيْمٌ (سورۃ البقرۃ:۲۸۲)

''اور جب خرید و فروخت کرو تو گواہ بنالیا کرو اور نہ کسی لکھنے والے کو ضرر دیا جائے۔ اور نہ گواہ کو (یا نہ لکھنے والا ضرر دے اور نہ گواہ) اور اگر تم ایسا کرو تو یہ تمہارا فسق ہے۔ اور اللہ سے ڈرو اور اللہ تمہیں سکھاتا ہے۔ اور اللہ سب کچھ جانتا ہے۔''

تفسیر:

(اَشْهِدُوْا) اشہاد سے بنا بمعنی گواہ بنانا۔ اس میں خریدار اور تاجر دونوں کو حکم ہے۔ بعض نے (ظاہر لفظ کے لحاظ سے) امر کو وجوب کے لیے قرار دیا۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے فرمایا شروع میں وجوب تھا لیکن آیت (فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا) سے یہ وجوب منسوخ ہو گیا۔ لیکن جمہور کے نزدیک امر استحبابی ہے۔ (بہتر ہے کہ گواہ بنالیا کرو) کیوں کہ خود رسول اللہ ﷺ نے بکثرت خرید و فروخت کے وقت کسی کو گواہ نہیں بنایا۔ چناں چہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے عمارہ بن خزیمہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے بیان کیا کہ عمارہ رضی اللہ عنہ کے چچا جو صحابی تھے بیان کرتے تھے۔ کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک اعرابی سے ایک گھوڑا خریدا اور فوراً اس جگہ سے چل دیئے تاکہ گھوڑے کی قیمت ادا کریں۔ اتنے میں کچھ لوگ آئے اور گھوڑے کی قیمت میں کچھ اضافہ لگا دیا لیکن ان کو معلوم نہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ گھوڑا خرید چکے ہیں۔ قیمت میں اضافہ دیکھ کر

اعرابی بیع سے مکر گیا۔ اور گواہ مانگا۔ (لیکن سودے کے وقت موقع پر کوئی بھی موجود نہیں تھا جو کہ گواہ بنایا جاتا) اب جو بھی مسلمان آتا اعرابی کو جھڑکتا کہ خرابی ہو تیرے لیے کہ رسول اللہ ﷺ حق کے سوا اور کیا فرمائیں گے مگر گواہی کوئی نہیں دیتا تھا کہ کسی کے سامنے واقع نہ تھا) اتنے میں خزیمہ رضی اللہ عنہ تشریف لائے اور تمام گفتگو سن کر بولے۔ (اَنَا اَشْهَدُ اَنَّکَ قَدْ بَایَعْتَهٗ) میں گواہی دیتا ہوں کہ تو نے حضور اقدس ﷺ کے ہاتھ گھوڑا بیچا ہے)۔ تو رسول اللہ ﷺ نے خزیمہ رضی اللہ عنہ کی طرف رخ موڑا اور فرمایا تم کس بناء پر شہادت دے رہے ہو (خرید و فروخت کے وقت تم تو موجود نہ تھے) تو خزیمہ رضی اللہ عنہ نے عرض کی (بِتَصْدِیْقِکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ (فی الثانی) صَدَّقْتُکَ بِمَا جِئْتَ بِهٖ وَ عَلِمْتُ اَنَّکَ لاتقول اِلَّا حقًا (وفی الثالث) اَنَا اُصَدِّقُکَ عَلٰی خَبَرِ السَّمَاءِ والارضِ الا اُصَدِّقُکَ عَلَی الا عرابی) (یارسول اللہ میں نے آپ کی سچائی کا یقین رکھتے ہوئے (میں نے شہادت دی) (ثانی) میں حضور کے لائے ہوئے دین پر ایمان لایا۔ اور یقین جانا کہ حق ہی فرمائیں گے۔ (ثالث) میں آسمان زمین کی خبروں پر حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی تصدیق کرتا ہوں کیا اس اعرابی کے مقابلہ میں تصدیق نہ کروں؟ چنانچہ اس کے انعام میں حضور اقدس ﷺ نے ہمیشہ ان کی گواہی دو مردوں کی شہادت کے برابر فرمادی اور ارشاد فرمایا۔ (شَهِدَ لَه خزیمه او شَهِدَ علیه فَحَسْبُه) خزیمہ رضی اللہ عنہ جس کسی کے نفع خواہ ضرر کی گواہی دیں ایک انہی کی شہادت کافی ہے۔ علاوہ ازیں یہ حدیث مصنف ابن ابی شیبہ تاریخ بخاری، مسند ابی یعلیٰ، صحیح ابن خزیمہ، معجم کبیر طبرانی وغیرہ میں بمعناہ موجود ہے۔ (الامن والعلی)

شبہ:

ان دیکھے واقعہ کی شہادت دینا جائز نہیں۔ اور حضرت خزیمہ رضی اللہ عنہ نے محض تصدیق رسول اللہ ﷺ کی بناء پر بغیر دیکھے ہوئے شہادت کیوں دی؟ اور رسول اللہ ﷺ نے ان کی شہادت کو فیصلہ کن شہادت کیوں قرار دیا (دو آدمیوں کی شہادت کے برابر)؟

ازالہ شبہ:

چونکہ حضور اقدس ﷺ کو خرید و فروخت ہو چکنے کا پہلے ہی علم و یقین تھا۔ آپ جانتے تھے کہ اعرابی جھوٹا ہے جو فروخت کرنے کا انکار کر رہا ہے۔ محض خزیمہ رضی اللہ عنہ کی شہادت کی بناء پر آپ نے تکمیل عقد کا فیصلہ نہیں کیا تھا۔ رہی یہ بات کہ تنہا خزیمہ رضی اللہ عنہ کی گواہی کو آپ ﷺ نے دو آدمیوں کی گواہی کے برابر قرار دیا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ نے حضرت خزیمہؓ کی قوت ایمانی اور فہم و دانش کی پختگی ملاحظہ فرما کر بطور انعام اس اعزاز سے سرفراز فرمایا۔ قارئین حضرات! یہ ہے نبی کریم ﷺ کے ان بے شمار باذن اللہ اختیارات کی ایک ادنیٰ جھلک کہ سیدِ عالم ﷺ نے اپنے غلام کو قرآن عظیم کے حکم عام (وَاَشْهِدُوا ذَوِی عَدْلٍ مِنکم) سے مستثنیٰ فرمادیا۔

فوائد حدیث:

اس حدیث سے ایک یہ مسئلہ نکلتا ہے۔ کہ اگر حاکم کو کسی واقعہ کا یقینی علم ہو تو وہ اسے اپنے علم کے مطابق فیصلہ کرنے کا اختیار ہے۔ کیوں کہ دو آدمیوں کی شہادت سے گمان غالب حاصل ہوتا ہے۔ (یقین حاصل نہیں ہوتا) اور حاکم کا علم بجائے خود یقینی ہے اور یقین کا درجہ ظن سے اونچا ہوتا ہے۔

یہی وجہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ کے خلیفہ برحق سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہ کے خلاف اس حدیث کی بناء پر فیصلہ کیا جو خود (تنہا) آپ نے سنی تھی کہ (نحن معاشر الانبیاء لا نورث) (ہم انبیاء کے گروہ (اپنے بعد اپنے مال کا کسی کو) وارث نہیں بناتے) (مظہری)

نیز اسی بناء پر حضرت سیدنا عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ نے مروان بن حکم کو واپس مدینہ بلا لیا۔ کہ آپ حضور ﷺ سے اجازت لے چکے تھے۔ (تحفہ اثنا عشریہ) خیال رہے قاضی کا اپنے علم

سے فیصلہ کرنا مشروط بشرائط ہے۔ تفصیل کے لیے شامی کتاب القضاء کی طرف رجوع کریں)

اس حدیث سے یہ مسئلہ بھی نکلتا ہے۔ کہ اگر بادشاہ یا حاکم وقت وغیرہ کا کسی پر کوئی حق ہو۔ اور وہ انکاری ہو تو اس حاکم کے لیے جائز ہے اس سے اپنا حق جبراً وصول کرے۔ (خواہ حاکم کے پاس شہادت نہ ہو) لیکن اگر یہی مدعی حق حاکم کسی دوسرے حاکم کی عدالت میں اپنے حق کی چارہ جوئی کرے گا تو اس وقت شہادت کی ضرورت ہوگی۔ تنہا اس کا ذاتی یقین دعویٰ کو ثابت کرنے کے لیے کافی نہ ہوگا اور دوسرے حاکم کے لیے جائز نہ ہوگا کہ بادشاہ یا کسی مدعی حق حاکم کے ذاتی یقین کی بناء پر اس کے حق میں فیصلہ کر دے۔

وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ : (اور نہ کسی لکھنے والو کو ضرور دیا جائے اور نہ گواہ کو) (یا نہ لکھنے والا ضرور دے نہ گواہ) طاؤس، حسن اور قتادی نے اس آیت کا یہ مطلب بیان کیا کہ اگر کاتب اور گواہ معین ہوں (یعنی وہاں نہ کوئی دوسرا کاتب ہو نہ گواہ) تو کتابت یا شہادت سے انکار کر کے یہ دونوں خرید و فروخت کرنے والوں کو ضرر نہ پہنچائیں نہ کتابت و شہادت میں ردو بدل اور تحریف کر کے کسی فریق کو نقصان پہنچائیں اس صورت میں یُضَآر فعل معروف ہوگا۔ لیکن بعض حضرات نے اس کا یہ مطلب بھی بیان کیا ہے۔ کہ فریقین معاملہ کی طرف سے نہ کاتب کو دکھ دیا جائے۔ نہ گواہ کو مثلاً کاتب کی اجرت نہ دیں۔ گواہ کو شہادت کے لیے ایسی حالت میں طلب کریں کہ وہ اپنے کام میں مشغول ہو یا بیمار ہو یا کمزور ہو اور شہادت کا اس پر حصر بھی نہ ہو۔ بلکہ دوسرے گواہان واقعہ موجود ہوں اس صورت میں یضار فعل مجہول ہوگا۔

مسئلہ: دستاویز لکھنے پر اجرت لینا جائز بلکہ ضروری ہے کہ اجرت پہلے طے کر لی جائے۔

مسئلہ: کتابت پر اجرت بھی لے سکتے ہیں۔ اور ہدیہ بھی۔ ہاں گواہی پر اجرت لینا ناجائز اگر مدعی اپنی خوشی سے کچھ ہدیہ دے تو جائز ہے۔ مگر یہ خیال رہے کہ اس نیت سے گواہی نہ دی جائے۔ ایسے ہی عالم دین کو شرعی مسئلہ بتانے پر اجرت لینا حرام ہے کہ یہ اس پر فرض تھا۔ مسئلہ بتانا دینی تبلیغ ہے۔ مگر فتویٰ لکھنے پر خصوصاً جبکہ اس کا فتویٰ کچہری میں

پیش ہو عام کو گواہی وغیرہ دے لیے وہاں جانا پڑے اجرت لینا جائز ہے۔ یہ بھی (لا یضار) کاتب سے معلوم ہوا۔ یہ مسئلہ بتانے کی اجرت نہیں بلکہ لکھ کر دینے کی اجرت ہے۔

ضروری نوٹ:

بفضلہٖ تعالیٰ ہمارے دارالعلوم جامعہ حنیفہ اشرف المدارس کے دارالافتاء میں فتویٰ لکھ کر دیئے جانے پر بھی کوئی اجرت یا فیس وصول نہیں کی جاتی۔

مسئلہ: ایسے ہی قرآنی آیات سے دم کرنا آیت کا تعویز لکھ کر دینا ان دونوں کی اجرت لینا جائز ہے۔ کہ یہ آیت کا فروخت کرنا نہیں۔ بلکہ علاج کی اجرت ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہ نے سورہ فاتحہ پڑھ کر سانپ کاٹنے پر دم کیا اور تیس بکریاں اجرت لیں۔

مسئلہ: اگر گواہ اپنا کام چھوڑ کر تمام دن کچہری میں حاضر رہا تو یہ نقصان مدعی سے لے سکتا ہے کہ یہ گواہی کی اجرت نہیں بلکہ نقصان کی تلافی ہے۔ یہ تمام مسائل (ولا یضار کاتب) الخ سے معلوم ہوئے۔

وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ : (اور جو تم ایسا کرو تو یہ تمہارا فسق ہوگا) یعنی جس ضرر رسانی سے ہم نے تم کو منع کر دیا وہ فعل کرو گے تو وہ یہ اللہ کی نافرمانی ہوگی جس کا تم کو کوئی حق نہیں۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ : (اور اللہ سے ڈرو) یعنی اللہ کے حکم کی مخالفت سے ڈرتے رہو۔

وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ : (اور اللہ تمہیں سکھاتا ہے) یعنی اللہ تعالیٰ تم کو ایسی باتیں سکھاتا ہے۔ جن سے تمہارے دین و دنیا کی مصلحتیں وابستہ ہیں۔

وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ : (اور اللہ سب کچھ جانتا ہے)۔

لفظ اللہ کو تین جملوں میں تین بار ذکر کیا۔ کیونکہ ہر جملہ اپنا خاص مقصد رکھتا ہے۔ پہلے جملہ میں ترغیب و تقویٰ ہے دوسرے جملہ میں وعدہ انعام اور تیسرے جملہ میں اللہ کی عظمت شان کا اظہار ہے۔ (مظہری)

سفر اور حضر میں رہن رکھنے کا جواز

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِى اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗٓ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ٢٨٣

''اور اگر تم سفر میں ہو اور لکھنے والا نہ پاؤ تو گروی ہے۔ قبضہ میں دیا ہوا اگر تم میں ایک کو دوسرے پر اطمینان ہو تو وہ جسے اس نے امین سمجھا تھا اپنی امانت ادا کر دے۔ اور اللہ سے ڈرے جو رب اس کا ہے۔ اور گواہی نہ چھپاؤ اور جو گواہی چھپائے گا تو اس کا دل گناہ گار ہے۔ اور اللہ تمہارے کاموں کا جانتا ہے۔''

تفسیر:

(وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ) : (اور اگر تم سفر میں ہو اور لکھنے والا نہ پاؤ تو گروی ہے۔ قبضہ میں دیا ہوا (رہن بالقبض پر معاملہ کرو) رہن کا لغوی معنی ثابت، قائم رہنا، اور کسی چیز کو روک لینا (مفردات) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے (كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ) (ہر شخص اپنے اعمال سے وابستہ ہے)۔ اصطلاحِ شریعت میں رہن اسی چیز کو کہتے ہیں۔ جس کو کوئی شخص اپنے حق کے عوض (جائز طور پر) روک لے تا کہ اس سے اپنا حق وصول کر سکے۔ چوں کہ روک لینا لغوی معنی ہیں اور شرعی معنی میں لغوی معنی ملحوظ رہتے ہیں اس لیے عقدِ رہن ایک عقدِ لازم ہے۔ گرو کرنے والا جب تک گروی رکھنے والے کے ایک درہم کا بھی قرض دار رہے گا۔ اپنی چیز واپس لینے کا مستحق نہیں ہوتا۔

خیال رہے! کہ معاملہ رہن میں حالت سفر میں ہونا اور کاتب کا نہ ملنا یہ دونوں شرطیں اتفاقی ہیں نہ کہ احترازی۔ لہذا بالاجماع شہروں کے اندر قیام کی حالت میں جہاں کاتب بھی موجود ہو رہن رکھنا جائز ہے کیوں کہ شرط کی نفی سے حکم کی نفی لازم نہیں۔ لیکن چوں کہ ایسی ضرورت زیادہ تر سفر میں پیش آتی ہے اس لیے خاص طور پر اس کا ذکر کر دیا گیا۔

مسئلہ: رہن صرف ایجاب وقبول سے مکمل نہیں ہوتا۔ جب تک کہ مرتہن یعنی قرض خواہ اس پر قبضہ نہ کرے آیت مذکورہ میں لفظ مقبوضہ میں اسی طرف اشارہ ہے خرید وفروخت ، نکاح اجارہ صرف ایجاب قبول سے مکمل ہو جاتے ہیں۔ مگر رہن اور ہبہ بغیر قبضہ غیر مکمل۔

مسئلہ ضروریہ:

رہن بالقبض کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ قرض خواہ کو اپنے قرضہ کی واپسی کا اطمینان ہو جائے۔ لہذا اسے مقروض کی طرف سے گروی رکھی ہوئی چیز سے کسی قسم کا نفع اٹھانے کا حق نہیں اگر کوئی آدمی رہن رکھے ہوئے مکان میں خود رہتا ہے یا اس کا کرایہ وصول کر کے اپنی ضروریات میں خرچ کرتا ہے تو وہ سود کے حکم میں ہے۔

مسئلہ: رہن صرف ذی قیمت مال کو رکھا جاتا ہے۔ لہذا کوئی شخص اپنی بیوی بچوں یا اپنے کو گروی نہیں رکھ سکتا۔ کیوں کہ یہ مال نہیں۔ اسی طرح کوئی مسلمان شراب یا یا خنزیر پر گروی نہیں رکھ سکتا کیوں کہ یہ بھی مسلمان کے لیے ذی قیمت مال نہیں۔

مسئلہ: مرہون (گروی رکھی گئی) چیز کی زکواۃ کسی پر واجب نہیں کیوں کہ مالک کا اس پر قبضہ نہیں اور قرض خواہ کی اس پر ملکیت نہیں۔ ہاں جب مقروض اپنا رہن چھڑا لے تب اس پر گزشتہ سالوں یعنی زمانہ قرض کی بھی زکواۃ واجب ہوگی مگر قرض وضع کرنے کے بعد۔

تنبیہ

ہمارے ہاں جو رہن کا رواج ہے کہ کسی کا کھیت اپنے پاس گروی رکھتے ہیں اور سالہا اس کی آمدنی کھاتے رہتے ہیں۔ پھر پورا قرض وصول کر کے گروی رکھا ہوا کھیت واپس کرتے ہیں یہ سراسر ناجائز ہے۔

وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ :(اور گواہی نہ چھپاؤ اور جو گواہی چھپائے گا تو اس کا دل گناہ گار ہے)

وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ : (تکتمو اکتم) سے بنا اس کا معنی ہے کوئی بات چھپانا (مفردات) یہ گواہوں سے خطاب ہے یا مقروضوں سے یعنی اے گواہو گواہی نہ چھپاؤ کہ مدعی کا حق برباد نہ ہو۔ گواہی چھپانے کی چند صورتیں ہیں۔ گواہی نہ دینا، یا خلاف دینا، یا حق سے کم کی گواہی دینا، یا میعاد قرض میں فرق کر کے گواہی دینا کہ تھوڑی میعاد کو زیادہ بتا دینا ان سب سے منع کیا گیا یا اے مقروضو! تم پر جو حقوق واجب ہیں ان کی شہادت نہ چھپاؤ اور اپنے خلاف حق کا اقرار کرلو (وَمَنْ يَّكْتُمْهَا) الخ یعنی جو شخص شہادت کو چھپائے گا تو بلا شبہ اس کا دل گناہ گار ہے گناہ کی نسبت قلب کی طرف اس لیے کی گئی کہ چھپانا دل ہی کا فعل ہے اصل فاعل کی طرف فعل کی نسبت کرنے سے فعل میں شدت اور قوت پیدا ہو گئی جیسے کہتے ہیں میں نے اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھا، کانوں سے سنا اور اپنے دل سے یاد رکھا یا دل کی طرف نسبت کرنے کی وجہ یہ ہے کہ دل تمام اعضاء کا سردار ہے۔ اس کے افعال کا اثر تمام جسم پر مرتب ہوتا ہے۔ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا (**ان فی جسد بنی ادم لمضغة اذا صلحت صلح الجسد کله و اذا فسدت فسد الجسد کله الا وهی القلب**) کہ انسان کے بدن میں ایک گوشت کا لوتھڑا ہے۔ جب وہ ٹھیک ہوتا ہے تو سارا بدن ٹھیک ہوتا ہے جب وہ بگڑ جاتا ہے تو سارا بدن بگڑ جاتا ہے۔ سن لو! وہ گوشت کا ٹکڑا دل ہے} (رواہ الشیخان عن نعمان بن بشیر)

نیز بعض وہ گناہ ہیں جس سے دل میں سیاہی پیدا ہوتی ہے اور وہ پھر بڑھتے بڑھتے سارے دل کو گھیر لیتی ہے یہاں فرمایا گیا کہ جھوٹی گواہیوں کا اثر دل پر پڑتا ہے اور اس سے جھوٹے گواہ کا دل سیاہ ہو جاتا ہے۔ صاحبِ تفسیر خاذن نے فرمایا کہ یہاں اثم بمعنی مسخ یعنی جھوٹے گواہ کا دل مسخ ہو جاتا ہے۔

فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِی اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ : (اگر تم میں ایک کو دوسرے پر اطمینان ہو تو وہ جسے اس نے امین سمجھا انہیں امانت ادا کر دے اور اللہ سے ڈرے جو اس کا رب ہے)

اَمِنَ یا اَمْنٌ سے بنا یا امانۃ سے بنا بمعنی بے خوفی نفس کا مطمئن ہونا (مفردات) بعضکم سے مراد قرض دینے والا اور بعضا سے قرض لینے والا مراد ہے۔

فَلْيُؤَدِّ : تادیۃ سے بنا اس کا مادہ اداء ہے۔ عین واجب کا دینا ادا کہلاتا ہے۔ اور اسکے مثل کا دینا قضاء لیکن یہاں ادا بمعنی قضاء ہے کیوں کہ قرض میں واجب کا مثل دیا جاتا ہے نہ کہ عین نیز چوں کہ دین ذمہ میں واجب ہوتا ہے۔ اسی لیے اس کے مثل کا دینا گویا عین ہی کا دینا ہے اسی لیے یہاں ادا فرمایا گیا (ملخصاً از تفسیرات احمدیہ، نعیمی) (اَلَّذِی) سے مقروض مراد ہے۔

اؤْتُمِنَ : ایتمان سے بنا اس کا مادہ امن یا امانت ہے۔ امن اور ایتمان دونوں کے معنی امین جا ننا اسی لیے معتمد شخص کو مامون بھی کہتے ہیں۔ امانت سے مراد قرض ہے قرض کو امانت اس لیے فرمایا گیا کہ دینے والے نے مقروض پر اعتماد کیا تحریر اور رہن کی ضرورت نہیں سمجھی گئی بلکہ اسی کو امین سمجھ لیا گیا (مظہری) نیز امانت کو بھی امانت اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ بھی اطمینان اور بے خوفی کی بناء پر کسی کے پاس رکھی جاتی ہے۔ آیت کریمہ کا مطلب یہ ہوا کہ اگر تم میں سے ایک نے دوسرے پر اعتماد اور بھروسہ کرتے ہوئے یعنی اسے امین سمجھ کر تحریر یا رہن رکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تو پس جس کی امانت پر اطمینان کر لیا گیا (مقروض) اس پر لازم ہے کہ قرض خواہ کی امانت (قرض) ادا کر دے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دوران خطبہ فرمایا (لا

ایمان لمن لا امانة له) (الحدیث)

(جس میں امانت نہیں اس میں ایمان نہیں اور جس میں وعدہ کی پاسداری نہیں اس کا دین مکمل نہیں)(رواہ البیہقی فی الشعب

مقروض کو خیانت اور انکار حق کے معاملہ میں اللہ سے ڈرنا چاہیے کیوں کہ امانت میں خیانت کرنا منافق کی علامت ہے۔

وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِیْمٌ : (اللہ تمہارے کاموں کو جانتا ہے) یعنی شہادت دینے اور شہادت کو چھپانے سے وقف ہے یہ جملہ بطور تہدید فرمایا اس آیت سے معلوم ہوا کہ شہادت کو چھپانا حرام ہے بشرطیکہ وہ حقوق کی گواہی ہو خواہ حقوق بندوں کے ہوں یا شریعت کے حقوق کی گواہی کے اقسام اور احکام پہلے بیان ہو چکے۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ طلب شہادت کے بغیر شہادت دینا مذموم ہے۔ کیوں کہ حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میری بہترین امت میرے زمانہ کی ہے۔ ان کے بعد ان لوگوں کا مرتبہ جو ان سے متصل آئیں گے پھر ان کا مرتبہ جو ان کے متصل آئیں گے ان کے بعد ایسے لوگ آئیں گے جو بلا طلب شہادت دیں گے خیانت کریں گے۔ امانت دار نہ ہوں گے نذریں مانیں گے، مگر پوری نہیں کریں گے اور عموماً ان میں فربہی ہوگی۔ (موٹے، بے غیرت، بے حیاء، حرام خور ہو نگے) دوسری روایت میں یہ بھی آیا کہ بلا طلب قسمیں کھائیں گے۔ (متفق علیہ) لیکن حدیث بالا میں مذمومہ شہادت سے مراد جھوٹی شہادت ہے، کیوں کہ سچی شہادت کا ادا کرنا تو نص میں مامور ہے علامہ طحاوی رحمتہ اللہ علیہ نے بواسطہ مالک حضرت زید بن خالد جہنی رحمتہ اللہ علیہ کی روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں تم کو بتاؤں کہ سب سے اچھا گواہ کون ہے؟ سب سے اچھا گواہ وہ ہے جو درخواست سے پہلے ہی اپنی شہادت دیدے یا طلب شہادت سے پہلے اپنی شہادت کی اطلاع دیدے۔

دل کے بُرے افعال میں کونسا فعل گناہ ہے اور کونسا نہیں

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الۡاَرۡضِ وَاِنۡ تُبۡدُوۡا مَا فِيۡۤ اَنۡفُسِكُمۡ اَوۡ تُخۡفُوۡهُ

يُحَاسِبۡكُمۡ بِهِ اللّٰهُ فَيَغۡفِرُ لِمَنۡ يَّشَآءُ وَ يُعَذِّبُ مَنۡ يَّشَآءُ

''ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ اور اگر تم ظاہر کرو جو کچھ تمہارے دل میں ہے یا چھپاؤ اللہ تم سے اس کا حساب لے گا۔ جسے چاہے گا بخشے گا اور جسے چاہے گا سزا دے گا۔''

(آیت کے فوائد و مسائل)

ا۔ ہر چیز کا مالک حقیقی رب تعالیٰ ہے۔ اس کے ماسوا کی ملکیت مجازی عطائی اور فانی ہے۔ جیسا کہ لِلّٰہِ کے حصر سے معلوم ہوا دوسری جگہ ارشاد ہو (جاھدوا باموالکم و انفسکم) اپنے جان و مال سے جہاد کرو اس میں جان و مال کو مسلمانوں کی چیز قرار دیا یعنی حقیقی مالک رب تعالیٰ ہے اور مجازی مِلک مخلوق کو بھی حاصل ہے۔ قرآن مجید میں اس قسم کی تمام حصروں کا یہی حال ہے۔ جیسے اللہ کافی ہے، اللہ کافی وکیل ہے، اللہ کافی حساب لینے والا ہے۔ کہ اس کی یہ تمام صفتیں حقیقی ہیں اور دوسروں کی مجازی اسی طرح (لـــه غيـــب السـمـوٰت و الارض) یعنی زمین و آسمان کا غیب رب ہی کا ہے۔ یعنی علم حقیقی رب کیساتھ خاص ہے۔ اور عطائی مجازی اس کے پیاروں کو بھی حاصل ہے۔ جو لوگ اس آیت کی آڑ میں انبیاء کرام کے علم غیب عطائی کا بھی انکار کرتے ہیں انہیں چاہیے کہ سورہ بقرہ کی اس آیت سے مخلوق کی ملکیت کا بھی انکار کریں نہ کسی کو گواہ مانیں، نہ وکیل، نہ بادشاہ دیکھئے پھر کیا لطف آتا ہے۔ غرض ہر چیز میں ذاتی عطائی کا فرق کرنا ضروری ہے (نعیمی)

۲۔ حساب اور حشر حق ہے جیسا کہ (یحاسبکم) سے معلوم ہوا اس میں منکرینِ حساب کا رد ہے۔(تفسیرات احمدیہ وروح البیان)

۳۔ حساب وکتاب بندہ کے اظہار پر موقوف نہیں بلکہ انسان جو کام چھپ کر کرتا ہے اس کا بھی حساب وکتاب ہوگا جیسا کہ (او تخفوہ) سے معلوم ہوا۔

حساب دو قسم کا ہے۔(ا): حساب یسیر یعنی پیشی پھر معافی اور حساب عسیر یعنی پوچھ گچھ کہ تم نے گناہ کیوں کیے حساب یسیر تو ہر خطرہ اور وسوسہ پر ہوسکتا ہے۔رب تعالیٰ فرماتا ہے۔(ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ) مگر حساب عسیر اور سزا گناہ کے ارادے پر نہیں حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن جس کا محاسبہ ہوگا وہ ہلاک ہو جائے گا۔میں نے عرض کیا کیا اللہ تعالیٰ نے (فسوف یحاسب حسابا یسیرا) نہیں فرمایا؟ آپ ﷺ نے فرمایا یہ تو صرف پیشی ہوگی مگر (من نوقش فی الحساب یھلک) جس سے حساب میں پوچھ گچھ کی گئی وہ ہلاک ہو جائے گا(متفق علیہ)

۴۔ :انسان کے دل میں دو طرح کے خیالات آتے ہیں ایک بطور وسوسہ کے ان سے دل کا خالی کرنا انسان کی طاقت میں نہیں وہ ان کو بُرا جانتا ہے اور عمل میں لانے کا ارادہ نہیں رکھتا ان کو حدیث نفس اور وسوسہ کہتے ہیں۔اس پر مواخذہ نہیں بخاری، مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے کہ سید عالم ﷺ نے فرمایا کہ میری امت کے دلوں میں جو وسوسے گزرتے ہیں۔اللہ تعالیٰ ان سے تجاوز فرماتا ہے۔جب تک وہ انہیں عمل میں نہ لائیں یا ان کے ساتھ کلام نہ کریں یہ وسوسے اس آیت میں داخل نہیں ۔دوسرے وہ خیالات جس کو انسان اپنے دل میں جگہ دیتا ہے وہ ان کو عمل میں لانے کا قصد وارادہ کرتا ہے۔ان پر مواخذہ ہوگا اور انہی کا اس آیت میں بیان ہے۔(خزائن العرفان)

مسئلہ: حق یہ ہے کہ ارادہ گناہ پر گناہ کا عذاب نہ ہوگا بلکہ ارادہ گناہ کہ کوئی چوری کرنے نکلا مگر نہ کر سکا تو اس کے ہاتھ نہیں کٹ سکتے ہاں اس ارادے کا گناہ گار ہوا نہ کہ چوری کا۔

مسئلہ: کفر کا عزم (پختہ ارادہ) کرنا کفر ہے (احمدی)

مسئلہ: اگر بندے نے کسی گناہ کا ارادہ کیا پھر اس پر نادم ہوا اور استغفار کیا تو اللہ اس کو معاف فرمائے گا صاحب تفسیر کبیر نے نقل فرمایا کہ جب یہ آیت (ان تبدو مافی انفسکم او تخفوہ یحاسبکم اللہ) نازل ہوئی تو حضرت ابوبکر، عمر، عبدالرحمٰن بن عوف اور معاذ ابن جبل اور دیگر حضرات رضی اللہ عنھم اجمعین حضور سید عالم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگے کہ حضور ﷺ یہ حکم طاقت سے زیادہ ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ تم بھی بنی اسرائیل کی طرح کہنا چاہتے ہو (سمعنا وعصینا) یوں کہو (سمعنا واطعنا) یعنی ہم نے سنا اور اطاعت کریں گے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہ نے یہ کہا، مگر ان کی آوازیں خوف سے کانپتی تھیں ایک سال بعد یہ آیت نازل ہوئی۔ (لایکلف اللہ نفسا الا وسعھا)

خیال رہے آیت (لایکلف اللہ) (الایۃ) (ان تبدو مافی انفسکم) کی تفسیر اور وضاحت ہے۔ نہ کہ ناسخ ہے۔ ہاں بعض سلف توضیح مراد کو بھی نسخ سے تعبیر کر دیتے ہیں۔ اس بناء پر بعض مفسرین نے آیت (لایکلف اللہ) کو پہلی آیت کا ناسخ کہا ہے۔

فائدہ:

اہل سنت کا اجماع ہے کہ تمام گناہوں کی حساب فہمی حق ہے۔ قلبی گناہوں یا باطنی یا جسمانی یا چھوٹے بڑے تمام گناہوں کی سزا دینا بھی حق ہے، مگر لازم نہیں اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہے۔ طاؤس نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے کہ (فیغفر لمن یشاء) کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اگر چاہے گا تو کبیرہ گناہوں کو بھی معاف کر دے خواہ کرنے والے نے توبہ کی ہو یا نہ کی ہو اور (یعذب من یشاء) کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ چاہے گا تو چھوٹے گناہ پر بھی عذاب دیگا کوئی اس سے باز پرس نہیں کر سکتا (مظہری)

لا یکلف اللّٰہ نفسا الا وسعھا ط الخ لھا ماکسبت وعلیھا ماکتسبت :

اللہ کسی جان پر بوجھ نہیں ڈالتا مگر اس کی طاقت بھر اس کا فائدہ ہے جو اچھا کمایا اور اس کا نقصان ہے جو برائی کمائی۔

تعلق:

پہلی آیت میں فرمایا گیا کہ دلوں کی پوشیدہ باتوں پر بھی پکڑ ہوگی ان سے مراد امور غیر اختیاری نہیں بلکہ امور اختیاریہ مراد ہیں، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کسی شخص کو احکام شرعیہ کا مکلف نہیں بناتا مگر جو اس کی طاقت اور اختیار میں ہو یعنی خدا تعالیٰ ناممکن باتوں کی کسی کو تکلیف نہیں دیتا۔ ہر چیز کو بقدر طاقت احکام دیئے جاتے ہیں۔ خیال رہے کہ ہمارے عرف میں تکلیف دکھ، درد، مشقت کو کہتے ہیں۔ مگر شریعت میں کسی کے ذمہ کچھ احکام لازم کر دینے کو تکلیف کہا جاتا ہے۔

وسعھا : وسعت بمعنی استطاعت اور قدرت کے ہیں۔ اس جگہ وسع (قدرت وطاقت) سے مراد وہ استطاعت موہومہ ہے۔ جو فعل سے پہلے موجود ہوتی ہے جیسے اسباب اور آلات کا فراہم ہونا (موانع وغیرہ کا نہ ہونا) اور اوامر ونواہی احکام کے دلائل کا موجود ہونا کہ حقیقی قدرت (جس کو استطاعت فعلی کہا جاتا ہے) مراد نہیں یہ تو فعل کیساتھ ہوتی ہے۔ جمہور کے نزدیک استطاعت ادائے فعل کی شرط ہے علت نہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ جس وقت بندہ کوئی کام کرنے کا ارادہ کرتا ہے اور پہلے سے تمام اسباب وآلات فراہم ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اس کے اندر ایک صفت پیدا کر دیتا ہے۔ جس کی موجودگی میں وہ اچھا برا کام کرتا ہے اور اس قسم کی استطاعت کا فعل کے ساتھ ساتھ ہونا ضروری ہے ورنہ وجود فعل بغیر استطاعت کے لازم آئے گا گویا قدرت کے دو معنی ہیں۔ ایک آلات و اسباب کا فراہم ہونا اور موانع کا نہ ہونا اس قدرت کا وجود پہلے سے ہوتا ہے، لیکن یہ قدرت ناقصہ ہے۔ دوسری وہ قدرت جس کے پیدا ہونے کے وقت تمام شرائط ضرور یہ پہلے سے موجود ہوتی ہیں

اور کام کرنے کے وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندہ کو ایک خاص طاقت مل جاتی ہے۔ جس کو ہم توفیق کہہ سکتے ہیں اس کے ساتھ فعل کا صدور لازم ہوتا ہے۔ یا عادۃ ہو جاتا ہے (ملخصاً عامہ کتب اصول فقہ حاشیہ مظہری)

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ عَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ : (اس کا فائدہ ہے جو اچھا کمایا اور اس کا نقصان ہے جو برائی کمائی) کسب ایسا کام کرنے کو کہتے ہیں جس سے انسان اپنی ذات اور اس کے ساتھ دوسروں کے فائدے کے لیے کرے، مگر اکتساب ایسا کام کرنے کو کہتے ہیں جس میں انسان صرف اپنے مفاد کو پیش نظر رکھے لہذا ہر اکتساب کو کسب لازم لیکن ہر کسب کو اکتساب لازم نہیں (مفردات) نیز بعض نے آیت بالا میں ہر دو مستعمل الفاظ کے پیش نظر استدلال کیا ہے۔ کہ کسب کا لفظ اعمال صالحہ اور اکتساب کا لفظ اعمال سیہ کے ساتھ مخصوص ہے۔ (کبیر)

مطلب یہ ہوا کہ یہ نفس کی نیکیاں اس کے لیے ہیں اور ہر نفس کے گناہ اس پر پڑیں گے۔

شبہ: آیت کے معنی سے معلوم ہوا کہ ہر شخص کی نیکی اس کو ملتی ہے نہ کہ دوسرے کو تو کسی کو ثواب وغیرہ بخشا درست نہ ہوا کیوں کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ خیرات یا دیگر نیک کام کوئی کرے اور ثواب دوسروں کو مل جائے قرآن مجید میں دوسری جگہ ارشاد فرمایا لیس للانسان الا ماسعی (آدمی نہ پائے گا، مگر اپنی کوشش) معلوم ہوا کہ اپنی نیکی کام آسکتی ہے۔ نہ کہ دوسرے کی۔

ازالہ شبہ: خیال رہے! عبادات کی تین قسمیں ہیں (۱) بدنی، جیسے نماز روزہ (۲) مالی جیسے زکواۃ (۳) بدنی اور مالی کا مجموعہ جیسے حج بدنی عبادات میں نیابت نہیں ہو سکتی ہے۔ کہ کوئی کسی کی طرف سے نماز نہیں پڑھ سکتا۔ مالی عبادات میں نیابت ہو سکتی ہے۔ کہ کوئی شخص اپنی زکواۃ خود ادا کرے یا کسی سے کروا دے۔ بدنی اور مالی کا مجموعہ عبادات بحالت مجبوری نیابت جائز ہے اور بلا وجہ ناجائز کہ بحالت مجبوری میں حج دوسرے سے کرایا جا سکتا ہے نہ کہ بلا ضرورت اس لیے حج بدل صرف بوڑھے یا میت کی طرف سے جائز ہے۔ لیکن ہر قسم کی عبادت کرنے کے بعد اس کا ثواب کسی دوسرے کو بخشا جا سکتا ہے، کیوں کہ بخشنے سے محض ثواب پہنچتا ہے نہ کہ اصل فعل وہ تو کرنے والے

کے لیے ہی رہتا ہے اس آیت کا یہی مطلب ہے کے نفس کا کمایا ہوا فعل اسی کے لیے رہے گا نیز نیکی کرنے والا کبھی نیکی سے محروم نہیں ہو سکتا۔ چناں چہ ثواب بخشنے سے بخشنے والا خود ثواب سے محروم نہیں رہ جاتا بلکہ اس نے جتنوں کو ثواب بخشا اسے ان سب کے برابر ثواب ملتا ہے۔(درمختار) آیت (لیس للانسان الا ماسعی) یعنی آدمی اپنی ہی نیکیوں سے فائدہ پاتا ہے۔یہ مضمون دین ابراہیم اور موسیٰ علیہم السلام کا تھا اوران ہی امتوں کے لیے خاص تھا۔حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ حکم ہماری شریعت میں آیت (اَلْحَقْنَا بھم ذریتھم) سے منسوخ ہو گیا (خازن) حدیث شریف میں ہے کہ ایک شخص نے سید عالم ﷺ سے عرض کی کہ میری ماں کی وفات ہو گئی اگر میں اس کی طرف سے صدقہ دوں تو کیا نافع ہوگا؟ فرمایا ہاں۔علاوہ ازیں بکثرت حدیث سے ثابت ہے کہ میت کو صدقات وطاعات سے جو ثواب پہنچایا جاتا ہے۔ پہنچتا ہے اوراس پر علمائے امت کا اجماع ہے اسی لیے مسلمانوں میں معمول ہے کہ وہ اپنے مرنے والوں کو فاتحہ، سوم، چہلم، عرس وغیرہ کے موقع پر طاعات وصدقات سے ثواب پہنچاتے رہتے ہیں یہ عمل احادیث کے بالکل مطابق ہے۔نیز اس آیت کی تفسیر میں ایک قول یہ بھی ہے کہ انسان سے مراد کافر ہے۔اور معنی یہ ہیں کہ کافر کو کوئی بھلائی نہیں ملے گی بجز اس کے جو اس نے کی ہو کہ دنیا میں ہی وسعت رزق یا تندرستی وغیرہ سے اس کا بدلہ دے دیا جائے گا تا کہ آخرت میں اس کا کچھ حصہ باقی نہ رہے نیز مفسرین نے آیت کا ایک معنی یہ بھی بیان فرمایا کہ آدمی بمقتضائے عدل وہی پائے گا جو اس نے کیا اور اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے جو چاہے عطا فرمائے (خزائن العرفان)

خطاء اور نسیان پر مواخذہ نہ ہونا

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذۡنَآ اِنۡ نَّسِیۡنَآ اَوۡ اَخۡطَاۡنَا رَبَّنَا وَلَا تَحۡمِلۡ عَلَیۡنَآ اِصۡرًا کَمَا حَمَلۡتَهٗ عَلَی الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِنَا رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلۡنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ وَ اعۡفُ عَنَّا وَاغۡفِرۡ لَنَا وَارۡحَمۡنَا اَنۡتَ مَوۡلٰنَا فَانۡصُرۡنَا عَلَی الۡقَوۡمِ الۡکٰفِرِیۡنَ (سورۃ البقرۃ:۲۸۶)

"اے رب ہمارے ہمیں نہ پکڑ اگر ہم بھولیں یا چوکیں اے رب ہمارے اور ہم پر بھاری بوجھ نہ رکھ جیسا تو نے ہم سے اگلوں پر رکھا تھا اے رب ہمارے اور ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جس سے ہمیں سار (طاقت) نہ ہو اور ہمیں معاف فرمادے اور بخش دے اور ہم پر مہر (رحم) کر تو ہمارا مولا ہے۔ تو کافروں پر ہمیں مدد دے۔"

تفسیر:

جب کہ اللہ تعالیٰ نے اس صورت میں نماز، زکواۃ، روزہ، حج کی فضیلت طلاق، عدت، ایلاء حیض، جہاد وغیرہ کے احکام اور انبیاء علیہم السلام کے واقعات بیان فرمائے تو اب آخر میں سورہ کو دعائیہ کلمات پر ختم کیا جارہا ہے۔ کوئی شخص اپنی عبادت پر نازاں نہ ہو بلکہ ہر وقت اللہ کے فضل وکرم کا خواہاں رہے۔

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذۡنَآ اِنۡ نَّسِیۡنَآ اَوۡ اَخۡطَاۡنَا: (اے رب ہمارے ہمیں نہ پکڑ اگر ہم بھولیں یا چوکیں) کیوں کہ یہ دعا ہے اس لیے رب کے نام سے شروع کی گئی، لَا تُؤَاخِذۡنَآ مواخذہ سے بنا اس کا معنی پکڑنا یا عذاب دینا ہے۔ چوں کہ اللہ تعالیٰ گناہ گار کو عقوبت سے پکڑتا ہے۔ اور گناہ گار رب تعالیٰ کو مطالبہ عفو وکرم سے کیوں کہ وہ سوائے اللہ کے عذاب سے نجات دینے والا کوئی نہیں

پاتا اس لیے یہاں لفظ مواخذہ جو کہ باب مفاعلت سے ہے۔ اور مشارکت کے لیے لایا گیا ہے (کبیر) نسیان کا معنی کسی چیز کو ضبط میں نہ رکھنا خواہ یہ ترک ضبط ضعف دماغ کی وجہ سے ہو یا ازارہ غفلت یا قصداً کسی چیز کی یاد بھلادی جائے حتیٰ کے وہ چیز دل دماغ سے محو ہو جائے (مفردات) خیال رہے! کہ ہر وہ نسیان جو انسان کے قصد اور ارادہ سے ہو وہ مذموم ہے۔ اور جو بغیر قصد اور ارادہ کے ہو اس میں انسان معذور ہے۔ حدیث (رفع عن امتی الخطاء والنسیان) کہ میری امت کو خطا و نسیان معاف ہیں۔ اس سے یہی دوسری قسم کا نسیان مراد ہے کہ جس میں انسان کے ارادہ کو دخل نہ ہو جب لفظ نسیان کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس سے ازارہ اہانت انسان کو چھوڑ دینے اور احکام الٰہی کے ترک کرنے کی وجہ سے اسے سزا دینے کے معنی مراد ہوتے ہیں۔ جیسا کہ ارشاد ہوا (فالیوم ننساهم کما نسوا لقاء هم هذا) (تو جس طرح یہ لوگ اس دن کے آنے کو بھولے ہوئے تھے اس طرح آج ہم بھی انہیں بھلادیں گے)۔

خطا: اَخطَانا خطاءٌ سے بنا جس کا معنی صحیح جہت سے عدول کرنا ہے اس کی مختلف صورتیں ہیں۔

۱۔ گویا ایسا کام بالارادہ کرے جس کا ارادہ بھی مناسب نہ ہو یہ خطاء تام ہے جس پر مواخذہ ہوگا قرآن مجید میں (ان قتلهم کان خطأً کبیرا) (بیشک ان کا مارڈالنا بڑا سخت جرم ہے) اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔

۲۔ ارادہ تو اچھا کام کرنے کا ہو لیکن غلطی سے برا کام سرزد ہو جائے اس معنی کی ادائیگی کے لیے عموماً باب افعال استعاف ہوتا ہے۔ اور اسی کے متعلق حضور علیہ السلام کا ارشاد (رفع عن امتی الخطاء والنسیان) ہے۔

۳۔ غیر مستحن فعل کا ارادہ کرے، لیکن اتفاق سے مستحن فعل سرزد ہو جائے اس صورت میں اس کا فعل تو درست ہے، مگر ارادہ غلط لہٰذا اس کا قصد مذموم ہوگا، مگر فعل بھی قابل ستائش نہیں ہوگا حاصل کلام! یہ لفظ مشترک ہے لیکن زیادہ تر اس کا استعمال اس فعل کے متعلق ہوتا ہے۔ جو

بذات خود مقصود نہ ہو بلکہ کسی دوسری چیز کا ارادہ اس فعل کے صدور کا سبب بن جائے مثلاً کسی نے شکار کو نشانہ بنایا، مگر گولی خطا کسی انسان کو جا لگی (ملخصًا مفردات القرآن للراغب اصفہانی)

اس آیت میں نسیان سے نیکی چھوڑ دینا مراد ہے۔ اور خطا سے مراد دھوکے سے گناہ کر لینا فقہاء کی اصطلاح میں نسیان یہ ہے کہ کام ارادہ سے کیا جائے اور مانع کا خیال نہ رہے۔ جیسے روزہ یاد نہ رہا کچھ کھا پی لیا اور خطا یہ ہے کہ مانع تو یاد رہے، مگر فعل بلا ارادہ ہو گیا جیسے روزے کی حالت میں کلی کر رہا تھا کہ پانی حلق سے اتر گیا یعنی اے مسلمانوں یہ دعا مانگو کہ اے مولی! اگر ہم کوئی نیکی بھول جاویں یا غلطی سے گناہ کر بیٹھیں تو ہماری پکڑ نہ فرما۔

مسئلہ: آخرت میں بھول چوک پر پکڑ نہیں ہوگی، مگر احکام شرعیہ میں بعض جگہ بھول معاف ہے اور بعض جگہ نہیں روزے میں بھول کر کھا لیا معاف ہے، لیکن اگر نماز میں بھول کر بات کر لی تو نماز جاتی رہی۔ اگر ذبح پر بسم اللہ پڑھنا بھول گیا تو حلال ہے اگر خطاء کسی کا نقصان کر دیا تو تاوان واجب ہے۔ لہٰذا مومن کے قتل خطا پر غلام آزاد کرنا یا دیت ادا کرنا ہے۔ اگر کوئی بھول کر بے وضو نماز پڑھ لے تو نماز ادا نہیں ہوگی۔ غرض یہ کہ آیت آخروی عذاب کے متعلق ہے دنیاوی احکام کے لیے نہیں۔

مسئلہ: وہ بھول جس میں بندے کی اپنی کوتاہی شامل ہو اس پر پکڑ ہے۔ چناں چہ اگر حافظ قرآن تلاوت چھوڑ دے اور بھول جائے (دیکھ کر بھی نہ پڑھ سکے) تو سخت گناہ گار ہے۔ لہٰذا اگر کوئی بیماری وغیرہ کی وجہ سے بھول گیا تو معاف ہے۔

مسئلہ: بعض غلطیاں مثل زہر کے ہیں کہ اگر جان بوجھ کر کھائے تو بھی ہلاک اور بھول کر کھائے تو بھی ہلاک ایسے ہی نکاح، طلاق، عتاق، بیع، اجارہ ہبہ وغیرہ عقود کا یہی حال ہے کہ عمداً کرے یا بھول کر یا خطا سے بہر حال واقع ہو جائیں گی۔ حدیث شریف میں ہے (ثلٰث جدھن جد وھزلھن جد) (تین باتیں ہیں چاہے سنجیدگی سے کرے

یا مذاق سے واقع ہو جاتی ہیں)۔

مسئلہ: شریعت یا بندوں کے حقوق بھول چوک سے معاف نہیں ہو سکتے لہٰذا قرض خواہ اور مقروض دونوں بھول جائیں یا کوئی مسلمان کچھ نمازیں بھول گیا تو اس کو قرض اور نمازیں معاف نہ ہوں گی۔ جب یاد آ جائیں تو ادا کرے۔

آخر میں اس سورہ مبارکہ کے کچھ فضائل وفوائد بیان کرتے ہیں۔

۱۔ حضور سید عالم ﷺ نے فرمایا کہ سورہ بقر قرآن پاک میں ایسی ہے جیسے کہ اونٹ کے جسم میں کوہان جس طرح اونٹ کی خوبصورتی اس کے کوہان سے ہوتی ہے۔ اس طرح قرآن پاک کی زینت سورہ بقر ہے (مسند امام احمد)

۲۔ ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ زہراوین (چمک دار نورانی) سورتوں کو پڑھا کرو یعنی سورہ بقر اور آل عمران کیوں کہ قیامت کے دن یہ دونوں سورتیں اپنے پڑھنے والوں پر بادل کی طرح سایہ کریں گی اور ان کی شفاعت فرمائیں گی (مسلم)

۳۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے معلم انسانیت ﷺ سے سورہ بقرہ بارہ سال کے عرصہ میں تمام حقائق واسرار کیساتھ پڑھی اور جس دن ختم کی ایک اونٹ ذبح کر کے خوشی میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کی دعوت کی۔

فائدہ:

معلوم ہوا کہ دینی کتابیں شروع یا ختم کرتے وقت شرینی تقسیم کرنا اور خوشی منانا سنت صحابہ ہے۔

۱۔ عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور علیہ ﷺ نے فرمایا کہ سورہ بقرہ کی آخری دو آیتیں پڑھا کرو میرے رب نے خصوصیت کیساتھ عرش کے نیچے سے مجھے عطا فرمائیں مجھ سے پہلے کسی نبی کو نہ ملیں؟ (در منثور)

۲۔ مسلم نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ جب حضور اکرم ﷺ شب معراج سدرۃ المنتہی پر پہنچے تو آپ کو تین چیزیں عطا ہوئیں۔ پانچ نمازیں، سورہ بقرہ کی آخری دو آیتیں (امن رسول سے لے کر آخر تک) اور ہر مومن کی بخشش۔

۳۔ ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا رب تعالیٰ نے جن آیتوں پر بقرہ ختم فرمائی وہ عرش کا خزانہ ہیں۔ انہیں خود بھی سیکھو اور اپنے بیوی بچوں کو بھی سکھاؤ۔ یہ صلوۃ ہیں۔ یہ قرآن ہیں یہ دعائیں ہیں۔ (حاکم، بیہقی وغیرہ)

۴۔ مسلم شریف میں بروایت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ ہے کہ ایک روز حضرت جبرئیل امین علیہ السلام حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے۔ کہ اچانک اوپر سے سخت آواز سنی جبرئیل امین علیہ السلام نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ اس وقت آسمان کا وہ دروازہ کھلا جو آج تک کبھی نہ کھلا۔ یہ کہہ ہی رہے تھے کہ ایک فرشتہ حاضر ہوا۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے عرض کیا کہ حضور اکرم ﷺ یہ وہ فرشتہ ہے جو آج تک کبھی زمین پر نہیں آیا۔ اس فرشتہ نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ میں آپ کو دونوروں کی مبارکباد دینے آیا ہوں جو آپ سے پہلے کسی نبی کو نہ ملے ایک سورہ فاتحہ، دوسرا سورہ بقر کی آخری آیتیں۔ اس کے پڑھنے والے کی ہر تمنا پوری ہوگی۔

۵۔ اگر دفن کے بعد قبر کے سرہانے سورہ بقرہ کا پہلا رکوع مفلحون تک اور قبر کی پائنتی سورہ بقر کا آخری رکوع پڑھا جائے تو میت کو راحت ہوگی۔

اشرف التفاسیر

از افاداتِ شیخ القرآن

فی تفسیر سورۃ البقرۃ وامّ القرآن

اشرف التفاسیر

از افاداتِ شیخ القرآن

فی تفسیر سورۃ البقرۃ و امّ القرآن

مؤلفہ

حضرت علامہ شیخ القرآن ابوالفضل و البیان

مولانا غلام علی اوکاڑوی قادری اشرفی قدس سرہ